معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتیٔ اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi - Pakistan.

معارف القرآن

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد پنجم

فہرست مضامین ختم شد

سورۃ یوسف

سُورَةُ يُوسُفَ

مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی ، ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان

لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ② نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ

کا تاکہ تم سمجھ لو ، ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان اس

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ

واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن ، اور تو تھا اس سے پہلے

لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ

البتہ بے خبروں میں ، جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ④

خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو ، دیکھا میں نے انکو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ

کہا اے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ⑤ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ

البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن ، اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو

رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ

تیرا رب اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کریگا اپنا انعام تجھ پر

وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ

اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم

وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ⑥

اور اسحاق پر البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا۔

ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک واضح کتاب کی (جس کے الفاظ اور معانی اولیہ بہت صاف ہیں) ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم (اہل زبان ہونے کی وجہ سے دوسروں سے پہلے) سمجھو (پھر تمہارے واسطے سے دوسرے لوگ سمجھیں)۔ ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے پہلے آپ (اس قصہ سے) بالکل بے خبر تھے (کیونکہ نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، نہ کسی معلم سے کچھ سیکھا تھا، اور قصہ کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ عوام جانتے ہوں، آغازِ قصہ) وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے کہا کہ ابا میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، انھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندانِ نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج والد اور چاند ماں ہے، اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمہارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) تو وہ تمہارے (ایذاء رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی بھائیوں میں سے اکثر، کیونکہ دس بھائی علاتی تھے، ان سے خطرہ تھا، صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا، مگر یہ احتمال تھا کہ انکے منہ سے بات نکل جائے) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اسلئے بھائیوں کے دل میں وسوسے ڈالے گا) اور (جسطرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع و مطیع ہونگے) اسیطرح تمہارا رب تمکو (دوسری عزت نبوت کیلئے بھی) منتخب کریگا اور تمکو خوابوں کی تعبیر کا علم دیگا اور (دوسری نعمتیں دیکر بھی) تم پر اور اولادِ یعقوب پر اپنا انعام کامل کریگا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم و اسحٰق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کرچکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ یوسف چار آیتوں کے سوا پوری مکی سورۃ ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے، پورے قرآن میں دوبارہ اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصۂ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پورے قرآن میں خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کرکے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کے لئے بڑے سبق ہوتے ہیں، جن کی قدرتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب و دماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے محنت ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے، اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے، جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کے لئے نسخۂ کیمیا ہے، مگر قرآن کریم نے تاریخ عالم کے اس حصہ کو بھی اپنے مخصوص و بے مثال انداز میں اس طرح لیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ہر مقام پر جس قصہ کا کوئی ٹکڑا عبرت و موعظت کیلئے ضروری سمجھا گیا صرف اتنا ہی حصہ وہاں بیان کیا گیا، اور پھر کسی دوسرے موقع پر اس حصہ کی ضرورت سمجھی گئی تو پھر اس کا اعادہ کردیا گیا، اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کردیا گیا ہے، اس خاص اسلوبِ قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے، کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گذشتہ واقعات کا پڑھنا یا درکھنا خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ و خبر سے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

اسی لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے، خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے، اس میں اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں، کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہئے جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے

اور نہ اتنا طول ہونا چاہئے کہ اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ یہود نے آزمائش کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمیں بتلائیے کہ آلِ یعقوب ملکِ شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے، اور یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا تھا؟ ان کے جواب میں بذریعہ وحی یہ پورا قصہ نازل کیا گیا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی نبوت کا بڑا شاہد تھا، کہ آپ امی محض تھے اور عمر بھر مکہ میں مقیم رہے، کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی کتاب پڑھی، پھر وہ تمام واقعات جو تورات میں مذکور تھے، صحیح صحیح بتلا دیئے، بلکہ بعض وہ چیزیں بھی بتلا دیں جن کا ذکر تورات میں نہ تھا، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام و ہدایات ہیں جو آگے بیان ہوں گی۔

سب سے پہلی آیت میں حروف الٓرٰ مقطعات قرآنیہ میں سے ہیں، جن کے متعلق جمہور سلف صحابہ و تابعین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ متکلم اور مخاطب یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جس کو کوئی تیسرا آدمی نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کی تحقیق کے درپے ہو۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ، یعنی یہ ہیں آیتیں اس کتاب کی جو احکام حلال و حرام اور ہر کام کی حدود و قیود بتلا کر انسان کو ہر شعبۂ زندگی میں ایک معتدل سیدھا نظامِ حیات بخشتی ہیں جن کے نازل کرنے کا وعدہ تورات میں پایا جاتا ہے، اور یہود اس سے واقف ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، یعنی ہم نے نازل کیا اس کو قرآن عربی بنا کر کہ شاید تم سمجھ بوجھ حاصل کرلو۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قصہ یوسف علیہ السلام کا سوال کرنے والے عرب کے یہودی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں یہ قصہ نازل فرما دیا تاکہ وہ غور کریں، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر ایمان لائیں اور اس قصہ میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔

اسی لئے اس جگہ لفظ لَعَلَّ بمعنے شاید لایا گیا ہے، کیونکہ ان مخاطبوں کا حال معلوم تھا کہ ایسی واضح آیات بیّنات سامنے آنے کے بعد بھی ان سے قبولِ حق کی توقع مشکوک تھی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ، یعنی ہم بیان کرتے ہیں آپ کے لئے بہترین قصہ اس قرآن کو بذریعہ وحی آپ پر نازل کر کے بیشک آپ اس سے پہلے ان تمام واقعات سے ناواقف تھے۔

اس میں یہود کو تنبیہ ہو کہ تم نے جس طرح ہمارے رسول کی آزمائش کرنا چاہی اس میں بھی رسول کا کمال واضح ہوگیا، کیونکہ وہ پہلے سے اُمّی اور تاریخ عالم سے ناواقف تھے، اب اس واقفیت کا کوئی ذریعہ بجز تعلیم الٰہی اور وحی نبوت کے نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ اباجان میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تھا جس کی تعبیر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ گیارہ ستاروں سے مراد یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور سورج اور چاند سے مراد ماں باپ تھے۔

قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے وفات پاچکی تھیں، مگر ان کی خالہ والد ماجد کے نکاح میں آگئی تھیں، خالہ خود بھی ماں کے قائم مقام سمجھی جاتی ہے خصوصاً جبکہ وہ والد کی زوجیت میں آجائے تو عرفاً اس کو ماں ہی کہا جائے گا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ یعنی بیٹا تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا، ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خواب سن کر تمہاری عظمتِ شان معلوم کر کے تمہیں ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر کریں، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، وہ دنیا کے جاہ و مال کی خاطر انسان کو ایسے کاموں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ان آیات میں چند مسائل قابلِ ذکر ہیں:-

خواب کی حقیقت اور درجہ اور اس کی قسمیں: سب سے اوّل خواب کی حقیقت اور اس سے معلوم ہونے والے واقعات واخبار کا درجہ اور مقام ہے، تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفسِ انسان جس وقت نیند یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کو اس کی قوتِ خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے، پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح و صادق ہے، مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کچھ عوارض شامل ہو کر اس کو فاسد و ناقابل اعتبار کر دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں متشکل ہو کر نظر آجاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے یہ دونوں قسمیں باطل ہیں جن کی نہ کوئی حقیقت واصلیت ہے نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے، ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسویل شیطانی کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندہ کو متنبہ کرنے یا خوش خبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے، یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے (مظہری)

اس کی تحقیق صوفیائے کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں، اس وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے، اور اس عالم مثال میں جس طرح جواہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں اور شکلیں ہوتی ہیں، اسی طرح معانی اور اعراض کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں، خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہو جاتا ہے وہاں جو کائنات کی شکلیں ہیں وہ اس کو نظر آجاتی ہیں، پھر یہ صورتیں عالم غیب سے دکھائی جاتی ہیں، بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ کچھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں حقیقتِ واقعہ واضح نہیں ہوتی، ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ مختلف ہو جاتا ہے، اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہو اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوئے ہوں، اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے، ان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو

ناقابلِ اعتماد بنادیتی ہے، بعض اوقات تعبیر صحیح سمجھ میں نہیں آتی۔

خواب کی یہ تین قسمیں جو ذکر کی گئی ہیں یہی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو آپؐ نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم شیطانی ہے جس میں شیطان کی طرف سے کچھ صورتیں ذہن میں آتی ہیں، دوسری وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں سامنے آجاتی ہیں، تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ نبوّت کے اجزاء میں سے چھیالیسواں جُزء ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہے۔

خواب میں جزءِ نبوّت ہونے کے معنی اور اس کی تشریح

یہ قسم جو حق اور صحیح ہے اور صحیح احادیث نبویہ میں نبوت کا ایک جُزء قرار دی گئی ہو، اس میں روایاتِ حدیث مختلف ہیں بعض میں چالیسواں جزء اور بعض میں چھیالیسواں جزء بتلایا، اور بعض روایات میں انچاس اور پچاس اور ستّرواں جزء ہونا بھی منقول ہے، یہ سب روایتیں تفسیر قرطبی میں جمع کرکے ابن عبدالبر کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ان میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ ہر ایک روایت اپنی جگہ صحیح و درست ہے، اور تعددِ اجزاء کا یہ اختلاف خواب دیکھنے والوں کے مختلف حالات کی بناء پر ہے، جو شخص سچائی، امانت، دیانت اور کمالِ ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوّت کا چالیسواں جزء ہوگا، اور جو اِن اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھیالیسواں یا پچاسواں جُزء ہوگا، اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا ستّرواں جزء ہوگا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سچّے خواب کے جزءِ نبوّت ہونے سے کیا مراد ہے، تفسیر مظہری میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحیِ نبوّت کا سلسلہ تیئیس سال جاری رہا، ان میں سے پہلی ششماہی میں یہ وحی الٰہی خوابوں کی صورت میں آتی رہی، باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبرئیل امینؑ کی پیغام رسانی کی صورت میں آئی، اس حساب سے سچّے خواب وحیِ نبوّت کا چھیالیسواں جُزء ہوا، اور جن روایات میں کم و بیش عدد مذکور ہیں، ان میں یا تقریبی کلام کیا گیا ہے یا وہ سند کے اعتبار سے ساقط ہیں۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس کے جزءِ نبوّت ہونے سے مراد یہ ہو کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں، مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے، یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد و الہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، جو اصل میں خاصۂ نبوّت ہے، اس لئے اس کو ایک جُزءِ نبوّت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجّال کے ایک مغالطہ کی تردید

یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگا ہے کہ اس جزءِ نبوت

کے دنیا میں باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ بیٹھے، جو قرآن مجید کی نصوصِ قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدۂ ختمِ نبوت کے منافی ہے، اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کا ایک جزء موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا، اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مشین کے بہت سے کل پرزوں میں اگر کسی کے پاس ایک پُرزہ یا ایک سکرو موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریح حدیث بلاشبہ جزء نبوت ہیں مگر نبوت نہیں، نبوت تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَات، یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جزء بجز مبشرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ "سچے خواب"، جس سے ثابت ہوا کہ نبوت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا جزء باقی ہے جس کو مبشرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کافر فاسق آدمی کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے

اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت اور تجربات سے معلوم ہے کہ سچے خواب بعض اوقات فاسق فاجر بلکہ کافر کو بھی آسکتے ہیں سورۂ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہِ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن میں مذکور ہے، حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسریٰ کا خواب مذکور ہے، جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسریٰ مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی عاتکہ نے بحالتِ کفر آپؐ کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا، نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آجائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک، صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں، فساق و فجار کے عموماً حدیث النفس یا تسویل شیطانی کی قسم باطل سے ہوا کرتے ہیں، مگر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔

بہرحال سچے خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زائد کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کے لئے کسی معاملہ میں حجت ہیں نہ دوسروں کے لئے، بعض ناواقف لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہوجاتے ہیں، کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ سچی خوابوں میں بھی بکثرت نفسانی یا شیطانی یا دونوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں

مسئلہ: آیت قَالَ يٰبُنَيَّ الخ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے جو اس کا خیرخواہ اور ہمدرد نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے، اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جائے جب بیان کردیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہوجاتا ہے اس لئے چاہئے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے، بجز اس شخص کے کہ جو عالم و عاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیرخواہ ہو۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کردے، اور اگر اس میں کوئی بری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور اللہ سے اس کی برائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے، تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہوجائیں گے اور اگر سچا خواب ہو تو اس عمل کے ذریعہ اس کی برائی دور ہوجانے کی بھی امید ہے۔

مسئلہ: خواب کی تعبیر خواب پر موقوف رہنے کا مطلب تفسیر مظہری میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض تقدیری امور تقدیر مبرم یعنی قطعی نہیں ہوتے، بلکہ معلق ہوتے ہیں کہ فلاں کام ہوگیا تو یہ مصیبت ٹل جائے گی، اور نہ ہوا تو پڑ جائے گی، جس کو قضائے معلق کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں بری تعبیر دینے سے معاملہ برا اور اچھی تعبیر سے اچھا ہوجاتا ہے، اسی لئے

ترمذی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہو، یا اس کا خیرخواہ و ہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بُری تعبیر سُنکر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے میں اس کے حق میں ویسا ہی ہو جاتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادۃ اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضروری ہو گیا۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف و مصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں، اس لئے اگر کسی سے بیان کر دے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی جو بڑا حادثہ ہے، مگر آپؐ نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرما دیا تھا۔ (قرطبی)

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اُس کی کسی بُری خصلت یا نیت کا اظہار کر دینا جائز ہے، یہ غیبت میں داخل نہیں مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اِس کو چاہئے کہ اس شخص کو باخبر کر دے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوبؑ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مسئلہ:۔ اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا، اور نقصان پہونچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت و عزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

> "اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ دنیا میں ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے"

مسئلہ:۔ اس آیت اور بعد کی آیات سے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے یا کنویں میں ڈالنے کا مشورہ اور اس پر عمل مذکور ہے، یہ بھی واضح ہو گیا کہ

یوسف علیہ السلام کے بھائی اللہ کے نبی اور پیغمبر نہ تھے، ورنہ قتل یوسف کا مشورہ اور پھر ان کو ضائع کرنے کی تدبیر اور باپ کی نافرمانی کا عمل ان سے نہ ہوتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا سب گناہوں سے پاک ہونا اور معصوم ہونا ضروری ہے، کتاب طبری میں جو ان کو انبیاء کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں (قرطبی)

چھٹی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے چند انعامات عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اول کَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انعامات و احسانات کے لئے آپ کا انتخاب فرمالیں گے، جس کا ظہور ملک مصر میں حکومت اور عزت و دولت ملنے سے ہوا، دوسرے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ، اس میں احادیث سے مراد لوگوں کے خواب ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تعبیر خواب کا علم سکھا دیں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایک مستقل فن ہے، جو اللہ تعالیٰ کسی کسی کو عطا فرما دیتے ہیں، ہر شخص اس کا اہل نہیں۔

مسئلہ:۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ عبداللہ بن شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

تیسرا وعدہ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ یعنی اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمت پوری فرما دیں گے، اس میں عطاء نبوت کی طرف اشارہ ہے، اور اسی کی طرف اشارہ بعد کے جملوں میں ہے كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ، یعنی جس طرح ہم اپنی نعمت نبوت تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق علیہم السلام پر آپ سے پہلے پوری کر چکے ہیں، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ تعبیر خواب کا فن جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، اسی طرح ابراہیم و اسحٰق علیہم السلام کو بھی سکھایا گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ، یعنی تمہارا پروردگار بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے، نہ اس کے لئے کسی کو کوئی فن سکھانا مشکل ہے، اور نہ از روئے حکمت وہ یہ فن ہر شخص کو سکھاتا ہے، بلکہ اپنی حکمت کے ماتحت انتخاب کر کے کسی کو یہ ہنر دیدیتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا

البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کیلئے، جب کہنے لگے

لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ط اِنَّ

البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان سے زیادہ قوت والے لوگ ہیں، البتہ

اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ ۨ ۚ ﴿۸﴾ اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْہُ اَرْضًا یَّخْلُ

ہمارا باپ صریح خطا پر ہے ، مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے

لَکُمْ وَجْہُ اَبِیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِہٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ﴿۹﴾

تم پر توجہ تمہارے باپ کی ، اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ ،

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْھُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَاَلْقُوْہُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ

بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گمنام کنویں میں

یَلْتَقِطْہُ بَعْضُ السَّیَّارَۃِ اِنْ کُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا یٰٓاَبَانَا

کہ اٹھالے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے ، بولے اے باپ

مَا لَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْہُ

کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں ، بھیج اس کو

مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّیْ

ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں ، بولا مجھ کو

لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْھَبُوْا بِہٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَہُ الذِّئْبُ وَ

غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور

اَنْتُمْ عَنْہُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَکَلَہُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ

تم اس سے بے خبر رہو ، بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک

عُصْبَۃٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَھَبُوْا بِہٖ وَاَجْمَعُوْٓا

جماعت ہیں قوت ور تو تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا ، پھر جب لیکر چلے اس کو اور متفق ہوئے

اَنْ یَّجْعَلُوْہُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ لَتُنَبِّئَنَّھُمْ

کہ ڈالیں اس کو گمنام کنویں میں ، اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو

بِاَمْرِھِمْ ھٰذَا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ اَبَاھُمْ عِشَآءً

ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے ، اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے

یَّبْکُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَکْنَا یُوْسُفَ

روتے ہوئے ، کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو ،

عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا
اپنے اسباب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا، اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ
سچے ہوں ، اور لائے اس کے کُرتے پر لہو لگا کر جھوٹ ، بولا یہ ہرگز نہیں
سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
بلکہ بنا دی ہے تم کو تمھارے جیوں نے ایک بات ، اب صبر ہی بہتر ہے ، اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں
عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ
اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو ، اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا ، اس نے
فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ
لٹکا دیا اپنا ڈول کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا ، اور چھپا لیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ
اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ، اور بیچ آئے اسکو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی
مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾
چونیاں ، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار ۔

ع ۲ / ۱۴ / ۱۲

خلاصہ تفسیر

یوسف (علیہ السلام) کے اور ان کے (علاتی) بھائیوں کے قصہ میں (خدا کی قدرت اور آپ کی نبوت کے) دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو (آپ سے ان کا قصہ) پوچھتے ہیں، (کیونکہ یوسف علیہ السلام کو ایسی بے کسی اور بے بسی سے سلطنت و حکومت تک پہونچا دینا یہ خدا ہی کا کام تھا جس سے مسلمانوں کے لئے عبرت اور قوتِ ایمان حاصل ہوگی، اور یہود جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ پوچھا تھا ان کے لئے اس میں دلیلِ نبوت مل سکتی ہے) وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ اُن (علاتی) بھائیوں نے (باہمی مشورہ کے طور پر) یہ گفتگو کی کہ (یہ کیا بات ہے کہ) یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ (وہ دونوں کم عمری کی وجہ سے آن کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور) ہم ایک جماعت کی جماعت ہیں، (کہ اپنی قوت و کثرت کی وجہ سے ان کی ہر طرح

کی خدمت بھی کرتے ہیں) واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (اس لئے تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ ان دونوں میں بھی زیادہ پیارا یوسف سے ہے اس کو کسی طرح ان کے پاس سے ہٹانا چاہئے جسکی صورت یہ ہو کہ) یا تو یوسف کو قتل کر ڈالو، یا اس کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال آؤ، تو (پھر) تمہارے باپ کا رُخ خالص تمہاری طرف ہو جاوے گا اور تمہارے سب کام بن جاویں گے، انہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو (کہ وہ بڑا جرم ہے) اور ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو (جس میں اتنا پانی نہ ہو جس میں ڈوبنے کا خطرہ ہو کیونکہ وہ تو قتل ہی کی ایک صورت ہے، البتہ بستی اور رہگذر سے بہت دور بھی نہ ہو) تاکہ انکو کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جاوے، اگر تم کو (یہ کام) کرنا ہی ہے (تو اس طرح کرو، اس پر سب کی رائے متفق ہوگئی اور) سب نے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے (کہ کبھی کہیں ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے) حالانکہ ہم اس کے (دل وجان سے) خیر خواہ ہیں (ایسا نہ چاہئے بلکہ) آپ اس کو کل ہمارے ساتھ (جنگل) بھیجئے، کہ ذرا وہ کھاویں کھیلیں اور ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (مجھے ساتھ بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حزن اور ایک خوف، حزن تو یہ کہ) مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم (میری نظروں کے سامنے سے) لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جاوے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو (کیونکہ اس جنگل میں بھیڑیئے بہت تھے) وہ بولے اگر اس کو بھیڑیا کھالے اور ہم ایک جماعت کی جماعت (موجود) ہوں تو ہم بالکل ہی گئے گذرے ہوئے (غرض کہہ سُنکر یعقوب علیہ السلام سے یہ ان کو لے کر چلے) تو جب ان کو (اپنے ساتھ جنگل) لے گئے اور (قرار داد سابق کے مطابق) سب نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان کو کسی اندھیری کنویں میں ڈال دیں (پھر اپنی تجویز پر عمل بھی کرلیا) اور (اس وقت یوسفؑ کی تسلی کے لئے) ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ (تم مغموم نہ ہو ہم تم کو یہاں سے خلاصی دے کر بڑے رتبہ پر پہنچا دیں گے اور ایک دن وہ ہوگا کہ) تم ان لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو (اس وجہ سے کہ غیر متوقع طور پر شاہانہ صورت میں دیکھیں گے) پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ بھائی مصر پہونچے اور آخرکار یوسف علیہ السلام نے ان کو جتلایا ہَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ، یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا) اور (ادھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے پہنچے (اور جب باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو) کہنے لگے ابا ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے میں (کہ کون آگے نکلے) لگ گئے اور یوسف کو ہم نے (ایسی جگہ جہاں بھیڑیا آنے کا گمان نہ تھا) اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس (اتفاقاً) ایک بھیڑیا

(آیا اور) ان کو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں اور (جب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو) یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے (کہ کسی جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنی قول کی سند کے لئے پیش کیا) یعقوبؑ نے دیکھا تو کرتا کہیں سے پھٹا نہیں تھا، کما رواہ الطبری عن ابن عباس، (تو) فرمایا (یوسفؑ کو بھیڑیے نے ہرگز نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (صبر جمیل کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرفِ شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کی ہے) اور جو باتیں تم بناتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے (کہ اس وقت مجھے ان پر صبر آجائے اور آئندہ تمہارا جھوٹ کھل جائے، بہرحال حضرت یعقوبؑ صبر کر کے بیٹھ رہے) اور (یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ ہوا کہ اتفاق سے ادھر) ایک قافلہ آنکلا (جو مصر کو جا رہا تھا) اور انھوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنوئیں پر) بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا (یوسف علیہ السلام نے ڈول کو پکڑ لیا، جب ڈول باہر آیا اور یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو خوش ہو کر) کہنے لگا بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا (قافلہ والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے) اور ان کو مال (تجارت) قرار دے کر (اس خیال سے) چھپا لیا (کہ کوئی دعویدار نہ کھڑا ہو جائے تو پھر اس کو مصر لے جا کر بڑی قیمت پر فروخت کریں گے) اور اللہ کو ان سب کی کارگزاریاں معلوم تھیں (ادھر وہ بھائی بھی آس پاس لگے رہتے، اور کنوئیں میں یوسف کی خبر گیری کرتے کچھ کھانا بھی پہنچاتے، جس سے مقصد یہ تھا کہ یہ ہلاک بھی نہ ہوں اور کوئی آکر انھیں کسی دوسرے ملک میں لیجائے اور یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہو، اس روز جب یوسفؑ کو کنوئیں میں نہ دیکھا اور پاس ایک قافلہ پڑا دیکھا تو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، یوسف علیہ السلام کا پتہ لگ گیا تو قافلہ والوں سے کہا کہ ہمارا غلام ہے بھاگ کر آگیا تھا اور اب ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے) اور (یہ بات بنا کر) ان کو بہت ہی کم قیمت پر (قافلہ والوں کے ہاتھ) بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے میں اور (وجہ یہ تھی کہ) یہ لوگ کچھ ان کے قدردان تو تھے ہی نہیں (کہ ان کو عمدہ مال سمجھ کر بڑی قیمت سے بیچتے، بلکہ ان کا مقصد تو ان کو یہاں سے ٹالنا تھا)۔

معارف و مسائل

سورۂ یوسف کی مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں آنے والے قصۂ یوسف علیہ السلام کو محض ایک قصہ نہ سمجھو، بلکہ اس میں سوال کرنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور ہدایتیں ہیں۔

اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ آپ سے پوچھا تھا ان کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں، روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ کی خبر مدینہ طیبہ میں پہونچی تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کے لئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جا کر آپ کی آزمائش کریں، اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپ خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلائیے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملکِ شام سے مصر لے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے نابینا ہوگئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی، نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہلِ کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بحوالۂ تورات وانجیل اس قصہ کا کوئی جزء معلوم ہوسکتا، ان کے اس سوال پر ہی پوری سورۂ یوسف نازل ہوئی، جس میں حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کا پورا قصہ مذکور ہے، اور اتنی تفصیل سے مذکور ہے کہ تورات وانجیل میں بھی اتنی تفصیل نہیں، اس لئے اس کا بیان کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ تھا۔

اور اس آیت کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قطع نظر سوال یہود کے خود یہ واقعہ ایسے امور پر مشتمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بڑی نشانیاں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی ہدایتیں اور احکام ومسائل موجود ہیں، کہ جس بچہ کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی، اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں، اور یہ کہ جو شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں کیسی عزت دیتے ہیں، اور مخالفین کو اس کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں، یہ سب عبرتیں اور نصیحتیں اور قدرتِ الٰہیہ کی عظیم نشانیاں ہیں، جو ہر تحقیق کرنے والے اور غور کرنے والے کو معلوم ہوسکتی ہیں (قرطبی ومظہری)

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، اُن کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ ۱۲ لڑکے تھے، ان میں سے ہر لڑکا صاحبِ اولاد ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ ۱۲ خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

ان بارہ لڑکوں میں دس بڑے لڑکے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی زوجۂ محترمہ

حضرت لیّا بنتِ لیّان کے بطن سے تھے، ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام نے لیّا کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا، ان کے بطن سے دو لڑکے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے، اس لئے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی صرف بنیامین تھے، باقی دس بھائی علاتی یعنی باپ شریک تھے، یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں بنیامین کی ولادت کے ساتھ ہو گیا تھا (قرطبی)

دوسری آیت میں یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے، کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ یوسف علیہ السلام سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے بھائیوں کو حاصل نہیں، اس لئے ان پر حسد ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طرح ان کو یوسف علیہ السلام کا خواب بھی معلوم ہو گیا ہو جس سے انھوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان کی بڑی شان ہونے والی ہے اس سے حسد پیدا ہوا، اور آپس میں گفتگو کی کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والد کو بہ نسبت ہمارے یوسف اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین سے زیادہ محبت ہے، حالانکہ ہم دس ہیں اور ان سے بڑے ہیں، گھر کے کام کاج سنبھالنے کی قوت رکھتے ہیں، اور یہ دونوں چھوٹے بچے ہیں جو کچھ کام نہیں کر سکتے، ہمارے والد کو اس کا خیال کرنا اور ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کھلی ہوئی بے انصافی کر رکھی ہے، اس لئے یا تو تم یوسف کو قتل کر ڈالو، یا پھر کسی دور زمین میں پھینک آؤ جہاں سے واپس نہ آسکے۔

اس آیت میں ان بھائیوں نے اپنے متعلق لفظ عُصْبَۃ استعمال کیا ہے، یہ لفظ عربی زبان میں پانچ سے لے کر دس تک کی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، اور اپنے والد کے بارے میں جو یہ کہا کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ، اس میں لفظ ضَلَال کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں، مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں، ورنہ ایسا خیال کرنے سے یہ سب کے سب کافر ہو جاتے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر اور نبی ہیں، ان کی شان میں ایسا خیال قطعی کفر ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق خود قرآن کریم میں مذکور ہے، کہ بعد میں انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے والد سے دعاءِ مغفرت کی درخواست کی جس کو ان کے والد نے قبول کیا جس سے ظاہر یہ ہے کہ ان سب کی خطا معاف ہوئی، یہ سب اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ سب مسلمان ہوں، ورنہ کافر کے حق میں دعاءِ مغفرت جائز نہیں، اسی لئے ان بھائیوں کے انبیاء ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مسلمان ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ضلال اس جگہ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ بھائیوں کے حقوق میں برابری نہیں کرتے۔

تیسری آیت میں یہ بیان ہے کہ ان بھائیوں میں مشورہ ہوا، بعض نے یہ رائے دی کہ یوسف

کو قتل کر ڈالو، بعض نے کہا کہ کسی غیر آباد کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو، تاکہ یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے اور تمھارے باپ کی پوری توجہ تمھاری ہی طرف ہوجائے، رہا یہ گناہ جو اس کے قتل یا کنوئیں میں ڈالنے سے ہوگا سو بعد میں توبہ کرکے تم نیک ہوسکتے ہو، آیت کے جملہ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یوسف کے قتل کے بعد تمھارے حالات درست ہوجائیں گے، کیونکہ باپ کی توجہ کا یہ مرکز ختم ہوجائے گا، یا کہ قتل کے بعد باپ سے عذر معذرت کرکے تم پھر ویسے ہی ہوجاؤ گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے، کیونکہ انھوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا، ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ، باپ کی نافرمانی اور ایذا رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، پھر جھوٹی سازش وغیرہ، انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہوسکتے۔

چوتھی آیت میں ہے کہ انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو کنوئیں کی گہرائی میں ایسی جگہ ڈال دو جہاں یہ زندہ رہے، اور راہ رو مسافر جب اس کنوئیں پر آئیں تو وہ اس کو اٹھا کر لے جائیں، اس طرح تمھارا مقصد بھی پورا ہوجائیگا اور اس کو لے کر تمھیں خود کسی دور مقام پر جانا بھی نہ پڑے گا، کوئی قافلہ آئے گا وہ خود اس کو اپنے ساتھ کسی دور مقام پر پہونچا دے گا۔

یہ رائے دینے والا ان کا سب سے بڑا بھائی یہوذا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ روبیل سب سے بڑا تھا، اسی نے یہ رائے دی، اور یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کو روک لیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جا کر باپ کو کیا منھ دکھاؤں گا، اس لئے میں واپس کنعان نہیں جاتا۔

اس آیت میں لفظ غَيٰبَتِ الْجُبِّ، فرمایا ہے، غَیَابَہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کردے، اسی لئے قبر کو بھی غَیَابَہ کہا جاتا ہے، اور جُبّ ایسے کنوئیں کو کہتے ہیں جس کی مَن بنی ہوئی نہ ہو۔

يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ، لفظ التقاط لُقطہ سے بنا ہے، لُقطہ اس گری پڑی چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلب مل جائے، غیر جان دار چیز ہو تو اس کو لُقطہ اور جان دار کو فقہاء کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جبکہ وہ بچہ ہو، عاقل بالغ نہ ہو، قرطبی نے اسی لفظ سے استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچے تھے، نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی ان کے

بچہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے، کیونکہ بھیڑیئے کا کھا جانا بچوں ہی کے معاملہ میں متصور ہے، ابن جریر ابن المنذر ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہو کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔ (مظہری)

امام قرطبیؒ نے اس جگہ لقطہ اور لقیط کے شرعی احکام کی تفصیل دی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ اس کے متعلق ایک اصولی بات یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی نظام میں عام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت، راستوں اور سڑکوں کی صفائی وغیرہ کو صرف حکومت کے محکموں کی ذمہ داری نہیں بنایا، بلکہ ہر شخص کو اس کا مکلّف بنایا ہے، راستوں اور سڑکوں میں کھڑے ہو کر یا اپنا کوئی سامان ڈال کر چلنے والوں کے لئے تنگی پیدا کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، فرمایا کہ "جو شخص مسلمانوں کا راستہ تنگ کر دے اس کا جہاد مقبول نہیں"، اسی طرح اگر راستہ میں کوئی ایسی چیز پڑی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہونچ جانے کا خطرہ ہے جیسے کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے یا پتھر وغیرہ ان کو راستہ سے ہٹانا صرف میونسپل بورڈ کی ذمہ داری نہیں بنایا بلکہ ہر مسلمان کو ترغیبی انداز میں اس کا ذمہ دار بنایا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے لئے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی اصول پر کسی شخص کا گم شدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو چرائے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے، اور اعلان و تلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غریب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور بہر دو صورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا، گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔

یہ ہیں خدمتِ عامہ اور امدادِ باہمی کے وہ اصول جن کی ذمہ داری اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر عائد کی گئی ہے، کاش مسلمان اپنے دین کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے لگیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جائیں، کہ حکومت کے بڑے بڑے محکمے کروڑوں روپیہ کے خرچ سے جو کام انجام نہیں دے سکتے، وہ اس آسانی کے ساتھ کس شان سے پورا ہو جاتا ہے۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ہے کہ ان بھائیوں نے والد کے سامنے درخواست ان لفظوں میں پیش کر دی کہ ابا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ کو یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں، حالانکہ ہم

اس کے پورے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں، کل اس کو آپ ہمارے ساتھ (سیر و تفریح کے لئے) بھیجدیجئے کہ وہ بھی آزادی کے ساتھ کھائے پیئے اور کھیلے، اور ہم سب اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

بھائیوں کی اس درخواست سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس سے پہلے بھی ایسی درخواست کرچکے تھے، جس کو والد بزرگوار نے قبول نہ کیا تھا، اس لئے اس مرتبہ ذرا تاکید اور اصرار کے ساتھ والد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر و تفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر و تفریح کھیل کود جائز حدود کے اندر جائز و مباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو (قرطبی وغیرہ)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اوّل تو مجھے اس نورِ نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہے کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑیا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی، اور یا اس وجہ سے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں، اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں، اچانک دس بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیئے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

جس کی تعبیر بعد میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ دس بھیڑیئے یہ دس بھائی تھے اور جس بھیڑیئے نے مدافعت کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا وہ بڑے بھائی یہوداہ تھے، اور زمین میں چھپ جانا کنویں کی گہرائی سے تعبیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا، مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی (قرطبی)

بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ کا یہ خوف و خطرہ عجیب ہے

ہم دس آدمیوں کی قوی جماعت اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے، اگر ہم سب کے ہوتے ہوئے اسکو بھیڑیا کھا جائے تو ہمارا تو وجود ہی بے کار ہو گیا، اور پھر ہم سے کسی کام کی کیا امید کی جاسکتی ہے ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی، دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی، اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے، اس لئے اجازت دیدی، مگر بھائیوں سے مکمل عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے دیں گے، اور بڑے بھائی روبیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبرگیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مونڈھوں پر اٹھالیا، اور باری باری سب اٹھاتے رہے، کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو رخصت کرنے کے لئے باہر گئے ۔

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا، یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے، مگر کم عمر تھے، اُن کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکار، وہی تیری مدد کریں گے ۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدتِ غیظ و غضب کا سبب بنا ۔

آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور صغر سنی اور اپنے والد ضعیف کے حال پر رحم کریں، اور اس عہد کو یاد کریں جو جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ نے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو بھلا دیا، یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہونچا سکیں گے ۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے، خدا سے ڈرو، اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہونچا دو، البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کرے۔

بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کر لو، اس لئے سن لو کہ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمھیں بھی

قتل کر دیں گے، یہودا نے دیکھا کہ نو بھائیوں کے مقابلہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتے، تو کہا کہ اچھا اگر تم یہی طے کر چکے ہو کہ اس بچہ کو ضائع کرو تو میری بات سنو، یہاں قریب ہی ایک پرانا کنواں ہے جس میں بہت سے جھاڑ نکل آئے ہیں، سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں، تم اس کو کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کر دیا تو تمھاری مراد حاصل ہے، اور تم اپنے ہاتھ سے اس کا خون بہانے سے بری رہے، اور اگر یہ زندہ رہا تو کوئی قافلہ شاید یہاں آئے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالے اور یہ نکل آئے، تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچا دے گا، اس صورت میں بھی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اس بات پر سب بھائیوں کا اتفاق ہو گیا، جس کا بیان آیاتِ مذکورہ میں سے تیسری آیت میں اس طرح آیا ہے، فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، "یعنی جب یہ بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے، اور اس پر سب متفق ہو گئے کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اپنے بھائیوں کو اُن کے اس کرتوت پر تنبیہ کرو گے اور وہ کچھ نہ جانتے ہوں گے"۔

یہاں لفظ وَأَوْحَيْنَا، فَلَمَّا ذَهَبُوا کی جزاء اور جواب ہے، حرف واؤ اس جگہ زائد ہے (قرطبی) مطلب یہ ہے کہ بھائیوں نے مل کر کنویں میں ڈالنے کا عزم کر ہی لیا، تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تسلی کے لئے وحی بھیجدی، جس میں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں سے ملاقات کی اور اس کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اُس وقت آپ ان بھائیوں سے مستغنی اور بالادست ہوں گے، جس کی وجہ سے ان کے اس ظلم و ستم پر مواخذہ کریں گے، اور وہ اس سارے معاملہ سے بےخبر ہوں گے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ وحی ان کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ان کی تسلی اور یہاں سے نجات کی خوش خبری دینے کے لئے آئی ہو، دوسرے یہ کہ کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو پیش آنے والے حالات و واقعات سے بذریعہ وحی باخبر کر دیا، جس میں یہ بھی بتلا دیا کہ آپ اس ہلاکت سے سلامت رہیں گے، اور ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آپ کو ان بھائیوں پر سرزنش کرنے کا موقع ملے گا جب کہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں، کہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔

یہ وحی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر زمانۂ طفولیت میں نازل ہوئی، تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ وحی نبوت نہ تھی، کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے، بلکہ یہ وحی ایسی ہی تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا، یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا سلسلہ

مصر پہونچنے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا، جیسا کہ ارشاد ہے وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، اور ابن جریرؒ ابن ابی حاتم وغیرہ نے اس کو استثنائی طور پر وحیِ نبوت ہی قرار دیا ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت عطا کی گئی۔ (مظہری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہونچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیجیں (قرطبی) یہی وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبرِ خدا نے جیل سے رہائی اور ملکِ مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والدِ ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے۔

اللہ جل شانہٗ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاجتمند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا تو ان کو بھی دینا مقصود ہو۔

امام قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ جب ان کو ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی مَن سے چمٹ گئے، بھائیوں نے ان کا کُرتہ نکالکر اس سے ہاتھ باندھے، اُس وقت پھر یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے رحم کی درخواست کی، مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھے سجدہ کرتے ہیں ان کو بُلا وہی تیری مدد کریں گے، پھر ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکایا، جب نصف تک پہونچے، تو اس کی رسّی کاٹ دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے یوسف کی حفاظت فرمائی، پانی میں گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ نہ آئی، اور قریب ہی ایک پتھر کی چٹان نکلی ہوئی نظر آئی، صحیح سالم اس پر بیٹھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا، انھوں نے چٹان پر بٹھا دیا۔

یوسف علیہ السلام تین روز اس کنویں میں رہے، ان کا بھائی یہودا دوسرے بھائیوں سے چھپ کر روزانہ ان کے لئے کھانا پانی لاتا اور ڈول کے ذریعہ ان تک پہنچا دیتا تھا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ، یعنی عشاء کے وقت یہ بھائی روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس پہونچے، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے پوچھا کیا حادثہ ہے، کیا تمھاری بکریوں کے گلہ پر کسی نے حملہ کیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟ تو بھائیوں نے کہا:۔

یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ، "یعنی ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا اس درمیان میں یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، اور ہم کتنے ہی سچے ہوں آپکو ہمارا یقین تو آئے گا نہیں"۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ باہمی مسابقت (دوڑ) شریعت میں مشروع اور اچھی خصلت ہے، جو جنگ وجہاد میں کام آتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس خود بھی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور گھوڑوں کی مسابقت کرانا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ دوڑ میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آگئے۔

آیتِ مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں، تیراندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی باہمی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دیدینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہار جیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھہرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، آجکل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوئے اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔

پچھلی آیتوں میں مذکور تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس کی گفت وشنید کے بعد بالآخر ان کو ایک غیر آباد کنویں میں ڈال دیا اور والد کو آکر یہ بتایا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا ہے، مذکور الصدر آیات میں اگلا قصہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیئے کے کھانے کا یقین دلائیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا، کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے جس سے بھیڑیئے کا کھانا ثابت ہوتا، انھوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کرتا صحیح سالم دیکھ کر فرمایا، میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتہ کہیں سے نہیں پھٹا۔

اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا، اور فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ۝ یعنی یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا، بلکہ تمھارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی ہے، اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں۔

مسئلہ:۔ یعقوب علیہ السلام نے کرتہ صحیح سالم ہونے سے برادرانِ یوسفؑ کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کیساتھ

حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے (قرطبی)

ماوردیؒ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ: خون آلود کرکے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا، اس میں بھی اُن کا کرتہ ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ:۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اُس وقت کہی تھی کہ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا، یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے، یہی بات اس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام میں پکڑ لئے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ، یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی دوسری صحیح نہیں تھی، کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداءً ہوسکتی ہے، اگرچہ بعد میں ان کو بوحی الٰہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا۔

نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہوسکتی ہے، اس لئے ہر صاحبِ رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔

وَجَاۗءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ، سیارہ کے معنی قافلہ، وَارِد سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں، قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ مہیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اِدْلَاء کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں، مطلب یہ ہو کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سرزمین پر آنکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملکِ شام سے مصر جارہا تھا، راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہونچ گیا، اور پانی لانے والوں کو کنویں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ رستہ بھول کر یہاں پہونچا، اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن رازِ کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں، یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو رستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے، اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے، یہی حال ہر

ان تمام حالات و واقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت و اتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلۂ تکوین میں کوئی بخت و اتفاق نہیں، حق سبحانہ و تعالیٰ جس کی شان فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے مخفی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا، تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہرحال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن دُعبر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہونچا، ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ کیا، اس ڈول کی رسی پکڑ لی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آگیا جس کی آئندہ ہونے والی عظمتِ شان سے بھی قطعِ نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن و جمال اور معنوی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور ہونہار بچہ کو دیکھ کر پکار اٹھا، يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ، ارے بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا ہے، صحیح مسلم میں شبِ معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً، یعنی چھپا لیا اس کو ایک مالِ تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہے کہ شروع میں تو مالک بن دُعبر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکار اٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہوگیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقتِ واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مالِ تجارت بنا لیا، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہونچانے کے لئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آکر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا، یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہونچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آگیا ہے، تم نے بہت برا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن دُعبر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائیں گے، اس لئے بھائیوں سے اُن کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔

تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ برادرانِ یوسف نے خود ہی یوسف کو ایک مالِ تجارت بنا لیا اور فروخت کر دیا، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کی سب کارگزاریاں معلوم تھیں

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کو سب معلوم تھا کہ برادرانِ یوسف کیا کریں گے، اور ان سے خریدنے والا قافلہ کیا کرے گا، اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتے تھے کہ ان سب کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن تکوینی حکمتوں کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے ان منصوبوں کو چلنے دیا۔

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپؐ کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم و قدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب کو بدل ڈالیں، لیکن تقاضائے حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے، اور انجام کار آپؐ کو ان پر غالب کر کے حق کو غالب کیا جائے گا، جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ، لفظ شرٰا عربی زبان میں خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، ضمیر اگر برادرانِ یوسف کی طرف عائد کی جائے تو فروخت کرنے کے معنی ہوں گے، اور قافلہ والوں کی طرف عائد کی جائے تو خریدنے کے معنی ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ بیچ ڈالا برادرانِ یوسف نے یا خرید لیا قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت تھوڑی قیمت یعنی گنتی کے چند دراہم کے معاوضہ میں۔

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجار کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتی تھے، اس لئے دراہم کے ساتھ معدودہ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ دراہم کی مقدار چالیس سے کم تھی، ابن کثیرؒ نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ لکھا ہے کہ بیس درہم کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دو دو درہم آپس میں تقسیم کر لئے، تعداد دراہم میں بائیس ۲۲ اور چالیس ۴۰ درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں۔ (ابن کثیر)

وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ، زاہدین، زاہد کی جمع ہے، جو زہد سے مشتق ہے، زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں، محاورات میں دنیا کی مال و دولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے، ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کر لیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى

اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے رکھ اس کو شاید

اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي

ہمارے کام آئے یا ہم کرلیں اسکو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو

الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ

اس ملک میں، اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا اور اللہ زور آور رہتا ہے

عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ

اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اور جب پہونچ گیا

اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ

اور پھسلایا اس کو اس عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے اور بند کردیئے دروازے

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ

اور بولی شتابی کر، کہا خدا کی پناہ وہ عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو،

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

(قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے، وہاں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کردیا) اور جس شخص نے مصر میں ان کو خریدا تھا (یعنی عزیز) اس نے (ان کو اپنے گھر لا کر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور) اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو خاطر سے رکھنا کیا عجب ہے کہ (بڑا ہو کر) ہمارے کام آوے، یا ہم اس کو بیٹا بنالیں (مشہور یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا کہ ان کے اولاد نہ تھی) اور ہم نے (جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت سے اس اندھیرے کنویں سے نجات دی) اسی طرح یوسف کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہے) اور (یہ نجات دینا اس غرض سے بھی تھا) تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلادیں (مطلب یہ تھا کہ نجات دینے کا مقصد

اُن کو ظاہری اور باطنی دولت سے مالا مال کرنا تھا) اور اللہ تعالیٰ اپنے (چاہے ہوئے) کام پر غالب (اور قادر) ہے (جو چاہے کردے) لیکن اکثر آدمی جانتے نہیں (کیونکہ اہلِ ایمان و یقین کم ہی ہوتے ہیں، یہ مضمون قصّہ کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی موجودہ حالت یعنی غلام بن کر رہنا بظاہر کوئی اچھی حالت نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ حالت چند روزہ بطور ذریعہ کے ہے، اصل مقصد ان کو اونچا مقام عطا فرمانا ہے اور اس کا ذریعہ عزیز مصر کو اور اس کے گھر میں پرورش پانے کو بنایا گیا، کیونکہ امراء کے گھر میں پرورش پانے سے سلیقہ و تجربہ بڑھتا ہے، امورِ سلطنت کا علم ہوتا ہے، اسی کا بقیہ آگے یہ ہے) اور جب وہ اپنی جوانی (یعنی سنِ بلوغ یا کمالِ شباب) کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا (مراد اس سے علوم نبوّت کا عطا کرنا ہے، اور کنویں میں ڈالنے کے وقت جو اُن کی طرف وحی بھیجنے کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وحیِ نبوّت نہیں تھی، بلکہ ایسی وحی تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ کو وحی بھیجی گئی تھی) اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں (جو قصّہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگانے کا آگے بیان ہوگا، اس سے پہلے ان جملوں میں بتلا دیا گیا ہے کہ وہ سراسر تہمت اور جھوٹ ہوگا، کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و حکمت عطا ہو اس سے ایسے کام صادر ہو ہی نہیں سکتے، آگے اس تہمت کے قصّہ کا بیان ہے کہ یوسف علیہ السّلام عزیز مصر کے گھر میں آرام و راحت کے ساتھ رہنے لگے) اور (اسی درمیان میں یہ ابتلا پیش آیا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ (اُن پر مفتون ہوگئی اور) ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی اور (گھر کے) سارے دروازے بند کر دیئے اور (ان سے) کہنے لگی آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا (کہ اول تو یہ خود بڑا بھاری گناہ ہے) اللہ بچائے (دوسرے) وہ (یعنی تیرا شوہر) میرا مُربیّ (اور محسن) ہے کہ مجھ کو کیسی اچھی طرح رکھا (تو کیا میں اس کے ناموس میں خلل اندازی کروں) ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی (بلکہ اکثر تو دنیا ہی میں ذلیل اور پریشان ہوتے ہیں ورنہ آخرت میں تو عذاب یقینی ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی سرگذشت بیان ہوچکی ہے، کہ قافلہ والوں نے جب اُن کو کنویں سے نکال لیا تو برادرانِ یوسف نے ان کو اپنا غلام گریختہ بتا کر تھوڑے سے درہموں میں ان کا سودا کر لیا، اوّل تو اس لئے کہ ان کو اس بزرگ ہستی کی قدر معلوم

نہ تھی، دوسرے اس لئے کہ ان کا اصل مقصد ان سے پیسہ کمانا نہیں بلکہ باپ سے دور کردینا تھا، اس لئے صرف فروخت کردینے پر بس نہیں کی، کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں قافلہ والے ان کو یہیں نہ چھوڑ جائیں اور یہ پھر کسی طرح والد کے پاس پہونچ کر ہماری سازش کا راز فاش کردے، اس لئے امام تفسیر مجاہدؒ کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کے لئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دور تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو بھاگ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باندھ کر رکھو، اس دُرِّ شہوار کی قدر و قیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے (تفسیر ابن کثیر)

آیات مذکورہ میں اس کے بعد کا قصہ اس طرح مذکور ہے، اور قرآنی ایجاز کے ساتھ قصہ کے جتنے اجزاء خود بخود سمجھ میں آسکتے ہیں اُن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مثلاً قافلہ کا مختلف منزلوں سے گذر کر مصر تک پہونچنا، اور وہاں جاکر یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا وغیرہ، سب کو چھوڑ کر یہاں سے بیان ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ، یعنی کہا اس شخص نے جس نے یوسف علیہ السلام کو مصر میں خریدا اپنی بیوی سے کہ یوسفؑ کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کرو"

مطلب یہ ہو کہ قافلہ والوں نے ان کو مصر لے جاکر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر قرطبی میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا، یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کی برابر سونا اور اسی کی برابر مُشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدر کی تھی اس نے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کرکے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

جیسا کہ پہلے ارشاد قرآنی سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ رب العزت کی بنائی ہوئی مستحکم تدبیر کے اجزاء ہیں، مصر میں یوسفؑ کی خریداری کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے عزت والے شخص کو مقدر فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملکِ مصر کا وزیر خزانہ تھا جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے، اور بادشاہِ مصر اس زمانہ میں قومِ عمالقہ کا ایک شخص ریّان بن اُسید تھا، (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا (مظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتلایا گیا ہے، عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دنیا میں تین آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے، اول عزیز مصر جس نے ان کے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کر کے بیوی کو یہ ہدایت دی، دوسرے شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ، "یعنی ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجئے، اس لئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"۔ تیسرے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں جنھوں نے اپنے بعد فاروق اعظمؓ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا (ابن کثیر)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ، "یعنی اس طرح حکومت دیدی ہم نے یوسف کو زمین کی"۔ اس میں آئندہ آنے والے واقعہ کی بشارت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جو عزیز مصر کے گھر میں اس وقت بحیثیت غلام داخل ہوئے ہیں عنقریب یہ ملکِ مصر کے سب سے بڑے آدمی ہوں گے، اور حکومت کا اقتدار اُن کو ملے گا۔

وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ یہاں شروع میں حرف واؤ کو اگر عطف کیلئے مانا جائے تو ایک جملہ اس معنی کا محذوف مانا جائے گا، کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین کی حکومت اس لئے دی کہ وہ دنیا میں عدل وانصاف کے ذریعہ امن وامان قائم کریں، اور باشندگانِ ملک کی راحت کا انتظام کریں، اور اس لئے کہ ہم ان کو باتوں کا ٹھکانے لگانا سکھادیں، باتوں کا ٹھکانے لگانا ایک ایسا عام مفہوم ہے جس میں وحیِ الٰہی کا سمجھنا اور اس کو بر روئے کار لانا بھی داخل ہے، اور تمام ضروری علوم کا حاصل ہونا بھی اور خوابوں کی تعبیر صحیح بھی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ غالب اور قادر ہے اپنے کام پر جو اس کا ارادہ ہوتا ہے تمام عالم کے اسباب ظاہرہ اس کے مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسا ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا کے سارے اسباب اس کے لئے تیار کر دیتے ہیں، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور اسبابِ ظاہرہ ہی کو سب کچھ سمجھ کر انہی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مسبب الاسباب اور قادرِ مطلق کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، "یعنی جب پہونچ گئے یوسف علیہ السلام اپنی پوری قوت اور جوانی پر تو دیدی ہم نے ان کو حکمت اور علم"۔

یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوتی، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی، ضحاکؒ نے بیس سال اور حسن بصریؒ

نے چالیس سال بتلائی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوت ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت مصر پہونچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی ہے، اور کنویں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی، بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جاسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریمؑ کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، "اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو"، مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہونچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی، خدا ترسی اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ تھا، یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ، یعنی جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام رہتے تھے وہ اُن پر مفتون ہوگئی، اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اُن کو پھسلانے لگی، اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیئے، اور اُن سے کہنے لگی کہ جلد آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں "۔

پہلی آیت میں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عورت عزیزِ مصر کی بیوی تھی، مگر اس جگہ قرآن کریم نے زوجۂ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر اَلَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا کے الفاظ اختیار کئے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے گھر میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے، اس کے کہنے کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔

گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ خود اللہ سے پناہ مانگنا ہے

اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ، محض اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و موعظت کے ساتھ خود زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا، کہ وہ بھی خدا سے ڈرے اور اپنے ارادہ سے باز آجائے، فرمایا:

اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ، "وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی"۔

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا،

میرا محسن ہے میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود زلیخا کو بھی یہ سبق دیدیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہچانتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچاننا چاہیے۔

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا ربّ فرمایا، حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی لئے شریعتِ محمدیہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا ربّ نہ کہے، اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے، مگر یہ خصوصیت شریعتِ محمدیہ کی ہے جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جن میں ذریعۂ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے، مگر اسباب و ذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی، اسی وجہ سے پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی، مگر شریعتِ محمدیہ، چونکہ قیامت تک کے لئے آئی ہے، اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کے لئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہوسکیں، بہرحال یوسف علیہ السلام کا اِنَّہٗ رَبِّیْ فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِنَّہٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا ٹھکانا بھی درحقیقت اسی نے دیا، اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

بعض مفسرین سدی اور ابن اسحٰق وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس خلوت میں زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے لئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کی، کہا کہ تمہارے بال کس قدر حسین ہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بال موت کے بعد سب سے پہلے میرے جسم سے علیحدہ ہو جائیں گے، پھر کہا تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں تو فرمایا موت کے بعد یہ سب پانی ہو کر میرے چہرے پر بہہ جائیں گی، پھر کہا تمہارا چہرہ کتنا حسین ہے، تو فرمایا کہ یہ سب مٹی کی غذا ہے، اللہ تعالیٰ نے فکرِ آخرت آپ پر اس طرح مسلط کر دی کہ نوجوانی کے عالم میں دنیا کی ساری لذتیں ان کے سامنے گرد ہو گئیں، صحیح ہے کہ فکرِ آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ہر جگہ ہر شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا اِیَّاہُ

وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی، یوں ہی ہوا

لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۲۴﴾

تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں ۔

خلاصہ تفسیر

اور اس عورت کے دل میں ان کا خیال (عزم کے درجہ میں) جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال (امر طبعی کے درجہ میں) ہو چلا تھا (جو کہ اختیار سے باہر ہے، جیسے گرمی کے روزہ میں پانی کی طرف میلان طبعی ہوتا ہے، گو روزہ توڑنے کا وسوسہ تک بھی نہیں آتا، البتہ) اگر اپنے رب کی دلیل کو (یعنی اس فعل کے گناہ ہونے کی دلیل کو جو کہ حکم شرعی ہے) انھوں نے نہ دیکھا ہوتا (یعنی اُن کو شریعت کا علم مع قوتِ عملیہ کے حاصل نہ ہوتا) تو زیادہ خیال ہو جانا عجب نہ تھا (کیونکہ اس کے دواعی اور اسباب سب قوی جمع تھے مگر) ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں (یعنی ارادہ سے بھی بچا لیا اور فعل سے بھی، کیونکہ) وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے ۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عظیم ابتلاء و امتحان مذکور تھا کہ عزیز مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی، اور اپنی طرف راغب کرنے اور مبتلا کرنے کے سارے ہی اسباب جمع کر دیئے، مگر رب العزت نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلاء میں ثابت قدم رکھا، اس کی مزید تفصیل اس آیت میں ہے کہ زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی ہی، یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر اختیاری میلان پیدا ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی، جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا، اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے ۔

اس آیت میں لفظ ہَمّ بمعنی خیال زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا، اور یہ معلوم ہے کہ زلیخا کا ہَمّ یعنی خیال گناہ

کا تھا، اس سے یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا، اور یہ باجماعِ امت شانِ نبوت و رسالت کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے نہ سہو و خطاء کی راہ سے ہو سکتا ہے، البتہ صغیرہ گناہ سہو و خطاء کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے (مسائرہ)

اور یہ مسئلہ عصمت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا، اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنیکا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

اس لئے اجمالی طور پر یہ تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ہَمّ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا، پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابلِ مواخذہ ہے، ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی درج فرما دیتے ہیں، اور دوسری صورت کہ محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کریں (قرطبی) اور صحیحین میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیک عمل کر لے تو دس نیکیاں لکھو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کر ہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ہَمّ کا ان دونوں معنی کے لئے استعمالِ عرب کے محاورات اور

اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ہَمّ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا، مگر ان دونوں کے ہَمّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو گناہ میں داخل نہیں، قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے، کیونکہ دونوں کا ہَمّ و خیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغۂ تثنیہ وَلَقَدْ هَمَّا کہہ دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا، اس کو چھوڑ کر دونوں کے ہَمّ و خیال کا بیان الگ الگ فرمایا هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا، اور زلیخا کے ہَمّ و خیال کے ساتھ تاکید کے الفاظ لَقَدْ کا اضافہ کیا، یوسف علیہ السلام کے ہَمّ کے ساتھ لام اور قَدْ کی تاکید نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے یہی جتلانا ہے کہ زلیخا کا ہَمّ کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا دوسری طرح کا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ابتلا پیش آیا تو فرشتوں نے اللہ جل شانہ سے عرض کی کہ آپ کا یہ مخلص بندہ گناہ کے خیال میں ہے، حالانکہ وہ اس کے وبال کو خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انتظار کرو، اگر وہ یہ گناہ کرلے تو جیسا کیا ہو وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دو، اور اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اس کے نامۂ اعمال میں نیکی درج کرو، کیونکہ اس نے صرف میرے خوف سے اپنی خواہش کو چھوڑا ہے، (جو بہت بڑی نیکی ہے) (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا، جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہوگیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ جو بعد میں مذکور ہے وہ اصل میں مقدم ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی حجت و برہان کو نہ دیکھ لیتے، لیکن برہان رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ہَمّ اور خیال سے بھی بچ گئے، مضمون یہ بھی درست ہے مگر بعض حضرات نے اس تقدیم و تاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے بھی پہلی ہی تفسیر راجح ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شانِ تقویٰ و طہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے، کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ اس کی جزا محذوف ہے، اور معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھتے تو اس خیال میں مبتلا رہتے مگر

برہانِ رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر اختیاری خیال اور وسوسہ بھی قلب سے نکل گیا۔

قرآن کریم نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ وہ برہانِ ربی جو یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی، کیا چیز تھی؟ اسی لئے اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ، حسن بصریؒ وغیرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت اس طرح ان کے سامنے کر دی کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت ان کے سامنے کر دی گئی، بعض نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نظر چھت کی طرف اٹھی تو اس میں یہ آیتِ قرآن لکھی ہوئی دیکھی، لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا، یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ وہ بڑی بے حیائی (اور قہر خداوندی کا سبب) اور (معاشرہ کے لئے) بہت برا راستہ ہے"۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ زلیخا کے مکان میں ایک بت تھا، اس نے اس بت پر پردہ ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے، اس کے سامنے گناہ کرنے کی جرأت نہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیا کا مستحق ہے، اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفتِ الٰہیہ خود ہی برہانِ رب تھی۔

امام تفسیر ابن جریرؒ نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہلِ تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے، وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلادی ہے صرف اسی پر اکتفا کیا جائے، یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے وسوسہ ان کے دل سے جاتا رہا، اس چیز کی تعیین میں وہ سب احتمال ہوسکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، لیکن قطعی طور پر کسی کو متعین نہیں کیا جاسکتا، (ابن کثیر)

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ

یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اس لئے دکھائی کہ ان سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں، برائی سے مراد صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے کبیرہ گناہ ہے (مظہری)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ برائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دینے کا ذکر فرمایا ہے، یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے، مگر برائی اور بے حیائی نے اُن کو گھیر لیا تھا ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا، قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوئے، اور انکے

دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہ تھا ورنہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا دیا نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹا دیا۔

کیونکہ یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں، لفظ مُخْلَصِیْنَ اس جگہ بفتح لام مخلَص کی جمع ہے، جس کے معنی منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں، جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کارِ رسالت اور اصلاحِ خلق کے لئے انتخاب فرمایا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے، کہ وہ کسی بُرائی میں مبتلا نہ ہو سکیں، خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا، اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ، "یعنی قسم ہو تیری عزت و قوت کی کہ میں اُن سب انسانوں کو گمراہ کروں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرما لیا ہے۔

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ بکسر لام مُخْلِصِیْنَ بھی آیا ہے، اور مخلِص کے معنی یہ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و فرمانبرداری اخلاص کے ساتھ کرے، اس میں کسی دنیاوی اور نفسانی غرض شہرت وجاہ وغیرہ کا دخل نہ ہو، اس صورت میں مراد اس آیت کی یہ ہو گی کہ جو شخص بھی اپنے عمل اور عبادت میں مخلص ہو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے میں اس کی امداد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو لفظ سوء اور فحشاء کے استعمال فرمائے ہیں، سوء کے لفظی معنی بُرائی کے ہیں، اور مراد اس سے صغیرہ گناہ ہے، اور فحشاء کے معنی بے حیائی کے ہیں، اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف قرآن میں جس ہَمّ یعنی خیال کو منسوب کیا ہے وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ کا ہَمّ تھا جو نہ کبیرہ گناہ میں داخل ہے نہ صغیرہ میں، بلکہ معاف ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا

اور دونوں دوڑے دروازہ کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کُرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے

لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْٓءًا إِلَّآ أَنْ

دروازہ کے پاس، بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں بُرائی، مگر یہی کہ

يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ

قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک ۔ یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنا جی کو اور

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے، اگر ہے اس کا کرتہ پھٹا آگے سے تو عورت سچی ہے اور

هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ

وہ ہے جھوٹا، اور اگر ہے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے

وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ

اور وہ سچا ہے ، پھر جب دیکھا عزیز نے کرتہ اس کا پھٹا ہوا پیچھے سے کہا

اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ

بیشک یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا، البتہ تمھارا فریب بڑا ہے ، یوسف جانے دے اس

عَنْ هٰذَا ۫ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ ع

ذکر کو، اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ ، بیشک تو ہی گنہگار تھی -

۳ ع ۹ ۱۳

خلاصۂ تفسیر

(اور جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے چلی) اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور (دوڑنے میں جو اُن کو پکڑنا چاہا تو) اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا (یعنی اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے) اور (عورت بھی ساتھ تھی تو) دونوں نے (اتفاقاً) اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس (کھڑا) پایا، عورت (خاوند کو دیکھ کر سٹ پٹائی اور فوراً بات بنا کر) بولی کہ جو شخص تیری بی بی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا بجز اس کے اور کیا (ہو سکتی) ہے کہ وہ جیل خانے بھیجا جائے یا اور کوئی دردناک سزا ہو (جیسے ضرب جسمانی) یوسف (علیہ السلام) نے کہا (کہ یہ جو میری طرف الزام کا اشارہ کرتی ہے بالکل جھوٹی ہے، بلکہ معاملہ برعکس ہے) یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھ کو پھسلاتی تھی اور (اس موقع پر) اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیر خوار بچہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے معجزے

سے بول پڑا اور آپ کی براءت پر) شہادت دی (اس بچہ کا بولنا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا، اس پر دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اس شیر خوار بچہ نے ایک معقول علامت بتا کر عاقلانہ فیصلہ بھی کیا اور کہا) کہ ان کا کرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں، سو جب (عزیز نے) اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا (عورت سے) کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے، بیشک تمہاری چالاکیاں بھی غضب کی ہوتی ہیں (پھر یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا) اے یوسف اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا یا خیال مت کرو) اور (عورت سے کہا کہ) اے عورت تو (یوسف سے) اپنے قصور کی معافی مانگ بیشک سرتاسر تو ہی قصوروار ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مشغول تھی، اور یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے مگر فطری اور غیر اختیاری خیال کی کشمکش بھی تھی، تو حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی اعانت کیلئے بطور معجزہ کے کوئی ایسی چیز سامنے کر دی جس نے دل سے وہ غیر اختیاری خیال بھی نکال ڈالا خواہ وہ چیز اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت ہو یا وحیِ الٰہی کی کوئی آیت۔

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برہانِ ربّی کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑے عزیز کی بیوی اُن کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہ رُکے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے، اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہونچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، انکی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کے لئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ بُرے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے، یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انھوں نے

حقیقت کا اظہار کیا کہ ھِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ یعنی یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معاملہ بڑا نازک اور عزیز مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سچا سمجھے، شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا، مگر اللہ جل شانہ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو معصوم و محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فرما دیتے ہیں، اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادۃً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے، مگر بطور معجزہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی برأت کا اظہار فرما دیتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن (اور راجح قول کے مطابق چالیس) کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر انکی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی، اور قدرتِ خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی برأت کے لئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما دی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی، یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا، کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا، اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادرِ مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے، جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے، اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے' میدانِ حشر میں حساب کتاب کے وقت انسان اپنی دنیا کی قدیم عادت کی بناء پر جب اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کرے گا تو اسی کے ہاتھ پاؤں اور کھال اور در و دیوار کو اس کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا، وہ اس کی ایک ایک حرکت کو محشر کے عظیم الشان مجمع کے سامنے کھول کر رکھ دے گا، اُس وقت انسان کو پتہ لگے گا کہ ہاتھ پاؤں اور گھر کے در و دیوار اور حفاظتی انتظامات میں سے کوئی بھی میرا نہ تھا، بلکہ یہ سب رب العزت کے خفیہ کارندے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا بچہ جو گہوارہ میں بظاہر اس دنیا کی ہر چیز سے غافل و بے خبر پڑا تھا وہ

یوسف علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر عین اس وقت بول اٹھا جب کہ عزیز مصر اس واقعہ سے کشمکش میں مبتلا تھا۔

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں براءت کی بڑی شہادت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک حکیمانہ بات کہلوائی، کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں، اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی، اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کرتہ کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی براءت ظاہری علامات سے بھی ظاہر ہو گئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرما دی، یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمدؒ نے اپنے مسند میں اور ابن حبانؒ نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکمؒ نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے، یہ چاروں وہی ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، (مظہری) اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں، مگر ابن جریرؒ ابن کثیرؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں:۔

اوّل:۔ آیت وَاسْتَبَقَا الْبَابَ سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہئے، جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ:۔ یہ کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے اور تاریخی روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرما دی،

ایسی صورت میں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے امداد و اعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرما دیتے ہیں، مولانا رومی رحؒ نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　٭　خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکرست　٭　نامرادی نے مرادِ دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھولیتے اور پھر جمعہ کے لئے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہونچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا، اور یہ نمازِ جمعہ ادا کرلیتے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا جس پر ہزاروں کرامتیں قربان ہیں، کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر جمعہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا، یہی وہ استقامت ہے، جس کو اکابر صوفیاء نے کرامت سے بالاتر فرمایا ہے۔

تیسرا مسئلہ:۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی تو اپنی صفائی پیش کرنا سنتِ انبیاء ہے، یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔

چوتھا مسئلہ:۔ اس میں شاہد کا ہے، یہ لفظ جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے، تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزاع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جس کو شاہد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس نے کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک صورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو اصطلاحی طور پر شاہد نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحات سب بعد کے علماء و فقہاء نے افہام و تفہیم کے لئے اختیار کرلی ہیں، قرآن حکیم کی نہ یہ اصطلاحیں ہیں نہ وہ ان کا پابند ہے، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہو جاتا ہے، اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس بچہ کے

بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہوگیا، کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے لئے شاہد تھی اور پھر اس نے جو علامات بتلائیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام ہی کی برارت کا ثبوت ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچا نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کر دیا تھا، اور زلیخا کے سچے ہونے کو ایک ایسی صورت میں بھی فرضی طور پر تسلیم کر لیا تھا، جس میں ان کا سچا ہونا یقینی نہ تھا، بلکہ دوسرا بھی احتمال موجود تھا، کیونکہ کرتے کا سامنے سے پھٹنا دونوں صورتوں میں ممکن ہے، اور یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے کو صرف ایسی صورت میں تسلیم کیا تھا، جس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن انجام کار نتیجہ اس حکمت عملی کا یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام کا بری ہونا ثابت ہو۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصومات کے فیصلوں میں قرائن اور علامات سے کام لیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی، اس معاملہ میں اتنی بات پر تو سب فقہار کا اتفاق ہے کہ معاملات کی حقیقت پہچاننے میں علامات اور قرائن سے ضرور کام لیا جائے جیسا کہ یہاں کیا گیا، لیکن محض علامات و قرائن کو کافی ثبوت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، واقعہ یوسف علیہ السلام میں بھی درحقیقت برارت کا ثبوت تو اس بچہ کی معجزانہ انداز سے گویائی ہے، علامات و قرائن جن کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس معاملہ کی تائید ہوگئی۔

بہرحال یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت والزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو خلاف عادت گویائی دے کر اس کی زبان سے یہ حکیمانہ فیصلہ صادر فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو، اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو یہ اس کی صاف علامت ہے کہ وہ بھاگ رہے تھے، اور زلیخا پکڑ رہی تھی، یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں۔

مذکورہ آیات میں سے آخری دو آیتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ عزیز مصر بچہ کے اس طرح بولنے ہی سے یہ سمجھ چکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی برارت ظاہر کرنے کے لئے یہ مافوق العادة صورت پیش آئی ہے، پھر اس کے کہنے کے مطابق جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ بھی پیچھے سے ہی پھٹا ہے تو یقین ہوگیا کہ قصور زلیخا کا ہے، یوسف علیہ السلام بری ہیں، تو اس نے پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ، یعنی یہ سب تمہارا مکر و حیلہ ہے،

کہ اپنی خطا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر و حیلہ بہت بڑا ہے، کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہر ان کا نرم و نازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آجاتا ہے، مگر عقل و دیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (مظہری)

تفسیر قرطبی میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا کید اور مکر شیطان کے کید و مکر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کے کید کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا، اور عورتوں کے کید کے متعلق یہ فرمایا کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ، یعنی تمہارا کید بہت بڑا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سب عورتیں نہیں بلکہ وہی ہے جو اس طرح کے مکر و حیلہ میں مبتلا ہوں، عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ، یعنی خطا سراسر تمہاری ہے، تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے، کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

فائدہ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بے حیائی ثابت ہو جانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون و اطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابلِ تعجب ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے پھر رسوائی سے بچانے کا فوق العادت انتظام فرمایا، اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا، ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے، اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی، یہ قدرتِ حق کے کرشمے ہیں کہ اطاعتِ حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

بعد کی آیتوں میں اور واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو پچھلے قصہ سے ہی وابستہ ہے،

وہ یہ کہ یہ واقعہ چھپانے کے باوجود درباری لوگوں کی عورتوں میں پھیل گیا، ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو لعن طعن کرنا شروع کیا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ پانچ عورتیں عزیز مصر کے قریبی افسروں کی بیویاں تھیں۔ (قرطبی، مظہری)

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں کہ دیکھو کیسی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اتنے بڑے مرتبہ پر ہوتے ہوئے اپنے نوجوان غلام پر فریفتہ ہو کر اس سے اپنی مطلب برآری چاہتی ہے، ہم تو اس کو بڑی گمراہی پر سمجھتے ہیں، آیت میں لفظ فتٰھا فرمایا ہے، فتٰی کے معنی نوجوان کے ہیں، عرف میں مملوک غلام جب چھوٹا ہو تو اس کو غلام کہتے ہیں، جوان ہو تو لڑکے کو فتیٰ اور لڑکی کو فتاۃ کہا جاتا ہے، اس میں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کا غلام یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ شوہر کی چیز کو بھی عادۃً بیوی کی چیز کہا جاتا ہے، اور یا اس لئے کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر سے بطور ہبہ اور تحفہ لے لیا تھا (قرطبی)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اس کے جی

نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰ فَلَمَّا

کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر ، پھر جب

سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ

سنا اس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور

اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا

دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری اور بولی یوسف نکل آ ان کے سامنے، پس جب

رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا

دیکھا ان کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں حاشا للہ! نہیں یہ شخص

بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ

آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ ، بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے

لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَئِنْ لَّمْ

مجھ کو اس کے واسطے، اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھام رکھا اور بیشک اگر

يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ

نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑیگا اور ہوگا بے عزت ، یوسف بولا اے رب

السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ

مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں، اور اگر تو دفع نہ کرے گا مجھ سے

كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ

ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل ، سو قبول کرلی

لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

اس کی دعاء اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب ، البتہ وہی ہے سننے والا خبردار ،

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت۔

ع ۴ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بی بی اپنے غلام کو اس سے اپنا (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے (کیسی کمینہ حرکت ہے کہ غلام پر گرتی ہے) اس غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ پکڑ گیا ہے۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بدگوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ ان کو بلا بھیجا (کہ تمہاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکیہ لگایا اور (جب وہ آئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے) ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دیدیا (جو ظاہر میں تو پھل تراشنے کا بہانہ تھا، اور اصل مقصد وہ تھا جو آگے آتا ہے کہ یہ حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھوں کو زخمی کرلیں گی) اور (یہ سب سامان درست کرکے یوسف علیہ السلام کو جو کسی دوسرے مکان میں تھے) کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آجاؤ (یوسف علیہ السلام یہ سمجھ کر کہ کوئی صحیح غرض ہوگی باہر آگئے) سو عورتوں نے جب انکو دیکھا تو ان کے جمال سے) حیران رہ گئیں اور (اس حیرت میں) اپنے ہاتھ کاٹ لئے (چاقو سے پھل تراش رہی تھیں، یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھائی کہ چاقو ہاتھ پر چل گیا) اور کہنے لگیں حاش للہ! یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص

یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو بُرا بھلا کہتی تھیں (کہ اپنے غلام کو چاہتی ہے) اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور (پھر یوسف علیہ السلام کے دھمکانے اور سُنانے کو کہا کہ) اگر آئندہ میرا کہنا نہ مانے گا (جیسا کہ اب تک نہیں مانا) تو بیشک جیل خانہ بھیج دیا جاوے گا اور بے عزت بھی ہوگا (وہ عورتیں بھی یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ تم کو اپنی محسن عورت سے ایسی اعتنائی مناسب نہیں جو یہ کہے اس کو ماننا چاہئے) یوسف (علیہ السلام) نے (یہ باتیں سُنی کہ یہ تو سب کی سب اسی کی موافقت کرنے لگیں تو حق تعالیٰ سے) دعاء کی کہ اے میرے رب جس (ناجائز) کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں، اس سے تو جیلخانہ میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں اُن کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا، سو ان کی دعاء ان کے رب نے قبول کی اور اُن عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا (اور ان کے احوال کا) خوب جاننے والا ہے (پھر یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی) مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد (جن سے خود تو اس کا پورا یقین ہو گیا، مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو قطع کرنے کی غرض سے) ان لوگوں کو (یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت تک قید میں رکھیں۔

معارف ومسائل

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ، یعنی جب زلیخا نے ان عورتوں کے مکر کا حال سُنا تو ان کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا۔

یہاں ان عورتوں کے تذکرہ کرنے کو زلیخا نے مکر کہا ہے، حالانکہ بظاہر انھوں نے کوئی مکر نہیں کیا تھا، مگر چونکہ خفیہ خفیہ اس کی بدگوئی کرتی تھیں، اس لئے اس کو مکر سے تعبیر کیا۔

وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً، یعنی ان کے لئے مسند تکیوں سے مجلس آراستہ کی، وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا، یعنی جب یہ عورتیں آگئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے ہر ایک کو ایک ایک تیز چاقو بھی دیدیا جس کا ظاہری مقصد تو پھل تراشنا تھا، مگر دل میں وہ بات پوشیدہ تھی جو آگے آتی ہے، کہ یہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جائیں گی اور چاقو سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیں گی۔

وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ، یعنی یہ سب سامان درست کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام سے جو کسی دوسرے مکان میں تھے زلیخا نے کہا کہ ذرا باہر آجاؤ، یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کی غرض فاسد معلوم نہ تھی اس لئے باہر اس مجلس میں تشریف لے آئے۔

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ، یعنی ان عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو اُن کے جمال سے حیران رہ گئیں، اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے، یعنی پھل تراشتے وقت جب یہ حیرت انگیز واقعہ سامنے آیا تو چاقو ہاتھ پر چل گیا، جیسا کہ دوسری طرف خیال بٹ جانے سے اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے اور کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، مطلب یہ تھا کہ ایسا نورانی تو فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ، وہ عورت بولی کہ دیکھو وہ شخص یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے بُرا بھلا کہتی تھیں، اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، مگر یہ پاک صاف رہا، اور آئندہ یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو بیشک جیلخانے بھیجا جائے گا، اور بے عزت بھی ہوگا۔

اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ میرا راز ان عورتوں پر فاش تو ہو ہی چکا ہے، اس لئے ان کے سامنے ہی یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے لگی، بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس وقت یہ سب عورتیں بھی یوسف علیہ السلام کو کہنے لگیں کہ یہ عورت تمہاری محسن ہے اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔

اور قرآن کریم کے بعض الفاظ جو آگے آتے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مثلاً يَدْعُوْنَنِيْٓ اور كَيْدَهُنَّ، جن میں چند عورتوں کا قول بصیغۂ جمع ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی موافقت اور تائید کر رہی ہیں، اور ان کے مکر و کید سے بچنے کی ظاہری کوئی تدبیر نہ رہی تو پھر اللہ جل شانہ، کی طرف ہی رجوع فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ، یعنی اے میرے پالنے والے یہ عورتیں مجھے جس کام کی طرف دعوت دیتی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ہی ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں، یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے

کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے، کیونکہ آپ نے کہا تھا اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے دعاء میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت اور بلاء کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہئے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعاء مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلاء و مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ سے صبر کی دعاء مانگنے کے بجائے عافیت کی دعاء مانگو (ترمذی) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعاء تلقین فرما دیجئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے رب سے عافیت کی دعاء مانگا کریں، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر میں نے آپؐ سے تلقین دعاء کا سوال کیا، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کریں (مظہری از طبرانی)

اور یہ فرمانا کہ اگر آپ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں انکی طرف مائل ہو جاؤں یہ عصمتِ نبوت کے خلاف نہیں، کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچا لیں، اور گو بمقتضاء نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا، مگر پھر بھی غایت خوفِ ادب سے اس کی دعاء کرنے پر مجبور ہو گئے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے، علم کا تقاضا گناہوں سے اجتناب ہے (قرطبی)

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یعنی ان کی دعاء ان کے رب نے قبول فرمائی، اور ان عورتوں کے مکر و حیلہ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے"

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے جال سے بچانے کے لئے یہ سامان فرما دیا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقویٰ و طہارت کی کھلی نشانیاں دیکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا، مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا، اس کو ختم کرنے کے لئے ان کو مصلحت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا جائے، تاکہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے، اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچا بھی ختم ہو جائے، ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ، یعنی پھر

عزیز اور اس کے مشیروں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے، چنانچہ جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ
اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں
خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ
شراب اور دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے
الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶ قَالَ
ہیں اس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا، بولا
لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ
نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے
يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ
پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ
لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷ وَاتَّبَعْتُ
ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے
مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ
دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک
نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي
کریں اللہ کا کسی چیز کو، یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں
النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۳۸ يٰصَاحِبَيِ
پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے، اے رفیقو!
السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹
قید خانہ کے بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست،
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ
کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے

۵

مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا

نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو

اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

مگر اسی کو یہی ہے راستہ سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے،

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ

اے رفیقو! قید خانہ کے! ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائے گا اپنے مالک کو شراب اور دوسرا جو ہے سو

فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ

سولی دیا جائے گا پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے، فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق

تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ

تم چاہتے تھے، اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا

عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ

اپنے مالک کے پاس، سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے مالک سے پھر رہا قید میں

بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع

کئی برس۔

۵ ع ۷ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی اسی زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے (جن میں ایک ساقی تھا، دوسرا روٹی پکانے والا باورچی، اور ان کی قید کا سبب یہ شبہ تھا کہ انھوں نے کھانے میں اور شراب میں زہر ملا کر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے قید کر دیئے گئے، انھوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو) ان میں سے ایک نے (حضرت یوسف علیہ السلام سے) کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے انگور کا شیرہ) نچوڑ رہا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر روٹیاں لئے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوچ نوچ کر) کھاتے ہیں، ہم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلائیے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں یوسف (علیہ السلام) نے (جب

یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوئے ہیں تو چاہا کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اس لئے اوّل اپنا نبی ہونا ایک معجزہ سے ثابت کرنے کے لئے) فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے، میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیلِ نبوّت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعہ میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اثباتِ نبوّت کے بعد آگے اثباتِ توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ) میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیمؑ کا اور اسحٰقؑ کا اور یعقوبؑ کا (علیہم السلام اور اس مذہب کا رکنِ اعظم یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں یہ (عقیدۂ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو اختیار نہیں کرتے) اے قید خانہ کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو اُن (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو یہی (توحید اور عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدھا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، (ایمان کی دعوت و تبلیغ کے بعد اب ان کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں کہ) اے قید خانہ کے رفیقو! تم میں ایک تو (جرم سے بری ہو کر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا، اور دوسرا (مجرم قرار پا کر) سُولی دیا جاوے گا اور اس کے سر کو پرندے (نوچ نوچ کر) کھاویں گے، اور جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدر ہو چکا (چنانچہ مقدمہ کی تنقیح کے بعد اسی طرح ہوا کہ ایک بری ثابت ہوا اور دوسرا مجرم، دونوں جیل خانہ سے بلائے گئے، ایک رہائی کیلئے دوسرا سزا کے لئے) اور (جب وہ لوگ جیل خانہ سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اس سے یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (کہ ایک

شخص بے قصور قید میں ہے، اس نے وعدہ کرلیا) پھر اس کو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو (اس وجہ سے) قیدخانہ میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ایک ذیلی واقعہ مذکور ہے، یہ بات آپ بار بار معلوم کرچکے ہیں کہ قرآن حکیم نہ کوئی تاریخی کتاب ہے، نہ قصہ کہانی کی، اس میں جو تاریخی واقعہ یا قصہ ذکر کیا جاتا ہے اس سے مقصود صرف انسان کو عبرت و موعظت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اہم ہدایات ہوتی ہیں، پورے قرآن اور بے شمار انبیا علیہم السلام کے واقعات میں صرف ایک ہی قصۂ یوسف علیہ السلام ایسا ہے جس کو قرآن نے مسلسل بیان کیا ہے، ورنہ ہر مقام کے مناسب تاریخی واقعہ کا کوئی ضروری جزء ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

قصۂ یوسف علیہ السلام کو اوّل سے آخر تک دیکھئے تو اس میں سینکڑوں عبرت و موعظت کے مواقع اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے لئے اہم ہدایتیں ہیں، یہ ذیلی قصہ بھی بہت سی ہدایات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی براءت اور پاکی بالکل واضح ہوجانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کرلیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعاء اور خواہش کی تکمیل تھی، کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہوگیا تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا، ابن کثیرؒ نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انھوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی، مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبرگیری کرتے تھے، جو بیمار ہوگیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے، جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے، اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی

آپ کی بزرگی کے معتقد ہوگئے، جیل کا افسر بھی متأثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

فائدہ عجیبہ جیل کے افسر نے یا قیدیوں میں سے بعض نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا، کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے، تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کے لئے مجھ سے محبت نہ کرو، کیونکہ جب کسی نے مجھ سے محبت کی ہے تو مجھ پر آفت آئی ہے، بچپن میں میری پھوپی کو مجھ سے محبت تھی اس کے نتیجہ میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنوئیں کی قید پھر غلامی اور جلا وطنی میں مبتلا ہوا، عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں پہونچا (ابن کثیر، مظہری)

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انھوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انھوں نے حقیقۃً دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محض یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہرحال اُن میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوتِ ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں، اور اصولِ دعوت کے ماتحت حکمت و دانشمندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمھارے لئے جو کھانا تمھارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا، اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے، ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ، اور یہ کوئی رَمَل، جفر کا فن یا کہانت وغیرہ کا شعبدہ نہیں، بلکہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے تبلادیتا ہے، میں اس کی اطلاع دیدیتا ہوں، اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیلِ نبوّت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے، اس کے بعد اوّل کفر کی بُرائی اور ملّتِ کفر سے اپنی بیزاری بیان کی، اور پھر یہ بھی جتلا دیا کہ میں خاندانِ نبوّت ہی کا ایک فرد اور انہی کی

ملتِ حق کا پابند ہوں، میرے آباء و اجداد ابراہیم و اسحٰق و یعقوب ہیں، یہ خاندانی شرافت بھی عادۃً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں، پھر فرمایا کہ یہ دینِ حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامتِ فہم عطا فرما کر قبولِ حق ہمارے لئے آسان کر دیا، مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے، پھر انہی قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پرستا ہو یہ بہتر ہے یا یہ کہ صرف ایک اللہ کا بندہ بنے جس کا قہر و قوت سب پر غالب ہے، پھر بت پرستی کی بُرائی ایک دوسرے طریقہ سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے، یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں، نہ ان میں ذاتی صفات اس قابل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت و طاقت کا مالک سمجھا جائے، کیونکہ وہ سب بےحس و حرکت ہیں، یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے، دوسرا راستہ ان کے معبودِ حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پرستش کے لئے احکام نازل فرمائے، تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتی، مگر حکمِ خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو چھوڑ کر اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کی عبادت کیلئے کوئی حجت و دلیل نازل نہیں فرمائی، بلکہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی وہ دینِ قیّم ہے جو میرے آباء و اجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ و دعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا، اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا، اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی، اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور باورچی کو سولی دی جائے گی، مگر پیغمبرانہ شفقت و رافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی، تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سُولی دی جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محض اٹکل اور تخمینہ سے نہیں

بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا، جن حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ، چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہوگا جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔

پھر جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام تعبیر خواب کے ذریعہ یہ سمجھے تھے کہ وہ رہا ہوگا اس سے کہا کہ جب تم آزاد ہو کر جیل سے باہر جاؤ اور شاہی دربار میں رسائی ہو تو اپنے بادشاہ سے میرا بھی ذکر کر دینا کہ وہ بے گناہ قید میں پڑا ہوا ہے، مگر اس شخص کو آزاد ہونے کے بعد یوسف علیہ السلام کی یہ بات یاد نہ رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگی، اور اس واقعہ کے بعد چند سال مزید قید میں رہے، یہاں قرآن میں لفظ بِضْعَ سِنِیْنَ آیا ہے، یہ لفظ تین سے لے کر نو تک صادق آتا ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد سات سال مزید قید میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور فوائد و ہدایات حاصل ہوتے ہیں، ان میں غور کیجئے:۔

پہلا مسئلہ:۔ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حُسنِ اخلاق، حُسنِ معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں خطاکاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کر کے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ:۔ آیت کے جملے اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جن کے نیک، صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ:۔ یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاحِ خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے حُسنِ اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں اُن کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندانِ نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا

یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو یہ وہ تزکیۂ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ: تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہو کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفۂ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیرِ خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیرِ خواب کے جواب سے پہلے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد وہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ: بھی اسی ارشاد واصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہوسکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اِس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملّتِ کفر کو چھوڑ کر ملّتِ اسلام کو اختیار کیا، اور پھر کفر وشرک کی خرابیاں دلنشیں انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیرِ خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کرکے نہیں کہا کہ تم سولی چڑھائے جاؤ گے (ابن کثیر، مظہری)

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ وہ بے قصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔

آٹھواں مسئلہ: یہ ہو کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے، شاید اسی لئے یہ قیدی یوسف علیہ السلام کے اس کہنے کو بھول گیا اور انکو مزید کئی سال جیل میں رہنا پڑا، ایک حدیث میں بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دُبلی

وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ

اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے

رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ

خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے، بولے یہ خیالی خواب ہیں،

وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا

اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں، اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں

مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

میں سے اور یاد آ گیا اس کو مدت کے بعد، میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو،

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ

جا کر کہا اے یوسف اے سچے! حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائیں

سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ

سات دُبلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، تا کہ

اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ

لیجاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو، کہا تم کھیتی کرو گے سات

سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا

برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا

مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ

جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو

مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ

رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا اس کے

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ ع

پیچھے ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

ع ۶ ۷ ۱۶

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى	
اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا	
رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ	
اپنے خاوند کے پاس اور پوچھ اس سے کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنھوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے، میرا	
رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾	
رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے۔	

خلاصۂ تفسیر

اور بادشاہِ مصر نے (بھی ایک خواب دیکھا اور ارکانِ دولت کو جمع کر کے ان سے) کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں فربہ ہیں جن کو سات لاغر گائیں کھا گئیں، اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں (اور خشک بالوں نے اسی طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کر دیا) اے دربار والو اگر تم (خواب کی) تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو وہ لوگ کہنے لگے کہ (اول تو یہ کوئی خواب ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں) یونہی پریشان خیالات ہیں اور (دوسرے) ہم لوگ (کہ امورِ سلطنت میں ماہر ہیں) خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے (دو جواب اس لئے دیئے کہ اول جواب سے بادشاہ کے قلب سے پریشانی اور وسواس دور کرنا ہے، اور دوسرے جواب سے اپنا عذر ظاہر کرنا ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابلِ تعبیر نہیں دوسرے ہم اس فن سے واقف نہیں) اور اُن (مذکورہ) دو قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا (وہ مجلس میں حاضر تھا) اس نے کہا اور مدت کے بعد اس کو (یوسف علیہ السلام کی وصیت کا) خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائے دیتا ہوں، آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے (چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قیدخانہ میں یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور جا کر کہا) اے یوسف اے صدق مجسم آپ ہم لوگوں کو اس (خواب) کا جواب (یعنی تعبیر) دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دُبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں (کہ ان خشک کے لپٹنے سے وہ ہری بھی خشک ہو گئیں آپ تعبیر بتلائیے) تاکہ میں (جنھوں نے مجھ کو بھیجا ہے) ان لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں (اور بیان کروں) تاکہ (اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال) ان کو بھی معلوم ہو جائے (تعبیر کے موافق عملدرآمد کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے) آپ نے فرمایا کہ (ان سات

فربہ گایوں اور سات سبز بالوں سے مراد پیداوار اور بارش کے سال ہیں پس) تم سات سال متواتر (خوب) غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا (تاکہ گھن نہ لگ جاوے) ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آوے (وہ بالوں میں سے نکالا ہی جاوے گا) پھر اس (سات برس) کے بعد سات برس ایسے سخت (اور قحط کے) آویں گے جو کہ اس (تمامتر) ذخیرہ کو کھاجاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا، ہاں مگر تھوڑا سا جو (بیج کے واسطے) رکھ چھوڑو گے (وہ البتہ بچ جاوے گا، اور ان خشک بالوں اور دُبلی گایوں سے اشارہ ان سات سال کی طرف ہی) پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اور اس میں (بوجہ اس کے کہ انگور کثرت سے پھلیں گے) شیرہ بھی نچوڑیں گے (اور شرابیں پئیں گے غرض وہ شخص تعبیر لیکر دربار میں پہنچا) اور (جاکر بیان کیا) بادشاہ نے (جو سنا تو آپ کے علم و فضل کا معتقد ہوا اور) حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ (چنانچہ یہاں سے قاصد چلا) پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا (اور پیغام دیا تو) آپ نے فرمایا کہ (جب تک میرا اس تہمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہو جائے گا میں نہ آؤں گا) تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہی) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (مطلب یہ تھا کہ ان کو بلا کر اس واقعہ کی جس میں مجھ کو قید کی گئی تفتیش و تحقیق کی جاوے، اور عورتوں کے حال سے مراد ان کا واقف یا ناواقف ہونا ہے حال یوسفؑ سے اور ان عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی ہو کہ ان کے سامنے زلیخا نے اقرار کیا تھا، وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ) میرا رب ان عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے (یعنی اللہ کو تو معلوم ہی ہے کہ زلیخا کا مجھ پر تہمت لگانا کید تھا، مگر عند الناس بھی اس کی تنقیح ہو جانا مناسب ہی، چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو حاضر کیا) ❊

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں یہ بیان ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لئے پردۂ غیب سے ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ بادشاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے وہ پریشان ہوا، اپنی مملکت کے تعبیر دینے والے اہلِ علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیرِ خواب دریافت کی، وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دیدیا کہ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ، اضغاث، ضغث کی جمع ہے، جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہی جس میں مختلف قسم کے خس و خاشاک گھاس پھونس جمع ہوں، معنی یہ تھے کہ یہ خواب کچھ ملی جلی ہی،

جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے، کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کردیتے۔

اس واقعہ کو دیکھ کر مدت مدیدہ کے بعد اس رہا شدہ قیدی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ کو اس خواب کی تعبیر بتلا سکوں گا، اس وقت اس نے یوسف علیہ السلام کے کمالات اور تعبیر خواب میں مہارت اور پھر مظلوم ہو کر قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر کے یہ چاہا کہ مجھے جیل خانہ میں ان سے ملنے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے اس کا انتظام کیا وہ یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو صرف ایک لفظ فَاَرْسِلُوْنِ فرما کر بیان کیا ہے، جس کے معنی ہیں مجھے بھیج دو، یوسف علیہ السلام کا تذکرہ پھر سرکاری منظوری اور پھر جیل خانہ تک پہونچنا یہ واقعات خود ضمنی طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں، اس لئے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ بیان شروع کیا:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ، یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہونچکر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلائیے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فربہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر و کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سرسبز ہرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا، لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ؀ یعنی آپ تعبیر بتلادیں گے تو ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہوجائیں۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فن تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سنکر سمجھ لیا کہ سات بیل فربہ اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں، جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگانے میں خاص دخل ہے، اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فربہ بیلوں کے کھالینے سے یہ مراد ہے کہ پچھلے

سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہو جائے گا صرف بیج کے لئے کچھ غلّہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کے سال کل سات ہی ہیں تو عادۃ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کر دیا تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہونچے، جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل و کمال ظاہر ہو کر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پرانا ہونے کے بعد کیڑا نہ لگ جائے، یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔

ثُمَّ يَأْتِيْ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ، یعنی پہلے سات سال کے بعد پھر سات سال سخت خشک سالی اور قحط کے آئیں گے، جو پچھلے جمع کئے ہوئے ذخیرہ کو کھا جائیں گے خواب میں چونکہ یہ دیکھا تھا کہ ضعیف کمزور بیلوں نے فربہ اور قوی بیلوں کو کھا لیا، اس لئے تعبیر خواب میں اس کے مناسب یہی فرمایا کہ قحط کے سال پچھلے سالوں کے جمع کردہ ذخیرہ کو کھا جائیں گے، اگرچہ سال تو کوئی کھانے والی چیز نہیں، مراد یہی ہے کہ انسان اور جانور قحط کے سالوں میں پچھلے ذخیرہ کو کھا لیں گے۔

قصہ کے سیاق سے ظاہر ہے کہ یہ شخص تعبیر خواب یوسف علیہ السلام سے معلوم کر کے لوٹا اور بادشاہ کو خبر دی وہ اس سے مطمئن اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کا معتقد ہو گیا، مگر قرآنِ کریم نے ان سب چیزوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ خود بخود مفہوم ہو سکتی ہیں، اس کے بعد کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ، یعنی بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیلخانہ سے نکالا جائے، اور دربار میں لایا جائے، چنانچہ بادشاہ کا کوئی قاصد بادشاہ کا یہ پیغام لے کر جیل خانہ پہونچا۔

موقع بظاہر اس کا تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ کی طویل مدت سے عاجز آرہے تھے

اور خلاصی چاہتے تھے، جب بادشاہ کا پیغام بلانے کے لئے پہنچا تو فوراً تیار ہو کر ساتھ چل دیتے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جو مقام بلند عطا فرماتے ہیں اس کو دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے، اس قاصد کو جواب یہ دیا :

قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام نے قاصد سے کہا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا کر پہلے یہ دریافت کرو کہ آپ کے نزدیک ان عورتوں کا معاملہ کس طرح ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، کیا اس واقعہ میں وہ مجھے مشتبہ سمجھتے ہیں اور میرا کوئی قصور قرار دیتے ہیں

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا، جو اصل سبب تھی، اس میں اس حق کی رعایت تھی جو عزیز کے گھر میں پرورش پانے سے فطرۃً شریف انسان کے لئے قابلِ لحاظ ہوتا ہے (قرطبی)

اور ایک بات یہ بھی ہے کہ اصل مقصود اپنی برارت کا ثبوت تھا، وہ ان عورتوں سے بھی ہو سکتا تھا، اور اس میں عورتوں کی بھی کوئی زیادہ رسوائی نہ تھی، اگر وہ سچی بات کا اقرار بھی کر لیتیں تو صرف مشورہ ہی کی مجرم ٹھہرتیں، بخلاف عزیز کی بیوی کے کہ اس کو تحقیقات کا ہدف بنایا جاتا، تو اس کی رسوائی زیادہ تھی، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ، یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہی ہے میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقتِ واقعہ سے واقف ہو جائیں، جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برارت کا اظہار بھی ہے۔

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدّت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبریؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق قابلِ تعجب ہیں، جب اُن سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا، پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا (قرطبی)

اس حدیث میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ منشار حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق کی تعریف و مدح کرنا ہے، مگر اس کے بالمقابل جس صورتِ حال کو

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کرکے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا، اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طرزِ عمل کو افضل فرما رہے ہیں، اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کر پاتا، بلکہ اس کے مقابلہ میں مفضول کو اختیار کر لیتا، جو بظاہر افضل الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہیں، تو اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں، مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریقِ کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے، اور وہ اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقِ کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیمِ امت اور خیر خواہیِ عوام کے لئے وہی مناسب اور افضل ہے، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے، یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسولِ خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمۃ للعالمینؐ کے مزاج و مذاق میں عامۂ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قُلْنَ حَاشَ

کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت سے، بولیں

لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ

حاشاللہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی، بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی سچی

حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

بات، میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ

الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥١﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ

سچا ہے، یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی

اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٢﴾

چھپ کر اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی خواہش کی (یعنی ایک نے خواہش کی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کہ اعانتِ فعل بھی مثل فعل کے ہی، اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا، شاید بادشاہ نے اس طور پر اس لئے پوچھا ہو کہ مجرم سُن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے اُن سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید اس کا نام بھی معلوم ہو، اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، پس اس طرح شاید خود اقرار کرلے) عورتوں نے جواب دیا کہ حاش للہ ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی (وہ بالکل پاک صاف ہیں، شاید عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ مقصود یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا ثبوت تھا اور وہ حاصل ہوگیا، یا زلیخا کے روبرو ہونے سے حیاء مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں) عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہو ہی گئی (اب اخفاء بیکار ہی سچ یہی ہے کہ) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انھوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا، ماجزاء من الخ) اور بیشک وہی سچے ہیں (اور غالبًا ایسے امر کا اقرار کرلینا مجبوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا، غرض تمام صورت مقدمہ اور اظہارات اور یوسف علیہ السلام کی برارت کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا اس وقت) یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا تاکہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی حرمت میں خیانت کی تھی کہ دوسرے پر نگاہ کی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی، پس میری غرض یہ تھی)۔

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہی قاصد رہائی کا پیغام دے کر بلانے کے لئے آیا اور انھوں نے قاصد کو یہ جواب دیا کہ پہلے ان عورتوں سے میرے معاملہ کی تحقیق کرو جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، اس میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جیسے دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقل کامل اور معاملات و حالات کی پوری بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں، یوسف علیہ السلام نے شاہی پیغام سے یہ اندازہ کرلیا کہ اب جیل سے رہائی کے بعد بادشاہِ مصر مجھے کوئی

اعزاز دیں گے، اس وقت دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ جس عیب کی تہمت ان پر لگائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی حقیقت بادشاہ اور سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہو اور ان کی برا‌ءت میں کسی کو شبہ نہ رہے، ورنہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاہی اعزاز سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہو جائیں گی، مگر ان کے دلوں میں یہ خیالات کھٹکتے رہیں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے آقا کی بیوی پر دست درازی کی تھی، اور ایسے حالات کا پیدا ہو جانا بھی شاہی درباروں میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت بادشاہ بھی لوگوں کے ایسے خیالات سے متاثر ہو جائے، اس لئے رہائی سے پہلے اس معاملہ کی صفائی اور تحقیق کو ضروری سمجھا، اور مذکور الصدر دو آیتوں میں سے دوسری آیت میں خود یوسف علیہ السلام نے اپنے اس عمل اور رہائی میں تاخیر کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

اوّل یہ کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ، یعنی یہ تاخیر میں نے اس لئے کی کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں کوئی خیانت نہیں کی۔

عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا، اور اس پر سکوت ان کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا وہ چونکہ ایک زمانہ تک آقا کی حیثیت میں رہ چکا تھا، اس لئے یوسف علیہ السلام کی شرافت نفس نے اس کی اذیت کو گوارا نہ کیا، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جب عزیز مصر کو برا‌ءت کا یقین ہو جائیگا تو دوسرے لوگوں کی زبانیں خود بند ہو جائیں گی۔

دوسری حکمت یہ ارشاد فرمائی وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ، یعنی یہ تحقیقات اس لئے کرائی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے، کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا،،

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تحقیقات کے ذریعہ خیانت کرنے والوں کی خیانت ظاہر ہو کر سب لوگ متنبہ ہو جائیں کہ خیانت کرنے والوں کا انجام آخر کار رسوائی ہوتا ہے، تاکہ آئندہ سب لوگ ایسے کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں، دوسرے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا، اور خیانت کی برائی دلوں سے نکل جاتی، بہرحال مذکورہ بالا حکمتوں کے پیش نظر یوسف علیہ السلام نے رہائی کا پیغام پاتے ہی فوراً نکل جانا پسند نہیں کیا، بلکہ شاہی انداز سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مذکور الصدر پہلی آیت میں اسی تحقیقات کا خلاصہ مذکور ہے، قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ، "یعنی بادشاہ نے اُن عورتوں کو جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حاضر کر کے سوال کیا، کہ کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسفؑ سے اپنے مطلب کی خواہش کی" بادشاہ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اس کو اپنی جگہ یہ یقین ہوگیا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں ان عورتوں ہی کا ہے، اسی لئے یہ کہا تم نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی، اس کے بعد عورتوں کا جواب یہ مذکور ہے :-

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ "یعنی سب عورتوں نے کہا کہ حاش للہ! ہمیں ان میں ذرا بھی کوئی برائی کی بات نہیں معلوم ہوئی، عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی، میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی، اور بیشک وہی سچے ہیں"

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق و صفائی کے لئے کھل جاتی ہیں، اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہارِ حق کا اعلان خود کر دیا، یہاں تک جو حالات و واقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سُنے ہیں، ان میں بہت سے فوائد و مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔

ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں، مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید مسائل اور ہدایات یہ ہیں :-

نواں مسئلہ :- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کے لئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنونِ احسان کرنا پسند نہیں فرماتے، یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردۂ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت و شان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔

اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہِ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا، جس کی تعبیر سے اس کے درباری اہلِ علم و فن عاجز ہوئے، اس طرح ضرورتمند ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا (ابن کثیر)

دسواں مسئلہ :- اس میں حسن اخلاق کی تعلیم ہے، کہ رہا ہونے والے قیدی نے یوسف علیہ السلام کا اتنا کام نہ کیا کہ بادشاہ سے ذکر کر دیتا اور ان کو مزید سات سال قید کی مصیبت میں گذارنے پڑے، اب سات سال کے بعد جب وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کا لے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہو سکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا (ابن کثیر و قرطبی)

گیارھواں مسئلہ :- اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہئے، کہ وہ پریشان نہ ہوں، جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف تعبیر خواب بتا دینے کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ یہ حکیمانہ اور خیرخواہانہ مشورہ بھی دیا، کہ پیداوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں، اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں، تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جاوے۔

بارھواں مسئلہ :- یہ ہے کہ عالم مقتداء کو اس کی بھی فکر رہنی چاہئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہئے، کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت وارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے، لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے، یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے، خواص اور علماء کو اس میں دوہری احتیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے ایک بی بی آپ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ نے دور ہی سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہو جائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہو جائیں۔

تیرھواں مسئلہ :- اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی بھی پڑے

تو اس میں بھی مقدور بھر حقوق و احترام کی رعایت کرنا شرافت کا مقتضیٰ ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

چودھواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت اُن سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہونچے، جیسے آیت لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بیشک جی تو سکھلاتا ہے بُرائی مگر

مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٣﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي

جو رحم کر دیا میرے رب نے بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان، اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے

بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا

پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس

مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي

جگہ پائی معتبر ہو کر، یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان

حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ

ہوں خوب جاننے والا، اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ

اس میں جہاں چاہتا، پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں، اور ضائع نہیں کرتے ہم

أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا

بدلہ بھلائی والوں کا، اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے

وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾ ع

اور رہے پرہیزگاری میں۔

ع ۸ ۷

خلاصۂ تفسیر

اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہر ایک کا) بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس میں برائی کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، مطمئنہ جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصۂ مطلب یہ ہوا کہ میری نزاہت و عصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں، بلکہ رحمت و عنایت الٰہیہ کا اثر ہے، اس لئے میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا، ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا) بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے، یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں امّارہ اور مطمئنہ، سو امّارہ اگر توبہ کرلے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے، اور مرتبۂ توبہ میں وہ لوّامہ کہلاتا ہے، اور جو مطمئنہ ہے کمال اس کا لازم ذات نہیں، بلکہ عنایت و رحمت کا اثر ہے، پس امّارہ کے لوّامہ ہونے پر صفت غفور کا ظہور ہوتا ہے، اور مطمئنہ میں صفت رحیم کا۔

یہ تمام تر مضمون ہوا یوسف ؑ کی تقریر کا، باقی یہ امر کہ یہ صورت اثبات نزاہت کی بعد رہائی کے بھی تو ممکن تھی پھر رہائی پر اس کو مقدم کیوں رکھا، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جتنا یقین اس ترتیب میں ہوسکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ دلائل کی دلالت تو مشترک ہے، لیکن اس صورتِ مجوّزہ میں یہ امر زائد ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب بدون تبریہ کے یہ رہا ہونا نہیں چاہتے، حالانکہ ایسی حالت میں رہائی قیدی کی انتہائی تمنا ہوتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نزاہت و براءت کا کامل یقین ہے اس لئے اس کے ثابت ہوجانے کا پورا اطمینان ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین بَری ہی کو ہوسکتا ہے نہ کہ ملوّث کو،

یہ ساری باتیں بادشاہ نے سُنیں، اور (یہ سُن کر اس) بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے (کام کے) لئے رکھوں گا (اور عزیز سے ان کو لیلوں گا کہ اس کے ماتحت نہ رہیں گے چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لائے) پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں (اور باتوں سے زیادہ فضل و کمال آپ کا ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے (ان سے) کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہو (بعد اس کے اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قحط کا اہتمام بڑا بھاری کام ہے، یہ انتظام کس کے سپرد کیا جاوے) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کردو، میں (ان کی) حفاظت (بھی) رکھوں گا اور (آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی) خوب واقف ہوں (چنانچہ بجائے اس کے

کہ ان کو کوئی خاص منصب دینا مثل اپنے پورے اختیارات ہر قسم کے دیدیئے، گویا حقیقت میں بادشاہ یہی ہوگئے، گو برائے نام وہ بادشاہ رہا، اور یہ عزیز کے عہدہ سے مشہور ہوگئے (چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں با اختیار بنا دیا، کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں (جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے، یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنویں میں محبوس تھے، پھر عزیز کی ماتحتی میں مقید رہے، اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی، بات یہ ہے کہ) ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے، کہ حیاتِ طیبہ عطا فرماتے ہیں، خواہ مالدار بنا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے لئے تھا، اور خواہ بغیر مالداری کے قناعت و رضا عطا کر کے جس سے عیش لذیذ میسّر ہوتا ہے یہ تو آج دنیا میں ہوا) اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے"۔

معارف و مسائل

اپنی پاکبازی بیان کرنا درست نہیں، مگر خاص حالات میں

اس سے پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول مذکور تھا کہ جو الزام مجھ پر عائد کیا تھا اس کی صفائی اور معاملہ کی مکمل تحقیق سے پہلے میں قید سے رہائی کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ عزیز اور بادشاہِ مصر کو پورا یقین ہو جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی تھی، بلکہ الزام سراسر جھوٹا تھا، اس میں چونکہ اپنی برأت اور پاکبازی کا ذکر ایک ناگزیر ضرورت سے ہو رہا تھا جو بظاہر اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا اظہار ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ "یعنی کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ وہ جس کو چاہیں پاک قرار دیں"۔ ـــــــ اور سورۂ نجم میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى "یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کے مدعی نہ بنو، اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون واقعی پرہیزگار متقی ہے"۔

اس لئے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جتلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے، بجز اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک

کردے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے، حاصل یہ ہو کہ ایسے ابتلاء عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں، کہ خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ ایک قسم کا خیال تو بہرحال ان کے دل میں بھی پیدا ہو ہی گیا تھا، گو وہ غیر اختیاری وسوسے کی حد تک تھا، مگر شانِ نبوت کے سامنے وہ بھی ایک لغزش اور برائی ہی تھی، اس لئے اس کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے نفس کو بھی بالکل ہی بری اور پاک نہیں سمجھتا۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہو کہ اس میں ہر نفسِ انسانی کو اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ یعنی بُرے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے، صحابۂ کرام رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپؐ نے فرمایا قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہو کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہو جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کرکے ذلیل و خوار بھی کرتا ہو اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

بہرحال آیت مذکورہ اور ان روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی بُری ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورۂ قیامہ میں اسی نفسِ انسانی کو لوّامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہو کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، اور سورۂ والفجر میں اسی نفسِ انسانی کو نفسِ مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ، اس طرح نفسِ انسانی کو ایک جگہ اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ کہا گیا، دوسری جگہ لوّامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفسِ انسانی اپنی ذات میں تو اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ یعنی بُرے کاموں کا

تقاضا کرنے والا ہے، لیکن جب انسان خدا و آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے
تو اس کا نفس لوّامہ بن جاتا ہے، یعنی بُرے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنیوالا
جیسے عام صلحاء اُمت کے نفوس ہیں، اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے
اپنے نفس کو اس حالت میں پہونچا دے کہ بُرے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس
مطمئنہ ہو جاتا ہے، صلحاء اُمت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے، اور پھر بھی
اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطاءِ خداوندی سے
ایسا ہی نفسِ مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے،
اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، آخر آیت میں فرمایا کہ میرا رب بڑا مغفرت کرنے والا اور رحمت
کرنے والا ہے، لفظ غفور میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفسِ اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ جب اپنی خطاء پر نادم
ہو کر توبہ کرے، اور نفس لوّامہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت بڑی ہے، وہ معاف فرما دیں گے
اور لفظ رحیم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے، کہ جس شخص کو نفس مطمئنہ نصیب ہو وہ بھی اللہ کی رحمت
ہی کا نتیجہ ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ الخ یعنی بادشاہِ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کے
فرمانے کے مطابق عورتوں سے واقعہ کی تحقیق فرمائی اور زلیخا اور دوسری سب عورتوں نے
حقیقتِ واقعہ کا اقرار کر لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے پاس لایا جائے
تاکہ میں اُن کو اپنا مشیر خاص بنا لوں، حکم کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیلخانہ
سے دربار میں لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ
ہو گیا، تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے معزز اور معتمد ہیں۔

امام بغوی ؒ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے
پاس دوبارہ پہونچا، اور بادشاہ کی دعوت پہونچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں
کے لئے دعاء کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربارِ شاہی پر پہونچے تو یہ دعاء کی،
حَسْبِيْ رَبِّيْ مِنْ دُنْيَايَ وَحَسْبِيْ رَبِّيْ مِنْ خَلْقِهٖ عَزَّ جَارُهٗ وَجَلَّ ثَنَاۤؤُهٗ وَلَآ اِلٰهَ
غَيْرُهٗ ۔ یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے، اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب
میرے لئے کافی ہے، جو اسکی پناہ میں آگیا وہ بالکل محفوظ ہے، اور اسکی بڑی تعریف ہے اور اسکے سوا کوئی معبود نہیں''
جب دربار میں پہونچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعاء کی اور عربی
زبان میں سلام کیا، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ اور بادشاہ کیلئے دعاء عبرانی زبان میں کی

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا، مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا، عبرانی زبان میں۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں، جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کردی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلا واسطہ سن لوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں، اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے، تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کرا کر غلّہ اگانے کا انتظام کریں، اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، اور جتنا غلّہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصّہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلّہ سرکاری محاصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں، کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اُس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلّہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہو جائے گا، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہ مصر اس مشورہ سے بیحد مسرور و مطمئن ہوا، مگر کہنے لگا، کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ، یعنی ملک کے خزانے (جن میں زمین کی پیداوار بھی شامل ہے) آپ میرے سپرد کر دیں میں ان کی حفاظت بھی پوری کر سکتا ہوں، اور خرچ کرنے کے مواقع اور مقدار خرچ کے اندازہ سے بھی پورا واقف ہوں (قرطبی و مظہری)

ان دو لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا، جو ایک وزیر خزانہ میں ہونے چاہئیں، کیونکہ پہلی ضرورت تو امین خزانہ کے لئے اس کی ہے کہ

وہ سرکاری اموال کو ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری حفاظت سے جمع کرے، پھر غیر مستحق لوگوں اور غلط قسم کے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے اور دوسری ضرورت اس کی ہے کہ جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے، اس میں نہ کوتاہی کرے اور نہ مقدار ضرورت سے زائد خرچ کرے، لفظ "حفیظ" پہلی ضرورت کی پوری ضمانت ہے اور لفظ "علیم" دوسری ضرورت کی۔

شاہِ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا گردیدہ اور ان کی دیانت اور عقل کامل کا پورا معتقد ہو چکا تھا، مگر بالفعل وزارتِ خزانہ کا منصب ان کو سپرد نہیں کیا، بلکہ ایک سال تک ایک معزز مہمان کی طرح رکھا۔

سال بھر پورا ہونے کے بعد نہ صرف وزارتِ خزانہ بلکہ پورے امور مملکت ان کے سپرد کر دیئے، شاید مقصد یہ تھا کہ جب تک گھر میں رکھ کر ان کے اخلاق وعادات کا پورا تجربہ نہ ہو جائے اتنا بڑا منصب سپرد کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ہے ؎

چو یوسف کسے در صلاح و تمیز ٭ بیک سال باید کہ گردد عزیز

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قطفیر کا انتقال ہو گیا تو شاہِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کر دی، اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ اجل شانہٗ نے بڑی عزت وشان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی، اور عیش ونشاط کے ساتھ زندگی گذری، تاریخی روایات کے مطابق دو لڑکے بھی پیدا ہوئے، جن کا نام افرائیم اور منشا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی، زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی، اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات مضمحل ہو گئے، یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور مظہری میں بیان ہوا ہے۔

قصۂ یوسف علیہ السلام کے ضمن میں جو عام انسانوں کی صلاح وفلاح کے لئے بہت سی ہدایات اور تعلیمات آئی ہیں، ان کا ذکر کچھ پہلے ہو چکا ہے، مذکور الصدر آیات میں مزید مسائل اور ہدایات حسب ذیل ہیں:

پہلا مسئلہ:۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہوجائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گناہگاروں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ ارشادِ یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جمائیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے نفسِ امّارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا، ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر بُرے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنا جائز نہیں مگر چند شرائط کے ساتھ اجازت ہے

دوسرا مسئلہ:۔ اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے، جیسے یوسف علیہ السلام نے خزائنِ ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کرسکے گا اور اپنے بارہ میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا، اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کرلینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ حُبِّ جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو، بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا، اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کرکے عہدۂ امارت حاصل بھی کرلیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی، جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی، جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کرسکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا اِنَّا لَنۡ نَّسۡتَعۡمِلَ عَلٰی عَمَلِنَا مَنۡ اَرَادَہٗ، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا طلب عہدہ خاص حکمت پر مبنی تھا

مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بادشاہِ مصر کافر ہے، اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہے اور ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے، اس وقت خود غرض لوگ عام خلق اللہ پر رحم نہ کھائیں گے اور لاکھوں انسان بھوک سے مرجائیں گے، کوئی دوسرا آدمی ایسا موجود نہ تھا جو غریبوں کے حقوق میں انصاف کرسکے، اس لئے خود اس عہدہ کی درخواست کی، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی بضرورت کرنا پڑا، تاکہ بادشاہ مطمئن ہوکر عہدہ ان کو سپرد کردے۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے جاہ و مال کے لئے نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھالینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا، صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ اور معاویہ و حضرت حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ وغیرہم کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی پر مبنی تھے، کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائضِ خلافت کو میں اپنے مقابل سے زیادہ حکمت و قوت کے ساتھ پورا کرسکوں گا، جاہ و مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔

کیا کسی کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے

تیسرا مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر کی ملازمت قبول فرمائی، حالانکہ وہ کافر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

لیکن امام جصاصؒ نے آیت کریمہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت کی رو سے ظالموں کافروں کی اعانت کرنا جائز نہیں، اور ظاہر ہے انکی حکومت کا عہدہ قبول کرنا ان کے عمل میں شریک ہونا اور اعانت کرنا ہے، اور ایسی اعانت کو قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اس ملازمت کو نہ صرف قبول فرمایا بلکہ درخواست کرکے حاصل کیا، اس کی خاص وجہ امام تفسیر مجاہدؒ نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہِ مصر اس وقت مسلمان ہوچکا تھا، مگر چونکہ قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہِ مصر کے معاملہ

سے یہ معلوم کرچکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلافِ شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیارات دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانونِ حق پر عمل کرسکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلافِ شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگرچہ اس کا فر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم وجور کا اندیشہ قوی ہو تو بمجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہوجاتی ہے، جس میں خود کسی خلافِ شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہوجائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ و تابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کرلینا ثابت ہے (قرطبی و مظہری)

علامہ ماوردی نے سیاستِ شرعیہ سے متعلق اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی بناء پر کافر اور ظالم حکمرانوں کا عہدہ قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ خود اس کو کوئی کام خلافِ شرع نہ کرنا پڑے، اور بعض حضرات نے اس شرط کے ساتھ بھی اس کو اس لئے جائز نہیں رکھا کہ اس میں بھی اہلِ ظلم و جور کی تقویت اور تائید ہوتی ہے، یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے فعل کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات یا اُن کی شریعت کے ساتھ مخصوص تھا، اب دوسروں کے لئے جائز نہیں، مگر جمہور علماء فقہاء نے پہلے ہی قول کو اختیار فرما کر جائز قرار دیا ہے۔ (قرطبی)

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہوجائیں گے، انصاف نہ ہوسکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کرلینا جائز بلکہ ثواب ہے، بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلافِ شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

چوتھا مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ سے یہ ثابت ہوا، کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کردینا تزکیۂ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے، بشرطیکہ

اس کا ذکر کرنا کبر و غرور اور فخر و تعلّی کی وجہ سے نہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ "یعنی جس طرح ہم نے یوسف ؑ کو بادشاہِ مصر کے دربار میں عزت و منزلت عطا کی اسی طرح ہم نے ان کو پورے ملکِ مصر پر اقتدار کامل عطا کر دیا، کہ اس کی زمین میں جس طرح چاہیں احکام جاری کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و نعمت سے یوں ہی نوازا کرتے ہیں، اور ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے"۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہِ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا جس میں تمام عُمّالِ دولت اور معززینِ حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امورِ مملکت کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا (قرطبی و مظہری وغیرہ)

حضرت یوسف علیہ السلام نے امورِ سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گرویدہ ہو گیا، اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہو گئی، خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا رنج و تکلیف پیش نہیں آئی۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیشِ نظر چونکہ اس سارے جاہ و جلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوئے، کہ شاہِ مصر کو اسلام و ایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ مسلسل دعوت و کوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہِ مصر بھی مسلمان ہو گیا۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ "یعنی اور آخرت کا اجر و ثواب اس دنیا کی نعمت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے، ان لوگوں کے لئے جو مؤمن ہوئے، اور جنھوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی"۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی دولت و سلطنت اور مثالی حکومت تو عطا ہوئی ہی تھی، اس کے ساتھ آخرت کے درجاتِ عالیہ بھی ان کے لئے تیار ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ یہ درجاتِ دنیا و آخرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ صلائے عام ہے ہر اس شخص کے لئے جو ایمان اور تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کر لے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانۂ حکومت میں عوام کی راحت رسانی کے وہ کام کئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے، جب تعبیرِ خواب کے مطابق سات سال خوش حالی کے

گذر گئی اور قحط شروع ہوا تو یوسف علیہ السلام نے پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا، لوگوں نے کہا کہ ملک مصر کے سارے خزانے آپ کے قبضہ میں ہیں اور آپ بھوکے رہتے ہیں، تو فرمایا کہ میں یہ اس لئے کرتا ہوں تاکہ عام لوگوں کی بھوک کا احساس میرے دل سے غائب نہ ہو، اور شاہی باورچیوں کو بھی حکم دیدیا کہ دن میں صرف ایک مرتبہ دوپہر کو کھانا پکا کرے، تاکہ شاہی محل کے سب افراد بھی عوام کی بھوک میں کچھ حصہ لے سکیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ

مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ

نہیں پہچانتے، اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب، کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو

مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ

تمہارا ہے باپ کی طرف سے، تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ اور خوب طرح اتارتا ہوں

الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ

مہمانوں کو، پھر اگر اسکو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں میرے نزدیک

وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور میرے پاس نہ آئیو، بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے،

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

اور کہہ دیا اپنے خدمتگاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید

يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

اس کو پہچانیں جب پھر کر پہونچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں۔

خلاصۂ تفسیر

(غرض یوسف علیہ السلام نے با اختیار ہو کر غلہ کاشت کرانا اور جمع کرانا شروع کیا اور سات برس کے بعد قحط شروع ہوا، یہاں تک کہ دُور دُور سے یہ خبر سن کر کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے غلہ فروخت ہوتا ہے جوق جوق لوگ آنا شروع ہوئے) اور (کنعان میں بھی قحط ہوا، یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (بھی بجز بنیامین کے غلہ لینے مصر میں)

آئے پھر یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہونچے سو یوسف (علیہ السلام) نے (تو) اُن کو پہچان لیا اور انھوں نے یوسف (علیہ السلام) کو نہیں پہچانا (کیونکہ ان میں تغیر کم ہوا تھا، نیز یوسف علیہ السلام کو ان کے آنے کا خیال اور قوی احتمال بھی تھا، پھر نو وارد سے پوچھ بھی لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور شناسا لوگوں کو تھوڑے پتہ سے اکثر پہچان بھی لیتے ہیں بخلاف یوسف علیہ السلام کے کہ ان ہیں (چونکہ مفارقت کے وقت بہت کم عمر تھے) تغیر بھی زیادہ ہوگیا تھا اور ان کو یوسف علیہ السلام کے ہونے کا احتمال بھی نہ تھا، پھر حکام سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا کہ آپ کون ہیں؟ یوسف علیہ السلام کا معمول تھا کہ ہر شخص کے ہاتھ غلہ بقدر حاجت فروخت کرتے تھے، چنانچہ ان کو بھی جب فی آدمی ایک ایک اونٹ غلہ قیمت دے کر ملنے لگا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا ایک علاتی بھائی اور ہے، اس کو باپ نے اس وجہ سے کہ ان کا ایک بیٹا گم ہوگیا تھا اپنی تسلی کے لئے رکھ لیا ہے، اس کے حصہ کا بھی ایک اونٹ غلہ زیادہ دیدیا جائے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اگر اس کا حصہ لینا ہی تو وہ خود آکر لے جائے، غرض اُن کے حصہ کا غلہ اُن کو دلوا دیا) اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ کا) تیار کر دیا تو (چلتے وقت) فرمادیا کہ (اگر یہ غلہ خرچ کر کے اب کے آنے کا ارادہ کرو تو) اپنے علاتی بھائی کو بھی (ساتھ) لانا (تاکہ اس کا حصہ بھی دیا جاسکے) تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں (پس اگر تمہارا وہ بھائی آئے گا اس کو بھی پورا حصہ دوں گا، اور اس کی خوب خاطر داشت کروں گا جیسا تم نے اپنے ساتھ دیکھا، غرض آنے میں تو نفع ہی نفع ہے) اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اس کو میرے پاس نہ لائے تو (میں سمجھوں گا کہ تم مجھ کو دھوکہ دے کر غلہ زیادہ لینا چاہتے تھے تو اس کی سزا میں) نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلہ ہوگا، اور نہ تم میرے پاس آنا (پس اس کے نہ لانے میں یہ نقصان ہوگا کہ تمھارے حصہ کا غلہ بھی سوخت ہوجاوے گا) وہ بولے (دیکھئے) ہم (اپنی حد امکان تک تو) اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم اس کام کو (یعنی کوشش اور درخواست) ضرور کریں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے) اور (جب وہاں سے بالکل چلنے لگے تو) یوسف (علیہ السلام) نے اپنے نوکروں سے کہدیا کہ ان کی جمع پونجی (جس کے عوض انھوں نے غلہ مول لیا ہے) ان (ہی) کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو (جب وہ اسباب میں سے نکلے) پہچانیں، شاید (یہ احسان وکرم دیکھ کر) پھر دوبارہ آئیں (چونکہ یوسف علیہ السلام کو ان کا دوبارہ آنا اور ان کے بھائی کا لانا منظور تھا اس لئے کسی طرح سے اکی

تدبیر کی اوّل وعدہ کیا کہ اگر اس کو لاؤ گے تو اس کا بھی حصہ ملے گا، دوسرے وعید سنادی کہ اگر نہ لاؤ گے تو اپنا حصہ بھی نہ پاؤ گے، تیسرے دام جو کہ نقد کے علاوہ کوئی اور چیز تھی واپس کر دی، دو خیال سے ایک یہ کہ اس سے احسان وکرم پر استدلال کر کے پھر آئیں گے، دوسرا اس لئے کہ شاید ان کے پاس اور دام نہ ہوں اور اس لئے پھر نہ آسکیں، اور جب یہ دام ہوں گے انہی کو لیکر پھر آسکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ملکِ مصر کا کامل اقتدار اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو جانے کا بیان تھا، مذکورالصدر آیات میں برادرانِ یوسفؑ کا غلہ لینے کے لئے مصر آنا بیان ہوا ہے، اور یہ بھی ضمناً آگیا کہ دس بھائی مصر آئے تھے، یوسف علیہ السلام کے حقیقی چھوٹے بھائی ساتھ نہ تھے۔

درمیانی قصہ کی تفصیل قرآن نے اس لئے نہیں دی کہ پچھلے واقعات سے وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد ابن اسحٰق وغیرہ کے حوالہ سے جو تفصیل بیان کی ہے وہ اگر تاریخی اور اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابلِ قبول ہے کہ نسقِ قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو ملکِ مصر کی وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیرِ خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاہیت کے آئے، پیداوار خوب ہوئی، اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزء سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا، جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجودہ ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا، اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدر ان کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرا دیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف و اکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا، کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے، جس کی مقدار قرطبی نے ایک وَسَق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دو سو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلّہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملکِ مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارضِ کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے، یہیں حضرت ابراہیم و اسحٰق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں، یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی، ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ وہاں غلّہ قیمتاً مل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہونچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلقِ خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ، مصر سے غلّہ لے کر آؤ۔

اور چونکہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلّہ نہیں دیا جاتا، اس لئے سب ہی صاحبزادوں کو بھیجنے کی تجویز ہوئی، مگر سب سے چھوٹے بھائی بنیامین جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے، اور یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت و شفقت ان کے ساتھ زیادہ متعلق ہوگئی تھی، ان کو اپنے پاس اپنی تسلّی اور خبرگیری کے لئے روک لیا۔

دسّ بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہونچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت و تاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہو چکے تھے (قرطبی، مظہری)

ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ میں انسان کا حلیہ بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، اور ان کا یہ وہم و خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ جس بچہ کو غلام بنا کر بیچا گیا تھا، وہ کسی ملک کا وزیر یا بادشاہ ہو سکتا ہے اس لئے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا، مگر یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا۔ آیت مذکورہ میں فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُوْنَ کے یہی معنی ہیں، عربی زبان میں انکار کے اصلی معنی اجنبی سمجھنے ہی کے آتے ہیں، اس لئے مُنْكِرُوْنَ کے معنی ناواقف اور انجان کے ہوگئے۔

یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے متعلق ابن کثیرؒ نے بحوالہ سُدّی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب یہ دسّ بھائی دربار میں پہونچے تو یوسف علیہ السلام نے مزید اطمینان کے لئے ان سے ایسے سوالات کئے، جیسے مشتبہ لوگوں سے کئے جاتے ہیں، تاکہ وہ پوری حقیقت واضح

کر کے بیان کردیں، اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے، آپ یہاں کیسے پہونچے، انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے، اور ہم نے آپ کی تعریف سُنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو، تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کردیں، تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمھارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمھارے سوا ہے، تو انھوں نے بتلایا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی، اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا، تاکہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سُنکر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں، اور قاعدہ کے موافق غلّہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم کرلینے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آنا طبعی امر تھا کہ یہ پھر دوبارہ بھی آئیں، اس کے لئے ایک انتظام تو ظاہر یہ کیا کہ خود ان بھائیوں سے کہا اِئْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ، "یعنی جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی باپ شریک کو بھی لے کر آنا، تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح پورا پورا غلّہ دیتا ہوں اور کس طرح مہمانی کرتا ہوں"۔

اور پھر ایک دھمکی بھی دیدی فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ، "یعنی اگر تم اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو پھر میں تم میں سے کسی کو بھی غلہ نہ دوں گا، (کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے) اس طرح تم میرے پاس نہ آنا۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلّہ کی قیمت کے طور پر

ادا کیا تھا اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا، کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ انکو اس وقت پتہ نہ لگے تاکہ جب گھر پہنچکر سامان کھولیں اور اپنا نقد و زیور بھی انکو واپس ملے تو یہ پھر دوبارہ لینے کیلئے آسکیں۔

ابن کثیرؒ نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل میں کئی احتمال بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ یوسف علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کے پاس اس نقد و زیور وغیرہ کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر دوبارہ غلہ لینے کے لئے نہیں آسکیں گے، دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد اور بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا گوارا نہ ہو، اس لئے شاہی خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کردیا ان کی رقم ان کو واپس کر دی، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہو گا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واپس شدہ سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

بہرحال یوسف علیہ السلام نے یہ سب انتظامات اس لئے کئے کہ آئندہ بھی بھائیوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہے اور چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات بھی ہو جائے۔

مسائل و فوائد

یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے اس کا جواز معلوم ہوا کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ اگر حکومت نظم قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جائیں تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب قیمت مقرر کر سکتی ہے، حضرات فقہاءِ امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

یوسف علیہ السلام کا اپنے حالات سے والد کو اطلاع نہ دینا بامر الٰہی تھا

یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے، اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں، باپ سے فطری اور طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں، لیکن چالیس سال کے طویل زمانہ میں ایک مرتبہ بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہونچا دیں، خبر پہونچا دینا تو اس حالت میں بھی کچھ بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہونچ گئے تھے، پھر عزیز مصر کے گھر میں تو ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے، اس وقت کسی ذریعہ سے گھر تک خط یا خبر پہونچا دینا کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں اِدھر

کی اُدھر پہونچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملکِ مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اُس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہئے تھا، اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی۔

لیکن پیغمبرِ خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہو، اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلّہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کے بغیر رخصت کر دیا۔

یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصوّر نہیں ہو سکتے، اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ہمیشہ یہی جواب دل میں آیا کرتا تھا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہوگا، تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی، کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو وہی جانتے ہیں، انسان ان کا کیا احاطہ کر سکتا ہے، کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں بھی آجاتی ہے، یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جا رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتدا ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا، بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے، تو اس کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہونچتے تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا، اور پھر مدتوں کے بعد انھوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ "جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو"، جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرما دیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی ہم سے بھرتی،

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ

سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں، کہا میں کیا

اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ

اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے سو اللہ بہتر

حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ؀ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ

ہے نگہبان اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان ۔ اور جب کھولی اپنی چیز بست

وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ

پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی اُن کی طرف ، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہیے ،

هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا

یہ پونجی ہماری پھیر دی ہے ہم کو ، اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خبرداری کریں گے اپنے

وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ؀ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ

بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی وہ بھرتی آسان ہے ، کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو

مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ

تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ

يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ؀

گھیرے جاؤ تم سب ، پھر جب دیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے ۔

خلاصۂ تفسیر

غرض جب لوٹ کر اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے ابا (ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلّہ بھی ملا مگر بنیامین کا حصّہ نہیں ملا ، بلکہ بدون بنیامین کے ساتھ لے جائے ہوئے آئندہ بھی) ہمارے لئے (مطلقاً) غلّہ کی بندش کر دی گئی سو (اس صورت میں ضروری ہے کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ (دوبارہ غلّہ لانے سے جو امر مانع ہے وہ مرتفع ہو جاوے اور) ہم (پھر) غلّہ لاسکیں اور (اگر ان کے بھیجنے سے آپ کو کوئی اندیشہ ہی مانع ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ) ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے ، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں تمہارا اعتبار کرچکا ہوں (یعنی دل تو میرا گواہی دیتا نہیں مگر تم کہتے ہو کہ بدون اس کے گئے ہوئے آئندہ

غلّہ نہ ملے گا، اور عادۃً زندگی کا مدار غلہ ہی پر ہے اور جان بچانا فرض ہے) سو (خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو) اللہ (کے سپرد وہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہے (میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (میری محبت اور شفقت سے کیا ہوتا ہے) اور (اس گفتگو کے بعد) جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا تو (اس میں) ان کی جمع پونجی (بھی) ملی کہ ان ہی کو واپس کردی گئی، کہنے لگے کہ اے ابا (دیکھئے) اور ہم کو کیا چاہئے یہ ہماری جمع پونجی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی گئی (ایسا کریم بادشاہ ہے، اور اس سے زیادہ کس عنایت کا انتظار کریں، یہ عنایت بس ہے اس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ ایسے کریم بادشاہ کے پاس پھر جائیں، اور وہ موقوف ہے بھائی کے ساتھ لیجانے پر، اس لئے اجازت ہی دیدیجئے ان کو ساتھ لے جائیں گے) اور اپنے گھر والوں کیواسطے (اور) رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت رکھیں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ غلّہ اور زیادہ لائیں گے، (کیونکہ جس قدر اس وقت لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلّہ ہے (جلدی ختم ہو جائے گا، پھر اور ضرورت ہوگی، اور اسکا ملنا موقوف ہے انکے لیجانے پر) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (خیر اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں، لیکن) اسوقت تک ہرگز اسکو تمہارے ہمراہ نہ بھیجونگا جب تک کہ اللہ کی قسم کھاکر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اسکو ضرور لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے (چنانچہ سب نے اس پر قسم کھالی) سو جب وہ قسم کھاکر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے (یعنی وہی ہمارے قول و اقرار کا گواہ ہے، کہ سُن رہا ہے اور وہی اس قول کو پورا کرسکتا ہے، پس اس کہنے سے دو غرض ہوئیں، اوّل انکو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنے سے یہ بات ہوتی ہے، اور دوسرے اس تدبیر کا منتہیٰ تقدیر کو قرار دینا کہ توکل کا حاصل ہے، اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دیدی، غرض دوبارہ مصر کے سفر کو مع بنیامین سب تیار ہوگئے) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں واقعہ کا بقیہ حصّہ اس طرح مذکور ہے کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام مصر سے غلّہ لے کر گھر واپس آئے تو مصر کے معاملہ کا تذکرہ والد ماجد سے کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ عزیز مصر نے آئندہ کے لئے ہمیں غلّہ دینے کے لئے یہ شرط کردی ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لاؤ گے تو ملے گا ورنہ نہیں، اس لئے آپ آئندہ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہمیں آئندہ بھی غلّہ مل سکے، اور ہم اس بھائی کی تو پوری حفاظت کرنے والے ہیں، ان کو کسی قِسم کی تکلیف نہ ہوگی۔

والد ماجد نے فرمایا کہ کیا ان کے بارے میں تم پر ایسا ہی اطمینان کروں جیسا اس سے پہلے ان کے بھائی یوسف کے بارہ میں کیا تھا، مطلب ظاہر ہے کہ اب تمھاری بات کا اعتبار کیا ہے، ایک مرتبہ تم پر اطمینان کر کے مصیبت اٹھا چکا ہوں تم نے یہی الفاظ حفاظت کرنے کے اس وقت بھی بولے تھے۔

یہ تو ان کی بات کا جواب تھا، مگر پھر خاندان کی ضرورت کے پیشِ نظر پیغمبرانہ توکل اور اس حقیقت کو اصل قرار دیا کہ کوئی نفع نقصان کسی بندہ کے ہاتھ میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت وارادہ نہ ہو، اور جب ان کا ارادہ ہو جائے تو پھر اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس لئے مخلوق پر بھروسہ بھی غلط ہے، اور ان کی شکایات پر معاملہ کا مدار رکھنا بھی نامناسب ہے۔

اس لئے فرمایا فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا، یعنی تمھاری حفاظت کا نتیجہ تو پہلے دیکھ چکا ہوں، اب تو میں اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کرتا ہوں وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ، اور وہ سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے، اسی سے امید ہے کہ وہ میری ضعیفی اور موجودہ غم واندوہ پر نظر فرما کر مجھ پر دوہرے صدمے نہ ڈالے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ظاہری حالات اور اپنی اولاد کے عہد و پیمان پر بھروسہ نہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۔

یعنی اب تک تو برادرانِ یوسف علیہ السلام کی یہ ابتدائی گفتگو حالاتِ سفر بیان کرنے کے دوران میں ہو رہی تھی، ابھی سامان کھولا نہ تھا، اس کے بعد جب سامان کھولا اور دیکھا کہ ان کی وہ پونجی جو غلّہ کی قیمت میں ادا کر کے آئے تھے وہ بھی سامان کے اندر موجود ہے تو اس وقت انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام سہواً نہیں ہوا بلکہ قصداً ہماری پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اسی لئے رُدَّتْ اِلَيْنَا کہا، یعنی یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اور پھر والد محترم سے عرض کیا مَا نَبْغِيْ یعنی ہمیں اور کیا چاہئے کہ غلّہ بھی آ گیا اور اس کی قیمت بھی واپس مل گئی، اب تو ہمیں ضرور دوبارہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اطمینان سے جانا چاہئے، کیونکہ اس معاملہ سے معلوم ہوا کہ عزیز مصر ہم پر بہت مہربان ہے، اس لئے کوئی اندیشہ نہیں، ہم اپنے خاندان کے لئے غلّہ لائیں اور بھائی کو بھی حفاظت سے رکھیں، اور بھائی کے حصّہ کا غلّہ مزید مل جائے، کیونکہ ہم جو کچھ لائے ہیں یہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے، چند روز میں ختم ہو جائے گا۔

برادرانِ یوسفؑ نے جو یہ جملہ مَا نَبْغِيْ کہا اُس کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ابھی بتلایا گیا کہ ہمیں اور اس سے زیادہ کیا چاہیے، اور اس جملہ میں حرف مَا کو نفی کے معنی میں لیا جائے تو یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اولادِ یعقوب علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ اب تو ہمارے پاس غلہ لانے کے لئے قیمت موجود ہے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے، آپ صرف بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجدیں۔

والد محترم نے یہ سب باتیں سنکر جواب دیا، لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖ، "یعنی میں بنیامین کو تمھارے ساتھ اُس وقت تک نہ بھیجونگا جب تک تم اللہ تعالیٰ کی قسم اور یہ عہد و پیمان مجھے نہ دیدو کہ تم اس کو ضرور اپنے ساتھ واپس لاؤگے"۔ مگر چونکہ حقیقت بیں نظروں سے یہ بات کسی وقت غائب نہیں ہوتی کہ انسان بیچارہ ظاہری قوت و قدرت کتنی ہی رکھتا ہو پھر بھی ہر چیز میں مجبور اور قدرتِ حق جل شانہٗ کے سامنے عاجز ہے وہ کسی شخص کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کا عہد و پیمان ہی کیا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اس پر مکمل قدرت نہیں رکھتا، اس لئے اس عہد و پیمان کے ساتھ ایک استثنا بھی لگا دیا: اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ، یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گھیرے میں آجاؤ، امام تفسیر مجاہدؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ، اور قتادہؒ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہو کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ۔

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ، یعنی جب صاحبزادوں نے مطلوبہ طریقہ پر عہد و پیمان کر لیا، یعنی سب نے قسمیں کھائیں اور والد کو اطمینان دلانے کیلئے بڑی شدت سے حلف کئے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کی حفاظت کے لئے حلف دینے اور حلف اٹھانے کا جو کام ہم کر رہے ہیں اس سب معاملہ کا بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، اسی کی توفیق سے کوئی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے، ورنہ انسان بے بس ہے، اس کے ذاتی قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں۔

ہدایات و مسائل

مذکورہ آیات میں انسان کے لئے بہت سی ہدایات اور احکام ہیں، ان کو یاد رکھئے:

اولاد سے گناہ و خطا ہو جائے تو قطع تعلق کے بجائے انکی اصلاح کی فکر کرنا چاہئے

پہلی ہدایت:۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرہ اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اوّل، جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھیجدیں، دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی، تیسرے چھوٹے معصوم بھائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف

والد کی انتہائی دل آزاری کی پروا نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انھوں نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضیٰ بظاہر یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ انھیں کو مصر سے غلّہ لانے کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کو چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض کرنے کا موقع ملا اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی اُن کے حوالہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ وخطا سرزد ہو جائے تو باپ کو چاہیئے کہ تربیت کر کے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور جب تک اصلاح کی امید ہو قطع تعلق نہ کرے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور گناہوں سے تائب ہوئے، ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کر لینا انسب ہے۔

دُوسری ہدایت :۔ اُس حُسنِ معاملہ اور حُسنِ خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے اتنے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرأت کر سکے۔

تیسری ہدایت یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطا کار کو جتلا دینا بھی مناسب ہے کہ تمھارے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمھاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگذر کرتے ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہو کر اس سے کلی طور پر تائب ہو جائے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اوّل جتلایا، کہ کیا بنیامین کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کر لوں جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا، مگر جتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کر کے اللہ پر توکل کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کر دیا۔

چوتھی ہدایت یہ ہے کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے، وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے، اسی لئے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فَاللّٰہُ خَیۡرٌ حٰفِظًا۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے

کہنے پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قسم ہے میری عزت و جلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

پانچواں مسئلہ اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں نکلے اور قرائن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کے لئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے، تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جیسے یہ پونجی جو برادرانِ یوسفؑ کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرائنِ قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رقم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں مالک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہئے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح سالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرامؓ سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگا دی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

ساتواں مسئلہ اس میں یہ ہے کہ برادرانِ یوسف سے عہد و پیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالۃ بالنفس جائز ہے، یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے۔

اس مسئلہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے، وہ صرف مالی ضمانت کو جائز رکھتے ہیں، نفسِ انسانی کی ضمانت کو جائز نہیں رکھتے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ

اور کہا اے بیٹو! نہ داخل ہونا ایک دروازے سے اور داخل ہونا کئی دروازوں

اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ

سے جدا جدا، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے،

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ چاہئے بھروسہ
الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم
کرنے والوں کو ، اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے
مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ
کچھ نہیں بچا سکتا تھا اُن کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے
يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ
جی میں سو پوری کر چکا ، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے سکھایا اس کو لیکن بہت لوگوں کو
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ
خبر نہیں ، اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس
إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا
رکھا اپنے بھائی کو ، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے
يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾
جو انھوں نے کئے ہیں۔

ع ۸ / ۲

خلاصہ تفسیر

اور (چلتے وقت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو! (جب مصر میں پہنچو تو) سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا اور (یہ محض ایک تدبیر ظاہری ہے بعض مکروہات مثل نظرِ بد وغیرہ سے بچنے کی، باقی) خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا (چلتا) ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے، (یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا تدبیر پر نظر مت کرنا، غرض سب رخصت ہو کر چلے) اور جب (مصر پہنچ کر) جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا (اسی طرح شہر کے) اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا (باقی) ان کے باپ کو ان سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا (تاکہ اُن پر کسی قسم کا اعتراض یا اس تدبیر کے نافع نہ ہونے سے اُن پر شبہ لازم آئے چنانچہ خود انھوں نے ہی فرما دیا تھا مَا أُغْنِي عَنْكُم الخ) لیکن یعقوب (علیہ السلام) کے جی میں

(درجۂ تدبیر میں) ایک ارمان (آیا) تھا جسکو انھوں نے ظاہر کردیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے انکو علم دیا تھا (وہ علم کے خلاف تدبیر کو اعتقاداً مؤثر حقیقی کب سمجھ سکتے تھے، صرف ان کے اس قول کی وجہ وہی عملاً ایک تدبیر کا ارتکاب تھا جو کہ مشروع و محمود ہے) لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے (بلکہ جہل سے تدبیر کو مؤثر حقیقی اعتقاد کرلیتے ہیں) اور جب یہ لوگ (یعنی برادرانِ یوسف) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے (اور بنیامین کو پیش کرکے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے موافق ان کو لائے ہیں) انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں ان سے) کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا رنج مت کرنا (کیونکہ اب تو اللہ نے ہم کو ملا دیا اب سب غم بھلا دینا چاہیے، یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی تو ظاہر اور مشہور ہے، رہا بنیامین کے ساتھ، سو یا تو ان کو بھی کچھ تکلیف دی ہو، ورنہ یوسف علیہ السلام کی جدائی کیا ان کے حق میں کچھ کم تکلیف تھی، پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ بنیامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہیں کیونکہ ویسے رہنے میں تو اور بھائیوں کا بوجہ عہد و سوگند کے اصرار ہوگا ناحق جھگڑا ہوگا، اور پھر اگر وجہ بھی ظاہر ہوگئی تو راز کھلا، اور اگر مخفی رہی تو یعقوب علیہ السلام کا رنج بڑھے گا، کہ بلاسبب کیوں رکھے گئے، یا کیوں رہے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تدبیر تو ہے مگر ذرا تمھاری بدنامی ہے، بنیامین نے کہا کچھ پرواہ نہیں، غرض ان میں یہ امر قرار پاگیا، اور ادھر سب کو غلہ دے کر ان کی رخصت کا سامان درست کیا گیا)۔

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں برادرانِ یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جارہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے سب داخل نہ ہونا، بلکہ شہر پناہ کے پاس پہونچ کر متفرق ہوجانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند قد آور صاحب جمال و صاحب وجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے جس سے ان کو کوئی تکلیف پہونچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوتے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا جس سے عام ارکانِ دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہوگیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہوگیا کہ کسی کی نظر لگ جائے، یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہو جانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے، محض جاہلانہ وہم وخیال نہیں، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصدیق فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نظرِ بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، اور اُمت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کل عین لامّۃ بھی مذکور ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظرِ بد سے (قرطبی)

صحابۂ کرام میں سہل بن حنیف کا واقعہ معروف ہے، کہ انھوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کے لئے کپڑے اُتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حنیف کو سخت بخار چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں، یہ پانی سہل بن حنیف کے بدن پر ڈالا جائے، ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے اس پر روانہ ہوگئے، اس واقعہ میں آپ نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علامَ یقتل احدکم اخاہ الّا برکت انّ العین حقٌّ،	"کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے، تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب

ان کا بدن تمہیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعاء کر لیتے، نظر کا اثر ہو جانا حق ہے"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان ومال میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہئے کہ اس کے واسطے یہ دعاء کرے کہ

اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماویں، بعض روایات میں ہے کہ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہے، اس سے نظرِ بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسالہ اس کے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظرِ بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہونچ جانا حق ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں، دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بناء پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات داوہام کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان و مال میں ایک قسم کا مسمریزم ہے، اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مُضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کر دیتی ہے، گرمی، سردی کی شدّت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح نظرِ بد یا مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوّت سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہٗ کی قدرت کاملہ اور مشیت وارادہ کے تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہو سکتی ہے، نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ؁ یعنی نظرِ بد سے بچنے کی جو تدبیر میں نے بتلائی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کو نہیں ٹال سکتی، حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے، البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے، اس لئے یہ وصیت کی گئی، مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے، ظاہری اور مادّی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہو گئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا، ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام

ہو گئی، اگرچہ نظرِ بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقدیرِ الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا، اور بڑی عافیت و عزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

اسی مضمون کا بیان اس کے بعد کی آیت میں اس طرح آیا کہ صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی، شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے، تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا، ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی، مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت و محبت کا تقاضا تھا جو انھوں نے پورا کر لیا۔

اس آیت کے آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، یعنی یعقوب علیہ السلام بڑے علم والے تھے، کیونکہ ان کو ہم نے علم دیا تھا، مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح ان کا علم کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ بلاواسطہ عطاءِ خداوندی اور وہبی علم تھا، اسی لئے انھوں نے ظاہری تدبیر جو شرعاً مشروع اور محمود ہے وہ تو کر لی، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا، مگر بہت سے لوگ اس بات کی حقیقت کو نہیں جانتے اور ناواقفیت سے یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ایسے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کہ یہ تدبیریں پیغمبر کی شان کے شایاں نہ تھیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ پہلے لفظ علم سے مراد علم کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو علم ان کو عطا کیا وہ اس پر عامل اور اس کے پابند تھے، اسی لئے ظاہری تدبیروں پر بھروسہ نہیں فرمایا، بلکہ اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر فرمایا۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی جب شہر مصر پہونچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا، امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لئے فرمایا، جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام

نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اب تم کوئی فکر نہ کرو، اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

احکام و مسائل

مذکورہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے:

اول یہ کہ نظرِ بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شانِ انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کر دے، اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظرِ بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر بارَکَ اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے، تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

چھٹے یہ کہ نظرِ بد سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعاء اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتویں یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے، دانائے رومؒ نے فرمایا ؎ "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"

یہی پیغمبرانہ توکل اور سنتِ رسولؐ ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو تو بلانے کے لئے بھی کوشش اور تاکید کی، اور پھر جب وہ آگئے تو ان پر اپنا راز بھی

ظاہر کر دیا، مگر والدِ محترم کے نہ بلانے کی فکر فرمائی اور نہ اُن کو اپنی خیریت سے مطلع کرنے کا کوئی اقدام کیا، اس کی وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے کہ اس پورے چالیس سال کے عرصہ میں بہت سے مواقع تھے کہ والد ماجد کو اپنے حال اور خیریت کی اطلاع دیدیتے، لیکن یہ جو کچھ ہوا وہ بحکم قضاء و قدر باشاراتِ وحی ہوا، ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ ملی ہوگی، کہ والدِ محترم کو حالات سے باخبر کیا جائے، کیونکہ ابھی ان کا ایک اور امتحان بنیامین کی مفارقت کے ذریعہ بھی ہونے والا تھا، اس کی تکمیل ہی کے لئے یہ سب صورتیں پیدا کی گئیں۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے

ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَ

پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو، کہنے لگے مُنہ

أَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہو گئی، بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ

وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوا تَاللَّهِ

اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾

تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے،

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾ قَالُوا جَزَاؤُهُ

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے، کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے

مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي

کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں

الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ

ظالموں کو، پھر شروع کیں یوسفؑ نے انکی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے آخر کو وہ

اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ

برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے، یوں داؤ بتایا ہم نے یوسفؑ کو،

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ

وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے، مگر جو چاہے اللہ،

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾

ہم درجے بلند کرتے ہیں جسکے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا۔

خلاصۂ تفسیر

پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ اور روانگی کا) تیار کر دیا تو (خود یا کسی معتمد کی معرفت) پانی پینے کا برتن (کہ وہی پیمانہ غلہ دینے کا بھی تھا) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر (جب یہ لاد پھاند کر چلے تو یوسف علیہ السلام کے حکم سے پیچھے سے) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے (جس کی چوری کا ہم پر شبہ ہوا) انھوں نے کہا کہ ہمکو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہے) اور جو شخص اس کو (لاکر) حاضر کرے اس کو ایک بار شتر غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا (اور یا یہ مطلب ہو کہ اگر خود چور بھی مال دیدے تو عفو کے بعد انعام پائے گا) اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں (غالباً یہ ندا اور یہ وعدۂ انعام بحکم یوسف علیہ السلام ہوگا) یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے (جس میں چوری بھی داخل ہے) نہیں آئے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں (یعنی ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے) ان (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے نکلے (اور تم میں سے کسی پر سرقہ ثابت ہو گیا) تو اس (چور) کی کیا سزا ہے انھوں نے (موافق شریعت یعقوب علیہ السلام کے) جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی اپنی سزا ہے (یعنی چوری کی عوض میں خود اس کی ذات کو صاحب مال اپنا غلام بنالے) ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی سزا دیا کرتے ہیں، (یعنی ہماری شریعت میں یہی مسئلہ اور عمل ہے، غرض یہ امور باہم ٹھہرنے کے بعد اسباب اتروایا گیا) پھر (تلاشی کے وقت) یوسف (علیہ السلام) نے (خود یا کسی معتمد کی معرفت) اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتداء اول دوسرے بھائیوں کے (اسباب کے) تھیلوں سے کی پھر (اخیر میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے برآمد کیا، ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح (بنیامین کے رکھنے کی) تدبیر فرمائی (وجہ اس تدبیر کی یہ ہوئی کہ) یوسف اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر

کے قانون کی رُو سے نہیں لے سکتے تھے (کیونکہ اس کے قانون میں کچھ تادیب وجرمانہ تھا (روی الطبرانی عن معمر والاول فی روح المعانی) مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور تھا (اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ تدبیر آئی، اور ان لوگوں کے مُنہ سے یہ فتویٰ نکلا، اور اس مجموعہ سے تدبیر راست آگئی اور چونکہ یہ حقیقۃً غلام بنانا نہ تھا بلکہ بنیامین کی خوشی سے صورت غلامی کی اختیار کی تھی، اس لئے استرقاقِ حُر کا شبہ لازم نہیں آیا، اور گو یوسف علیہ السلام بڑے عالم وعاقل تھے، مگر پھر بھی ہماری تدبیر سکھانے کے محتاج تھے، بلکہ) ہم جس کو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں، اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے، (یعنی اللہ تعالیٰ جب مخلوق کا علم ناقص ٹھہرا اور علمِ خالق کامل تو لامحالہ ہر مخلوق اپنے علم میں اور تدبیر میں محتاج ہوگی خالق کی، اس لئے کِدْنَا اور اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ کہا گیا، حاصل یہ کہ جب اُن کے اسباب سے وہ برتن برآمد ہوگیا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعدہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔

بنیامین کے لئے جو غلہ اونٹ پر لادا گیا اس میں ایک برتن چھپا دیا گیا، اس برتن کو قرآن کریم نے ایک جگہ بلفظ سِقَایَہ اور دوسری جگہ صُوَاعَ الْمَلِکِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، سقایہ کے معنی پانی پینے کا برتن اور صُوَاع بھی اسی طرح کے برتن کو کہتے ہیں، اس کو ملک کی طرف منسوب کرنے سے اتنی بات اور معلوم ہوئی کہ یہ برتن کوئی خاص قیمت اور حیثیت رکھتا تھا، بعض روایات میں ہے کہ زبرجد کا بنا ہوا تھا، بعض نے سونے کا بعض نے چاندی کا بتلایا ہے، بہرحال یہ برتن جو بنیامین کے سامان میں چھپا دیا گیا تھا خاصہ قیمتی برتن ہونے کے علاوہ ملک مصر سے کوئی اختصاص بھی رکھتا تھا، خواہ یہ کہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے یا یہ کہ ملک نے بامرِ خود اس برتن کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ، یعنی کچھ دیر کے بعد ایک منادی کرنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو"

یہاں لفظ ثُمَّ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منادی فوراً ہی نہیں کی گئی، بلکہ کچھ مہلت دی گئی یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہوگیا، اس کے بعد یہ منادی کی گئی تاکہ کسی کو جلسازی کا شبہ نہ ہو جائے

بہرحال اس منادی کرنے والے نے برادرانِ یوسفؑ کے قافلہ کو چور قرار دیدیا۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ، یعنی برادرانِ یوسف منادی کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم ہمیں چور بنا رہے ہو، یہ تو کہو کہ تمھاری کیا چیز گم ہوگئی ہے ؟

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ، "منادی کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا صُوَاع یعنی برتن گم ہوگیا ہے اور جو شخص اس کو کہیں سے برآمد کرے گا اس کو ایک اونٹ بھر غلّہ انعام میں ملے گا، اور میں اس کا ذمہ دار ہوں"

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا، جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد پر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟

دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ جعلسازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی، اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو، یہ سب کام ناجائز ہیں، اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہوگئے، تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے، مجھے اپنے پاس رکھئے، یوسف علیہ السلام نے اول یہی عذر کیا، کہ اگر تم یہاں رُک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا، دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں، اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں، بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہوگئے۔

لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہوجانے سے تو جائز نہیں ہوسکتا، اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم و اجازت سے نہ ہوگا، ایک بے دلیل دعویٰ اور صورت واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے، اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا اس لئے ان کو چور کہا گیا، یہ بھی ایک تاویل ہی، اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے، کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا،

نہ یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا، بلکہ یہ سب کام بامر الٰہی اسی کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے، جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل ہو رہی تھی، اس جواب کی طرف خود قرآن کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر کی یوسف کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی۔

اس آیت میں واضح طور پر اس حیلہ و تدبیر کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، کہ یہ سب کام جب کہ بامر خداوندی ہوئے تو ان کو ناجائز کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے، ان کی مثال ایسی ہی ہو گی جیسے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا، لڑکے کو قتل کرنا وغیرہ، جو بظاہر گناہ تھے، اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نکیر کیا، مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام باذنِ خداوندی خاص مصالح کے تحت کر رہے تھے، اس لئے ان کا کوئی گناہ نہ تھا، قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ، یعنی جب شاہی منادی نے برادرانِ یوسف پر چوری کا الزام لگایا تو انھوں نے کہا کہ ارکانِ دولت بھی خود ہمارے حالات سے واقف ہیں کہ ہم کوئی فساد کرنے یہاں نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں"

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ، یعنی شاہی ملازمین نے کہا کہ اگر تمہارا جھوٹ ثابت ہو جائے تو بتلاؤ کہ چور کی کیا سزا ہے" قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ، "یعنی برادرانِ یوسف نے کہا کہ جس شخص کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو وہ شخص خود ہی اس کی جزا ہی، ہم چوروں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ شریعتِ یعقوب علیہ السلام میں چور کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کا مال چرایا ہے وہ شخص اس چور کو اپنا غلام بنا کر رکھے، سرکاری ملازمین نے اس طرح خود برادرانِ یوسف سے چور کی سزا شریعتِ یعقوبی کے مطابق معلوم کر کے ان کو اس کا پابند کر دیا کہ بنیامین کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو تو وہ اپنے ہی فیصلہ کے مطابق بنیامین کو یوسف علیہ السلام کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ، "یعنی سرکاری تفتیش کرنے والوں نے اصل سازش پر پردہ ڈالنے کے لئے پہلے سب بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی، پہلے ہی بنیامین کا سامان نہیں کھولا تاکہ ان کو شبہ نہ ہو جائے"

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ، "یعنی آخر میں بنیامین کا سامان کھولا گیا تو اس میں سے صواع الملک کو برآمد کر لیا"، اس وقت تو سب بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں، اور بنیامین کو سخت سست کہنے لگے کہ تو نے ہمارا منہ کالا کر دیا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ ۔ یعنی اسی طرح ہم نے تدبیر کی یوسف کے لئے، وہ اپنے بھائی کو شاہِ مصر کے قانون کے ماتحت گرفتار نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مصر کا قانون چور کے متعلق یہ تھا کہ چور کو مار پیٹ کی سزا دیکر اور مالِ مسروقہ سے دوگنی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیا جائے، مگر انھوں نے یہاں برادرانِ یوسف ہی سے چور کا حکم شریعتِ یعقوبی کے مطابق دریافت کر لیا تھا، اس کی رُو سے بنیامین کو اپنے پاس روک لینا صحیح ہو گیا، اس طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے یوسف علیہ السلام کی یہ مراد بھی پوری ہوگئی۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۔ یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں کے مقابلہ میں بلند کر دیئے گئے، اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے،

مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے، بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا ہی کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا تو پھر رب العزت جل شانہٗ کا علم تو سب سے بالاتر ہے ہی۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے چند احکام و مسائل حاصل ہوئے:

اوّل: آیت وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيرٍ سے ثابت ہوا کہ کسی معین کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر انعام یا اجرت ملے گی، جیسے اشتہاری مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورتِ معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق نہیں آتی، مگر اس آیت کی رُو سے اس کا بھی جواز ثابت ہوگیا (قرطبی)

دوسرے أَنَا بِهٖ زَعِيمٌ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے، اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ صاحبِ حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی چاہے وصول کر سکتا ہے، ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہوگا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا ہے وہ اصل مدیون سے وصول کرے (قرطبی خلافاً لمالک)

تیسرے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بنا پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصطلاح میں حیلۂ شرعیہ کہا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے، شرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم

نہ آتا ہو، ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے یہ باتفاق حرام ہے، ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الٰہی آیا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے، اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہوجاتا بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے، ایک تو اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چالبازی کا مرادف ہے، اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں ثابت کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے تب آہستہ سے کہا یوسف

فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ

نے اپنے جی میں اور ان کو نہ جتایا، کہا جی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں، اور اللہ

اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا

خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو، کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بہت بوڑھا

كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

بڑی عمر کا، سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ، ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا،

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ لا

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ ع فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ ط

تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے، پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو،

قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا

بولا ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمھارے باپ نے لیا ہے تم سے عہد

مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ

اللہ کا اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا

الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ

اس ملک سے جب تک کہ حکم دے مجھ کو میرا باپ یا قضیہ چکا دے اللہ میری طرف اور وہ ہے سب سے بہتر

ع ۹ / ۳

الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ

چکانے والا، پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو

سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

چوری کی، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا

وَسْــَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ

اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں،

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

کہنے لگے کہ (صاحب) اگر اس نے چوری کی تو (تعجب نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی (تھا وہ) بھی (اسی طرح) اس کے پہلے چوری کر چکا ہے (جس کا قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ان کی پھوپھی پرورش کرتی تھیں، جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے لینا چاہا، وہ ان کو چاہتی بہت تھیں، انھوں نے ان کو رکھنا چاہا، اس لئے انھوں نے ان کی کمر میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کردیا کہ پٹکا گم ہوگیا، اور سب کی تلاشی لی تو ان کی کمر میں نکلا، اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو پھوپھی کے قبضہ میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ ان کی پھوپھی نے وفات پائی، پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آگئے، اھ، اور ممکن ہو یہ صورت استرقاق کی بھی یوسف کی رضامندی سے ہوئی ہو، اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بنانا لازم نہیں آیا اور ہر چند کہ قرائن واخلاق یوسفیہ میں ذرا تامل کرنے سے آپ کی برأت اس فعل سے یقیناً معلوم تھی مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی) پس یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے) ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ بُرے ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقتِ سرقہ صادر نہیں ہوا، اور تم نے تو اتنا بڑا کام کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تم نے آدمی غائب کردیا، کہ مجھ کو باپ سے بچھڑا دیا، اور ظاہر ہے کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت جرم ہے) اور جو کچھ تم (ہم دونوں بھائیوں

کے متعلق) بیان کر رہے ہو (کہ ہم چور ہیں) اس (کی حقیقت) کا اللہ ہی کو خوب علم ہے (کہ ہم چور نہیں ہیں، جب بھائیوں نے دیکھا کہ انھوں نے بنیامین کو ماخوذ کرلیا اور اس پر قابض ہوگئے، تو براہِ خوشامد) کہنے لگے اے عزیز اس (بنیامین) کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے (اور اس کو بہت چاہتا ہے، اس کے غم میں خدا جانے کیا حال ہو، اور ہم سے اس قدر محبت نہیں) سو آپ (ایسا کیجئے کہ) اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے، (اور اپنا مملوک بنا لیجئے) ہم آپ کو نیک ذات دیکھتے ہیں (امید ہے کہ اس درخواست کو منظور فرمالیں گے) یوسف (علیہ السلام) نے کہا ایسی (بے انصافی کی) بات سے خدا بچائے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا دوسری شخص کو پکڑ کر رکھ لیں (اگر ہم ایسا کریں تو) اس حالت میں تو ہم بڑے بے انصاف سمجھے جائیں گے (کسی آزاد آدمی کو غلام بنا لینا اور غلاموں کا معاملہ کرنا اس کی رضامندی سے بھی حرام ہے) پھر جب ان کو یوسف (علیہ السلام) سے تو (ان کے صاف جواب کے سبب) بالکل امید نہ رہی (کہ بنیامین کو دیں گے) تو (اس جگہ سے) علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے (کہ کیا کرنا چاہئے، پھر زیادہ کی یہ رائے ہوئی کہ مجبوری ہے سب کو واپس چلنا چاہئے، مگر) ان سب میں جو بڑا تھا اس نے کہا کہ (تم جو سب کے سب واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو) کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ تم سے خدا کی قسم کھلا کر پکا قول لے چکے ہیں (کہ تم اس کو اپنے ہمراہ لانا، لیکن اگر گھر جاؤ تو مجبوری ہے، سو ہم سب کے سب تو گھری نہیں کہ تدبیر کی گنجائش نہ رہتی، اس لئے حتی الامکان کچھ تدبیر کرنا چاہئے) اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں کس قدر کوتاہی کر چکے ہو (کہ ان کیساتھ جو کچھ برتاؤ ہوا اس سے باپ کے حقوق بالکل ضائع ہوئے سو وہ پرانی ہی شرمندگی کیا کم ہے جو ایک نئی شرمندگی لیکر جائیں) سو میں تو اس سرزمین سے ٹلتا نہیں، تاوقتیکہ میرے باپ مجھ کو (حاضری کی) اجازت نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ اس مشکل کو سلجھا دے اور وہی خوب سلجھانے والا ہے (یعنی کسی تدبیر سے بنیامین چھوٹ جائے، غرض میں یا اس کو لے کر جاؤں گا یا بلایا ہوا جاؤں گا، سو مجھ کو تو یہاں چھوڑ دو اور) تم واپس اپنے باپ کے پاس جاؤ اور (جا کر ان سے) کہو کہ اے ابا آپ کے صاحبزادے (بنیامین) نے چوری کی (اس لئے گرفتار ہوئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہمکو (مشاہدہ سے) معلوم ہوا ہے اور ہم (قول و قرار دینے کے وقت) غیب کی باتوں کے تو حافظ تھے نہیں (کہ یہ چوری کرے گا، ورنہ ہم کبھی قول نہ دیتے) اور (اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو) اس بستی (یعنی مصر) والوں سے (کسی اپنے معتمد کی معرفت) پوچھ لیجئے جہاں ہم (اس وقت) موجود تھے، (جب چوری برآمد ہوئی ہے) اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر (یہاں) آئے ہیں (معلوم ہوتا ہے اور بھی کنعان کے یا آس پاس کے لوگ غلہ لینے گئے ہوں گے) اور یقین جانئے ہم بالکل سچ کہتے ہیں (چنانچہ سب بڑے کو وہاں چھوڑا اور خود آکر سارا ماجرا بیان کیا) ۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر اور پھر ان کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے اُن پر چوری کا جرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مالِ مسروقہ برآمد ہو گیا اور شرم سے اُن کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے:

اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ، یعنی اگر اس نے چوری کر لی تو کچھ زیادہ تعجب نہیں، اس کا ایک بھائی تھا اُس نے بھی اسی طرح اس سے پہلے چوری کی تھی، مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں، علاتی ہے، اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت خود یوسف علیہ السلام پر بھی چوری کا الزام لگا دیا، جس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بچپن میں پیش آیا تھا، جس میں ٹھیک اسی طرح جیسے یہاں بنیامین پر چوری کا الزام لگانے کی سازش کی گئی ہے، اس وقت یوسف علیہ السلام پر ان کی بے خبری میں ایسی ہی سازش کی گئی تھی، اور یہ سب بھائیوں کو پوری طرح معلوم تھا کہ یوسف علیہ السلام اس الزام سے بالکل بری ہیں، مگر اس وقت بنیامین پر غصہ کی وجہ سے اُس واقعہ کو بھی چوری کا قرار دے کر اس کا الزام ان کے بھائی یوسفؑ پر لگا دیا ہے۔

وہ واقعہ کیا تھا اس میں روایات مختلف ہیں، ابن کثیرؒ نے بحوالہ محمد بن اسحاق مجاہدؒ امام تفسیر سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنیامین پیدا ہوئے تو یہ ولادت ہی والدہ کی موت کا سبب بن گئی، یوسفؑ اور بنیامین دونوں بھائی بغیر ماں کے رہ گئے، تو ان کی تربیت و حضانت ان کی پھوپھی کی گود میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بچپن سے ہی کچھ ایسی شان عطا فرمائی تھی کہ جو دیکھتا ان سے بے حد محبت کرنے لگتا تھا، پھوپی کا بھی یہی حال تھا کہ کسی وقت اُن کو نظروں سے غائب کرنے پر قادر نہ تھیں، دوسری طرف والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، مگر بہت چھوٹا ہونے کی بنا پر ضرورت اس کی تھی کہ کسی عورت کی نگرانی میں رکھا جائے، اس لئے پھوپی کے حوالے کر دیا تھا، اب جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کا ارادہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھیں، پھوپی سے کہا تو انھوں نے عذر کیا، پھر زیادہ اصرار پر مجبور ہو کر یوسف علیہ السلام کو ان کے

والد کے حوالے تو کر دیا مگر ایک تدبیر ان کو واپس لینے کی یہ کر دی کہ پھوپی کے پاس ایک پٹکا تھا، جو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف سے ان کو پہنچا تھا اور اس کی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی، یہ پٹکا پھوپی نے یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے کمر پر باندھ دیا۔

یوسف علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ شہرت دی کہ میرا پٹکا چوری ہو گیا، پھر تلاشی لی گئی تو وہ یوسفؑ کے پاس نکلا، شریعتِ یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق اب پھوپی کو یہ حق ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا مملوک بنا کر رکھیں، یعقوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے پھوپی یوسفؑ کی مالک بن گئی، تو ان کے حوالے کر دیا، اور جب تک پھوپی زندہ رہیں یوسف علیہ السلام انہی کی تربیت میں رہے۔

یہ واقعہ تھا جس میں چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگا، اور پھر ہر شخص پر حقیقتِ حال روشن ہو گئی، کہ یوسف علیہ السلام چوری کے ادنیٰ شبہ سے بھی بری ہیں، پھوپھی کی محبت نے ان سے یہ سازش کا جال پھیلوایا تھا، بھائیوں کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی، اس کی بنا پر کسی طرح زیبا نہ تھا کہ ان کی طرف چوری کو منسوب کرتے، مگر ان کے حق میں بھائیوں کی جو زیادتی اور بے راہ روی اب تک ہوتی چلی آئی تھی یہ بھی اسی کا ایک آخری جز تھا۔

فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ "یعنی یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی یہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی، کہ یہ لوگ اب تک بھی میرے درپے ہیں کہ چوری کا الزام لگا رہے ہیں، مگر اس کا اظہار بھائیوں پر نہیں ہونے دیا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی ہے اور اس سے کچھ اثر لیا ہے۔

قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ، "یوسف علیہ السلام نے (اپنے دل میں) کہا کہ تم لوگ ہی بُرے درجہ اور بُرے حال میں ہو کہ بھائی پر چوری کی تہمت جان بوجھ کر لگاتے ہو، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والے ہیں، کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط"، پہلا جملہ تو دل میں کہا گیا ہے، یہ دوسرا جملہ ممکن ہے کہ بھائیوں کے جواب میں اعلاناً کہہ دیا ہو۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ، برادرانِ یوسف نے جب دیکھا کہ کوئی بات چلتی نہیں اور بنیامین کو یہاں چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تو عزیز مصر کی خوشامد شروع کی، اور یہ درخواست کی کہ اس کے والد بہت بوڑھے ہیں اور ضعیف ہیں (اس کی مفارقت ان سے برداشت نہ ہو گی) اس لئے آپ اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو گرفتار کر لیں، یہ درخواست آپ سے ہم اس امید پر

کر رہے ہیں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بہت احسان کرنے والے ہیں، یا یہ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمایا ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی درخواست کا جواب ضابطہ کے مطابق یہ دیا کہ یہ بات تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ جسکو چاہیں پکڑ لیں، بلکہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہوا اگر اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں تو ہم تمہارے ہی فتوے اور فیصلے کے مطابق ظالم ہو جائیں گے، کیونکہ تم نے ہی یہ کہا ہے کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہی اس کی جزاء ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا، یعنی جب برادرانِ یوسف بنیامین کی رہائی سے مایوس ہو گئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہو گئے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ الخ ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے بنیامین کے واپس لانے کا پختہ عہد لیا تھا، اور یہ کہ تم اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے معاملہ میں ایک کوتاہی اور غلطی کر چکے ہو، اس لئے میں تو اب مصر کی زمین کو اس وقت تک نہ چھوڑونگا جب تک میرے والد خود ہی مجھے یہاں سے واپس آنے کا حکم نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم کرنے والے ہیں۔

یہ بڑے بھائی جن کا کلام بیان ہوا ہے بعض نے فرمایا کہ یہودا ہیں، اور اگرچہ عمر میں سب سے بڑے نہیں مگر علم و فضل میں بڑے تھے، اور بعض مفسرین نے کہا کہ روبیل ہیں جو عمر میں سب سے بڑے ہیں، اور یوسف علیہ السلام کے قتل نہ کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا تھا، اور بعض نے کہا کہ یہ بڑے بھائی شمعون ہیں جو جاہ و رتبہ کے اعتبار سے سب بھائیوں میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ، یعنی بڑے بھائی نے کہا کہ میں تو یہیں رہوں گا، آپ سب لوگ اپنے والد کے پاس واپس جائیں اور ان کو بتلائیں کہ آپ کے صاحبزادہ نے چوری کی، اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے چشم دید حالات ہیں کہ مال مسروقہ ان کے سامان میں سے ہمارے سامنے برآمد ہوا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ، یعنی ہم نے جو آپ سے عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو ضرور واپس لائیں گے، یہ عہد ظاہری حالات کے اعتبار سے تھا، غیب کا حال تو ہم نہ جانتے تھے کہ یہ چوری کر کے گرفتار اور ہم مجبور ہو جائیں گے، اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے بھائی بنیامین کی پوری حفاظت کی کہ کوئی ایسا کام ان سے نہ ہو جائے جس کے باعث وہ تکلیف

میں پڑیں، مگر ہماری یہ کوشش ظاہری احوال ہی کی حد تک ہو سکتی تھی، ہماری نظروں سے غائب لاعلمی میں ان سے یہ کام ہو جائے گا ہم کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔

چونکہ برادرانِ یوسف اس سے پہلے ایک فریب اپنے والد کو دے چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارے مذکور الصدر بیان سے والد کا ہرگز اطمینان نہ ہوگا، اور وہ ہماری بات پر یقین نہ کریں گے اس لئے مزید تاکید کے لئے کہا کہ آپ کو ہمارا یقین نہ آئے تو آپ اس شہر کے لوگوں سے تحقیق کرلیں جس میں ہم تھے، یعنی شہر مصر، اور آپ اس قافلہ سے بھی تحقیق کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہی مصر سے کنعان آیا ہے، اور ہم اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

تفسیر مظہری میں اس جگہ اس سوال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کے ساتھ اس قدر بے رحمی کا معاملہ کیسے گوارا کرلیا، کہ خود اپنے حالات سے بھی اطلاع نہیں دی، پھر چھوٹے بھائی کو بھی روک لیا، جبکہ بار بار یہ بھائی مصر آتے رہے، نہ ان کو اپنا راز بتایا نہ والد کے پاس اطلاع بھیجی، ان سب باتوں کا جواب تفسیر مظہری نے یہی دیا ہے: اِنَّهٗ عَمِلَ ذٰلِكَ بِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى لِيَزِيْدَ فِىْ بَلَاۗءِ يَعْقُوْبَ، "یعنی یوسف علیہ السلام نے یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کئے جن کا منشاء حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان اور ابتلاء کی تکمیل تھی۔

احکام و مسائل

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا سے ثابت ہوا کہ انسان جب کسی سے کوئی معاملہ اور معاہدہ کرتا ہے تو وہ ظاہری حالات ہی پر محمول ہوتا ہے، ایسی چیزوں پر حاوی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادرانِ یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا، اور یہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آگیا اور اس میں پکڑے گئے اس سے معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے، علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جاسکتی ہے اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو بچشم خود دیکھ کر دی جاسکتی ہے اسی طرح کسی معتبر ثقہ سے سنکر بھی دی جاسکتی ہے، شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کر دے، کہ یہ واقعہ خود نہیں دیکھا، فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے، اسی اصول کی بناء پر فقہاء مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص حق اور راستی پر ہو مگر موقع ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہو سکتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ اس اشتباہ کو دور کر دے، تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعۂ بنیامین میں

پچھلے واقعۂ یوسف علیہ السلام کی بنا پر موقع تہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اسکی صفائی کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، جبکہ آپ حضرت صفیہؓ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے فرمادیا کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارے میں کسی کو کوئی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں شبہ ڈال دے (بخاری، مسلم)

(قرطبی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن

بولا کوئی نہیں بنالی ہے تمھارے جی نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے، شاید اللہ لے آئے

يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَ

میرے پاس ان سب کو، وہی ہے خبردار حکمتوں والا، اور اُلٹا پھرا اُن کے پاس سے

قَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٤﴾

اور بولا اے افسوس یوسف پر، اور سفید ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے، سو وہ آپکو گھونٹ رہا تھا،

قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ

کہنے لگے قسم ہے اللہ کی تو نہ چھوڑیگا یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہو جائے

مِنَ الْهَالِكِينَ ﴿٨٥﴾ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَ

مُردہ، بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور

أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِن

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، اے بیٹو! جاؤ اور تلاش کرو

يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ

یوسف کی، اور اس کے بھائی کی اور ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے بیشک ناامید نہیں

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

یعقوب (علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان سب سے غیر مطمئن ہوچکے تھے تو سابق پر قیاس کرکے) فرمانے لگے (کہ بنیامین چوری میں ماخوذ نہیں ہوا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو (خیر مثل سابق) صبر ہی کروں گا، جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (مجھ کو) اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو (یعنی یوسفؑ اور بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہے ان تینوں کو) مجھ تک پہنچا دے گا (کیونکہ) وہ (حقیقتِ حال سے) خوب واقف ہے (اس لئے اس کو سب کی خبر ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس حال میں ہیں اور وہ) بڑی حکمت والا ہے (جب ملانا چاہے گا تو ہزاروں اسباب و تدابیر درست کر دے گا) اور (یہ جواب دے کر بوجہ اس کے کہ ان سے رنج پہنچا تھا) ان سے دوسری طرف رُخ کرلیا اور (بوجہ اس کے کہ اس نئے غم سے وہ پُرانا غم اور تازہ ہوگیا، یوسفؑ کو یاد کرکے) کہنے لگے ہائے یوسف افسوس! اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں (کیونکہ زیادہ رونے سے سیاہی آنکھوں کی کم ہوجاتی ہے اور آنکھیں بے رونق یا بالکل بے نور ہوجاتی ہیں) اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے (کیونکہ شدتِ غم کے ساتھ جب شدّتِ ضبط ہوگا جیسا کہ صابرین کی شان ہے تو کظم کی کیفیت پیدا ہوگی) بیٹے کہنے لگے بخدا (معلوم ہوتا ہے) تم ہمیشہ ہمیشہ یوسف کی یادگاری میں لگے رہوگے، یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بہ لب ہوجاؤ گے، یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے (تو اتنے غم سے فائدہ کیا) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (باتوں سے مراد یا تو لطف و کرم و رحمتِ اتم ہے اور یا مراد الہام ہے ان سب کے ملنے کا جو بلا واسطہ ہو یا بواسطۂ خواب یوسفؑ کے جس کی تعبیر اب تک واقع نہیں ہوئی تھی، اور واقع ہونا اس کا ضرور ہے) اے میرے بیٹو (اظہارِ غم تو صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں مسبب الاسباب وہی ہے، لیکن ظاہری تدبیر تم بھی کرو کہ ایک بار پھر سفر میں) جاؤ اور یوسفؑ اور ان کے بھائی کی تلاش کرو (یعنی اس فکر و تدبیر کی جستجو کرو جس سے یوسفؑ کا نشان ملے، اور بنیامین کو رہائی ہو) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں ؛

معارف و مسائل

یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے بنیامین کی مصر میں گرفتاری کے بعد ان کے بھائی وطن واپس آئے اور یعقوب علیہ السلام کو یہ ماجرا سنایا، اور یقین دلانا چاہا کہ ہم اس واقعہ میں بالکل سچے ہیں، آپ اس بات کی تصدیق مصر کے لوگوں سے بھی کر سکتے ہیں، اور جو قافلہ ہمارے ساتھ مصر سے کنعان آیا ہے اس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بنیامین کی چوری پکڑی گئی، اس لئے وہ گرفتار ہو گئے، یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان صاحبزادوں کا جھوٹ ثابت ہو چکا تھا، اس لئے اس مرتبہ بھی یقین نہیں آیا، اگرچہ فی الواقع اس وقت انھوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس لئے اس موقع پر بھی وہی کلمات فرمائے جو یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے وقت فرمائے تھے: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ، یعنی یہ بات جو تم کہہ رہے ہو صحیح نہیں، تم نے خود بات بنائی ہے، مگر میں اب بھی صبر ہی کرتا ہوں، وہی میرے لئے بہتر ہے۔

قرطبی نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہیں اس میں ابتداءً غلطی ہو جانا ممکن ہے جیسے اس معاملہ میں پیش آیا، کہ بیٹوں کے سچ کو جھوٹ قرار دیدیا، مگر انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو منجانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور انجام کار وہ حق کو پا لیتے ہیں۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا، اس آیت کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا، یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا، اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں، بات کچھ اور ہی ہے، یہ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٤﴾ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس دوسرے صدمے کے بعد صاجزادوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کی، اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج وغم ہے یوسف پر اور اس رنج وغم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں، یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہوگئی، مقاتل امام تفسیر نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی، فَهُوَ كَظِيمٌ" یعنی پھر وہ خاموش ہوگئے، کسی سے اپنا دکھ نہ کہتے تھے كَظِيمٌ، كَظْم سے بنا ہے جس کے معنی بند ہوجانے اور بھرجانے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ غم واندوہ سے ان کا دل بھر گیا، اور زبان بند ہوگئی، کہ کسی سے اپنا رنج وغم بیان نہ کرتے تھے۔

اسی لئے کَظْم کے معنی غصہ کو پی جانے کے آتے ہیں کہ غصہ دل میں بھرے ہوئے ہونے کے باوجود زبان یا ہاتھ سے کوئی چیز غصہ کے مقتضیٰ کے مطابق سرزد نہ ہو، حدیث میں ہے وَمَنْ يَّكْظِمِ الْغَيْظَ يَأْجُرْهُ اللّٰهُ" یعنی جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کے تقاضے پر باوجود قدرت کے عمل نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دیں گے"۔

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مجمع عام کے سامنے لاکر جنّت کی نعمتوں میں اختیار دیں گے کہ جو چاہیں لے لیں۔

امام ابن جریرؒ نے اس جگہ ایک حدیث نقل کی ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، پڑھنے کی تلقین اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ کلمہ انسان کو رنج وغم کی تکلیف سے نجات دینے میں بڑا مؤثر ہے، خصوصیت امّتِ محمدیہ کی اس سے معلوم ہوتی کہ اس شدید غم وصدمہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کلمہ کے بجائے يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ فرمایا، بیہقی نے شعب الایمان میں بھی یہ حدیث ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا شغفِ محبت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیوں تھا

اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ غیر معمولی محبت اور اُن کے گم ہونے پر اتنا اثر کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بنا پر چالیس سال اور بعض کی بنا پر اسّی سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا، یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی بظاہر ان کی پیغمبرانہ شان کے شایان نہیں، کہ اولاد سے اتنی محبت کریں، جب کہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے، ارشاد ہے: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، یعنی تمہارے مال اور اولاد فتنہ اور آزمائش ہیں"، اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ، یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کردیا ہے، وہ صفت ہے دارِ آخرت کی یاد" مالک بن دینارؒ نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ

ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال دی اور صرف آخرت کی محبت سے ان کے قلوب کو معمور کر دیا، ان کا مطمح نظر کسی چیز کے لینے یا چھوڑنے میں صرف آخرت ہوتی ہے ۔

اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت مجدد الف ثانی کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے، قرآن وحدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے، یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حُسنِ صورت ہی نہیں، بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حُسنِ سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی، انتہیٰ ۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یہ محبت اگرچہ درحقیقت دنیا کی محبت نہ تھی مگر بہرحال اس میں ایک حیثیت دنیوی بھی تھی، اسی وجہ سے یہ محبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور امتحان کا ذریعہ بنی، اور چالیس سال کی مفارقت کا ناقابلِ برداشت صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور اس واقعہ کے اجزاء اوّل سے آخر تک اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ ایسی صورتیں بنتی چلی گئیں کہ یہ صدمہ طویل سے طویل ہوتا چلا گیا ورنہ واقعہ کے شروع میں اتنی شدید محبت والے باپ سے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ بیٹوں کی بات سُن کر گھر میں بیٹھ رہتے، بلکہ موقع پر پہونچ کر تفتیش وتلاش کرتے تو اسی وقت پتہ چل جاتا، مگر اللہ ہی کی طرف سے ایسی صورتیں بن گئیں کہ اُس وقت یہ دھیان نہ آیا، پھر یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے حال کی اپنے والد کو خبر بھیجیں، یہاں تک کہ مصر کی حکومت واقتدار ملنے کے بعد بھی انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں فرمایا، اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما وہ واقعات تھے جو بار بار ان کے بھائیوں کے مصر جانے کے متعلق پیش آتے رہے، اس وقت بھی نہ بھائیوں پر اظہار فرمایا نہ والد کو خبر بھیجنے کی کوشش فرمائی، بلکہ دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس ایک تدبیر کے ذریعہ روک کر والد کے صدمہ کو دُوہرا کر دیا، یہ سب چیزیں یوسف علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اُن کو بذریعہ وحی اس سے نہ روک دیا گیا ہو، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس سارے عمل کو وحیِ خداوندی کی تلقین قرار دیا ہے، اور کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ کے

قرآنی ارشاد میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ، یعنی صاحبزادے والد کے اس شدید غم واندوہ اور اس پر صبر جمیل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ بخدا آپ تو یوسف ؑ کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں اور ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائیں، (آخر ہر صدمہ اور غم کی کوئی انتہا ہوتی ہے، مرورِ ایام سے انسان اس کو بھول جاتا ہے، مگر آپ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی اسی روزِ اوّل میں ہیں، اور آپ کا غم اُسی طرح تازہ ہے)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی بات سنکر فرمایا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ، یعنی میں تو اپنی فریاد اور رنج وغم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا، بلکہ اللہ جل شانہٗ کی ذات سے کرتا ہوں، اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرمایا کہ میرا یہ یاد کرنا خالی نہ جائے گا، میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ پھر مجھے ان سب سے ملائیں گے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ، یعنی اے میرے بیٹو جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، کیونکہ اس کی رحمت سے بجز کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اتنے عرصہ کے بعد صاحبزادوں کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور اُن کے بھائی کو تلاش کرو، اور ان کے ملنے سے مایوس نہ ہو، اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا تھا، یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی کے تابع تھیں، اس سے پہلے ملنا مقدر نہ تھا، اس لئے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا گیا، اور اب ملاقات کا وقت آچکا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب تدبیر دل میں ڈالی۔

اور دونوں کی تلاش کا رُخ مصر ہی کی طرف قرار دیا، جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا، مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے مناسب اسباب جمع فرما دیتے ہیں، اس لئے اس مرتبہ تلاش وتفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ انکی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہو گیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف کریم ہے شاید یوسف ؑ ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ واقعۂ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبرِ جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتداء کرے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔

اور حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

مَنْ بَثَّ لَمْ يَصْبِرْ، یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔

امام قرطبی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس شدید ابتلاء و امتحان کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے جو بعض روایات میں آئی ہے کہ ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نماز تہجد پڑھ رہے تھے، اور یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سو رہے تھے، اچانک یوسف علیہ السلام سے کچھ خراٹے کی آواز نکلی، تو ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف چلی گئی، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا دیکھو یہ میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے، قسم ہے میری عزت و جلال کی میں ان کی یہ دونوں آنکھیں نکال لوں گا جن سے میرے غیر کی طرف توجہ کی ہے، اور جس کی طرف توجہ کی ہے اس کو ان سے مدتِ دراز کے لئے جدا کر دوں گا۔

اسی لئے بخاری کی حدیث میں بروایت عائشہؓ وارد ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز میں کسی دوسری طرف دیکھنا کیسا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ شیطان بندہ کی نماز کو اُچک لیتا ہے، والعیاذ باللہ سبحانہ وتعالیٰ۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس. بولے اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ

لائے ہیں ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر، اللہ

اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ

بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو، کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے

وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ

اور اس کے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی، بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف، کہا

اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ

میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور

يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ

صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـــِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ

البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تھے چوکنے والے، کہا کچھ الزام نہیں

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

تم پر آج، بخشے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (حضرت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے موافق کہ انھوں نے فرمایا تھا تَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ؛ مصر کو چلے، کیونکہ بنیامین کو مصر ہی میں چھوڑا تھا، یہ خیال ہوا ہوگا کہ جس کا نشان معلوم ہے پہلے اس کے لانے کی تدبیر کرنا چاہئے، کہ بادشاہ سے مانگیں، پھر یوسف علیہ السلام کے نشان کو ڈھونڈیں گے، غرض مصر پہونچ کر) جب یوسف ؑ کے پاس (جس کو عزیز سمجھ رہے تھے) پہنچے (اور غلّہ کی بھی حاجت تھی، پس یہ خیال ہوا کہ غلّہ کے بہانے سے عزیز کے پاس چلیں، اور اس کی خرید کے ضمن میں خوشامد کی باتیں کریں، جب اس کی طبیعت میں نرمی دیکھیں، اور مزاج خوش پائیں تو بنیامین کی درخواست کریں، اس لئے اوّل غلّہ لینے کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قحط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور (چونکہ ہم کو ناداری نے

گھیر رکھا ہے اس لئے خرید غلہ کے واسطے کھرے دام بھی میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ یہ نکمی چیز لائے ہیں، سو آپ (اس کے نکمے ہونے سے قطع نظر کرکے) پورا غلہ دید یجئے (اور اس نکمے ہونے سے غلہ کی مقدار میں کمی نہ کیجئے) اور (ہمارا کچھ استحقاق نہیں) ہم کو خیرات (سمجھ کر) دیدیجئے بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو (خواہ حقیقۃً خیرات دیں خواہ سہولت و رعایت کریں کہ وہ بھی مثل خیرات کے ہے) جزا (ئے خیر) دیتا ہے (اگر مومن ہے تو آخرت میں بھی ورنہ دنیا ہی میں) یوسف (علیہ السلام) نے (جو اُن کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے تو رہا نہ گیا اور بے اختیار چاہا کہ اب اُن سے کھُل جاؤں، اور عجب نہیں کہ نور قلب سے معلوم ہوگیا ہو کہ اب کی بار اُن کو تجسّس بھی مقصود ہے اور یہ بھی منکشف ہوگیا ہو کہ اب زمانہ مفارقت کا ختم ہوچکا، پس تمہید تعارف کے طور پر) فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد ہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمھاری جہالت کا زمانہ تھا (اور برے بھلے کی سوجھ نہ تھی یہ سنکر پہلے تو چکرائے کہ عزیز مصر کو یوسفؑ کے قصہ سے کیا واسطہ ادھر اس شروع زمانہ کے خواب سے غالب احتمال تھا ہی کہ شاید یوسفؑ کسی بڑے رتبہ کو پہنچیں کہ ہم سب کو ان کے سامنے گردن جھکانا پڑے اس لئے اس کلام سے شبہ ہوا اور غور کیا تو کچھ کچھ پہچانا اور مزید تحقیق کیلئے) کہنے لگے کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو انھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا (حقیقی) بھائی ہے (یہ اس لئے بڑھادیا کہ اپنے یوسفؑ ہونے کی اور تاکید ہوجاوے یا انکے تجسّس کی کامیابی کی بشارت ہو کہ جن کو تم ڈھونڈنے نکلے ہو ہم دونوں ایک جگہ جمع ہیں) ہم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا (کہ ہم دونوں کو اوّل توفیق صبر و تقویٰ کی عطا فرمائی پھر اُس کی برکت سے ہماری تکلیف کو راحت سے اور افتراق کو اجتماع سے اور قلتِ مال و جاہ کو کثرتِ مال و جاہ سے مبدّل فرمادیا) واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور (مصائب پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا وہ (تمام گذشتہ قصوں کو یاد کرکے نادم ہوئے اور معذرت کے طور پر) کہنے لگے کہ بخدا کچھ شک نہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی (اور تم اسی لائق تھے) اور (ہم نے جو کچھ کیا) بیشک ہم (اس میں) خطا وار تھے (لِللہ معاف کردو) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (بے فکر رہو میرا دل صاف ہوگیا) اللہ تعالیٰ تمھارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (تائب کا قصور معاف کر ہی دیتا ہے، اسی دعاء سے یہ بھی مفہوم ہوگیا کہ میں نے بھی معاف کردیا)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا باقی قصہ مذکور ہے، کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو تو انہوں نے تیسری مرتبہ مصر کا سفر کیا، کیونکہ بنیامین کا تو وہاں ہونا معلوم تھا، پہلی کوشش اس کی خلاصی کے لئے کرنا تھی، اور یوسف علیہ السلام کا وجود اگرچہ مصر میں معلوم نہ تھا مگر جب کسی کام کا وقت آجاتا ہے تو انسان کی تدبیریں غیر شعوری طور پر بھی درست ہوتی چلی جاتی ہیں، جیساکہ ایک حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرما لیتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود جمع کر دیتے ہیں؛ اس لئے تلاش یوسف کے لئے بھی غیر شعوری طور پر مصر ہی کا سفر مناسب تھا، اور غلّہ کی ضرورت بھی تھی، اور یہ بات بھی تھی کہ غلّہ طلب کرنے کے بہانے سے عزیز مصر سے ملاقات ہوگی اور ان سے اپنے بھائی بنیامین کی خلاصی کے متعلق عرض معروض کرسکیں گے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا الآیۃ یعنی جب برادرانِ یوسف والد کے حکم کے مطابق مصر پہونچے اور عزیز مصر سے ملے تو خوشامد کی گفتگو شروع کی، اپنی محتاجی اور بیکسی کا اظہار کیا کہ اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے سخت تکلیف پہونچ رہی ہے، یہاں تک کہ اب ہمارے پاس غلّہ خریدنے کے لئے بھی کوئی مناسب قیمت موجود نہیں۔ ہم مجبور ہو کر کچھ نکمّی چیزیں غلّہ خریدنے کے لئے لے آئے ہیں، آپ اپنے کریمانہ اخلاق سے انہی نکمی چیزوں کو قبول کرلیں، اور ان کے بدلے میں غلّہ پورا اتنا ہی دیدیں جتنا اچھی قیمتی چیزوں کے بالمقابل دیا جاتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں آپ ہم کو خیرات سمجھ کر دیدیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

یہ نکمی چیزیں کیا تھیں؟ قرآن و حدیث میں انکی کوئی تصریح نہیں، مفسرین کے اقوال مختلف ہیں؛ بعض نے کہا کہ کھوٹے دراہم تھے جو بازار میں نہ چل سکتے تھے، بعض نے کہا کہ کچھ گھریلو سامان تھا، یہ لفظ مزجٰۃ کا ترجمہ ہے اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اس کو زبردستی چلایا جائے۔

یوسف علیہ السلام نے جب بھائیوں کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے اور شکستہ حالت دیکھی تو طبعی طور پر اب حقیقتِ حال ظاہر کر دینے پر مجبور ہو رہے تھے اور واقعات کی رفتار کا انداز یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر جو اظہارِ حال کی پابندی منجانب اللہ تھی اب اس کے خاتمہ کا وقت بھی آچکا تھا، اور تفسیر قرطبی و مظہری میں بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"من جانب یعقوب صفی اللہ، ابن اسحٰق ذبیح اللہ[1] ابن ابراہیم خلیل اللہ بخدمت عزیز مصر!

اما بعد؛ ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے، میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولادِ انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے، نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام "

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے، اور بے اختیار رونے لگے، اور اپنے راز کو ظاہر کردیا، اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تمھاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے بُرے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ سوال سُنا تو چکرا گئے کہ عزیز مصر کو یوسف کے قصے سے کیا واسطہ، پھر ادھر بھی دھیان گیا کہ یوسفؑ نے جو بچپن میں خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر یہی تھی، کہ ان کو کوئی بلند مرتبہ حاصل ہوگا کہ ہم سب کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، کہیں یہ عزیز مصر خود یوسف ہی نہ ہوں، پھر جب اور غور و تامل کیا تو کچھ علامات سے پہچان لیا، اور مزید تحقیق کیلئے اُن سے کہا:

ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ، "کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو؟" تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں ہی یوسف ہوں، اور یہ بنیامین میرا حقیقی بھائی ہے، بھائی کا ذکر اس لئے بڑھا دیا کہ ان کو اچھی طرح یقین آجائے، نیز اس لئے بھی کہ اُن پر اس وقت اپنے مقصد کی مکمل کامیابی واضح ہوجائے کہ جن دو کی تلاش میں تم نکلے تھے وہ دونوں بیک جا تمہیں مل گئے، پھر فرمایا:

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ "یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان و کرم فرمایا کہ اوّل ہم دونوں کو صبر و تقویٰ کی دو صفتیں عطا فرمائیں، جو کلید کامیابی اور ہر مصیبت سے امان ہیں، پھر ہماری تکلیف کو راحت سے، افتراق کو اجتماع سے مال و جاہ کی قلت کو ان سب کی کثرت سے تبدیل فرما دیا، بیشک جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ

[1] ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے، یا حضرت اسماعیل علیہ السلام؟ اسکی پوری تحقیق سُورۃُ الصّٰفّٰت (جلد ہفتم ص ۴۶۲ تا ۴۶۶) پر دیکھی جائے۔ ناشر

ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے ہیں۔

اب تو برادرانِ یوسف کے پاس بجز جرم و خطا کے اعتراف اور یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کے اقرار کے چارہ نہ تھا، سب نے یک زبان ہو کر کہا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ، "بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور اور آپ اسی کے مستحق تھے، اور ہم نے جو کچھ کیا بے شک ہم اس میں خطا وار تھے، للہ معاف کر دیجئے"۔ یوسف علیہ السلام نے جواب میں اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ، یعنی میں تم سے تمہارے مظالم کا انتقام تو کیا لیتا، آج تم کو کوئی ملامت بھی نہیں کرتا، یہ تو اپنی طرف سے معافی کی خوش خبری سُنا دی، پھر اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی: يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ، "یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادیں، وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں"۔

پھر فرمایا اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا، وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ، "یعنی میرا یہ کرتہ لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی جس سے وہ یہاں تشریف لا سکیں گے اور انہی باقی گھر والوں کو بھی سب کو میرے پاس لے آؤ تاکہ سب ملیں اور خوش ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور شکر گذار رہوں"۔

احکام و ہدایات

آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایات حاصل ہوئیں:

اوّل لفظ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ اولادِ انبیاء ہیں ان کے لئے صدقہ خیرات کیسے حلال تھا؟ دوسرے اگر صدقہ حلال بھی ہو تو سوال کرنا کیسے جائز تھا، برادرانِ یوسف اگر انبیاء بھی نہ ہوں تو بھی یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے انھوں نے اس غلطی پر کیوں متنبہ نہیں فرمایا؟

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ خیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلّہ کا سوال تو انھوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمّی چیزیں پیش کی تھیں، اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کر کے قبول فرمالیں، اِس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اولادِ انبیاء کے لئے صدقہ خیرات کی حرمت صرف امّتِ محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمۂ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے (بیان القرآن)

اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کی ایک جزاء تو عام ہے، جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رَدِّ بلاء اور دفع مصائب، اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہلِ ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے، اور برادرانِ یوسفؑ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہے یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا وآخرت دونوں کی جزاء شامل ہے۔ (بیان القرآن)

اس کے علاوہ بظاہر موقع تو اس جگہ اس کا تھا کہ چونکہ عزیز مصر سے خطاب تھا اس لئے اس جملہ میں بھی خطاب ہی کے صیغہ سے یہ کہا جاتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں گے، لیکن چونکہ ان کا تو مومن ہونا معلوم نہ تھا اس لئے عام عنوان اختیار کیا اور خصوصی طور پر ان کو جزا ملنے کا ذکر نہیں کیا (قرطبی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گذشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام واحسان ہی کا ذکر کرنا چاہیے جو اب حاصل ہوا ہے، مصیبت سے نجات اور انعامِ الٰہی کے حصول کے بعد بھی پچھلی تکلیف و مصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے، ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کَنُوْد کہا گیا ہے، اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ، کنود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھے۔

اسی لئے یوسف علیہ السلام کو، بھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

صبر و تقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ سے معلوم ہوا کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنا اور تکلیفوں پر صبر و ثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلاء و مصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح وکامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـــًٔا، ”یعنی اگر تم نے صبر و تقویٰ اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند اور نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعاء کر رہے ہیں کہ ہمارے صبر و تقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجاتِ عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقوے کا دعویٰ کرنا بنصِ قرآن ممنوع ہے، فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى، ”یعنی اپنی پاکی نہ جتلاؤ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون

متقی ہے»، مگر یہاں درحقیقت دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث بالنعمۃ اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے، کہ اس نے اوّل ہم کو صبر و تقویٰ کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں
لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، یعنی آج تم پر کوئی ملامت نہیں» یہ اخلاقِ کریمانہ کا اعلیٰ مقام ہے کہ ظالم کو صرف معاف ہی نہیں کر دیا بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تم پر کوئی ملامت بھی نہیں۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ
لے جاؤ یہ کرتا میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ
اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا، اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے

اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ
میں پاتا ہوں بو یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا، لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو

لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى
اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے، پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتا

وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ
اس کے منہ پر پھر لوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا، بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ
کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو

اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ
بیشک ہم تھے چوکنے والے، کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہے

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ
بخشنے والا مہربان، پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنے پاس

اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾
اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جمعی سے

رکوع ۱۰

الربع

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدے میں اور کہا اے باپ یہ

تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ

بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا اس کو میرے رب نے سچ کر دیا اور اس نے انعام کیا مجھ پر

اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ

جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ

اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ

جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

بیشک وہی ہے خبردار حکمت والا ۔

خلاصۂ تفسیر

اب تم (میرے باپ کو جا کر بشارت دو اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ کرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی (اور یہاں تشریف لے آئیں گے) اور اپنے (باقی) گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ (کہ سب ملیں اور خوش ہوں، کیونکہ حالتِ موجودہ میں میرا جانا مشکل ہے، اس لئے گھر والے ہی چلے آئیں) اور جب (یوسف علیہ السلام سے بات چیت ہو چکی، اور آپ کے فرمانے کے موافق کرتہ لے کر چلنے کی تیاری کی اور) قافلہ (شہر مصر سے) چلا (جس میں یہ لوگ بھی تھے) تو ان کے باپ نے (پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آرہی ہے (معجزہ اختیاری نہیں ہوتا اس لئے اس سے پہلے یہ ادراک نہ ہوا) وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور ملیں گے اسی خیال کے غلبہ سے اب خوشبو کا وہم ہو گیا، اور واقع میں نہ خوشبو ہے نہ کچھ اور ہے، یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے) پس جب (یوسفؑ کے صحیح سلامت ہونے کی) خوش خبری لانے والا (مع کرتہ کے یہاں) آپہنچا تو (آتے ہی) اس نے وہ کرتہ ان کے منہ پر لا کر ڈال دیا پس (آنکھوں کو لگنا تھا اور دماغ میں خوشبو پہنچنا کہ) فوراً ہی

ان کی آنکھیں کھُل گئیں (اور انھوں نے سارا ماجرا آپ سے بیان کیا) آپ نے (بیٹوں سے) فرمایا کیوں، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (اور اسی لئے میں نے تم کو یوسف ؑ کے تجسّس کے لئے بھیجا تھا، دیکھو آخر اللہ تعالیٰ میری امید راست لایا ان کا یہ قول اس سے اوپر کے رکوع میں آچکا ہے، اُس وقت) سب بیٹوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دُعاءِ مغفرت کیجئے (ہم نے جو کچھ آپ کو یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں تکلیف دی) ہم بیشک خطاوار تھے (مطلب یہ ہے کہ آپ بھی معاف کر دیجئے، کیونکہ عادۃً کسی کے لئے استغفار وہی کرتا ہے جو خود بھی مواخذہ کرنا نہیں چاہتا) ۔ یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمھارے لئے اپنے رب سے دُعاءِ مغفرت کروں گا بے شک وہ غفور رحیم ہے (اور اسی سے ان کا معاف کر دینا بھی معلوم ہو گیا اور عنقریب کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کا وقت آنے دو جو کہ قبولیت کی ساعت ہے کذا فی الدر المنثور مرفوعاً غرض سب مصر کو تیار ہو کر چل دیئے اور یوسف علیہ السلام خبر سن کر استقبال کے لئے مصر سے باہر تشریف لائے اور باہر ہی ملاقات کا سامان کیا گیا) پھر جب سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے (سب سے مل ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی، اور (بات چیت سے فارغ ہو کر) کہا سب مصر میں چلئے (اور) انشاء اللہ تعالیٰ (وہاں) امن چین سے رہئے (مفارقت کا غم اور قحط کا الم سب کافور ہو گئے، غرض سب مصر میں پہنچے) اور (وہاں پہنچ کر تعظیماً) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا، اور (اس وقت سب کے قلوب پر یوسف علیہ السلام کی ایسی عظمت غالب ہوئی کہ) سب کے سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور (یہ حالت دیکھ کر) وہ کہنے لگے کہ اے ابّا یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانہ میں دیکھا تھا (کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں) میرے رب نے اس (خواب) کو سچا کر دیا، (یعنی اس کی سچائی کا ظہور کر دیا) اور (اس شرف کے سوا میرے رب نے مجھ پر اور انعامات بھی فرمائے، چنانچہ) میرے ساتھ (ایک) اُس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس مرتبۂ سلطنت تک پہنچایا) اور (دوسرا یہ انعام فرمایا کہ) بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوا دیا تھا (جس کا مقتضا یہ تھا کہ عمر بھر بھی مجتمع و متفق نہ ہوتے، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ) تم سب کو (جن میں میرے بھائی بھی ہیں) باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملا دیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم اور حکمت والا ہے، (اپنے علم و حکمت سے سب امور کی تدبیر درست کر دیتا ہے) ۔

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصّہ سے متعلق سابقہ آیات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب باذنِ خداوندی اس کا وقت آ گیا کہ یوسف علیہ السلام اپنا راز بھائیوں پر ظاہر کر دیں تو انھوں نے حقیقت ظاہر کر دی، بھائیوں نے معافی مانگی، انھوں نے نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا، بلکہ گذشتہ واقعات پر کوئی ملامت کرنا بھی پسند نہ کیا، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی، اور اب والد سے ملاقات کی فکر ہوئی، حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں تشریف لائیں، مگر معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی بینائی اس مفارقت میں جاتی رہی، اس لئے سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی اور بھائیوں سے کہا :

اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ، یعنی تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی عود کر آئے گی " یہ ظاہر ہے کہ کسی کے کُرتے کا چہرہ پر ڈال دینا بینائی کے عود کرنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک معجزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو باذنِ خداوندی معلوم ہو گیا کہ جب اُنکا کُرتہ والد کے چہرے پر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی بینائی بحال فرما دیں گے۔

اور ضحاک اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ اس کُرتے کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنّت سے اُس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈالا تھا، پھر یہ جنّت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پاس رہا، اُن کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا، آپ نے اس کو ایک بڑی متبرک شے کی حیثیت سے ایک نلکی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گلے میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا، تاکہ نظر بد سے محفوظ رہیں، برادرانِ یوسف نے جب ان کا کُرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اُتار لیا، اور وہ برہنہ کر کے کنوئیں میں ڈال دیئے گئے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اس سے یہ کُرتہ برآمد کیا، اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا، اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلا آیا، اس وقت بھی جبرئیل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنّت کا لباس ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے، اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا

حُسن و جمال اور ان کا وجود خود جنت ہی کی ایک چیز تھی، اس لئے ان کے جسم سے متصل ہونیوالے ہر کُرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے (مظہری)

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ، "یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس مصر لے آؤ"، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی، اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی ضرور تشریف لائیں گے، قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں سے یہودا نے کہا کہ یہ کُرتہ میں لے جاؤں گا، کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہیئے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ" یعنی جب قافلہ شہر سے باہر نکلا ہی تھا" تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے بیوقوف نہ کہو تو میں تمھیں بتلاؤں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، شہر مصر سے کنعان تک ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی مسافت کا راستہ تھا، اور حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ اسّی فرسخ یعنی تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی دور سے قمیصِ یوسفؑ کے ذریعہ حضرت یوسفؑ کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہونچا دی، اور یہ عجائب میں سے ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی، یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل وعمل بھی نہیں ہوتا، یہ براہ راست فعلُ اللہ ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کر دیتے ہیں، اور جب اذنِ خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہو جاتا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ، "یعنی حاضرین مجلس نے یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں" کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ، "یعنی جب بشارت دینے والا کنعان پہونچا" اور قمیصِ یوسفؑ کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا، تو فوراً ان کی بینائی عود کر آئی، بشارت دینے والا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائی یہودا تھا جو ان کا کرتہ مصر سے لایا تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، "یعنی کیا میں نہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جس کی آپ لوگوں کو خبر نہیں" کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ، اب جبکہ حقیقتِ حال واضح ہو کر سامنے آگئی تو برادرانِ یوسفؑ نے والد سے اپنی خطاؤں کی معافی اس شان سے مانگی کہ والد سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ان کی خطا معاف کرنے کی دعا کریگا وہ خود بھی انکی خطا معاف کردیگا۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کروں گا۔

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً ہی دُعا کرنے کے بجائے وعدہ کیا کہ عنقریب دعا کروں گا، اس کی وجہ عام مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اہتمام کے ساتھ آخر شب کے وقت میں دعا کریں، کیونکہ اس وقت کی دعا خصوصیت سے قبول کی جاتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں زمین سے قریب تر آسمان پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے، تو میں اس کو قبول کرلوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کردوں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ، بعض روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دو سو اونٹوں پر لدا ہوا بہت سا سامان کپڑوں اور دوسری ضروریات کا بھیجا تھا، تاکہ پورا خاندان مصر آنے کے لئے عمدہ تیاری کر سکے، اس کے مطابق یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد اور تمام متعلقین مصر کے لئے تیار ہو کر نکلے، تو ایک روایت میں ان کی تعداد بہتر ۷۲ اور دوسری میں ترانوے ۹۳ نفوس مرد و عورت پر مشتمل تھی۔

دوسری طرف جب مصر پہونچنے کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ملکِ مصر کے لوگ استقبال کے لئے شہر سے باہر تشریف لائے، اور چار ہزار سپاہی ان کے ساتھ سلامی دینے کے لئے نکلے، جب یہ حضرات مصر میں یوسف علیہ السلام کے مکان میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھہرایا۔

یہاں ذکر والدین کا ہے، حالانکہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا مگر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے مرحومہ کی بہن لَیّا سے نکاح کر لیا تھا، جو یوسف علیہ السلام کی خالہ ہونے کی حیثیت سے بھی مثل والدہ کے تھیں، اور والد کے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ ہی کہلانے کی مستحق تھیں [۱]

وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ، یوسف علیہ السلام نے سب خاندان

---

[۱] یہ توجیہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ بنیامین کی ولادت کے وقت وفات پاگئی تھیں اسی بنا پر یہاں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت صفحہ ۲۹ و ۳۰ ج ۵ کی عبارت سے متضاد معلوم ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کو قرار دیا گیا ہے لیکن دراصل اس معاملے میں کوئی مستند روایت تو ہے نہیں، اسرائیلی روایات ہیں اور ان میں بھی تعارض ہے خود صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودی حضرات حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کے بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال کے قائل نہیں ہیں اگر اس روایت کو لیا جائے تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا، اس صورت میں وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ مراد ہونگی۔ ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ ابن کثیرؒ اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں قال ابن جریر ولم یقم دلیل علی موت امه (ای ام یوسف علیه السلام) وظاهر القرآن یدل علی حیاتها۔ محمد تقی عثمانی

کے لوگوں سے کہا کہ آپ سب باذنِ خداوندی مصر میں بے خوف وخطر بغیر کسی پابندی کے داخل ہوجائیں
مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملک میں داخل ہونے والے مسافروں پر جو پابندیاں عادۃً ہوا کرتی ہیں
آپ ان سب پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تختِ
شاہی پر بٹھایا۔

وَخَرُّوا لَهٗ سُجَّدًا، یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے
سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا،
یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدۂ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت
میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدۂ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعتِ
اسلام میں ذریعۂ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہوگیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی
غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔

وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ، یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں
ماں باپ اور گیارہ بھائیوں نے بیک وقت سجدہ کیا تو ان کو اپنا وہ بچپن کا خواب یاد آگیا، اور
فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب وماہتاب اور
گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو
آنکھوں سے دکھلا دیا۔

احکام و مسائل

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و
دعاءِ مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ "عنقریب تمہارے لئے دعاءِ مغفرت
کر دوں گا"، اور فوراً دُعا نہیں کی۔

اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف
علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہوجائے کہ انھوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہے یا نہیں،
کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عنداللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعاءِ
مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی
کہ صاحبِ حق اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے، محض زبانی توبہ واستغفار کافی نہیں۔

۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہودا قمیصِ یوسف لے کر آئے اور یعقوب
علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انھوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ

ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پوچھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پوچھنا یہ ہے کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انھوں نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتلائے، یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں، ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہئے۔

۳۔ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیصِ یوسف لے کر پہونچا، تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات ساز گار نہ تھے، اس لئے عذر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں پکی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعاء دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکراتِ موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعاء ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔

۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنتِ انبیاء ہے، صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے، کہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب اُن پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبولِ توبہ کی بشارت لایا تھا اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقتِ واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا اس پر لازم ہے کہ فوراً اس حق کو ادا کر دے یا اس سے معاف کرالے۔

صحیح بخاری میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذاء ہاتھ یا زبان سے پہونچائی ہو اس کو چاہئے کہ آج اس کو ادا کر دے، یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کرلے، قبل اس کے کہ قیامت کا دن آجائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا، اس لئے اس کے اعمالِ صالحہ مظلوم کو دیدیئے جائیں گے، یہ خالی رہ جائے گا، اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یوسف علیہ السلام کا مقامِ صبر و شکر

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگذشت بیان کرنا شروع کی، یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے، کہ آج اگر کسی کو اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے، جتنے یوسف علیہ السلام پر گذرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور مایوسی کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگذشت کیا بیان کرے گا، کتنا روئے گا اور رُلائے گا، اور کتنے دن رات مصائب کی داستان سنانے میں صرف کرے گا، مگر یہاں طرفین میں اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیے، یعقوب علیہ السلام کے بچھڑے ہوئے محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گذرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں:

وَقَدْ أَحْسَنَ بِيْٓ إِذْ أَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ أَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ إِخْوَتِيْ، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا، اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا،

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصائب ترتیب وار تین بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، اوّل بھائیوں کا ظلم وجور، دوسرے والدین سے طویل جدائی، تیسرے قید خانے کی تکالیف، خدا تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکالیف کا نام نہیں لیا، بلکہ قید خانہ سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا، قید خانہ سے نجات اور اس پر شکرِ الٰہی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا، بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کنویں سے نکالا، وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے، اور فرما چکے تھے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنویں کا کسی طرح سے بھی ذکر آئے، تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزما مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ کیا، کہ آپ کو بدو یعنی دیہات سے شہر مصر میں پہونچا دیا، اس میں اس نعمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا وطن دیہات میں تھا، جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ اندر پہنچا دیا۔

اب پہلی بات رہ گئی، بھائیوں کا ظلم وجور، سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیباق کر دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے، شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرا دیا۔

یہ ہے شانِ نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکرگذار نہ ہوں، بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کوئی مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں، قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ "یعنی انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے"۔

یوسف علیہ السلام نے داستانِ مصائب کو تین لفظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ "یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے"۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا،

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں،

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰۱

موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

(اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہتے رہے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر ختم پر پہنچی، اور بعد وفات ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے، پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا، اور دعا کی کہ) اے میرے پروردگار آپ نے مجھ کو (ہر طرح کی نعمتیں دیں، ظاہری بھی باطنی بھی، ظاہری یہ کہ مثلاً) سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور (باطنی یہ کہ مثلاً) مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ علم عظیم ہے خصوصاً

جب کہ وہ یقینی ہو، جو موقوف ہے وحی پر پس اس کا وجود مستلزم ہوگا عطاء نبوت کو) اے خالق آسمانوں اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنا دیئے کہ سلطنت دی، علم دیا، اسی طرح آخرت کے کام بھی بنا دیجئے کہ) مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے (یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیاء عظام ہوئے ہیں ان میں مجھ کو بھی پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہِ راست حق تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعا میں مشغول ہو گئے، فرمایا

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ؁ یعنی اے میرے پروردگار آپ نے ہی مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا، اے آسمان و زمین کے خالق آپ ہی دنیا و آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور مجھ کو کامل نیک بندوں میں شامل رکھئے"، کامل نیک بندے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں، جو ہر گناہ سے معصوم ہیں (مظہری)

اس دعاء میں حسنِ خاتمہ کی دعاء خاص طور پر قابلِ نظر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا و آخرت کے اُن کو نصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ و منصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت اُن پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں، اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔

یہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب و غریب قصہ اور اس کے ضمن میں آئی ہوئی ہدایات کا سلسلہ جو قرآن میں مذکور ہے پورا ہو گیا، اس کے بعد کا قصہ قرآن کریم یا کسی حدیث مرفوع میں منقول نہیں، اکثر علماءِ تفسیر نے تاریخی یا اسرائیلی روایات کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، پھر اسّی سال والد سے غائب رہے، اور والدین کی ملاقات کے بعد تئیس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس ۱۲۰

سال کی عمر میں وفات پائی۔

اور محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی مفارقت کا زمانہ چالیس ۴۰ سال تھا، پھر یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لانے کے بعد یوسف علیہ السلام کے ساتھ سترہ ۱۷ سال زندہ رہے، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

تفسیر قرطبی میں اہلِ تاریخ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مصر میں چوبیس ۲۴ سال رہنے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی، اور وفات سے پہلے یوسف علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش کو میرے وطن بھیج کر میرے والد اسحٰق علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے۔

سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سال کی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا، اسی وجہ سے عام یہود میں یہ رسم چل گئی کہ اپنے مُردوں کو دور دور سے بیت المقدس میں لے جاکر دفن کرتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر وفات کے وقت ایک سو سینتالیس سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام مع اپنی اولاد کے جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد ترانوے ۹۳ مرد و عورت پر مشتمل تھی، اور جب یہ اولاد یعقوب یعنی بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی (قرطبی)۔

یہ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ سابق عزیز مصر کے انتقال کے بعد شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا کے ساتھ کرادی تھی۔

تورات اور اہلِ کتاب کی تاریخ میں ہے کہ ان سے یوسف علیہ السلام کے دو لڑکے افرائیم اور منشا اور ایک لڑکی رحمت بنت یوسف پیدا ہوئے، رحمت کا نکاح حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ ہوا، اور افرائیم کی اولاد میں یوشع بن نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو بیس ۱۲۰ سال کی عمر میں ہوا، اور دریائے نیل کے کنارے پر دفن کئے گئے۔

ابن اسحٰق نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں، تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو مصر میں نہ چھوڑیں، اس کو اپنے ساتھ لے کر ملکِ شام چلے جائیں، اور ان کے آباء واجداد کے پاس دفن کریں، اس حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کرکے ان کی قبر دریافت کی، جو ایک سنگِ مرمر کے تابوت میں

تھی، اس کو اپنے ساتھ ارضِ کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کر دیا (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دینِ یوسف علیہ السلام پر قائم رہے، مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا (تفسیر مظہری)

ھدایات اور احکام

آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ تو یہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم و تکریم واجب ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تعظیمی جائز تھا، اسی لئے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا، مگر شریعتِ محمدیہ میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دیکر غیر اللہ کے لئے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ جب ملکِ شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آکر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپؐ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے آپؐ کو سجدہ کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا لَا تَسْجُدْ لِیْ یَا سَلْمَانُ وَاسْجُدْ لِلْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ یعنی اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ صرف اس ذات کو کرو جو حی وقیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں" (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بعض اوقات زمانہ دراز کے بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسے اس واقعہ میں چالیس یا اسی سال کے بعد ظہور ہوا (ابن جریر و ابن کثیر)

قَدْ اَحْسَنَ بِیْ سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو پھر اس سے نجات ہو جائے تو سنتِ پیغمبری یہ ہے کہ نجات پر شکر ادا کرے، اور مرض و مصیبت کے ذکر کو بھول جائے۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کی ایسی لطیف اور مخفی تدبیریں اور سامان کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا، میں یوسف علیہ السلام نے ایمان واسلام پر موت کی دعاء مانگی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خاص حالات میں موت کی دعا کرنا ممنوع نہیں، اور احادیث صحیحہ میں جو موت کی تمنا کو منع فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی تکلیفوں سے گھبرا کر بے صبری سے موت مانگنے لگے، یہ درست نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے، اگر کہنا ہی ہے تو یوں کہے کہ یا اللہ مجھے جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک زندہ رکھ اور جب موت بہتر ہو تو مجھے موت دیدے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس

اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ

جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے، اور اکثر لوگ نہیں ہیں

وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔــلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ

یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے، اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

یہ تو اور کچھ نہیں مگر نصیحت سارے عالم کو، اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمان اور

ع ۱۱ ۵

الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا

زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے؛ اور نہیں

يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ

ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں، کیا نڈر ہو گئے اس سے

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

کہ آڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپہنچے قیامت اچانک،

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي

اور ان کو خبر نہ ہو، کہہ دے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، سمجھ

بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے

الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ

رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

انجام ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے

لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾

پرہیز کرنے والوں کو، کیا اب بھی نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ قصہ (جو اوپر بیان کیا گیا آپ کے اعتبار سے) غیب کی خبروں میں سے ہے (کیونکہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا صرف) ہم (ہی) وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور (یہ ظاہر ہے کہ) آپ ان (برادرانِ یوسفؑ) کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انھوں نے اپنا ارادہ (یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کا) پختہ کر لیا تھا اور وہ (اس کے متعلق) تدبیریں کر رہے تھے (کہ آپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائیں، وغیر ذٰلک، اور اس طرح یہ امر یقینی ہے کہ آپ نے کسی سے یہ قصہ سُنا سُنایا بھی نہیں، پس یہ صاف دلیل ہے نبوت کی اور صاحبِ وحی ہونے کی) اور (باوجود نبوت پر دلائل قائم ہونے کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو اور (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا تو کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ آپ ان سے اس (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں (جس میں یہ احتمال ہو کہ اگر یہ قرآن کو قبول نہ کریں گے تو آپ کا معاوضہ فوت ہو جائے گا) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے (جو نہ مانے گا اسی کا نقصان ہوگا) اور (جیسے یہ لوگ منکرِ نبوت ہیں اسی طرح باوجود دلائل کے منکرِ توحید بھی ہیں چنانچہ) بہت سی نشانیاں ہیں

(کہ توحید پر دلالت کرنے والی) آسمانوں میں (جیسا کواکب وغیرہ) اور زمین میں (جیسے عناصر و عنصریات) جن پر ان کا گذر ہوتا رہتا ہے (یعنی ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں) اور وہ ان کی طرف (ذرا) توجہ نہیں کرتے (یعنی ان سے استدلال نہیں کرتے) اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں (پس بدون توحید خدا کا ماننا مثل نہ ماننے کے ہے پس یہ لوگ اللہ کیساتھ بھی کفر کرتے ہیں اور نبوت کیساتھ بھی کفر کرتے ہیں) سو کیا (اللہ و رسول کے منکر ہو کر، پھر بھی اس بات سے مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ اُن پر خدا کے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو اُنکو محیط ہو جاوے یا اُن پر اچانک قیامت آجائے، اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ مقتضاء کفر کا عقوبت ہے خواہ دنیا میں نازل ہو جائے یا قیامت کے دن واقع ہو رہے ان کو ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہئے) آپ فرما دیجئے کہ میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں (توحید کی اور اپنے داعی من اللہ ہونے کی) دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی (یعنی میرے پاس بھی دلیل ہے توحید و رسالت کی اور میرے ساتھ والے بھی استدلال کے ساتھ مجھ پر ایمان لائے ہیں، میں بے دلیل بات کی طرف کسی کو نہیں بلاتا، دلیل سنو اور سمجھو، پس حاصل طریق یہ ہوا کہ خدا واحد ہے اور میں داعی ہوں) اور اللہ (شرک سے) پاک ہے اور میں (اس طریق کو قبول کرتا ہوں اور) مشرکین میں سے نہیں ہوں اور (یہ جو نبوت پر شبہ کرتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے محض مہمل بات ہے کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے (کوئی بھی فرشتہ نہ تھا جنھوں نے ان کو نہ مانا، اور ایسے ہی مہمل شبہات کرتے رہے، ان کو سزائیں دی گئیں، اسی طرح اِن کو بھی سزا ہوگی خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں، اور یہ لوگ جو بے فکر ہیں) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا جو اِن سے پہلے (کافر) ہو گذرے ہیں اور (یاد رکھو کہ جس دنیا کی محبت میں مدہوش ہو کر تم نے کفر اختیار کیا ہے یہ دنیا فانی اور ہیچ ہے) البتہ عالم آخرت اُن لوگوں کے لئے نہایت بہبودی کی چیز ہے، جو (شرک وغیرہ سے) احتیاط رکھتے ہیں (اور توحید و اطاعت اختیار کرتے ہیں) تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ فانی اور بے حقیقت چیز اچھی ہے یا باقی اور پائدار) :

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ، یعنی یہ قصہ غیب کی اُن خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے،، آپ برادرانِ یوسف ؑ کے پاس موجود نہ تھے،

جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنا طے کر چکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کر رہے تھے۔

اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر دینا آپ کی نبوّت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصّہ آپ کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے، نہ آپ وہاں موجود تھے، کہ دیکھ کر بیان فرمادیا ہو اور نہ آپ نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی، کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سنکر بیان فرمادیا ہو اس لئے بجز وحی الٰہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

قرآن کریم نے اس جگہ صرف اتنی بات پر اکتفاء فرمایا ہے کہ آپ وہاں موجود نہ تھے، کسی دوسرے شخص یا کتاب سے اس کا علم حاصل نہ ہونے کا ذکر اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ پورا عرب جانتا تھا، کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں، آپ نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ آپ کی پوری عمر مکہ معظمہ میں گذری ہے، ملکِ شام کا ایک سفر تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ کیا تھا، جس میں راستے ہی سے واپس تشریف لے آئے، دوسرا سفر تجارت کے لئے کیا، چند ایام میں کام کر کے واپس تشریف لے آئے، اس سفر میں بھی کسی عالم سے ملاقات یا کسی علمی ادارے سے تعلق کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اس لئے اس جگہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کا بھی ذکر فرما دیا ہے مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا، یعنی نزولِ قرآن سے پہلے ان واقعات کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

امام بغوی نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ اپنے دعوائے نبوّت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلائیے کہ کیا اور کس طرح ہوا، جب آپ نے بوحیِ الٰہی یہ سب بتلا دیا اور وہ پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جمے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہونچا، اس پر اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ آپ کی نبوّت و رسالت کے دلائل واضح ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان لانے والے نہیں، آپ کتنی ہی کوشش کریں، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ اور اصلاح کی کوشش ہے اس کا کامیاب بنانا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ آپ کے ذمّہ ہے، نہ آپ کو اس کا کوئی رنج ہونا چاہئے اس کے بعد فرمایا:

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ، یعنی آپ جو کچھ ان کو تبلیغ کرنے اور صحیح راستے پر لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اس پر ان لوگوں سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگتے، جس کی وجہ سے انکو اس کے سننے یا ماننے میں کوئی دشواری ہو، بلکہ آپ کا کلام تو خالص خیرخواہی

اور نصیحت ہی تمام جہان والوں کے لئے، اس میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب اس کوشش سے آپ کا مقصد کوئی دنیوی منفعت نہیں، بلکہ ثوابِ آخرت اور قوم کی خیر خواہی ہو تو وہ مقصد آپ کا حاصل ہو چکا پھر آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ "یعنی یہ لوگ صرف یہی نہیں کہ کسی ناصح کی نصیحت ضد اور ہٹ دھرمی سے نہیں سنتے بلکہ ان کا تو حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی جو کھلی کھلی نشانیاں آسمان وزمین میں ہر وقت سامنے رہتی ہیں ان پر بھی یہ غفلت و اعراض سے گذرے چلے جاتے ہیں، ذرا دھیان نہیں دیتے کہ یہ کس کی قدرت وعظمت کی نشانیاں ہیں، آسمان وزمین میں حق تعالیٰ شانہٗ کی خدائی وحکمت وقدرت کی نشانیاں بے شمار ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ پچھلی قوموں پر جو عذاب آئے اور ان کی اُلٹی ہوئی یا برباد کی ہوئی بستیاں ان کی نظروں سے گذرتی ہیں، مگر اُن سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔

یہ بیان تو ایسے لوگوں کا تھا جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی حکمت وقدرت ہی کے قائل نہیں تھے، آگے ان کا بیان ہے جو وجود باری تعالیٰ کے تو قائل ہیں، مگر اس کی خدائی میں دوسری چیزوں کو شریک قرار دیتے ہیں، فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ، یعنی ان میں جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو وہ بھی شرک کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت وغیرہ اوصاف میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، جو سراسر ظلم اور جہل ہے۔

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو ایمان کے باوجود مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہیں، مسند احمد میں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم پر جس چیز کا خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک شرک اصغر ہے، صحابہ کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ریاء شرکِ اصغر ہے، اسی طرح ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا ہے (ابن کثیر عن الترمذی) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام کی مَنّت اور نیاز ماننا بھی باتفاقِ فقہاء اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد ان کی غفلت وجہالت پر اظہارِ افسوس وتعجب ہو کہ یہ لوگ اپنے انکار وسرکشی کے باوجود اس بات سے کیسے بے فکر ہو گئے کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حادثہ عذاب کا آپڑے، یا دفعۃً اُن پر قیامت آجائے اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، "یعنی آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ (تم مانو یا نہ مانو) میرا تو یہی

طریقہ اور مسلک ہے کہ لوگوں کو بصیرت اور یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتا رہوں، میں بھی اور وہ لوگ بھی جو میرا اتباع کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری یہ دعوت کسی سرسری نظر پر مبنی نہیں بلکہ پوری بصیرت اور عقل و حکمت کا ثمرہ ہے، اس دعوت و بصیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین اور پیروؤں کو بھی شامل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو علوم رسالت کے خزانے اور خداوند سبحانہ وتعالیٰ کے سپاہی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے، تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت و خدمت کے لئے منتخب فرمالیا ہے، تم انہی کے اخلاق و عادات اور طریقوں کو سیکھو، کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔

اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ مَنِ اتَّبَعَنِیْ عام ہو ہر اُس شخص کے لئے جو قیامت تک دعوتِ رسولؐ کو امت تک پہنچانے کی خدمت میں مشغول ہو، کلبی اور ابن زید نے فرمایا کہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا دعویٰ کرے اس پر لازم ہے کہ آپؐ کی دعوت کو لوگوں میں پھیلائے، اور قرآن کی تعلیم کو عام کرے (مظہری)

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک سے پاک ہے اللہ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں، اوپر چونکہ یہ ذکر آیا تھا کہ اکثر لوگ جب اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو اس کے ساتھ شرک جلی یا خفی ملا دیتے ہیں، اس لئے شرک سے اپنی بالکل برات کا اعلان فرمایا، خلاصہ یہ ہے کہ میری دعوت کا یہ مطلب نہیں کہ میں لوگوں کو اپنا بندہ بناؤں، بلکہ میں خود بھی اللہ کا بندہ ہوں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، البتہ بحیثیت داعی مجھ پر ایمان لانا فرض ہے۔

اس پر جو مشرکین مکہ یہ شبہ پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور قاصد تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے، اس کا جواب اگلی آیت میں اس طرح فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، یعنی ان کا یہ خیال بے بنیاد اور لغو ہے کہ اللہ کا رسول اور پیغمبر فرشتہ ہونا چاہئے انسان نہیں ہو سکتا بلکہ معاملہ برعکس ہے، کہ انسانوں کے لئے اللہ کا رسول ہمیشہ انسان ہی ہوتا چلا آیا ہے، البتہ عام انسانوں سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ اس کی طرف براہِ راست حق تعالیٰ کی وحی اور پیغام آتا ہے، اور وہ کسی کی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندوں میں سے جس کو

مناسب سمجھتے ہیں اس کام کے لئے انتخاب فرما لیتے ہیں، اور یہ انتخاب ایسی خاص صفاتِ کمال کی بناء پر ہوتا ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔

آگے ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی طرف داعی اور رسول کی ہدایات کی خلاف ورزی کرکے عذابِ الٰہی کو دعوت دیتے ہیں، فرمایا:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، "یعنی کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان کو پچھلی قوموں کے حالات کا مشاہدہ ہو کہ رسولوں کے انکار نے ان کو کس انجام بد میں مبتلا کیا، مگر یہ لوگ دنیا کی ظاہری زینت و راحت میں مست ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں، حالانکہ پرہیزگاروں کے لئے آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے، کیا ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ دنیا کی چند روزہ راحت کو آخرت کی دائمی اور مکمل نعمتوں اور راحتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

احکام و ہدایات

اخبارِ غیب اور علمِ غیب میں فرق

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ "یہ سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں" یہی مضمون تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ آلِ عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریم کے قصہ میں آیا ہے، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ، اور سورۂ ہود کی آیت نمبر ۴۹ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے، تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ۔

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں، خصوصاً ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے، کتبِ حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علمِ غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے، اور یہ وصف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجۂ اتم موجود ہے، اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے، مگر قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے کہ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عالم الغیب سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، علم غیب اللہ جل شانہٗ کی صفت خاصہ ہے اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مرادف اور عیسائیوں کا عمل ہی، جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں، قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہو گئی، کہ علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصّہ ہے، اور عالم الغیب صرف اللہ جل شانہٗ ہی ہیں، البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلادیتے ہیں، یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علم غیب نہیں کہلاتا، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علم غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علم غیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں، جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ؎

اختلافِ خلق از نام اوفتاد ؎ چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رِجَالًا سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں، عورت نبی یا رسول نہیں ہو سکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا، بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہؓ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم اُمِّ عیسیٰ علیہ السلام، کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ بحکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحیِ الٰہی سے کوئی بات معلوم ہوئی، مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوّت و رسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

اور اسی آیت میں لفظ اَهْلِ الْقُرٰى سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں میں سے بھیجتے ہیں، دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے، کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل و فہم میں کامل نہیں ہوتے (ابن کثیر وقرطبی وغیرہ)۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ
یہاں تک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو
نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾
ہماری مدد پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا
البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو، کچھ بنائی ہوئی بات
يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ
نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز
شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾
کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

۱۲ ع ۷ ۶

خلاصۂ تفسیر

(اگر تم کو کفار پر تاخیر عذاب سے شبہ عدم وقوع کا ہوتا ہو تو تمہاری غلطی ہے، اس لئے کہ پچھلی امتوں کے کفار کو بھی بڑی بڑی مہلتیں دی گئی تھیں) یہاں تک کہ (مدتِ مہلت دراز ہونے کی وجہ سے) پیغمبر (اس بات سے) مایوس ہوگئے (کہ ہم نے اللہ کی طرف سے کفار پر عذاب آنے کے وعدہ کا جو وقت اپنے قیاس اور انداز سے مقرر کرلیا تھا کہ اس وقت میں کفار پر عذاب آکر ہمارا غلبہ اور حقانیت واضح ہوجائے گی) اور ان (پیغمبروں) کو گمان غالب ہوگیا کہ (وعدۂ الٰہیہ کا وقت مقرر کرنے میں) ہمارے فہم نے غلطی کی (کہ بلا تنصیص محض قرائن یا نصرتِ الٰہیہ کے جلد آنے کی خواہش سے قریب کا وقت معین کرلیا، حالانکہ وعدہ مطلق ہے ایسی مایوسی کی حالت میں) ان کو ہماری مدد پہنچی (وہ مدد یہ کہ کفار پر عذاب آیا) پھر (اُس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا، (مراد اس سے مؤمنین ہیں) اور (اس عذاب میں کفار ہلاک کئے گئے، کیونکہ) ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، (بلکہ اُن پر ضرور واقع ہوتا ہے، گو بدیر سہی، پس یہ کفار مکہ بھی اس دھوکہ میں نہ رہیں) ان (انبیاء و امم سابقین) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے (بڑی) عبرت ہے (جو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں کہ اطاعت کا یہ انجام ہوا اور معصیت کا یہ انجام ہے) یہ قرآن (جس میں یہ قصے ہیں) کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں (کہ اس سے عبرت نہ ہوتی) بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوچکی ہیں یہ اُن کی تصدیق کرنیوالا ہے اور

ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت و رحمت ہے (پس ایسی کتاب میں جو مضامین عبرت کے ہوں گے ان سے تو عبرت حاصل کرنا لازم ہی ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوتِ حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجام بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گرد وپیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے، قوم لوط علیہ السلام کی بستی اُلٹ دی گئی، قوم عاد و ثمود کو طرح طرح کے عذابوں سے نیست و نابود کر دیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔

دوسری آیت میں ہدایت کی گئی کہ دنیا کی تکلیف و راحت تو بہرحال چند روزہ ہے، اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے، جہاں کا قیام دائمی اور رنج یا راحت بھی دائمی ہے اور فرمایا کہ آخرت کی درستی تقویٰ پر موقوف ہے، جس کے معنی تمام احکامِ شرعیہ کی پابندی کرنا ہیں۔

اس آیت میں پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کے حالات سے موجودہ لوگوں کو متنبہ کرنا تھا اس لئے اگلی آیت میں ان کے ایک شبہ کو دور کیا گیا، وہ یہ کہ اکثر لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عذابِ الٰہی سے ڈرانے کا ذکر عرصہ سے سن رہے تھے اور کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا تھا، اس سے ان کی ہمتیں بڑھ رہی تھیں کہ کوئی عذاب آتا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا، اس لئے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ اپنی رحمت اور حکمتِ بالغہ سے بسا اوقات مجرم قوموں کو مہلت دیتے رہتے ہیں، اور یہ مہلت بعض اوقات بڑی طویل بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے سرکشوں کی جرأت بڑھ جاتی ہے، اور پیغمبروں کو ایک گونہ پریشانی پیش آتی ہے، ارشاد فرمایا:-

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ یعنی پچھلی امتوں کے نافرمانوں کو بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں، یہاں تک کہ مدتِ دراز تک ان پر عذاب نہ آنے سے پیغمبر یہ خیال کر کے مایوس ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدۂ عذاب کا جو وقت ہم نے اپنے اندازے سے اپنے ذہن میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب نہ آئے گا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا، اور اُن پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ وعدۂ الٰہیہ کا اپنے اندازہ سے وقت مقرر کرنے میں ہماری فہم نے غلطی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی معین وقت بتلایا نہیں تھا، ہم نے مخصوص قرائن سے ایک مدت

متعین کرلی تھی، اسی مایوسی کی حالت میں ان کو ہماری مدد پہونچی، وہ یہ کہ وعدے کے مطابق کفار پر عذاب آیا، پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا اس کو بچالیا گیا، مراد اس سے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے مؤمنین کو بچالیا گیا، اور کفار ہلاک ہوگئے، کیونکہ ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، بلکہ ضرور آکر رہتا ہے، اس لئے کفارِ مکہ کو چاہیئے کہ عذاب میں دیر ہونے سے دھوکہ میں نہ رہیں۔

اس آیت میں لفظ کُذِبُوْا مشہور قراءت کے مطابق پڑھا گیا ہے، اور اس کی جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ سب سے زیادہ اسلم اور بے غبار ہے، کہ لفظ کُذِبُوْا کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے، جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے کوئی ایسی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جب کوئی اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے، بلکہ ان کو باخبر کر کے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ صلح حدیبیہ اس مضمون کے لئے کافی شاہد ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خواب ہے، کہ آپ نے دیکھا کہ آپ مع صحابہؓ کے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی بحکم وحی ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا ہونا یقینی ہوگیا، مگر خواب میں اس کا کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہوگا، اس لئے صحابۂ کرام میں اعلان کر کے ان کی خاصی تعداد کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے مکہ معظمہ کو روانہ ہوگئے، مگر قریش مکہ نے مزاحمت کی اور اس وقت طواف وعمرہ کی نوبت نہ آئی، بلکہ اس کا مکمل ظہور دو سال بعد ۸؁ھ ہجری میں فتح مکہ کی صورت سے ہوا، اور اس واقعہ سے معلوم ہوگیا کہ جو خواب آپ نے دیکھا تھا وہ حق و یقینی تھا، مگر اس کا وقت جو قرائن یا اندازہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمالیا تھا اس میں غلطی ہوئی مگر اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ہوگیا۔

اسی طرح آیتِ مذکورہ میں قَدْ کُذِبُوْا کا بھی یہی مفہوم ہے کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، اور جو وقت اندازہ سے انبیاء نے اپنے ذہن میں مقرر کیا تھا اس وقت عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے وقت متعین کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے اور علامہ طیبی نے کہا کہ یہ روایت صحیح ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ذکر کی گئی ہے (مظہری)

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ ذال کی تشدید کے ساتھ قَدْ کُذِّبُوْا بھی آیا ہے، جو مصدر تکذیب سے مشتق ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انبیاء نے جو اندازہ سے وقتِ عذاب مقرر کردیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے سے ان کو یہ خطرہ ہوگیا کہ اب جو مسلمان ہیں وہ بھی ہماری

تکذیب نہ کرنے لگیں، کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، منکروں پر عذاب آپڑا اور مؤمنین کو اس سے نجات ملی، اس طرح ان کا غلبہ ظاہر ہوگیا۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ "یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے"۔

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان ہوا ہو وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہو کر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید و نصرت ہوتی ہے، کہ کنویں سے نکال کر ایک تختِ سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہا پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکر و فریب کرنے والوں کا انجام ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔

مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ "یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی گھڑی ہوئی بات، بلکہ تصدیق ہے اُن کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں"، کیونکہ تورات و انجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے، اور حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصے سے کوئی خالی نہیں (مظہری)۔

وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ؕ "یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی"، مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں، اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے"، اس میں ایمان لانے والوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہونچ سکتا ہے، کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بدعملی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابومنصور نے فرمایا کہ پوری سورۃ یوسف اور اس میں درج شدہ قصہ یوسف کے بیان سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ کو جو کچھ ایذائیں اپنی قوم کے ہاتھوں پہونچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچتی رہیں مگر انجام کار اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو غالب فرمایا آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔

سُورۂ یوسف تمام شد

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ رعد مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تینتالیس ۴۳ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اُترا تجھ پر تیرے رب سے

الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ

سو حق ہے لیکن بہت لوگ نہیں مانتے ، اللہ وہ ہے جس نے اونچے

السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ

بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو تم ان کو پھر قائم ہوا عرش پر اور کام میں لگا دیا

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

سورج اور چاند کو ، ہر ایک چلتا ہے وقت مقرر پر تدبیر کرتا ہے کام کی

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ② وَهُوَ الَّذِيْ

ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ شاید تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو ، اور وہی ہے جس نے

مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ

پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ اور ندیاں اور ہر

الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ

میوے کے رکھے اس میں جوڑے دو دو قسم، ڈھانکتا ہے دن پر رات کو اس میں

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ

نشانیاں ہیں اُن کے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں، اور زمین میں کھیت ہیں مختلف

مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ

ایک دوسرے سے متصل اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسری سے ملی

صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ

ہوئی اور بعضی بن ملی اُن کو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں سے ایک کو ایک سے

فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۴

میووں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓرٰ، (اس کے معنے تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آپ سن رہے ہیں) آیتیں ہیں ایک بڑی کتاب (یعنی قرآن) کی، اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ بالکل سچ ہے اور (اس کا مقتضا یہ تھا کہ سب ایمان لاتے) لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے، (ربط، اوپر حقیقتِ قرآن کا مضمون تھا، آگے توحید کا مضمون ہے جو کہ اعظم مقاصدِ قرآن سے ہے) اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کر دیا چنانچہ تم ان (آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تختِ سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگا دیا (ان دونوں میں سے) ہر ایک (اپنے مدار پر) ایک وقتِ معیّن میں چلتا رہتا ہے (چنانچہ سورج اپنے مدار کو سال بھر میں قطع کر لیتا ہے اور چاند مہینہ بھر میں) وہی (اللہ) ہر کام کی (جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے) تدبیر کرتا ہے (اور) دلائل (تکوینیہ و تشریعیہ) کو صاف صاف بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا (یعنی قیامت کا) یقین کر لو (اس کے امکان کا تو اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی عظیم چیزوں کی تخلیق پر قادر ہے تو مُردوں کو زندہ کرنے پر کیوں نہیں قادر ہوگا، اور اس کے وقوع کا یقین اس طرح کہ مخبرِ صادق نے ایک امرِ ممکن کے وقوع

کی خبر دی، لامحالہ وہ سچی اور صحیح ہے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے اور میٹھے یا چھوٹے اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا اور) شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو چھپا دیتا ہے (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ان امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں (جس کی تقریر پارہ دوم کے رکوع چہارم کے شروع میں گذری ہے) اور (اسی طرح اور بھی دلائل ہیں توحید کے چنانچہ) زمین میں پاس پاس (اور پھر) مختلف قطعے ہیں (جن کا باوجود متصل ہونے کے مختلف الاثر ہونا عجیب بات ہے) اور انگوروں کے باغ ہیں اور (مختلف) کھیتیاں ہیں اور کھجور (کے درخت) ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضوں میں دو تنے نہیں ہوتے (بلکہ جڑ سے شاخوں تک ایک ہی تنہ چلا جاتا ہے اور) سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور (باوجود اس کے پھر بھی) ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں، ان امور (مذکورہ) میں (بھی) سمجھداروں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں ⁂

معارف و مسائل

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی کل آیتیں تینتالیس ہیں، اس سورۃ میں بھی قرآن مجید کا کلامِ حق ہونا، اور توحید و رسالت کا بیان اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

الٓمّٓرٰ، یہ حروف مقطعہ ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑنا بھی مناسب نہیں۔

حدیثِ رسول بھی قرآن کی طرح وحی الٰہی ہے

پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلامِ الٰہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب سے مراد قرآن ہے اور وَالَّذِیٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو لیکن واؤ حرفِ عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور اَلَّذِیٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور اَلَّذِیٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آتی ہے، کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپؐ دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جاسکتی۔

معنیٰ آیت کے یہ ہوگئے کہ یہ قرآن اور جو کچھ احکام آپؐ پر نازل کئے جاتے ہیں وہ سب حق ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن اکثر لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے اس پر ایمان نہیں لاتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے دلائل مذکور ہیں، کہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات کو ذرا غور سے دیکھو تو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ ان کی بنانے والی کوئی ایسی ہستی ہے جو قادر مطلق ہے اور تمام مخلوقات و کائنات اس کے قبضہ میں ہیں۔

ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، "یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے اتنے بڑے وسیع اور بلند قبہ کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو"

کیا آسمان کا جرم آنکھوں سے نظر آتا ہے عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں تَرَوْنَهَا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں اِلَى السَّمَاۗءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا (روح المعانی)

اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، "یعنی پھر عرش پر جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے، قائم اور اس طرح جلوہ فرما ہوا جو اس کی شان کے لائق ہے، اس جلوہ فرمانے کی کیفیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، اتنا اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ جس طرح کا استواء شانِ الٰہی کے

شایان ہے وہ مراد ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى، یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو مسخر اور تابع حکم کیا ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک، ایک معین رفتار سے چلتا ہے"

مسخر کرنے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کو جس جس کام پر لگادیا ہے برابر لگے ہوئے ہیں، ہزاروں سال گذر گئے ہیں لیکن نہ کبھی اُن کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے، نہ تھکتے ہیں، نہ کبھی اپنے مقررہ کام کے خلاف کسی دوسرے کام میں لگتے ہیں، اور معین مدت کی طرف چلنے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ پورے عالم دنیا کے لئے جو آخری مدت قیامت متعین ہے، سب اسی کی طرف چل رہے ہیں اس منزل پر پہونچ کر ان کا یہ سارا نظام ختم ہوجائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کردیا ہے وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کرلیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔

ان سیاروں کا عظیم الشان وجود پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ نہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی مصنوعات میں سائنس کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزارواں حصہ ملنا بھی ناممکن ہے، یہ نظام قدرت بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو انسانی ادراک وشعور سے بالاتر ہے۔

ہر چیز کی تدبیر درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ "یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے" انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کرسکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہٗ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا صحیح استعمال سمجھ لے، تمام اشیاءِ عالم کے استعمال کا نظام بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہے جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرتِ خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے، کہ ہر چیز کھنچی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ سے لے کر رنگ وروغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان اور اپنا ہنر لئے ہوئے آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامانِ تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھرا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا

کہ اپنے مال یا تدبیر کے زور سے یہ ساری چیزیں مہیا اور سارے انسانوں کو اپنی خدمت کے لئے حاضر کرلیتے، آپ تو کیا کوئی بڑی سے بڑی حکومت بھی قانون کے زور سے یہ نظام قائم نہیں کرسکتی، بلاشبہ یہ تدبیر اور نظامِ عالم کا قیام صرف حی وقیوم ہی کا کام ہے، انسان اگر اس کو اپنی تدبیر قرار دے تو جہالت کے سوا کیا ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، یعنی وہ اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہوسکتی ہیں جن کو حق تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ نازل فرمایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مزید اُن کا بیان اور تفسیر فرمائی۔

اور آیات سے مراد آیاتِ قدرت یعنی اللہ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں جو آسمان، زمین اور خود انسان کے وجود میں موجود ہیں، وہ بھی ہوسکتی ہیں، جو بڑی تفصیل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ انسان کی نظر کے سامنے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ؏ یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب و غریب نظام و تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، تو تمھیں آخرت اور قیامت کا یقین ہوجائے، کیونکہ اس نظامِ عجیب اور پیدائشِ عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخلِ قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہوگیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک رہ سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ اور وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بوجھل پہاڑ اور نہریں بنائیں۔

زمین کا پھیلانا اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصّہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا، پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرما دیئے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہونچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحرِ منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوض ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال، نہ سڑنے کا امکان، پھر اس کو ایک زیرِ زمین قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ ساری دنیا

میں پھیلایا جاتا ہے، اسی سے کہیں کھلی ہوئی ندیاں اور نہریں نکلتی ہیں اور کہیں زیر زمین مستور رہ کر کنووں کے ذریعہ اس پائپ لائن کا سراغ لگایا اور پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيۡهَا زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ، یعنی پھر اس زمین سے طرح طرح کے پھل نکالے اور ہر ایک پھل دو دو قسم کے پیدا کئے، چھوٹے بڑے، سرخ، سفید، کھٹے میٹھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد صرف دو نہ ہوں بلکہ متعدد انواع و اقسام مراد ہوں جنکی تعداد کم سے کم دو ہوتی ہے، اس لئے زوجین اثنین سے تعبیر کر دیا گیا، اور کچھ بعید نہیں کہ زوجین سے مراد نر و مادہ ہوں، جیسے بہت سے درختوں کے متعلق تو تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان میں نر و مادہ ہوتے ہیں، جیسے کھجور، پپیتہ وغیرہ دوسرے درختوں میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ ابھی تک تحقیقات وہاں تک نہ پہونچی ہوں۔

يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر، مراد یہ ہے کہ دن کی روشنی کے بعد رات لے آتا ہے جیسے کسی روشن چیز کو کسی پردہ میں ڈھانپ دیا جائے۔

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۞ بلاشبہ اس تمام کائنات کی تخلیق اور اس کی تدبیر و نظام میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرتِ کاملہ کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

وَفِى الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِيۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّغَيۡرُ صِنۡوَانٍ يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰى بَعۡضٍ فِى الۡاُكُلِ، یعنی پھر زمین میں بہت سے قطعے آپس میں ملے ہوئے ہونے کے باوجود مزاج اور خاصیت میں مختلف ہیں، کوئی اچھی زمین ہے کوئی کھاری، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کے قابل کوئی باغ کے قابل، اور ان قطعات میں باغات ہیں، انگور کے، اور کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں بعض ایسے ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں، اور بعض میں ایک ہی تنہ رہتا ہے۔

اور یہ سارے پھل اگرچہ ایک ہی زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں، اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں اور مختلف قسم کی ہوائیں بھی اُن سب کو یکساں پہونچتی ہیں مگر پھر بھی ان کے رنگ اور ذائقے مختلف اور چھوٹے بڑے کا نمایاں فرق ہوتا ہے۔

باوجود اتصال کے پھر یہ طرح طرح کے اختلافات اس بات کی قوی اور واضح دلیل ہے کہ یہ سب کاروبار کسی حکیم و مدبر کے فرمان کے تابع چل رہا ہے، محض مادّے کے تطورات

نہیں، جیسا کہ بعض جاہل سمجھتے ہیں، کیونکہ مادے کے تطورات ہوتے تو سب مواد کے مشترک ہونے کے باوجود یہ اختلاف کیسے ہوتا، ایک ہی زمین سے ایک پھل ایک موسم میں نکلتا ہو دوسرا دوسرے موسم میں، ایک ہی درخت کی ایک ہی شاخ پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے اور مختلف ذائقہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ اس میں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اس کی وحدت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے"، اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے وہ عقل والے نہیں گو دنیا میں ان کو کیسا ہی عقلمند سمجھا، اور کہا جاتا ہو۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ

اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کیا نئے سرے سے بنائے

جَدِیْدٍ ۬ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ

جائیں گے، وہی ہیں جو منکر ہو گئے اپنے رب سے اور وہی ہیں کہ طوق ہیں

فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵

ان کی گردنوں میں، اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہیں گے برابر،

وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ

اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے اور گذر چکے ہیں ان سے

قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى

پہلے بہت سے عذاب اور تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے

ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۶ وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ

ظلم کے اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے، اور کہتے ہیں کافر

كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ

کیوں نہ اُتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے،

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ

اور ہر قوم کیلئے ہوا ہے راہ بتانیوالا، اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑتے ہیں

الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿٨﴾

پیٹ اور بڑھتے ہیں، اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو (ان لوگوں کے انکارِ قیامت سے) تعجب ہو تو (واقعی) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم (مرکر) خاک ہوگئے کیا (خاک ہوکر) ہم پھر (قیامت کو) از سرِ نو پیدا ہوں گے (تعجب کے لائق اس لئے کہ جو ذات ایسی اشیاء مذکورہ کے خلق پر ابتداءً قادر ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اور اسی سے جواب ہوگیا استبعادِ بعث کا اور انکارِ نبوّت کا بھی جس کا مبنیٰ وہ استبعاد تھا ایک کے جواب سے دوسرے کا جواب ہوگیا، آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا (کیونکہ انکارِ بعث سے اُس کی قدرت کا انکار کیا، اور انکارِ قیامت سے انکارِ نبوّت لازم آتا ہے) اور ایسے لوگوں کی گردنوں میں (دوزخ میں) طوق ڈالے جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ لوگ عافیت (کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے مصیبت (کے نازل ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں (کہ اگر آپ نبی ہیں تو جائیے عذاب منگا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے وقوع کو بہت بعید سمجھتے ہیں) حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعاتِ عقوبت گذر چکے ہیں (تو ان پر آجانا کیا مستبعد ہے) اور (اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کو سُن کر یہ لوگ مغرور نہ ہوجاویں کہ اب ہم کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ وہ صرف غفور و رحیم ہی نہیں ہیں اور پھر سب کے لئے غفور و رحیم نہیں ہیں، بلکہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی) یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی (ایک خاص درجہ کی) بیجا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت سزا دیتا ہے، (یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں اور ہر ایک کے ظہور کی شرطیں اور اسباب ہیں، پس انھوں نے بلا سبب اپنے کو مستحقِ رحمت و مغفرت کیسے سمجھ لیا، بلکہ کفر کی وجہ سے اُن کے لئے تو اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہی) اور یہ کفار (انکارِ نبوت کی غرض سے) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں نہیں نازل کیا گیا (اور یہ اعتراض محض حماقت ہے کیونکہ آپ مالکِ معجزات نہیں، بلکہ) آپ

صرف (عذاب خدا سے کافروں کو) ڈرانے والے (یعنی نبی) ہیں (اور نبی کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے جو کہ ظاہر ہو چکا ہے نہ کسی خاص معجزہ کی) اور (کوئی آپ انوکھے نبی نہیں ہوئے بلکہ) ہر قوم کیلئے (امم ماضیہ میں) ہادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعویٰ نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا، خاص دلیل کا التزام نہیں ہوا) اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے، اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے ہے۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ کی پہلی تین آیتوں میں کفار کے شبہات کا جواب ہے، جو نبوت کے متعلق تھے اور اس کے ساتھ منکرین کے لئے عذاب کی وعید مذکور ہے۔

ان کے شبہات تین تھے، ایک یہ کہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور محشر کے حساب وکتاب کو محال خلافِ عقل سمجھتے تھے، اسی بنار پر آخرت کی خبر دینے والے انبیار کی تکذیب اور ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم نے ان کے اس شبہ کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے:۔ هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اس میں انبیار کا مذاق اڑانے کے لئے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو تمھیں یہ بتلاتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور تمھاری مٹی کے ذرات بھی سارے جہان میں پھیل جائیں گے تم اس وقت پھر دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ان کے اس شبہ کا جواب دیا گیا:۔ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ، اس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ کفار آپ کے لئے کھلے ہوئے معجزات اور آپ کی نبوت پر اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اور مانتے ہیں تو ایسے بے جان پتھروں کو مانتے ہیں جن میں نہ حس ہے نہ شعور، خود اپنے نفع ونقصان پر بھی قادر نہیں دوسروں کو کیا نفع پہونچا سکتے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا، قرآن نے وجہ اس تعجب کی بالتصریح بیان نہیں کی، کیونکہ پچھلی آیات میں اللہ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ کے عجیب عجیب مظاہر بیان کر کے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسا قادرِ مطلق ہے جو ساری مخلوق کو عدم سے وجود میں

لایا، اور پھر ہر چیز کے وجود میں کیسی کیسی حکمتیں رکھیں کہ انسان ان کا ادراک واحاطہ بھی نہیں کر سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ بالکل عدم سے ایک چیز کو موجود کر سکتی ہے اس کو دوبارہ موجود کر دینا کیا مشکل ہے، انسان بھی جب کوئی نئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلی مرتبہ اس کو مشکل پیش آتی ہے اور اسی کو دوبارہ بنانا چاہے تو آسان ہو جاتا ہے۔

تو تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے تو قائل ہیں کہ پہلی مرتبہ تمام کائنات کو بے شمار حکمتوں کے ساتھ اسی نے پیدا فرمایا ہے پھر دوبارہ پیدا کرنے کو کیسے محال اور خلافِ عقل سمجھتے ہیں۔

شاید ان منکرین کے نزدیک بڑا اشکال یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد انسان کے اجزاء اور ذرات دنیا بھر میں منتشر ہو جاتے ہیں، ہوائیں ان کو کہیں سے کہیں لیجاتی ہیں، اور دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی یہ ذرات سارے جہان میں پھیل جاتے ہیں، پھر قیامت کے روز ان تمام ذرات کو جمع کس طرح کیا جائے گا اور پھر ان کو جمع کرکے دوبارہ زندہ کیسے کیا جائیگا؟

مگر وہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت جو وجود ان کو حاصل ہے اس میں کیا سارے جہان کے ذرات جمع نہیں، دنیا کے مشرق و مغرب کی چیزیں پانی ہوا اور ان کے لائے ہوئے ذرات انسان کی غذا میں شامل ہو کر اس کے بدن کا جزو بنتے ہیں، اس مسکین کو بسا اوقات خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایک لقمہ جو منھ تک لے جا رہا ہے اس میں کتنے ذرات افریقہ کے کتنے امریکہ کے اور کتنے مشرقی ممالک کے ہیں، تو جس ذات نے اپنی حکمتِ بالغہ اور تدبیر امور کے ذریعہ اس وقت ایک ایک انسان اور جانور کے وجود کو سارے جہان کے منتشر ذرات جمع کرکے کھڑا کر دیا ہے، کل اس کے لئے یہ کیوں مشکل ہو جائے گا کہ ان سب ذرات کو جمع کر ڈالے، جبکہ دنیا کی ساری طاقتیں ہوا اور پانی اور دوسری قوتیں سب اس کے حکم کے تابع اور مسخر ہیں، اس کے اشارہ پر ہوا اپنے اندر کے، اور پانی اپنے اندر کے اور فضاء اپنے اندر کے سب ذرات کو جمع کر دیں اس میں کیا اشکال ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور حکمِ حق کے تابع چلتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند
بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

خلاصہ یہ ہے کہ کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود جس طرح ان کا نبوت سے انکار قابلِ تعجب ہے اس سے زیادہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حشر کے دن سے انکار تعجب

کی چیز ہے۔

اس کے بعد ان معاند منکرین کی سزا کا ذکر کیا گیا ہو کہ یہ لوگ صرف آپؐ ہی کا انکار نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت اپنے رب کا انکار کرتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہوگی کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

دوسرا شبہ منکرین کا یہ تھا کہ اگر فی الواقع آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں تو نبی کی مخالفت پر جو عذاب کی وعیدیں آپؐ سناتے ہیں وہ عذاب آتا کیوں نہیں، اس کا جواب دوسری آیت میں یہ دیا گیا

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ "یعنی یہ لوگ ہمیشہ عافیت کی میعاد ختم ہونے سے پہلے آپؐ سے مصیبت کے نازل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں (کہ اگر آپ نبی ہیں تو فوری عذاب منگا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے کو بہت ہی بعید یا ناممکن سمجھتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے دوسرے کافروں پر بہت سے واقعات عذاب کے گذر چکے ہیں جن کا سب لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے، تو ان پر عذاب آجانا کیا مستبعد ہے، یہاں لفظ مَثُلٰت مَثُلَۃ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کردے، اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے۔

پھر فرمایا کہ بیشک آپؐ کا رب لوگوں کے گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود بڑی مغفرت و رحمت والا بھی ہے، اور جو لوگ اس مغفرت و رحمت سے فائدہ نہ اٹھائیں، اپنی سرکشی و نافرمانی پر جمے رہیں ان کے لئے سخت عذاب دینے والا بھی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے غفور و رحیم ہونے سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں، کہ ہم پر عذاب آہی نہیں سکتا۔

تیسرا شبہ ان کفار کا یہ تھا کہ اگرچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ہم دیکھ چکے ہیں، لیکن جن خاص خاص قسم کے معجزات کا ہم نے مطالبہ کیا ہے وہ کیوں ظاہر نہیں کرتے؟ اس کا جواب تیسری آیت میں یہ دیا گیا ہے:۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ "یعنی یہ کفار آپؐ کی نبوت پر اعتراض کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ اُن پر خاص معجزہ جس کو طلب کرتے ہیں وہ کیوں نازل نہیں کیا گیا، سو اس کا جواب واضح ہے کہ معجزہ ظاہر کرنا پیغمبر اور نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست وہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، وہ اپنی حکمت سے جس وقت جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، وہ کسی کے مطالبہ اور خواہش کے پابند نہیں، اسی لئے فرمایا اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ، یعنی

آپ کافروں کو خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والے ہیں، معجزہ ظاہر کرنا آپ کا کام نہیں۔
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، یعنی ہر قوم کے لئے پچھلی امتوں میں ہادی ہوتے چلے آئے ہیں، آپ کوئی انوکھے نبی نہیں، سب ہی انبیاء کا وظیفہ یہ تھا کہ وہ قوم کو ہدایت کریں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں معجزات کا ظاہر کرنا کسی کے اختیار میں نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ جب اور جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔

کیا ہر قوم اور ہر ملک میں نبی آنا ضروری ہے؟ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطۂ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا خواہ وہ کوئی نبی ہو یا اس کے قائم مقام نبی کی دعوت کو پھیلانے والا ہو جیسا سورۂ یٰسٓ میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت و ہدایت کے لئے بھیجنے کا ذکر ہے، جو خود نبی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا مذکور ہے۔

اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی و رسول پیدا ہوا ہو البتہ دعوتِ رسول کے پہونچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے، اور پھر یہاں بے شمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

یہاں تک تین آیتوں میں نبوت کا انکار کرنے والوں کے شبہات کا جواب تھا، چوتھی آیت میں پھر وہی اصل مضمون توحید کا مذکور ہے، جس کا ذکر اس سورۃ کی ابتداء سے آ رہا ہے، ارشاد ہے
اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے لڑکا ہو یا لڑکی حسین ہے یا بدشکل، نیک ہے یا بد، اور جو کچھ ان عورتوں کے رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کہ کبھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے کبھی زیادہ اور کبھی جلدی پیدا ہوتا ہے کبھی دیر میں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے، کہ وہ عالم الغیب ہیں، تمام کائنات و مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرّہ کے بدلتے ہوئے حالات سے باخبر ہیں اس کے ساتھ ہی تخلیقِ انسانی کے ہر دَور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا ذکر ہے کہ حمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا دونوں یا کچھ بھی نہیں صرف پانی یا ہوا ہے، قرائن اور تخمینہ سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے، ایکسرے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو کھولنے سے قاصر ہے، اس کا حقیقی اور یقینی علم صرف

اللہ جل شانہ، ہی کو ہو سکتا ہے، اسی کا بیان ایک دوسری آیت میں ہے وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔

لفظ تَغِيضُ عربی زبان میں کم ہونے اور خشک ہونے کے معنی میں آتا ہے، آیت مذکورہ میں اس کے بالمقابل تَزْدَادُ کے لفظ نے متعین کر دیا کہ اس جگہ معنی کم ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ کمی یا بیشی ہوتی ہے اس کا علم صحیح بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس کمی اور بیشی سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی تعداد میں کمی بیشی ہو کہ حمل میں صرف ایک بچہ ہے یا زیادہ، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ پیدائش کی کمی بیشی مراد ہو کہ یہ حمل کتنے مہینے کتنے دن اور کتنے گھنٹوں میں پیدا ہو کر ایک انسان کو ظاہری وجود دے گا، اس کا یقینی علم بھی بجز اللہ جل شانہ، کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ زمانہ حمل میں جو خون عورت کو آجاتا ہے وہ حمل کی جسامت و صحت میں کمی کا باعث ہوتا ہے، تَغِيضُ الْأَرْحَامُ سے مراد یہ کمی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جتنے اقسام کمی کے ہیں آیت کے الفاظ سب پر حاوی ہیں، اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص انداز اور پیمانہ مقرر ہے، نہ اس سے کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہے کہ کتنے دن حمل میں رہے گا، پھر کتنے زمانہ تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہ، کا یہ بے مثال علم اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ﴿٩﴾ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر، برابر ہے تم میں جو

أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ

آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں

بِالنَّهَارِ ﴿١٠﴾ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ

پھرتا ہر دن کو، اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں

مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ؕ

اللہ کے حکم سے، اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو اُن کے جیوں میں ہے

وَإِذَآ أَرَادَ اللَّهُ بِقَوۡمٖ سُوٓءٗا فَلَا مَرَدَّ لَهُۥۚ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِۦ

اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی، اور کوئی نہیں اُن کا اس کے سوا

مِن وَالٍ ﴿١١﴾ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفٗا وَطَمَعٗا وَيُنشِئُ

مددگار، وہی ہے تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر کو اور امید کو اور اٹھاتا ہے

السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهِۦ وَالۡمَلَـٰٓئِكَةُ مِنۡ

بادل بھاری، اور پڑھتا ہے گرجنے والا خوبیاں اس کی اور سب فرشتے اس کے

خِيفَتِهِۦ وَيُرۡسِلُ الصَّوَٰعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَن يَشَآءُ وَهُمۡ

ڈر سے اور بھیجتا ہے کڑک بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ لوگ

يُجَٰدِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الۡمِحَالِ ﴿١٣﴾ لَهُۥ دَعۡوَةُ الۡحَقِّۖ

جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی آن سخت ہے، اسی کا پکارنا سچ ہے،

وَالَّذِينَ يَدۡعُونَ مِن دُونِهِۦ لَا يَسۡتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيۡءٍ إِلَّا

اور جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے

كَبَٰسِطِ كَفَّيۡهِ إِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَٰلِغِهِۦۚ وَمَا دُعَآءُ

پھیلا دیئے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اس تک، اور جتنی پکار ہے

الۡكَٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَٰلٖ ﴿١٤﴾ وَلِلَّهِ يَسۡجُدُ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَ

کافروں کی سب گمراہی ہے، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمان اور

الۡأَرۡضِ طَوۡعٗا وَكَرۡهٗا وَظِلَٰلُهُم بِالۡغُدُوِّ وَالۡأٓصَالِ ۩ ﴿١٥﴾

زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام۔

السجدة ۲

خلاصۂ تفسیر

وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے سب سے بڑا (اور) عالی شان ہے تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں (یعنی سب کو یکساں جانتا ہے اور

جیسا تم میں سے ہر شخص کو جانتا ہے اسی طرح ہر ایک کی حفاظت بھی کرتا ہے چنانچہ تم میں سے) ہر شخص (کی حفاظت) کے لئے کچھ فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا (بہت بلاؤں سے) اس کی حفاظت کرتے ہیں (اور اس سے کوئی یوں نہ سمجھ جائے کہ جب فرشتے ہمارے محافظ ہیں پھر جو چاہو کرو، معصیت خواہ کفر، کسی طرح عذاب نازل ہی نہ ہوگا، یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (ابتداءً تو کسی کو عذاب دیتا نہیں، چنانچہ اس کی عادت ہے کہ وہ) کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے (مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنی صلاحیت میں خلل ڈالنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر مصیبت وعقوبت تجویز کی جاتی ہے) اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں (وہ واقع ہو جاتی ہے) اور (ایسے وقت میں) کوئی خدا کے سوا (جن کی حفاظت کا ان کو زعم ہے) ان کا مددگار نہیں رہتا (حتیٰ کہ فرشتے بھی ان کی حفاظت نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی تو حفاظت اُن کے کام نہ آسکتی) وہ ایسا (عظیم الشان) ہے کہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہ بادلوں کو (بھی) بلند کرتا ہے جو پانی سے بھرے ہوتے ہیں اور رعد (فرشتہ) اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور (دوسرے) فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تحمید وتسبیح کرتے ہیں) اور وہ (زمین کی طرف) بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہے گرا دیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں باوجود اس کے ایسے عظیم الشان ہونے کے) جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑا شدید القوت ہے (کہ جس سے ڈرنا چاہئے مگر یہ لوگ ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور وہ ایسا مجیب الدعوات ہے) کہ سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے (کیونکہ اس کو قبول کرنے کی قدرت ہے) اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ (اپنے حوائج و مصائب میں) پکارتے ہیں وہ (بوجہ عدم قدرت کے) ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے، جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہو (اور اس کو اشارہ سے اپنی طرف بلا رہا ہو) تاکہ وہ (پانی) اس کے منہ تک (اُڑ کر) آجاوے اور وہ (از خود) اس کے منہ تک (کسی طرح) آنیوالا نہیں (پس جس طرح پانی ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہے اسی طرح ان کے معبود عاجز ہیں، اس لئے) کافروں کی (ان سے) درخواست کرنا محض بے اثر ہے اور (اللہ ہی ایسا قادر مطلق ہے کہ اسی) کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں

(بعضے) خوشی سے اور (بعضے) مجبوری سے (خوشی سے یہ کہ باختیار خود عبادت کرتے ہیں، اور مجبوری کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتا) اور اُن (زمین والوں) کے سایے بھی (سرخم کئے ہیں) صبح اور شام کے وقتوں میں (یعنی سایہ کو جتنا چاہیں بڑھائیں جتنا چاہیں گھٹائیں اور صبح وشام کے وقت چونکہ دراز ہونے اور گھٹنے کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اس لئے تخصیص کی گئی ورنہ سایہ بھی بایں معنی ہر طرح مطیع ہے)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے پہلے اللہ جل شانہ کی مخصوص صفات کمال کا سلسلہ چل رہا ہے، جو درحقیقت توحید کے دلائل ہیں، اس آیت میں فرمایا:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ - غیب سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی حواس سے غائب ہو، یعنی نہ آنکھوں سے اس کو دیکھا جاسکے نہ کانوں سے سُنا جاسکے، نہ ناک سے سونگھا جاسکے نہ زبان سے چکھا جاسکے، نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کیا جاسکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفتِ کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حاضر و موجود کو جانتا ہے۔

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہے کہ وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور اکبر ہے، کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کے لئے اجمالی طور پر بڑائی اور کبریائی کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اپنے قصورِ فہم سے اللہ تعالیٰ کو بھی عام انسانوں پر قیاس کرکے اللہ کے لئے ایسی صفات ثابت کرتے تھے جو اس کی شان سے بہت بعید ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ نے اللہ کے لئے بیٹا ثابت کیا، کسی نے اللہ کے لئے انسان کی طرح جسم اور اعضاء ثابت کئے، کسی نے جہت اور سمت کو ثابت کیا، حالانکہ وہ ان تمام حالات وصفات سے بالا و بلند اور منزہ ہے، قرآن کریم نے ان کی بیان کردہ صفات سے برأت کے لئے بار بار فرمایا سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ، یعنی پاک ہے اللہ اُن صفات سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

پہلے جملے عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ میں نیز اس سے پہلی آیت اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى میں اللہ جل شانہ کے کمالِ علمی کا بیان تھا، اس دوسرے جملے اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ میں کمال قدرت وعظمت کا ذکر ہے، کہ اس کی طاقت و قدرت انسانی تصورات سے بالاتر ہے، اس کے بعد کی آیت میں بھی اسی کمالِ علمی اور کمال قدرت کو ایک خاص انداز

سے بیان فرمایا ہے :

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ۔

اَسَرَّ الْقَوْلَ ، اسرار سے بنا ہے جس کے معنی خفیہ کلام اور جہر کے معنی علانیہ کلام کے ہیں جو کلام انسان کسی دوسرے کو سنانے کے لئے کرتا ہے اسے جہر کہتے ہیں ، اور جو خود اپنے آپ کو سنانے کے لئے کرتا ہے اس کو سِر کہا جاتا ہے ، مستخف کے معنی چھپنے والا ، سارب کے معنی آزادی اور بے فکری سے راستہ پر چلنے والا ۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کے علم محیط کی وجہ سے اس کے نزدیک خفیہ کلام کرنے والا اور بلند آواز سے کلام کرنے والا دونوں برابر ہیں ، وہ دونوں کے کلام کو یکساں طور پر سنتا اور جانتا ہے ، اسی طرح جو شخص رات کی اندھیری میں چھپا ہوا ہے ، اور جو دن کے اجالے میں کھلے راستے پر چل رہا ہے ، یہ دونوں اس کے علم اور قدرت کے اعتبار سے برابر ہیں ، کہ دونوں کے اندرونی اور ظاہری سب حالات اس کو یکساں معلوم ہیں ، اور دونوں پر اس کی قدرت یکساں حاوی ہے ، کوئی اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں ، اسی کا مزید بیان اگلی آیت میں اس طرح ہے ۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ

مُعَقِّبٰت ، معقبۃ کی جمع ہے ، اس جماعت کو جو دوسری جماعت کے پیچھے متصل آئے اس کو مُعَقِّبَہ یا متعقبہ کہا جاتا ہے ، مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ کے لفظی معنی ہیں دونوں ہاتھ کے درمیان ، مراد انسان کے سامنے کی جہت اور سمت ہے ، وَمِنْ خَلْفِهٖ پیچھے کی جانب مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ میں مِنْ بمعنی بار سببیت کے لئے ہے ، بِاَمْرِ اللّٰهِ کے معنی میں آیا ہے ، بعض قراءتوں میں یہ لفظ بامر اللہ منقول بھی ہے (روح)

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر شخص خواہ اپنے کلام کو چھپاتا ہے یا ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی طرح اپنے چلنے پھرنے کو رات کی تاریکیوں کے ذریعہ مخفی رکھنا چاہے یا کھلے بندوں سڑکوں پر پھرے ان سب انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے فرشتوں کی جماعتیں مقرر ہیں ، جو ان کے آگے اور پیچھے سے احاطہ کئے رہتے ہیں ، جن کی خدمت اور ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور وہ یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں ، ان کے ذمہ یہ کام سپرد ہے کہ وہ بحکمِ خداوندی انسانوں کی حفاظت کریں ۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں

ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے اور یہ دونوں جماعتیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں صبح کی نماز کے بعد رات کے محافظ رخصت ہوجاتے ہیں، دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں، اور عصر کی نماز کے بعد یہ رخصت ہوجاتے ہیں، رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آجاتے ہیں۔

ابو داؤد کی ایک حدیث میں بروایت علی مرتضیٰؓ مذکور ہے، کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گرجائے، یا کسی گڑھے اور غار میں نہ گرجائے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہونچائے، البتہ جب حکم الٰہی کسی انسان کو بلاء و مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافذ ہوجاتا ہے تو محافظ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی ایک حدیث سے بروایت عثمان غنیؓ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیاوی مصائب اور تکلیفوں ہی سے حفاظت نہیں بلکہ وہ انسان کو گناہوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، انسان کے دل میں نیکی اور خوفِ خدا کا داعیہ بیدار کرتے رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ گناہ سے بچے، اور اگر پھر بھی وہ فرشتوں کے الہام سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہی ہوجائے تو وہ اس کی دعاء اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ جلد توبہ کرکے گناہ سے پاک ہوجائے، پھر اگر وہ کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تب وہ اس کے نامۂ اعمال میں گناہ کا کام لکھدیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں، حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے یہ حفاظتِ خداوندی کا پہرہ ہٹادیا جائے تو جنّات ان کی زندگی وبال کردیں، لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اُسی وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیرِ الٰہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندہ کو مبتلا کرنا چاہیں تو یہ حفاظتی پہرا ہٹ جاتا ہے،

اسی کا بیان اگلی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ، "یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالتِ امن و عافیت کو آفت و مصیبت میں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اعمال و احوال کو بُرائی اور فساد میں تبدیل نہ کرلے، اور جب وہ اپنے حالات کو سرکشی اور نافرمانی سے بدلتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرز بدل دیتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کا بُرا چاہیں اور عذاب دینا چاہیں تو نہ پھر کوئی اس کو ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی حکم ربانی

کے خلاف ان کی مدد کو پہونچ سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے، لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اس کی اطاعت چھوڑ کر بدعملی بدکرداری اور سرکشی ہی اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں، پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب اُن پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ آیتِ مذکورہ میں تغییرِ احوال سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم اطاعت اور شکر گذاری چھوڑ کر اپنے حالات میں بُری تبدیلی پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرز رحمت و حفاظت کا بدل دیتے ہیں۔

اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے، اسی مفہوم میں یہ شعر مشہور ہے ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیتِ مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیتِ کریمہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الٰہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں، ؎

دادِ حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان اور سب قویٰ و اعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی ملی ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

البتہ انعامات کا استحقاق اور وعدہ بغیر اپنی سعی کے حاصل نہیں ہوتا، اور کسی قوم کو بغیر سعی و عمل کے انعامات کا انتظار کرتے رہنا خود فریبی کے مرادف ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے، جو تمھیں برق و بجلی دکھلاتا ہے جو انسان کے لئے خوف بھی بن سکتی ہے کہ جس جگہ پڑ جائے سب کچھ خاک کر ڈالے، اور طمع بھی ہوتی ہے کہ بجلی کی چمک کے بعد بارش آئے گی، جو انسان اور حیوانات کی زندگی کا سہارا ہے، اور وہی ذات پاک ہے جو بڑے بڑے بھاری بادل سمندر سے مان سون بنا کر اٹھاتا ہے، اور پھر ان پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو فضا میں بڑی سرعت کے ساتھ کہیں سے کہیں لے جاتا ہے، اور اپنے حکم قضاء و قدر کے مطابق جس زمین پر چاہتا ہے برساتا ہے۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ، یعنی تسبیح پڑھتا ہے رعد اللہ تعالیٰ کے حمد و شکر کی اور تسبیح پڑھتے ہیں فرشتے اس کے خوف سے، رعد، عرف و محاورہ میں بادل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے، اس کے تسبیح پڑھنے سے مراد وہی تسبیح ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن یہ تسبیح عام لوگ سُن نہیں سکتے۔

اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو بارش برسانے پر مسلط ہے اور مامور ہے، اس معنی کے اعتبار سے تسبیح پڑھنا ظاہر ہے۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ، صواعق، صاعقہ کی جمع ہے زمین پر گرنے والی بجلی کو صاعقہ کہا جاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ بجلیاں زمین پر بھیجتا ہے، جن کے ذریعہ جسکو چاہتا ہے جلا دیتا ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ، لفظ مِحال، بکسر میم حیلہ و تدبیر کے معنی میں ہے، اور عذاب و عقاب کے معنی میں بھی، اور قدرت کے معنی میں بھی، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کے معاملہ میں باہمی جھگڑے اور مجادلہ میں مبتلا ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوی تدبیر کرنے والے ہیں جس کے سامنے کسی کی چال نہیں چلتی۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہ دے اللہ، کہہ پھر کیا تم نے پکڑ رکھے ہیں

مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ

اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے اور برے کے، کہہ

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ

کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہو اندھیرا اور

النُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ

اُجالا کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ

عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

ہوگئی پیدائش ان کی نظر میں، کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست،

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ

اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق پھر اوپر لے آیا

السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ

وہ نالا جھاگ پھولا ہوا، اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے

ابْتِغَاۗءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ

زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی، یوں بیان کرتا ہے اللہ

الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا

حق اور باطل کو، سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں، اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے یوں) کہیے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار (یعنی موجد و مبقی یعنی خالق و حافظ) کون ہے (اور چونکہ اس کا جواب متعین ہے، اس لئے جواب بھی) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہے (پھر) آپ یہ کہیے کہ کیا (یہ دلائل توحید سن کر) پھر بھی تم نے خدا کے سوا دوسرے

مددگار (یعنی معبود بنا) قرار دے رکھے ہیں جو (بوجہ غایت عجز کے) خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے (اور پھر شرک کے ابطال اور توحید کے احقاق کے بعد اہل توحید و اہل شرک اور خود توحید و شرک کے درمیان اظہار فرق کے لئے) آپ یہ (بھی) کہئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے (یہ مثال ہے مشرک اور موحد کی) یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہے (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انھوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسا خدا (ان کے اعتراف کے موافق بھی) پیدا کرتا ہے پھر (اس وجہ سے) ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو (اور اس سے استدلال کیا ہو کہ جب دونوں یکساں خالق ہیں تو دونوں یکساں معبود بھی ہوں گے اس کے متعلق بھی) آپ (یہی) کہدیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی (اپنی ذات وصفات کمال میں) واحد ہے (اور سب مخلوقات پر) غالب ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر (اس پانی سے) نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے (یعنی چھوٹے نالے میں تھوڑا پانی اور بڑے نالے میں زیادہ پانی) پھر وہ سیلاب (کا پانی) خس و خاشاک کو بہا لایا، جو اس (پانی) کی (سطح کے) اوپر (آرہا) ہے (ایک کوڑا کرکٹ تو یہ ہے) اور جن چیزوں کو آگ کے اندر (رکھ کر) زیور یا اور اسباب (ظروف وغیرہ) بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آجاتا) ہے (پس ان دو مثالوں میں دو چیزیں ہیں، ایک کارآمد چیز کہ اصل پانی اور اصل مال ہے اور ایک ناکارہ چیز کہ کوڑا کرکٹ میل کچیل ہے غرض) اللہ تعالیٰ حق (یعنی توحید و ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر و شرک وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے (جس کی تکمیل اگلے مضمون سے ہوتی ہے) سو (ان دونوں مذکورہ مثالوں میں) جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے کارآمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے (اور جس طرح حق و باطل کی مثال بیان کی گئی) اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

حاصل دونوں مثالوں کا یہ ہے کہ جیسا کہ ان مثالوں میں میل کچیل برائے چندے اصلی چیز کے اوپر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار وہ پھینک دیا جاتا ہے، اور اصلی چیز رہ جاتی ہے، اسی طرح باطل گو چند روز حق کے اوپر غالب نظر آئے، لیکن آخر کار باطل محو اور مغلوب

ہوجاتا ہے اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے، کذا فی الجلالین۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا

جنھوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے، اور جنھوں نے اس کا حکم نہ مانا

لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا

اگر ان کے پاس ہو جو کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں اپنے

بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ

بدلہ میں ان لوگوں کے لئے ہے برا حساب، اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے، اور وہ بری

الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ

آرام کی جگہ ہے، بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے،

كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ

برابر ہو سکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہو، سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے، وہ لوگ جو پورا

يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ

کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو، اور وہ لوگ جو

يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا ملانا اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے،

وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ

اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا، اور وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا خوشی کو

وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

اپنے رب کی اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ

پوشیدہ اور ظاہر اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی ان لوگوں کے لئے

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ع ۱۱ ۲ ۸ النصف

لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ

ہی آخرت کا گھر، باغ ہیں رہنے کے داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوتے

اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ

ان کے باپ دادوں میں اور جوروؤں میں اور اولاد میں اور فرشتے آئیں گے ان کے

عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ

پاس ہر دروازے سے، کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا،

عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

سو خوب ملا عاقبت کا گھر۔

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا (اور توحید اور اطاعت کو اختیار کر لیا) ان کے واسطے اچھا بدلہ (یعنی جنت مقرر) ہے اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا (اور کفر و معصیت پر قائم رہے) ان کے پاس (قیامت کے دن) اگر تمام دنیا بھر کی چیزیں (موجود) ہوں اور (بلکہ) اس کے ساتھ اسی کے برابر اور بھی (مال و دولت) ہو تو سب اپنی رہائی کے لئے دے ڈالیں ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا، (جس کو دوسری آیت میں حساب عسیر فرمایا ہے) اور ان کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور وہ بُری قرارگاہ ہے جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ سب حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طرح ہو سکتا ہے جو کہ (اس علم سے محض) اندھا ہے (یعنی کافر و مؤمن برابر نہیں) پس نصیحت تو سمجھدار ہی لوگ قبول کرتے ہیں (اور) یہ (سمجھدار) لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انھوں نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں اور (اس) عہد کو توڑتے نہیں اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم کیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں (جو کفار کے ساتھ خاص ہوگا، اس لئے کفر سے بچتے ہیں) اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ اپنے رب کی رضامندی کے جویاں رہ کر (دین حق پر) مضبوط رہتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے چپکے بھی اور ظاہر کر کے بھی (جیسا موقع ہوتا ہے) خرچ کرتے ہیں اور (لوگوں کی) بدسلوکی کو (جو اُنکے

ساتھ کی جاوے) حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں (یعنی کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو کچھ خیال نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں) اس جہان میں (یعنی آخرت میں) نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتیں جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور اُن کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں گے (گو ان موصوفین کے درجہ کے نہ ہوں) وہ بھی (جنت میں انکی برکت سے اِنہی کے درجوں میں) داخل ہوں گے اور فرشتے ان کے پاس ہر (سمت کے) دروازہ سے آتے ہوں گے (اور یہ کہتے ہونگے) کہ تم (ہر آفت اور خطرہ سے) صحیح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم (دینِ حق پر) مضبوط رہے تھے، سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حق و باطل کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا تھا، مذکورہ آیات میں اہلِ حق اور اہلِ باطل کی علامات و صفات اور ان کے اچھے اور بُرے اعمال اور ان کی جزا و سزا کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں احکامِ ربانی کی تعمیل و اطاعت کرنے والوں کے لئے اچھے بدلے کا اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے عذابِ شدید کا ذکر ہے۔

دوسری آیت میں ان دونوں کی مثال بینا اور نابینا سے دی گئی ہے، اور اس کے آخر میں فرمایا اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ، یعنی اگرچہ بات واضح ہے مگر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں، جن کی عقلیں غفلت و معصیت نے بیکار کر رکھی ہیں وہ اتنے بڑے عظیم فرق کو بھی نہیں سمجھتے۔

تیسری آیت سے ان دونوں فریق کے خاص خاص اعمال اور علامات کا بیان شروع ہوا ہے، پہلے احکامِ الٰہیہ کے ماننے والوں کی صفات یہ ذکر فرمائی ہیں :- اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، مراد اس سے وہ تمام عہد و پیمان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لئے ہیں، جن میں سب سے پہلا وہ عہدِ ربوبیت ہے جو ازل میں تمام ارواح کو حاضر کر کے لیا گیا تھا، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" جس کے جواب میں سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا، بَلٰى یعنی کیوں نہیں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں، اسی طرح تمام احکامِ الٰہیہ کی اطاعت، تمام فرائض کی ادائیگی اور ناجائز چیزوں سے اجتناب کی منجانب اللہ وصیّت اور بندوں

کی طرف سے اس کا اقرار مختلف آیاتِ قرآن میں مذکور ہے۔

دوسری صفت وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ہے یعنی وہ کسی عہد و میثاق کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہیں جن کا ذکر ابھی پہلے جملے میں عَهْدُ اللهِ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اور وہ عہد بھی جو امت کے لوگ اپنے نبی و رسول سے کرتے ہیں، اور وہ معاہدے بھی جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔

ابو داؤد نے بروایت عوف ابن مالکؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے، اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندیٔ عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو کسی انسان سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھا دو، بلکہ خود سواری سے اُتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابۂ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور جذبۂ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں، اور اتفاق سے ان کے دخولِ مسجد کے وقت آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ "بیٹھ جاؤ" عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہو تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبۂ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اُسی جگہ بیٹھ گئے۔

تیسری صفت اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی یہ بتلائی گئی وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ، یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں"، اس کی مشہور تفسیر تو یہی ہے کہ رشتہ داری کے تعلقات قائم رکھنے اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے یہ لوگ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے ساتھ پچھلے انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان کو ملا دیتے ہیں۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ، یعنی یہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں

یہاں لفظ خوف کے بجائے خشیہ کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا خوف اس طرح کا نہیں جیسے درندہ جانور یا موذی انسان سے طبعًا خوف ہوا کرتا ہے، بلکہ ایسا خوف ہے جیسے اولاد کو ماں باپ کا، شاگرد کو استاد کا خوف عادۃً ہوتا ہے کہ اس کا منشا کسی ایذار رسانی کا خوف نہیں ہوتا، بلکہ عظمت و محبت کی وجہ سے خوف اس کا ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی قول و فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور مکروہ نہ ہوجائے، اسی لئے مقام مدح میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے خوف کا ذکر ہے عمومًا وہاں یہی لفظ خشیت کا استعمال ہوا ہے، کیونکہ خشیت اُسی خوف کو کہا جاتا ہے جو عظمت و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اگلے جملہ میں جہاں حساب کی سختی کا خوف بیان کیا گیا ہے وہاں خشیت کا لفظ نہیں بلکہ خوف ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد فرمایا:

وَيَخَافُونَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ، یعنی یہ لوگ بُرے حساب سے ڈرتے ہیں" بُرے حساب سے مراد حساب میں سختی اور جزرسی ہے، حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمتِ الٰہی سے ہو سکتی ہے، کہ حسابِ اعمال کے وقت اجمال اور عفو و درگذر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص سے بھی پورا پورا ذرہ ذرہ کا حساب لیلیا جائے اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و خطاء کبھی سرزد نہ ہوا ہو، یہ حساب کی سختی کا خوف نیک و فرمانبردار لوگوں کی پانچویں صفت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، یعنی وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر کرتے ہیں"

صبر کے معنی عربی زبان میں اس مفہوم سے بہت عام ہیں جو اردو زبان میں سمجھا جاتا ہے، کہ کسی مصیبت اور تکلیف پر صبر کریں، کیونکہ اس کے اصلی معنی خلافِ طبع چیز دل سے پریشان نہ ہونا، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام پر لگے رہنا ہے، اسی لئے اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، ایک صبر علی الطاعۃ، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر ثابت قدم رہنا دوسرے صبر عن المعصیۃ یعنی گناہوں سے بچنے پر ثابت قدم رہنا۔

صبر کے ساتھ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلقًا صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبرے انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیاری ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیر اختیاری کیفیت کا اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى، "یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صدمہ کے

وقت اختیار کر لیا جائے، ورنہ بعد میں تو کبھی نہ کبھی جبری طور پر انسان کو صبر آہی جاتا ہے، بلکہ قابلِ مدح وثنا وہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے خلافِ طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض و واجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات و مکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہو گیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کر کے واپس آگیا، تو یہ غیر اختیاری صبر کوئی مدح وثواب کی چیز نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔

ساتویں صفت اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ہے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا ہے، محض نماز پڑھنا نہیں، اسی لئے قرآن کریم میں عموماً نماز کا حکم اقامتِ صلوٰۃ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

آٹھویں صفت وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اللہ کے نام پر بھی خرچ کرتے ہیں،، اس میں اشارہ کیا گیا کہ تم سے جس مال زکوٰۃ وغیرہ کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہ کچھ تم سے نہیں مانگتا بلکہ اپنے ہی دیئے ہوئے رزق کا کچھ حصہ وہ بھی صرف ڈھائی فی صد جیسی قلیل وحقیر مقدار میں آپ سے مانگا جاتا ہے، جس کے دینے میں آپ کو طبعاً کوئی پس وپیش نہ ہونی چاہئے۔

مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً کی قید سے معلوم ہوا کہ صدقہ خیرات میں ہر جگہ اخفاء ہی مسنون نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا اظہار بھی درست وصحیح ہوتا ہے، اسی لئے علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا اعلان و اظہار ہی افضل و بہتر ہے اس کا اخفاء مناسب نہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی تلقین اور ترغیب ہو، البتہ نفلی صدقات کا خفیہ دینا افضل و بہتر ہے، جن احادیث میں خفیہ دینے کی فضیلت آئی ہے وہ نفلی صدقات ہی کے متعلق ہے۔

نویں صفت ہے یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی سے دشمنی کو دوستی سے، ظلم کو عفو و درگذر سے دفع کرتے ہیں، بُرائی کے جواب میں بُرائی سے پیش نہیں آتے، اور بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ گناہ کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، یعنی اگر کسی وقت کوئی خطاء و گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے بعد طاعت و عبادت کی کثرت اور اہتمام اتنا کرتے ہیں کہ اس سے پچھلا گناہ محو ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ بدی کے بعد نیکی کر لو، تو وہ بدی کو مٹا دے گی،، مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہو کر توبہ

کرلی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کرلینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کی یہ نو صفتیں بیان کرنے کے بعد ان کی جزاء یہ بیان فرمائی أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ، دار سے مراد دار آخرت ہے، یعنی انہی لوگوں کے لئے ہے دار آخرت کی فلاح، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دار سے مراد دار دنیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ نیک لوگوں کو اگرچہ اس دنیا میں تکلیفیں بھی پیش آتی ہیں مگر انجام کار دنیا میں بھی فلاح و کامیابی انہی کا حصہ ہوتا ہے،

آگے اسی عُقْبَى الدَّارِ یعنی دار آخرت کی فلاح کا بیان ہے، کہ وہ جَنّٰتُ عَدْنٍ ہوں گی جن میں وہ داخل ہوں گے، عدن کے معنی قیام و قرار کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان جنتوں سے کسی وقت ان کو نکالا نہ جائے گا، بلکہ ان میں ان کا قرار و قیام دائمی ہوگا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عدن وسط جنت کا نام ہے جو جنت کے مقامات میں بھی اعلیٰ مقام ہے۔

اس کے بعد ان حضرات کے لئے ایک اور انعام یہ ذکر فرمایا گیا کہ یہ انعام ربانی صرف ان لوگوں کی ذات تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ان کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں اور اولاد کو بھی اس میں حصہ ملے گا، شرط یہ ہے کہ وہ صالح ہوں جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مسلمان ہوں، اور مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں کا اپنا عمل اگرچہ اس مقام پر پہونچنے کے قابل نہ تھا، مگر اللہ کے مقبول بندوں کی رعایت اور برکت سے ان کو بھی اسی مقام بلند پر پہونچا دیا جائے گا۔

اس کے بعد دار آخرت میں ان کی فلاح و کامیابی کا مزید بیان یہ ہے کہ فرشتے ہر دروازہ سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمہارے صبر کی وجہ سے تمام تکلیفوں سے سلامتی ہے، اور یہ کیسا اچھا انجام ہے دار آخرت کا[1]

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ

اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں ایسے لوگ

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ

ان کے واسطے ہے لعنت اور ان کے لئے ہے بُرا گھر، اللہ کشادہ کرتا ہے

[1] ان آیات سے مستنبط شدہ مزید احکام و ہدایات (پ ۱۳) صفحہ ۱۹۷ پر آرہی ہیں۔ ناشر

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا

روزی جسکو چاہے اور تنگ کرتا ہے، اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاع حقیر، اور کہتے ہیں کافر

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ

کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے کہدے اللہ گمراہ کرتا ہے جسکو چاہے،

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ

اور راہ دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا، وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں

قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

ان کے دل اللہ کی یاد سے، سنتا ہے اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے، خوش حالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گذر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سنا دے تو

عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ

ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمن سے،

قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کرکے

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معاہدوں کو ان کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں، اور خدا تعالیٰ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی (یعنی ظاہری دولت و ثروت

کو دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ یہ لوگ موردِ رحمت ہیں، کیونکہ رزق کی تو یہ کیفیت ہے کہ) اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے، (اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے (رحمت و غضب کا یہ معیار نہیں) اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگانی پر (اور اسکے عیش و عشرت پر) اتراتے ہیں اور (ان کا اترانا بالکل فضول اور غلطی ہے، کیونکہ) یہ دنیوی زندگی (اور اس کی عیش و عشرت) آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک متاع قلیل کے اور کچھ بھی نہیں، اور یہ کافر لوگ (آپ کی نبوت میں طعن و اعتراض کرنے کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر کوئی معجزہ (ہمارے فرمائشی معجزوں میں سے) ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ کہہ دیجئے کہ واقعی (تمہاری ان بیہودہ فرمائشوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں (وجہ معلوم ہونے کی ظاہر ہے کہ باوجود معجزات کافیہ کے جن میں سب سے اعظم قرآن ہے پھر فضول باتیں کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسمت ہی میں گمراہی لکھی ہے) اور (جس طرح ان معاندین کو قرآن جو اعظم معجزات ہے ہدایت کے لئے کافی نہ ہوا اور گمراہی ان کو نصیب ہوئی اسی طرح) جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے (اور طریق حق کا طالب ہوتا ہے جس کا مصداق آگے آتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تَطْمَئِنُّ الخ) اس کو اپنی طرف (رسائی دینے کے لئے) ہدایت کر دیتے ہیں (اور گمراہی سے بچا لیتے ہیں) مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے (جس کی بڑی فرد قرآن ہے) ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے (جس کی بڑی فرد ایمان ہے، یعنی وہ قرآن کے اعجاز کو دلالت علی النبوۃ کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور واہی تباہی فرمائش نہیں کرتے پھر خدا کی یاد اور طاعت میں ان کو ایسی رغبت ہوتی ہے کہ متاعِ حیاتِ دنیا سے مثل کفار کے ان کو رغبت اور فرحت نہیں ہوتی اور) خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (کی ایسی ہی خاصیت ہے کہ اس) سے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے (یعنی جس مرتبے کا ذکر ہو اسی مرتبہ کا اطمینان، چنانچہ قرآن سے ایمان اور اعمال صالحہ سے طاعت کا شدت تعلق اور توجہ الی اللہ میسر ہوتا ہے، غرض) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے (جن کا ذکر اوپر ہوا) ان کے لئے (دنیا میں) خوشحالی اور (آخرت میں) نیک انجامی ہے (جس کو دوسری آیت میں فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ الخ سے تعبیر فرمایا ہے اسی طرح) ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ اس (امت) سے پہلے اور بہت سی امتیں گذر چکی ہیں (اور آپ کو ان کی طرف اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ آپ انکو وہ کتاب پڑھ کر سنا دیں جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہے اور (ان کو چاہئے تھا کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے اور اس کتاب پر کہ وہ معجزہ بھی ہے ایمان لے آتے مگر) وہ لوگ ایسے بڑے رحمت والے کی ناسپاسی کرتے ہیں (اور قرآن پر ایمان نہیں لاتے) آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی ضرر

نہیں کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ مخالفت کروگے، سو اس سے مجھ کو اس لئے اندیشہ نہیں کہ) وہ میرا مربی اور نگہبان ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (پس لامحالہ وہ کامل الصفات ہوگا اور حفاظت کے لئے کافی ہوگا اس لئے) میں نے اسی پر بھروسہ کرلیا اور اسی کے پاس مجھ کو جانا ہے (خلاصہ یہ کہ میری حفاظت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے تم مخالفت کرکے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ تمھارا ہی ضرر ہے)۔

معارف و مسائل

شروع رکوع میں کُل انسانوں کی دو قسم کرکے بتلایا گیا تھا کہ ان میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں کچھ نافرمان، پھر فرمانبردار بندوں کی چند صفات و علامات بیان کی گئیں، اور آخرت میں اُن کے لئے بہترین جزاء کا ذکر کیا گیا۔

اب دوسری قسم کے لوگوں کی علامات و صفات اور ان کی سزاء کا بیان ان آیات میں ہے، اس میں ان سرکش اور نافرمان بندوں کی ایک خصلت تو یہ بتلائی گئی:

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ، "یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں"، اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں آکر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور معبود بنا بیٹھے۔

اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ضمن میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آجاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے۔

دوسری خصلت ان نافرمان بندوں کی یہ بتلائی گئی:

وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ، "یعنی یہ لوگ اُن تعلقات کو قطع کر دیتے ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان میں انسان کا وہ تعلق بھی شامل ہے جو اس کو اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس تعلق کا قطع کرنا یہی ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے، اور رشتہ داری کے وہ تعلقات بھی اس میں شامل ہیں

جن کو قائم رکھنے اور اُن کے حقوق ادا کرنے کی قرآن کریم میں جابجا ہدایت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ان حقوق و تعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں مثلاً ماں باپ، بھائی بہن، پڑوسی، اور دوسرے متعلقین کے جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے انسان پر عائد کئے ہیں، یہ لوگ ان کو ادا نہیں کرتے۔

تیسری خصلت یہ بتلائی ہے:

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ، "یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں" اور یہ تیسری خصلت درحقیقت پہلی ہی دو خصلتوں کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے عہد کی پرواہ نہیں کرتے اور کسی کے حقوق و تعلقات کی رعایت نہیں کرتے ظاہر ہے کہ ان کے اعمال و افعال دوسرے لوگوں کے لئے مضرت اور ایذا کا سبب بنیں گے، لڑائی جھگڑے، قتل و قتال کے بازار گرم ہوں گے یہی زمین کا سب سے بڑا فساد ہے۔

سرکش اور نافرمان بندوں کی یہ تین خصلتیں بتلانے کے بعد ان کی سزا یہ بتلائی گئی ہے:

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ، "یعنی ان کے لئے لعنت ہے اور بُرا ٹھکانا ہے"۔ لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دُور اور محروم ہونے کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کی رحمت سے دور ہونا سب عذابوں سے بڑا عذاب اور ساری مصیبتوں سے بڑی مصیبت ہے۔

احکام و ہدایات

مذکورہ آیات میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق خاص خاص احکام و ہدایات آئی ہیں، بعض صراحۃً اور بعض اشارۃً مثلاً:

(۱) اَلَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ، سے ثابت ہوا کہ جو معاہدہ کسی سے کرلیا جائے اس کی پابندی فرض اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے، خواہ وہ معاہدہ اللہ اور رسولؐ سے ہو جیسے عہدِ ایمانی یا مخلوقات میں کسی سے ہو، خواہ مسلمان سے یا کافر سے عہد شکنی بہرحال حرام ہے۔

(۲) وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم راہبانہ انداز سے ترکِ تعلقات کی نہیں بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق، دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو نظرانداز کر کے نفلی عبادت میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔

صلۂ رحمی اور رشتہ داری کے تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کی خبرگیری اور ادائے حقوق

کی تاکید قرآن کریم کی بے شمار آیات میں مذکور ہے۔

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں وسعت اور کاموں میں برکت عطا فرماویں تو اس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے، صلۂ رحمی کے معنی یہی ہیں کہ جن سے رشتہ داری کے خصوصی تعلقات ہیں ان کی خبرگیری اور بقدر گنجائش امداد و اعانت کرے۔

اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک گاؤں والا اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ مجھے یہ بتلا دیجئے کہ وہ عمل کونسا ہے جو مجھے جنت سے قریب اور جہنم سے دور کر دے، آپؐ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلۂ رحمی کرو (بغوی)

اور صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلۂ رحمی اتنی بات کا نام نہیں کہ تم دوسرے عزیز کے احسان کا بدلہ ادا کردو اور اس نے تمہارے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو تم اس پر احسان کردو، بلکہ اصل صلۂ رحمی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ دار عزیز تمہارے حقوق میں کوتاہی کرے، تم سے تعلق نہ رکھے تم پھر بھی محض اللہ کے لئے اس سے تعلق کو قائم رکھو، اور اس پر احسان کرو۔

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے تعلقات کو نبھانے ہی کے خیال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نسب ناموں کو محفوظ رکھو، جن کے ذریعہ تمہیں اپنی رشتہ داریاں محفوظ رہ سکیں، اور تم ان کے حقوق ادا کرسکو، پھر ارشاد فرمایا کہ صلۂ رحمی کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے)۔

اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑی صلۂ رحمی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں سے وہی تعلقات قائم رکھے جو باپ کے سامنے تھے۔

(۳) وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، سے معلوم ہوا کہ صبر کے جو فضائل قرآن و حدیث میں آئے ہیں کہ صبر کرنے والے کو اللہ جل شانہٗ کی معیت اور نصرت و امداد حاصل ہوتی ہے اور بے حساب اجر و ثواب ملتا ہے وہ سب اسی وقت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر اختیار کیا ہو، ورنہ یوں تو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے۔

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور ثابت قدم رہنے کے ہیں جس کی مختلف

صورتیں ہیں ایک مصیبت اور تکلیف پر صبر کہ گھبرائے نہیں اور مایوس نہ ہو اللہ تعالیٰ پر نظر رکھے اور امیدوار رہے، دوسرے طاعت پر صبر کہ احکامِ الٰہیہ کی پابندی اگرچہ نفس کو دشوار معلوم ہو اس پر قائم رہے، تیسرے معصیت اور برائیوں سے صبر کہ اگرچہ نفس کا تقاضا برائی کی طرف چلنے کا ہو لیکن خدا تعالیٰ کے خوف سے اس طرف نہ چلے۔

(۴) وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے درست ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ صدقات واجبہ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ کو علانیہ ادا کرے تاکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ادائیگی کی ترغیب ہو اور صدقات نافلہ جو واجب نہیں ان کو خفیہ ادا کرے تاکہ ریاکاری اور نام و نمود کے شبہ سے نجات ہو۔

(۵) يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ سے معلوم ہوا کہ ہر برائی کو دفع کرنا جو عقلی اور طبعی تقاضا ہے اسلام میں اس کا طریقہ یہ نہیں، کہ برائی کا جواب برائی سے دے کر دفع کیا جائے، بلکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو، جس نے تم پر ظلم کیا ہے تم اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو، جس نے تمہارے تعلق کا حق ادا نہیں کیا تم اس کا حق ادا کرو جس نے تم پر غصہ کیا تم اس کا جواب حلم و بردباری سے دو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دوست ہو جائیگا اور شریر بھی آپ کے سامنے نیک بن جائے گا۔

اور اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ گناہ کا بدلہ طاعت سے ادا کرو کہ اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ، تو اس سے تمہارا پچھلا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم سے کوئی برائی یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بعد تم نیک عمل کر لو، اس سے وہ گناہ مٹ جائے گا، (رواہ احمد بسند صحیح، مظہری) اس نیک عمل کی شرط یہ ہے کہ پچھلے گناہ سے توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنّت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ، بیوی اور اولاد کو بھی، شرط یہ ہے کہ یہ لوگ صالح یعنی مؤمن اور مسلمان ہوں کافر نہ ہوں، اگرچہ اعمالِ صالحہ میں اپنے اس بزرگ کے برابر نہ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقام جنّت میں پہونچا دیں گے جو اس بزرگ کا مقام ہو جیسے دوسری آیت میں مذکور ہے، اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ یعنی اپنے نیک بندوں کی ذریت

اور اولاد کو بھی انہی کے ساتھ کر دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا وہ آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع دے گا۔

(۶) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ، سے معلوم ہوا کہ آخرت کی نجات اور درجاتِ عالیہ سب اس کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ انسان دنیا میں صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو ادا کرنے اور اس کی نافرمانیوں سے بچنے پر اپنے نفس کو مجبور کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ، جس طرح پہلی آیات میں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی جزا یہ ذکر فرمائی ہے کہ ان کا مقام جنت میں ہوگا، فرشتے ان کو سلام کریں گے، اور بتلائیں گے کہ یہ جنّت کی دائمی نعمتیں سب تمھارے صبر و ثبات اور فرمانبرداری کا نتیجہ ہیں، اسی طرح اس آیت میں نافرمان سرکش لوگوں کا انجام بد یہ بتلایا ہے کہ اُن پر اللہ کی لعنت ہے، یعنی وہ رحمت سے دور ہیں، اور ان کے لئے جہنّم کا ٹھکانا مقرر ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ عہد شکنی اور رشتہ داروں عزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنّم کا سبب ہے؛ نعوذ باللہ منہ

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہووے اس سے زمین ،

أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ

یا بولیں اس سے مُردے تو کیا ہوتا ، بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں ، سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان

آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ

والوں کو اس پر کہ اگر چاہے اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں

كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ

کو ان کے کرتوت پر صدمہ یا اُترے گا اُن کے گھر سے نزدیک جب تک

حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ

کہ پہنچے وعدہ اللہ کا ، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ ، اور ٹھٹھا

ع ۴ / ۵ / ۱۰

اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ

کرچکے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا،

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

سو کیسا تھا میرا بدلہ ، بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے،

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ

اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک، کہہ اُن کا نام لو یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا

فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

زمین میں یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں یہ نہیں بلکہ بھلے سجھادیتے ہیں منکروں کو

مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ

ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو

مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

راہ بتانے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے پیغمبر اور اے مسلمانو! ان کافروں کی عناد کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی جو موجودہ حالت ہے کہ اس کا معجزہ ہونا غور و فکر پر موقوف ہے بجائے اس کے) اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹادیئے جاتے یا اس کے ذریعے سے زمین جلدی جلدی طے ہوجاتی یا اُس کے ذریعہ سے مُردوں کے ساتھ کسی کو باتیں کرادی جاتیں (یعنی مُردہ زندہ ہوجاتا اور کوئی اس سے باتیں کرلیتا اور یہ وہ معجزے ہیں جن کی فرمائش اکثر کفار کیا کرتے تھے، بعضے مطلقاً بعضے اس طرح سے کہ قرآن کو بحالتِ موجودہ تو ہم معجزہ مانتے نہیں، البتہ اگر قرآن سے ان خوارق کا ظہور ہو تو ہم اس کو معجزہ مان لیں، مطلب یہ کہ قرآن سے ایسے ایسے معجزات کا بھی ظہور ہوتا جس سے دونوں طرح کے لوگوں کی فرمائش پوری ہوجاتی، یعنی جو نفس خوارق مذکورہ کے مستدعی تھے اور جو ان کا ظہور قرآن سے چاہتے تھے) تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے (کیونکہ یہ اسباب مؤثر حقیقی نہیں، بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کو ہے (وہ جس کو توفیق عطا فرماتے ہیں وہی ایمان لاتا ہے

اور انکی عادت ہے کہ طالب کو توفیق دیتے ہیں اور معاند کو محروم رکھتے ہیں، اور چونکہ بعضے مسلمانوں کا جی چاہتا تھا کہ ان معجزات کا ظہور ہو جاوے تو شاید ایمان لے آدیں اس لئے آگے انکا جواب ہے کہ) کیا (یہ سنکر کہ یہ معاندین ایمان نہ لاوینگے اور یہ کہ سب اختیار خدا ہی کو ہے اور یہ کہ اسباب مؤثر حقیقی نہیں ہیں، کیا یہ سنکر) پھر بھی ایمان والوں کو اس بات میں دل جمعی نہیں ہوئی کہ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو تمام (دنیا بھر کے) آدمیوں کو ہدایت کر دیتا (مگر بعض حکمتوں سے مشیت نہیں ہوئی تو سب ایمان نہ لاویں گے جس کی بڑی وجہ عناد ہے، پھر ان معاندین کے ایمان لانے کے فکر میں کیوں لگے ہیں) اور (جب محقق ہو گیا کہ یہ لوگ ایمان نہ لاویں گے تو اس امر کا خیال آ سکتا ہے کہ پھر ان کو سزا کیوں نہیں دی جاتی اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) یہ (مکہ کے) کافر تو ہمیشہ (آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب اُن پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے (کہیں قتل، کہیں قید، کہیں ہزیمت و شکست) یا (بعض حادثہ اگر ان پر نہیں بھی پڑتا مگر) ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے (مثلاً کسی قوم پر آفت آئی اور ان کو خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں ہم پر بھی بلا نہ آوے) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) اللہ کا وعدہ آجاوے گا (یعنی آخرت کے عذاب کا سامنا ہو جاوے گا، جو کہ مرنے کے بعد شروع ہو جاوے گا اور) یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے (پس عذاب کا وقوع ان پر یقینی ہے گو بعض اوقات کچھ دیر سے سہی) اور (ان لوگوں کا یہ معاملہ تکذیب و استہزاء کچھ آپ کے ساتھ خاص نہیں، اور اسی طرح ان کے عذاب میں توقف ہونا کچھ ان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پہلے رُسُل اور ان کی امتوں کے ساتھ بھی ایسا ہو چکا ہے چنانچہ) بہت سے پیغمبروں کے ساتھ جو کہ آپ کے قبل ہو چکے ہیں، (کفار کی طرف سے) استہزاء ہو چکا ہے، پھر میں ان کافروں کو مہلت دیتا رہا پھر میں نے اُن پر دار و گیر کی سو (سمجھنے کی بات ہے کہ) میری سزا کس طرح کی تھی (یعنی نہایت سخت تھی، جب اللہ تعالیٰ کی شان معلوم ہو گئی کہ وہی مختار کل ہیں تو اس کے معلوم اور ثابت ہونے کے بعد) پھر (بھی) کیا جو (خدا) ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو اور ان لوگوں کے شرکاء برابر ہو سکتے ہیں اور (باوجود اس کے) ان لوگوں نے خدا کے لئے شرکاء تجویز کئے ہیں آپ کہئے کہ (ذرا) اُن (شرکاء) کے نام تو لو (میں بھی سنوں کون ہیں اور کیسے ہیں) کیا (تم حقیقۃً ان کو شرکاء سمجھ کر دعویٰ کرتے ہو تب تو یہ لازم آتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو کہ دنیا (بھر) میں اس (کے وجود) کی خبر اللہ تعالیٰ کو نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ اُسی کو موجود جانتے ہیں جو واقع میں موجود ہو، اور معدوم کو موجود نہیں جانتے، کیونکہ اس سے علم کا غلط ہونا لازم آتا ہے گو انکشاف میں دونوں یکساں ہیں، غرض ان کو حقیقی شریک کہنے سے یہ امر محال لازم آتا ہے، پس ان کا شریک ہونا بھی محال ہے) یا (یہ کہ ان کو حقیقۃً شریک نہیں کہتے بلکہ) محض ظاہری لفظ کے اعتبار

ان کو شریک کہتے ہو اور مصداق واقعی اس کا کہیں نہیں ہے، اگر یہ شق ثانی ہے تو ان کے شریک نہ ہونے کو از خود تسلیم کرتے ہو، پس مطلوب کہ بطلان اشراک ہے دونوں شقوں پر ثابت ہو گیا اول شق میں دلیل سے دوسری شق میں تمھاری تسلیم سے اور یہ تقریر باوجودیکہ اعلیٰ درجہ میں کافی ہے مگر یہ لوگ نہ مانیں گے) بلکہ ان کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں (جس سے تمسک کر کے مبتلائے شرک ہیں) مرغوب معلوم ہوتی ہیں اور (اسی وجہ سے) یہ لوگ راہِ (حق) سے محروم رہ گئے ہیں اور (اصل وہی بات ہے جو اوپر (بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ) سے مفہوم ہو چکی ہے یعنی) جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں (البتہ وہ اسی کو گمراہ رکھتا ہے جو باوجود وضوحِ حق کے عناد کرتا ہے)۔

معارف ومسائل

مشرکینِ مکہ کے سامنے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں آپ کی زندگی کے ہر شعبہ سے، پھر حیرت انگیز معجزات سے پوری طرح روشن ہو چکی تھیں، اور ان کا سردار ابوجہل یہ کہہ چکا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا خاندانی مقابلہ ہے ہم ان کی اس برتری کو کیسے قبول کر لیں کہ خدا کا رسولؐ ان میں سے آیا، اس لئے وہ کچھ بھی کہیں اور کیسی ہی نشانیاں دکھلائیں ہم ان پر کسی حال ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی لئے وہ ہر موقع پر اس ضد کا مظاہرہ لغو قسم کے سوالات اور فرمائشوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے، آیاتِ مذکورہ بھی ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں۔

تفسیر بغوی میں ہے کہ مشرکینِ مکہ جن میں ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ ابن امیہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، ایک روز بیت اللہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، اور عبداللہ بن امیہ کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اس نے کہا کہ اگر آپؐ یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ کی قوم اور ہم سب آپؐ کو رسول تسلیم کر لیں اور آپؐ کی پیروی کریں، تو ہمارے چند مطالبات ہیں اپنے قرآن کے ذریعہ ان کو پورا کر دیجئے تو ہم سب اسلام قبول کر لیں گے۔

مطالبات میں ایک تو یہ تھا کہ شہر مکہ کی زمین بڑی تنگ ہے، سب طرف پہاڑوں سے گھری ایک طولانی زمین ہے جس میں نہ کاشت اور زراعت کی گنجائش ہے، نہ باغات اور دوسری ضروریات کی، آپؐ معجزہ کے ذریعہ ان پہاڑوں کو دور ہٹا دیجئے، تاکہ مکہ کی زمین فراخ ہو جائے، آخر آپ ہی کے کہنے کے مطابق داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے گئے تھے، جب وہ تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کرتے تھے، آپؐ اپنے قول کے مطابق اللہ کے

نزدیک داؤدؑ سے کمتر تو نہیں ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے آپ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسخر کر کے زمین کے بڑے بڑے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیں کہ ہمیں شام و یمن وغیرہ کے سفر آسان ہو جائیں۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے آپ ان سے کچھ کم تو نہیں، آپ بھی ہمارے لئے ہمارے دادا قُصَیّ کو زندہ کر دیجئے، تاکہ ہم ان سے یہ دریافت کر سکیں کہ آپ کا دین سچا ہے یا نہیں، (مظہری بحوالہ بغوی و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ)

مذکور الصدر آیات میں ان معاندانہ مطالبوں کا یہ جواب دیا گیا:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۔

اس میں تسییر جبال سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹانا اور قطعت بہ الارض سے مراد مختصر وقت میں بڑی مسافت قطع کرنا اور کُلِّم بہ الموتیٰ سے مُردوں کو زندہ کر کے کلام کرنا مراد ہے اور لَوْ حرفِ شرط کا جواب بقرینۂ مقام محذوف ہے، یعنی لَمَا اٰمَنُوْا، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ایسا ہی مضمون اور اس کا یہی جواب مذکور ہے، وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا،

اور معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن کے ذریعہ بطور معجزہ کے ان کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں، کیونکہ وہ ان مطالبات سے پہلے ایسے معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں، جو ان کے مطلوبہ معجزات سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا پہاڑوں کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے اور تسخیر ہوا سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے، اسی طرح بے جان کنکریوں کا آپ کے دستِ مبارک میں بولنا اور تسبیح کرنا کسی مُردہ انسان کے دوبارہ زندہ ہو کر بولنے سے کہیں زیادہ عظیم معجزہ ہے، لیلۃ المعراج میں مسجدِ اقصیٰ اور پھر وہاں سے آسمانوں کا سفر اور بہت مختصر وقت میں واپسی تسخیر ہوا اور تختِ سلیمانی کے اعجاز سے کتنا زیادہ عظیم ہے، مگر یہ ظالم یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی جب ایمان نہ لائے تو اب ان مطالبات سے بھی ان کی نیت معلوم ہے کہ محض دفع الوقتی ہے، کچھ ماننا اور کرنا نہیں ہے، مشرکین کے ان مطالبات کا مقصد چونکہ یہی تھا کہ ہمارے مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو ہم کہیں گے کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کو ان کاموں پر قدرت نہیں، یا پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اللہ تعالیٰ کے یہاں مسموع

اور مقبول نہیں جس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول نہیں، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا، یعنی اللہ ہی کے لئے ہے اختیار سب کا سب، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مطالبات کا پورا نہ کرنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصالح عالم کو وہی جاننے والے ہیں، انھوں نے اپنی حکمت سے ان مطالبات کو پورا کرنا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ مطالبہ کرنے والوں کی ہٹ دھرمی اور بدنیتی ان کو معلوم ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ سب مطالبے پورے کر دیئے جائیں گے جب بھی یہ ایمان نہ لائیں گے۔

اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا، امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام نے جب مشرکین مکہ کے یہ مطالبات سنے تو یہ تمنا کرنے لگے کہ بطور معجزہ کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تو بہتر ہے، سارے مکہ والے مسلمان ہو جائیں گے اور اسلام کو بڑی قوت حاصل ہو جائے گی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ کیا اہلِ ایمان ان مشرکین کی حیلہ جوئی اور معاندانہ بحثوں کو دیکھنے جاننے کے باوجود اب تک ان کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے، کہ ایسی تمنائیں کرنے لگے، جب کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب ہی انسانوں کو ایسی ہدایت دیدیتا، کہ وہ مسلمان بنے بغیر نہ رہ سکتے مگر حکمت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ سب کو اسلام و ایمان پر مجبور کر دیا جائے، بلکہ حکمت یہی تھی کہ ہر شخص کا اپنا اختیار باقی رہے، اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کرے یا کفر کو۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قَارِعَۃ کے معنی مصیبت اور آفت کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان مشرکین کے مطالبات تو اس لئے منظور نہیں کئے گئے کہ ان کی بدنیتی اور ہٹ دھرمی معلوم تھی کہ پورے کرنے پر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں، یہ تو اللہ کے نزدیک اسی کے مستحق ہیں کہ ان پر دنیا میں بھی آفتیں اور مصیبتیں آئیں جیسا کہ اہلِ مکہ پر کبھی قحط کی مصیبت آئی، کبھی اسلامی غزوات بدر و اُحد وغیرہ میں اُن پر قتل اور قید ہونے کی آفت نازل ہوئی، کسی پر بجلی گر گئی، کوئی اور کسی بلا میں مبتلا ہوا، اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ یعنی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ مصیبت براہِ راست اُن پر نہیں آئے گی، بلکہ ان کے قریب والی بستیوں پر آئے گی، جس سے ان کو عبرت حاصل ہو اور ان کو اپنا انجامِ بد بھی نظر آنے لگے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ، یعنی ان مصائب و آفات کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہ ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی ٹل نہیں سکتا، مراد اس وعدہ سے فتحِ مکہ کا وعدہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر مختلف

قسم کی آفتیں آتی رہیں گی، یہاں تک کہ آخر میں مکہ مکرمہ فتح ہوگا، اور یہ سب لوگ مغلوب و مقہور ہو جائیں گے۔

آیت مذکورہ میں اَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ سے معلوم ہوا کہ جس قوم اور بستی کے قرب و جوار پر کوئی عذاب یا آفت و مصیبت آتی ہے تو اس میں حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ حکمت بھی مستور ہوتی ہے کہ آس پاس کی بستیوں کو بھی تنبیہ ہو جائے، اور وہ دوسروں سے عبرت حاصل کر کے اپنے اعمال درست کرلیں، تو یہ دوسروں کا عذاب اُن کے لئے رحمت بن جائے، ورنہ پھر ایک دن ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو دوسروں کا مشاہدہ میں آیا ہے۔

آج ہمارے ملک میں ہمارے قرب و جوار میں روز روز کسی جماعت، کسی بستی پر مختلف قسم کی آفتیں آتی رہتی ہیں، کہیں سیلاب کی تباہ کاری، کہیں ہوا کے طوفان، کہیں زلزلہ کا عذاب، کہیں کوئی اور آفت، قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق یہ صرف ان بستیوں اور قوموں ہی کی سزا نہیں ہوتی بلکہ قرب و جوار کے لوگوں کو بھی تنبیہ ہوتی ہے، پچھلے زمانہ میں اگرچہ علم و فن کی اتنی ٹیپ ٹاپ نہ تھی مگر لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا، کسی جگہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آجاتا تو خود وہ لوگ بھی اور اس کے قرب و جوار والے بھی سہم جاتے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے، اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، اور استغفار، صدقہ و خیرات کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے، اور آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ ان کی مصیبتیں بڑی آسانی سے ٹل جاتی تھیں، آج ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ مصیبت کے وقت بھی خدا ہی یاد نہیں آتا اور سب کچھ یاد آتا ہے، دنیا کے عام غیر مسلموں کی طرح ہماری نظریں بھی صرف مادی اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں، مسبّب الاسباب کی طرف توجہ کی اس وقت بھی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ اس طرح کے مسلسل حوادث ہیں جن سے دنیا ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ، یعنی ان کفار مشرکین پر دنیا میں بھی مختلف عذابوں اور آفتوں کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آپہونچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی خلاف نہیں کرتے۔

وعدہ سے مراد اس جگہ فتح مکہ ہے، جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا تھا، اور مطلب آیت کا یہ ہوا کہ آخر میں تو مکہ فتح ہو کر ان سب مشرکین کو زیر و زبر اور مغلوب و مقہور ہونا ہی ہے، اس سے پہلے بھی ان کے جرائم کی کچھ کچھ سزا ان کو ملتی رہے گی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَعْدُ اللّٰهِ سے مراد اس جگہ روزِ قیامت ہو، جس کا وعدہ سب پیغمبروں سے کیا ہوا ہے، اور ہمیشہ سے کیا ہوا ہے، اس روز تو ہر کافر مجرم اپنے کئے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔

مذکور الصدر واقعہ میں مشرکین کے معاندانہ سوالات اور ان کی ہٹ دھرمی سے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و تکلیف پہونچنے کا اندیشہ تھا اس لئے اگلی آیت میں آپ کی تسلّی کے لئے فرمایا گیا: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ، یہ حالات جو آپ کو درپیش ہیں کچھ آپ ہی کو پیش نہیں آئے، آپ سے پہلے انبیاء کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے کہ مجرموں اور منکروں کو ان کے جرم پر فوراً نہیں پکڑا گیا اور وہ انبیاء کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتے رہے، جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو پھر ان کو عذاب الٰہی نے پکڑ لیا اور کیسا پکڑا کہ کسی کو مقابلہ کی تاب نہ رہی۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ، اس آیت میں مشرکین کی جہالت اور بے عقلی کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ یہ کیسے بیوقوف ہیں کہ بے جان و بے شعور بتوں کو اس ذات پاک کے برابر ٹھہراتے ہیں جو ہر نفس پر نگراں اور اس کے اعمال وافعال کا محاسبہ کرنے والی ہے، پھر فرمایا کہ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ان کی اس جہالت ہی کو ان کی نظر میں مزیّن کر رکھا ہے وہ اسی کو بڑا کمال اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ ۖ وَمَا

اُن کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے، اور کوئی

لَهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿٣٤﴾ مَّثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ

نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، حال جنّت کا جس کا وعدہ ہے پرہیزگاروں سے

تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۚ تِلْكَ عُقْبَى

بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں، میوہ اس کا ہمیشہ ہو اور سایہ بھی، یہ بدلہ ہے اُن کا

الَّذِينَ اتَّقَوا ۖ وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ

جو ڈرتے رہے، اور بدلہ منکروں کا آگ ہے، اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے

الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَن

کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو نازل ہوا تجھ پر اور بعضے فرقے نہیں مانتے

يُنكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ

اس کی بعضی بات، کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں

بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا

اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا، اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم

عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

عربی زبان میں، اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا،

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝۳۷ۧ

کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا

خلاصۂ تفسیر

ان کافروں کے لئے دنیوی زندگانی میں (بھی) عذاب ہے (وہ قتل و قید و ذلت یا امراض و مصائب ہے) اور آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے (کیونکہ شدید بھی ہے اور دائم بھی ہے) اور اللہ (کے عذاب) سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا (اور) جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک و کفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ کہ اس (کی عمارات اور اشجار) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا، اور جن لوگوں کو ہم نے (آسمانی) کتاب (یعنی تورات و انجیل) دی ہے (اور وہ اس کو پورے طور سے مانتے تھے) وہ اس (کتاب) سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے (کیونکہ اس کی خبر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور خوش ہو کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں، جیسے یہود میں عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں نجاشیؓ اور ان کے فرستادے جن کا ذکر اور آیات میں بھی ہے) اور انہی کے گروہ میں بعضے ایسے ہیں کہ اس (کتاب) کے بعض حصہ کا (جس میں ان کی کتاب کے خلاف احکام ہیں) انکار کرتے ہیں (اور کفر کرتے ہیں) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ (احکام دو قسم کے ہیں اصول اور فروع، اگر تم اصول میں مخالفت ہو سو وہ سب شرائع میں مشترک ہیں چنانچہ) مجھ کو (توحید کے متعلق) صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں (اور نبوت کے متعلق یہ بات ہے کہ) میں (لوگوں کو) اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں (یعنی نبوت کا حاصل یہ ہے کہ میں داعی الی اللہ ہوں) اور (معاد کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ) اسی کی طرف مجھ کو (دنیا سے لوٹ کر) جانا ہے (یعنی اصول یہ تین ہیں، سو ان میں سے ایک بات بھی قابلِ انکار نہیں، چنانچہ توحید سب کے نزدیک مسلّم ہے، جیسا کہ یہی مضمون دوسری آیت میں ہے تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ

بَيَّنْنَا الخ، اور نبوت میں اپنے لئے مال وجاہ نہیں چاہتا جس پر انکار کی گنجائش ہو، محض دعوت الی اللہ کرتا ہوں، سو ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں جن کو تم بھی مانتے ہو، جیسا یہی مضمون دوسری جگہ بھی ہے مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ الخ اسی طرح معاد کا عقیدہ مشترک اور مسلّم اور غیر قابل انکار ہے، اور اگر فروع میں مخالف ہو تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ یوں دیتے ہیں کہ ہم نے جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص احکام دیئے) اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ خاص حکم ہے عربی زبان میں (عربی کی تصریح سے اشارہ ہوگیا دوسرے انبیاء کی دوسری زبانوں کی طرف، اور زبانوں کے اختلاف سے اشارہ ہوگیا اختلافِ اُمم کی طرف، تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ فروع میں اختلاف بسبب اختلافِ اُمم کے ہوا، کیونکہ مصالح اُمم کے ہر زمانہ میں جداگانہ ہیں، پس یہ اختلاف شرائع کا مقتضی مخالفت نہیں، چنانچہ خود تمہاری شرائع مسلّمہ میں بھی ایسا اختلاف فروع کا ہوا ہے، پھر تمہاری مخالفت و انکار کی کیا گنجائش ہے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ (بفرضِ محال) ان کے نفسانی خیالات کا (یعنی احکام منسوخہ یا احکامِ محرّفہ کا) اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس (احکامِ مقصودہ کا) علم (صحیح) پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (اور جب نبی کو ایسا خطاب کیا جا رہا ہے تو اور لوگ انکار کر کے کہاں رہیں گے، سو اس میں تعریض ہے اہل کتاب کے ساتھ، پس دونوں شقوں پر منکرین و مخالفین کا جواب ہوگیا)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ۭ

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جوروئیں اور اولاد

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ

اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر ایک وعدہ ہے

كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ

لکھا ہوا، مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اسی کے پاس ہے

الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

اصل کتاب، اور اگر دکھلاویں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو اٹھا لیویں

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي

سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے حساب لینا ، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں

الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے ، اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس

لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کا حکم ، اور وہ جلد لیتا ہے حساب ، اور فریب کرچکے ہیں جو اُن سے پہلے تھے ، سو

فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ

اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب ، جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی ، اور اب معلوم کئے لیتے ہیں

الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ

کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھر ، اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں

مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهُ

آیا ، کہہ دے اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں ، اور جس کو خبر

عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

ہے کتاب کی ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اہل کتاب میں سے بعضوں کا جو نبوت پر یہ طعن ہے کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے (یہ کونسا امر منافی رسالت ہے، ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں ہے أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ الخ) اور (چونکہ اختلافِ شرائع کا شبہ دیگر شبہات سے زیادہ مشہور اور پر محض اجمال کے ساتھ مذکور تھا، اس لئے اس کو آگے مکرر مفصل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی پر اختلاف شرائع کا شبہ کرتا ہے وہ درپردہ نبی کو مالکِ احکام سمجھتا ہے حالانکہ) کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بدون خدا کے حکم کے (اپنی طرف سے) لا سکے (بلکہ احکام کا مقرر ہونا اذن و اختیارِ خداوندی پر موقوف ہے ، اور

خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے یہ معمول مقرر ہے کہ) ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں (پھر دوسرے زمانے میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہو جاتے ہیں اور بعضے بحالہ باقی رہتے ہیں پس) خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و مستمر اس میں درج ہیں، وہ سب کی جامع اور گویا میزان الکل ہے، یعنی جہاں سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پس احکام سابقہ کے موافق یا مغایر احکام لانے کی کسی کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہو سکتی)

اور (یہ لوگ جو اس بناء پر انکارِ نبوت کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو انکارِ نبوت پر جس عذاب کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ عذاب کیوں نہیں نازل ہوتا، اس کے متعلق سن لیجئے کہ) جس بات کا (یعنی عذاب کا) ہم ان سے (انکارِ نبوت پر) وعدہ کر رہے ہیں، اس میں کا بعض واقعہ اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں کوئی عذاب ان پر نازل ہو جاوے) خواہ (قبل نزول اس عذاب کے) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر بعد میں وہ عذاب واقع ہو خواہ دنیا میں یا آخرت میں دونوں حالتوں میں آپ فکر و اہتمام نہ کریں کیونکہ) بس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور دارو گیر کرنا تو ہمارا کام ہے (آپ اس فکر میں کیوں پڑیں کہ اگر واقع ہو جائے تو بہتر ہے، شاید ایمان لے آویں، اور ان لوگوں پر بھی تعجب ہے کہ وقوعِ عذاب علی الکفر کا کیسے یک لخت انکار کر رہے ہیں) کیا (مقدماتِ عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم (فتح اسلام کے ذریعہ سے انکی) زمین کو ہر چہار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں (یعنی ان کی عملداری بسبب کثرتِ فتوحاتِ اسلامیہ کے روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، سو یہ بھی تو ایک قسم کا عذاب ہے جو مقدمہ ہے اصلی عذاب کا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ) اور اللہ (جو چاہتا ہے) حکم کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں (پس عذاب ادنیٰ خواہ عذابِ اکبر جو بھی ہو اس کو کوئی ان کے شرکاء یا غیر شرکاء میں سے رد نہیں کر سکتا) اور (اگر ان کو چندے مہلت بھی ہو گئی تو کیا ہے) وہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے (وقت کی دیر ہے، پھر فوراً ہی سزائے موعود شروع ہو جاوے گی) اور (یہ لوگ جو ایذاءِ رسول یا تنقیصِ اسلام میں طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں تو ان سے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ) ان سے پہلے جو (کافر) لوگ ہو چکے ہیں انھوں نے (بھی ان ہی اغراض کے لئے بڑی بڑی) تدبیریں کیں سو (کچھ بھی نہ ہوا کیونکہ) اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے (اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، سو اللہ نے ان کی وہ تدبیریں نہ چلنے دیں اور) اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو کچھ بھی کرتا ہے (پھر اس کو وقت پر

سزا دیتا ہے) اور (اسی طرح) ان کفار (کے اعمال کی بھی سب اس کو خبر ہے سو ان) کو (بھی) ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصہ میں ہے (آیا اُن کے یا مسلمانوں کے یعنی عنقریب ان کو اپنی بدانجامی اور سزائے اعمال معلوم ہو جاوے گی) اور یہ کافر لوگ (ان سزاؤں کو بھولے ہوئے) یوں کہہ رہے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے انکار بے معنی سے کیا ہوتا ہے) میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جن کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے (جس میں میری نبوت کی تصدیق ہے) کافی گواہ ہیں (مراد اس سے علماءِ اہلِ کتاب جو منصف تھے اور نبوّت کی پیشینگوئی دیکھ کر ایمان لے آتے تھے، مطلب یہ ہوا کہ میری نبوّت کی دو دلیلیں ہیں عقلی اور نقلی، عقلی تو یہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو معجزات عطا فرمائے جو دلیلِ نبوّت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے کے یہی معنی ہیں، اور نقلی یہ ہے کہ کتبِ سماویہ سابقہ میں اس کی خبر موجود ہے، اگر یقین نہ آئے تو منصف علماء سے پوچھ لو وہ ظاہر کر دیں گے، پس دلائل نقلیہ وعقلیہ کے ہوتے ہوئے نبوّت کا انکار کرنا بجز شقاوت کے اور کیا ہے، کسی عاقل کو اس سے شبہ نہ ہونا چاہئے)۔

معارف ومسائل

کفار ومشرکین کا رسول ونبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنسِ بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوّت و رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے تخیلات کے درپے ہوتے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال واخلاق سیکھیں، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے ہمجنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے، مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ، نہ اس کو نیند آوے نہ تکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا خصوصاً رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعددِ ازدواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوّت ورسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کی تو ابتداءِ آفرینش سے یہی سنّت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحبِ اہل وعیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گذرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوّت کے تم بھی قائل ہو،

وہ سب متعدد بیویاں رکھتے تھے، اور صاحبِ اولاد تھے، اس کو نبوت و رسالت یا بزرگی اور ولایت کے خلاف سمجھنا نادانی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں) اور فرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابلِ اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، یعنی کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ ایک آیت بھی بغیر حکمِ خدا تعالیٰ کے خود لا سکے۔

کفار و مشرکین جو معاندانہ سوالات ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے پیش کرتے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس زمانہ کے مشرکین نے پیش کئے، ان میں دو سوال بہت عام ہیں، ایک یہ کہ اللہ کی کتاب میں ہماری خواہش کے مطابق احکام نازل ہوا کریں، جیسے سورۂ یونس میں اُن کی یہ درخواست مذکور ہے کہ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ، یعنی یا تو آپ اس موجودہ قرآن کے بجائے بالکل ہی کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں ہمارے بتوں کی عبادت کو منع نہ کیا گیا ہو، یا پھر آپ خود ہی اس کے لائے ہوئے احکام کو بدل دیجئے، عذاب کی جگہ رحمت اور حرام کی جگہ حلال کر دیجئے۔

دوسرا سوال: انبیاء علیہم السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھلائیے تو ہم مسلمان ہوں، قرآن کریم کے اس جملہ میں لفظ آیۃ سے دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ اصطلاحِ قرآن میں قرآنی آیات کو بھی آیت کہا جاتا ہے اور معجزہ کو بھی، اسی لئے اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین میں سے بعض نے آیتِ قرآنی مراد لے کر یہ مطلب بیان کیا کہ کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے اپنی کتاب میں کوئی آیت بنا لے، اور بعض نے اس آیت سے مراد معجزہ لے کر یہ معنی قرار دیئے کہ کسی رسول و نبی کو اللہ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ جس وقت چاہے اور جس طرح کا چاہے معجزہ ظاہر کر دے تفسیر روح المعانی میں فرمایا کہ عموم مجاز کے قاعدہ پر اس جگہ یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، اور دونوں تفسیریں صحیح ہو سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہوا کہ ہمارے رسول سے قرآنی آیات کے بدلنے کا مطالبہ بے جا اور غلط ہے، ہم نے ایسا اختیار کسی رسول کو نہیں دیا، اسی طرح یہ مطالبہ کہ فلاں خاص قسم کا معجزہ دکھلائیے، یہ بھی حقیقتِ نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ کسی نبی رسول

کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق جو وہ چاہیں معجزہ ظاہر کردیں۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ، اجل کے معنی مدّتِ معینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے، اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا، اور اتنے دن زندہ رہے گا، کہاں کہاں جائے گا، کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکامِ قرآن میں نازل کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاندانہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و نبوّت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ، اُمّ الکتٰب کے لفظی معنی اصل کتاب کے ہیں، مراد اس سے وہ لوحِ محفوظ ہے جس میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔

معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے، اور اس محو و اثبات کے بعد جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے، جس پر نہ کسی کی دسترس ہے، نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

ائمۂ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؓ اور قتادہؒ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع کے محو و اثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکامِ شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں، اور اصل کتاب بہرحال ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے یہ ایک خاص میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بناء پر ہے، جب وہ میعاد گذر جائیگی، یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا، اس ام الکتٰب میں اس کی میعاد اور وقتِ مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ احکام خداوندی کبھی منسوخ نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ کوئی حکم جاری کرنے کے بعد منسوخ کرنا علامت اس کی ہے کہ حکم جاری کرنے والے کو حالات کا اندازہ نہ تھا اس لئے حالات دیکھنے کے بعد اس کو منسوخ کرنا پڑا، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہو، کیونکہ تقریر مذکور سے معلوم ہوگیا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اتنی مدت کے لئے جاری کیا گیا ہے، اس کے بعد بدلا جائے گا، اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مریض کا حال دیکھ کر کوئی حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا اس وقت کے مناسبِ حال تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کا یہ اثر ہوگا اس کے بعد اس دوا کو بدل کر فلاں دوسری دوا دی جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر کے مطابق آیت میں محو و اثبات سے مراد احکام کا منسوخ ہونا اور باقی رہنا ہے۔

اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سفیانؒ ثوری، وکیعؒ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی دوسری تفسیر نقل کی جس میں مضمونِ آیت کو نوشتۂ تقدیر کے متعلق قرار دیا ہے، اور معنی آیت کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق مخلوقات کی تقدیریں اور ہر شخص کی عمر اور رزق زندگی بھر میں ملنے والا رزق اور پیش آنے والی راحت یا مصیبت اور ان سب چیزوں کی مقداریں اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں، پھر بچہ کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بھی لکھوا دیا جاتا ہے، اور ہر سال شبِ قدر میں اس سال کے اندر پیش آنے والے معاملات کا چٹھا فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر فرد مخلوق کی عمر، رزق، حرکات و سکنات سب متعین ہیں، اور لکھے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس نوشتۂ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ، یعنی اصل کتاب جس کے مطابق محو و اثبات کے بعد انجام کار عمل ہونا ہے، وہ اللہ کے پاس ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق بڑھ جاتے ہیں، بعض سے گھٹ جاتے ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ صلۂ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے، اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور ماں باپ کی خدمت و اطاعت سے عمر بڑھ جاتی ہے، اور تقدیرِ الٰہی کو کوئی چیز بجز دعاء کے ٹال نہیں سکتی۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دعاء کی وجہ سے بھی تقدیر

بدلی جا سکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتاب تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدّل کسی عمل یا دُعا کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے مراد وہ کتابِ تقدیر ہو جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلّق کہلاتی ہے، جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو و اثبات ہوتا رہتا ہے، لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ نے بتلا دیا، کہ اس تقدیر معلّق کے اوپر ایک تقدیر مُبرَم ہے، جو اُمّ الکتاب میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ صرف علمِ الٰہی کے لئے مخصوص ہے، اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائط اعمال یا دعا کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں، اسی لئے وہ محو و اثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر)

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ، اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے آپ سے کئے ہیں کہ اسلام کی مکمل فتح ہوگی، اور کفر و کافر ذلیل و خوار ہوں گے، یہ تو ہو کر رہے گا، مگر آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ فتح مکمل کب ہوگی، ممکن ہے کہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وفات کے بعد ہو، اور آپ کے اطمینان کے لئے تو یہ بھی کافی ہے کہ آپ برابر دیکھ رہے ہیں کہ ہم کفار کی زمینوں کو ان کے اطراف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، یعنی یہ اطراف مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں، اس طرح ان کی مقبوضہ زمین گھٹتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے کشائش ہوتی جاتی ہے، اس طرح ایک دن اس فتح کی تکمیل بھی ہو جائے گی، حکم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

سُورۂ رعد تمام شد

سُوْرَةُ إِبْرَاهِيْمَ

سُوْرَةُ إِبْرَاهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی باون آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ ۱ اللّٰهِ

اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے رستہ پر اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے

الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ

جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور مصیبت ہے کافروں کو

مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝ ۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی

عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ

آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی،

اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ ۳

وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور۔

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبۂ تبلیغ میں کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لا دیں (روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلا دیں) جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور (جب یہ کتاب خدا کا راستہ بتلاتی ہے تو) بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں بلکہ) دنیوی زندگانی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (اس لئے دین کی جستجو نہیں کرتے) اور (نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں بلکہ) اللہ کی (اس) راہ (مذکور) سے روکتے ہیں اور اس میں کجی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں (جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کر سکیں) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں (یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ اور اس کے مضامین یہ قرآن کریم کی چودہویں سورۃ سورۂ ابراہیم شروع ہوتی ہے یہ سورۃ مکی ہے، قبل از ہجرت نازل ہوئی، بجز چند آیات کے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ مدنی ہیں یا مکی۔

اس سورۃ کے شروع میں رسالت و نبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۂ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ، الٓرٰ، اُن حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلفِ صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ھٰذا محذوف کی خبر قرار دی جائے، اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف، اور خطاب کی نسبت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا

ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبہ ہے، کہ اس کو خود ذات حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، دوسرے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ لفظ ناسؔ عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں، ظُلُمٰت ظلمۃ کی جمع ہے، جس کے معنی اندھیرے کے معروف و مشہور ہیں، یہاں ظُلُمٰت سے مراد کفر و شرک اور بداعمالیوں کی ظلمت ہے، اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے، اسی لئے لفظ ظُلُمٰت کو بصیغہ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اسی طرح بُرے اعمال بھی بیشمار ہیں، اور لفظ نُوْر کو بصیغہ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق واحد ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و شرک اور بُرے کاموں کی اندھیریوں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں اُن کے رب کی اجازت سے، یہاں لفظ رب لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبرؐ کے ذریعہ اُن کو اندھیریوں سے نجات دلائیں، اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شانِ ربوبیت سے اُن پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف خدا کا فعل ہے اس آیت میں اندھیری سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ "یعنی آپ باختیار خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے" اسی لئے اس آیت میں بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا، کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ کفر و شرک کی اندھیریوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپؐ کر سکتے ہیں۔

احکام و ہدایات

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوع انسانی کو بُرائیوں کی اندھیریوں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہی،

جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی اندازے سے ان کو دنیا میں بھی امن و امان اور عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے، اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے

مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو بُرائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر و شرک کے کیسے ہی خوبصورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دام میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدھی سنگٹھن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے، کہ ان کے دام میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف اُن گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد تبلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے:
یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے، اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو برائیوں سے پاک کرنا، اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنتِ رسول کی تعلیم دینا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے، اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں مؤثر ہونا بھی واضح ہے، اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں باذنِ خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، قرآن کریم

کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلا دی ہو اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے ظاہر ہے کہ یہ وہ اندھیری اور روشنی نہیں جو عام آنکھوں سے نظر آئے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے، جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے، نہ وہ مقصد تک پہونچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہونچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کرسکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نامِ حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذاتِ قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائگاں ہوگی بلکہ اس کا منزلِ مقصود پر پہونچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا اَللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ وہ ذات ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملکِ خاص ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، لفظ ویل عذاب شدید اور ہلاکت کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمتِ قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہے اس عذاب شدید سے جو اُن پر آنے والا ہے۔

خلاصۂ مفہوم | آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستہ کی روشنی میں لے آئے، مگر جو بدنصیب قرآن ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں، جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہے وہ بدنصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بری نہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۔ اس آیت میں منکرین قرآن کافروں کے تین حال بتلائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا کی زندگی کو بہ نسبت آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں، اور ترجیح دیتے ہیں، اسی لئے دنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا گوارا کر لیتے ہیں، اس میں اُن کے مرض کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ قرآن کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے منکر کیوں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنی اندھیری ہی پسند ہے، روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔

دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیریوں میں رہنے کو پسند کرتے ہی ہیں اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

قرآن فہمی میں بعض غلطیوں کی نشاندہی

تیسری خصلت یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بد باطنی اور بدعملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں، کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کجی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے، ابن کثیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے یعنی قرآن وسنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے، تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن وحدیث میں اس کے مؤیدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب وسنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ، اس جملہ میں ان کفار کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کی تین صفتیں اوپر بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دور جا پہنچے ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

احکام و مسائل

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحۃً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں، اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دور چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رُو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہو، ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔

(۲) دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔

(۳) قرآن و سنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ نعوذ باللہ منہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ ان کو سمجھائے پھر رستہ بھلاتا ہے اللہ

مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

جس کو چاہے اور رستہ دکھلا دیتا ہے جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہو جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کر لیا ہوگا، عجمی زبان میں کیوں نہیں تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دوسری کتب سماویہ سے عجمی ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ) ہم نے تمام (پہلے پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (ان کی زبان میں) ان سے (احکامِ الٰہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں) پھر (بیان کرنے کے بعد) جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول کر لیتا ہے) اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (پس غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کر سکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقتضی نہ ہوئیں)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہمزبان بھیجا ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہیہ انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو، اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام سمجھنے میں امت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی، اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملکِ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطۂ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان و مقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپ کے دائرۂ رسالت و نبوت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کی سب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں داخل ہوں گی، جیساکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا "یعنی اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف" اور صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا"

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی

اور اقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے، زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسبِ حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالمِ انسانی کا نشوونما سنِ کمال کو پہونچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین امام الانبیاء محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، "یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی"۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطّہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا، لیکن شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطّہ کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیلِ دین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی وجہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔

قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہو یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کے رسول ان کے ہمزبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی، لیکن غور و فکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اقوامِ دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جُدا جُدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوامِ عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوامِ عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے، وہ اس صورت سے حاصل نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن و حدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریفِ قرآن کے بے شمار راستے کھُل جاتے، اور قرآن کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرینِ قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ معجزانہ

خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہو جاتیں کہ کوئی نقطۂ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے، جو قرآن پر کسی درجہ میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت کا پوری اقوامِ دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسولؐ کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہونچائے اور پھیلائے جائیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپؐ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی کی خصوصیات اوّل یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے، اور جنّت، جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے، طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَّالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَّكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ، (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے) حافظ حدیث ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجۂ حسن سے کم نہیں، (فیض القدیر شرح جامع صغیر، ص ۱۷۹ ج ۱)

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہے۔“

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنّت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیرات ہو کر سریانی زبان پیدا ہو گئی۔

اس سے اُن روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کرکے پیغمبروں کو بتلایا اور انھوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہونچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسّرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کرکے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں، یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفتِ الٰہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام جس ملک میں پہونچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداعمالیوں کے شکار تھے، مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسولؐ کو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ، اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرما دیئے، جنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان، مال، اولاد سب کچھ قربان کیا اور آپ کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور فرمایا:
بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً، یعنی مجھ سے سُنی ہوئی بات کو امت تک پہنچا دو " جان نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پلے باندھا، اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گذرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت کا ایسا پیدا فرما دیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد نحو و صرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن و سنت کی جمع و تدوین پھر تفسیر و تشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی، اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک قوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہونچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ

اُجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر

صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ

کرنے والا ہے شکر گذار، اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے

عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ

اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب،

وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ

اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو اور اس میں مدد

بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان

شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

مانوگے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے،

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کروگے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے،

فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا۔

ع ۲ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر و معاصی کی) تاریکیوں سے (نکال کر ایمان و طاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات (نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے

(کیونکہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور نقمت یعنی عتاب کو پھر اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا) اور اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب (ہمارے اس ارشاد بالا کے موافق) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی ہو کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے کار خدمت لیں سو یہ بھی مثل ذبح ہی کے ایک عقوبت تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلاء تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلاء اور نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی نعمت و نقمت دونوں کی تذکیر فرما دی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم) وہ وقت یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرما دی کہ اگر (میری نعمتوں کو سن کر) تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کو سن کر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں اس کا احتمال ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ) بالکل بے احتیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (استکمال بالغیر کا وہاں احتمال نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ضرر محتمل ہی نہیں اور تم اپنا ضرر سن چکے ہو اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ اس لئے شکر کرنا ناشکری مت کرنا)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر و معصیت کی تاریکیوں سے ایمان و طاعت کی روشنی میں لے آئیں۔

لفظ آیات سے آیات تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ ان کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات خاص طور سے عطا فرمائے تھے جن میں عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا کئی جگہ قرآن میں مذکور ہے، آیات کو معجزات کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے ہوئے معجزات دے کر بھیجا گیا جن کو دیکھنے کے بعد کوئی شریف سمجھدار انسان اپنے انکار اور نافرمانی

پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک نکتہ اس آیت میں لفظ قوم آیا ہے کہ اپنی قوم کو اندھیری سے روشنی میں لائیں، لیکن یہی مضمون اسی سورۃ کی پہلی آیت میں جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے بیان کیا گیا تو وہاں قَوْمٌ کے بجائے لفظ نَاسْ استعمال کیا گیا، لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بعثت صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور مصری اقوام کی طرف تھی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے انسانوں کے لئے ہے۔

پھر ارشاد فرمایا وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ، یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو ایام اللہ یاد دلاؤ۔

ایام اللہ اَيَّامٌ، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ اَيَّام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوۂ بدر و اُحد اور احزاب و حُنین وغیرہ کے واقعات، یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں، جن میں بڑی بڑی قومیں زیر و زبر یا نیست و نابود ہوگئیں، اس صورت میں اَيَّام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجامِ بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی اَيَّام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرما جاتا ہے۔

قرآن مجید کا اُسلوب اور طریقِ اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں، یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہِ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں، ایک سزا سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں کہ پچھلی اُمتوں کے نافرمانوں کا انجامِ بد، ان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل و خوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کرکے اس سے بچ جائیں، اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے

مبذول ہوئی ہیں، مثلاً وادی تیہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے مَنّ وسلویٰ کا نزول پانی کی ضرورت ہوئی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں، اور صبّار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گذار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اَیّام اللہ یعنی پچھلے واقعات خواہ وہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات سے متعلق بہر حال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل اگرچہ ہر غور کرنے والے کی ہدایت کے لئے ہیں مگر بدنصیب کفار ان میں غور و فکر ہی نہیں کرتے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، فائدہ صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں، جو صبر و شکر کے جامع ہیں، مراد اس سے مؤمن ہیں، کیونکہ بیہقی نے بروایت انسؓ نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے دو حصے ہیں آدھا صبر اور آدھا شکر (مظہری)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے، اور صحیح مسلم اور مسند احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا ہے، جو اس کے لئے دین و دنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدۂ الٰہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت و راحت کا سامان ہو جاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝)

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال برا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی

اُبھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، سہ

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی،
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت و تکلیف کو بھی راحت و نعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی اُمت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسبِ منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعۂ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل و حلم کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہم ان کو اپنے علم و حلم کا ایک حصّہ عطا فرمادیں گے (مظہری)

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول و عمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجر عظیم کا یقین رکھے۔

دوسری آیت میں مضمون سابق کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص نعمت یاد دلائیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے ان کو ناجائز طور پر غلام بنایا ہوا تھا، اور پھر ان غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت کا سلوک نہ تھا، ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، اور صرف لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لئے پالا جاتا تھا؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فرعونی عذاب سے نجات دیدی۔

شکر اور ناشکری کے نتائج

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ، لفظ تاذن، اذن اور اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرما دیا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا یعنی ان کو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے

اور ان کے بقاء و دوام میں بھی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ مظہری)، اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے، یا اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں سستی کرے، اور کفرانِ نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہوجائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گذاروں کے لئے تو اجر و ثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لَاَزِيْدَنَّكُمْ لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لَاُعَذِّبَنَّكُمْ یعنی میں تمھیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہونچے، وہ بڑا سخت ہوتا ہے، اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتارِ عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔

قَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور جتنے آدمی زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگو تو یاد رکھو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو سب کی حمد و ثناء اور شکر و ناشکری سے بے نیاز اور بالاتر ہے اور وہ اپنی ذات میں حمید یعنی مستحق حمد ہے، اس کی حمد تم نہ کرو تو اللہ کے سارے فرشتے اور کائنات کا ذرّہ ذرہ کر رہا ہے۔

شکر کا فائدہ جو کچھ ہے وہ تمھارے ہی لئے ہے، اس لئے شکر گذاری کی تاکید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ بسبب رحمت تمھیں ہی فائدہ پہونچانے کے لئے ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ مع

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود

وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو آئے ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ

نشانیاں لے کر پھر لوٹائے انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾

دے کر بھیجا گیا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو خلجان میں ڈالنے والا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ

بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا

تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمھارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہو کہنے لگے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ

تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے

يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ

ہمارے باپ دادا سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی، ان کو کہا ان کے رسولوں نے

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ

ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر

عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى

چاہے، اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمھارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ

پر بھروسہ چاہئے ایمان والوں کو، اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور

هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری راہیں، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہئے

الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ ع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ

بھروسے والوں کو، اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو

ع ۲ ۱۴

مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں، تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے

الظّٰلِمِيْنَ ۝ۙ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ

ان ظالموں کو، اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں اُن کے پیچھے، یہ ملتا ہے

لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ

اس کو جو ڈرتا ہو کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہو میری عذاب کے وعدے سے، اور فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر اور نامراد

كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ۙ

ہوا ہر ایک سرکش ضدی۔

خلاصۂ تفسیر

(اے کفار مکہ) کیا تم کو ان لوگوں (کے واقعات) کی خبر (گو اجمالاً ہی) نہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہوگذرے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثمود (قوم صالح) اور جو لوگ اُن کے بعد ہوئے ہیں جن (کی مفصل حالت) کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، (کیونکہ ان کے حالات تفصیلات منضبط و منقول نہیں ہوئے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبر اُن کے پاس دلائل لے کر آئے سو ان قوموں (میں جو کفار تھے انھوں) نے اپنے ہاتھ اُن پیغمبروں کے مُنہ میں دیدیئے (یعنی مانتے تو کیا یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو (بزعم تمہارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید و ایمان) ہم اس کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو (یعنی وہی توحید و ایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو (ہم کو) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید و رسالت دونوں کا انکار ہے، توحید کا تو ظاہر ہے اور رسالت کا تدعونا میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم خود اپنی رائے سے دعوتِ توحید کر رہے ہو، مامور و مرسل من اللہ نہیں ہو) ان کے پیغمبروں نے (اس بات کے جواب میں) کہا کیا (تم کو) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (وانکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اس کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود دلیل اس کی ہستی اور وحدانیت کی ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کرنا بڑی تعجب کی بات ہے اور تم جو دعوت الی التوحید کو استقلالاً ہماری طرف منسوب کرتے ہو یہ

بھی محض غلط ہے گو توحید بوجہ حق ہونے کے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت کرے تو بھی زیبا ہے، لیکن محل متنازع فیہ میں تو ہماری دعوت بحکم خداوند تعالیٰ ہی ہے پس) وہ (ہی) تم کو (توحید کی طرف) بلا رہا ہے تاکہ (اس کے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارے (گذشتہ) گناہ معاف کردے اور (تمہاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر وخوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید علاوہ اس کے کہ فی نفسہٖ حق ہے تمہارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، اور اس جواب میں دونوں امر کے متعلق جواب ہوگیا، توحید کے متعلق بھی اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ الخ اور رسالت کے متعلق بھی يَدْعُوكُمْ میں جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے) پھر انھوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت منافی رسالت ہے، تم جو کہتے ہو وہ من اللہ نہیں ہے بلکہ تم (اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء واجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو، سو (اگر رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل وبینات مذکورہ کے اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب سے واضح تر ہو، اس میں نبوت پر تو کلام ظاہر ہے، اور يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا میں توحید کلام کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شرک کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس کو کرتے تھے) ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمہاری تقریر کے کئی جزو ہیں، انکار توحید دلیل فعل آباء، انکار نبوت مطالبہ سلطان مبین علاوہ بیناتِ سابقہ، سو امر اول کے متعلق فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، میں جواب ہوگیا، کیونکہ دلیل عقلی کے روبرو رسم دعوت کوئی چیز نہیں، امر دوم کے متعلق ہم اپنی بشریت کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہیں لیکن (بشریت اور نبوت میں تنافی نہیں، کیونکہ نبوت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان خداوندی ہے اور) اللہ (کو اختیار ہے کہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرما دے (اور احسان کے غیر بشر کے ساتھ مختص ہونے کی کوئی دلیل نہیں) اور (امر سوم کے متعلق یہ ہو کہ دعوٰی کے لئے جس میں دعوئِ نبوت بھی داخل ہے، نفس دلیل اور مطلق بینہ جو دعوٰی نبوت کی صورت میں معجزہ ہوگا ضرور ہے جو کہ پیش کی جاچکی ہے، رہا دلیل معجزۂ خاص جس کو سلطان مبین یعنی صاف دلیل سے تعبیر کر رہے ہو سو اولاً حسب قواعدِ مناظرہ ضروری نہیں ثانیاً) یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے (پس تمہارے تمامتر شبہات کا جواب ہوگیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمہاری مخالفت سے نہیں ڈرتے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب

ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے، (چونکہ ہم بھی با ایمان ہیں اور ایمان مقتضی ہے توکل کو اس لئے ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں) اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے، حالانکہ اس نے (ہمارے حال پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) رستے بتلادیئے (جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہئے) اور (ضرر خارجی سے تو یوں بے فکر ہوگئے، رہا ضرر داخلی کہ تمہاری مخالفت کا غم وحزن ہوتا ہو) تم نے (عناد وخلاف کر کے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (پس اس سے بھی ہم کو ضرر نہ رہا اور حاصل اس صبر کا بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہئے اور (ان تمام تر اتمام حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کردیں گے اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سرزمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ (وعدہ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو جس کی علامت خوفِ قیامت اور خوفِ وعید ہے سب کیلئے یہ وعدہ عذاب سے نجات دینے کا عام ہے) اور (پیغمبروں نے جو یہ مضمون کفار کو سنایا کہ تم نے دلائل کے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ جہل مرکب وعناد میں غرقاب تھے اس سے بھی نہ ڈرے بلکہ کمال بیباکی سے وہ) فیصلہ چاہنے لگے (جیسا آیت فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا وامثالہا سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) ضدی لوگ تھے وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہوگئے اور جو اُن کی مراد تھی کہ اپنے کو اہل حق سمجھ کر فتح وظفر چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی):

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا

پیچھے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا، گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور

يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ

گلے سے نہیں اُتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف سے اور وہ نہیں مرتا، اور

مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

اس کے پیچھے عذاب ہے سخت۔

خلاصۂ تفسیر

(جس جبار عنید کا اوپر ذکر ہوا ہے علاوہ دنیوی عذاب کے) اس کے آگے دوزخ (کا عذاب آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جاوے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو (غایت تشنگی کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور (غایت حرارت و کراہت کی وجہ سے) گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامانِ) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں (بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہ بھی نہیں کہ یہی عذاب مذکور ایک حالت پر رہے بلکہ) اس (شخص) کو اور (زیادہ) سخت عذاب کا سامنا (برابر) ہوا کرے گا (جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا کقولہٖ تعالیٰ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا)۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ راکھ کہ زور کی چلے اس پر

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ

ہوا آندھی کے دن، کچھ اُن کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے،

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا، تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور

الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ۙ

زمین جیسی چاہئے، اگر چاہے تم کو لیجاوے اور لائے کوئی پیدائش نئی،

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں، اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے پھر کہیں گے

الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ

کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے، سو کیا بچاؤ گے

مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ ، وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ

لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے ، اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں

مَّحِيْصٍ ۝۲۱ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ

خلاصی ، اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا

ع ۳ ۹ ۱۵

وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ

سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر جھوٹا کیا ، اور میری تم پر کچھ حکومت نہ

سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا

تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تمکو پھر تم نے مان لیا میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ

اپنے آپ کو ، نہ میں تمھاری فریاد کو پہنچوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچو ، میں منکر ہوں

بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۲

جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے ، البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

(ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہم کو نافع ہوں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ) جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اُڑنے میں بہت خفیف ہوتی ہے) جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جائے (کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام ونشان بھی نہ رہے گا اسی طرح) ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر و نفع کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہوگا (اس راکھ کی طرح ضائع و برباد جائے گا) یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے (کہ گمان تو ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر ظاہر ہو بد اور مضر جیسے عبادات اصنام یا غیر نافع جیسے اعتاق و صلۂ رحمی، اور چونکہ حق سے اس کو

بہت بُعد ہے اس لئے کہا گیا، پس اس طریق سے تو نجات کا احتمال نہ رہا، اور اگر ان کا یہ زعم ہو کہ قیامت ہی کا وجود محال ہے اور اس صورت میں عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ، کیا (اے مخاطب) تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی مشتمل بر منافع و مصالح) پیدا کیا ہے (اور اس سے قادر ہونا اس کا ظاہر ہے پس جب وہ قادرِ مطلق ہے تو) اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کردے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کردے اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کردینا کیا مشکل ہے) اور (اگر یہ وسوسہ ہو کہ ہمارے اکابر ہم کو بچالیں گے تو اس کی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن) خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی عوام وتابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی خواص ومتبوعین سے بطور ملامت وعتاب) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے (حتیٰ کہ دین کی جو راہ تم نے ہم کو بتلائی ہم اسی پر ہو لئے، اور آج ہم پر مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ہٹا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر بھی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی) راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں، (جیسا کہ تمہاری پریشانی فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ سے ظاہر ہے اور ہماری پریشانی تو لَوْ هَدَانَا اللّٰهُ سے ظاہر ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال و جواب سے یہ معلوم ہو گیا کہ طریق کفر کے اکابر بھی اپنے متبعین کے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ طریق بھی نجات کا محتمل نہ رہا) اور (اگر اس کا بھروسہ ہو کہ یہ معبودین غیر اللہ کام آدیں گے اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ) جب (قیامت میں) تمام مقدمات فیصل ہو چکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو (اہل دوزخ سب شیطان کے پاس کہ وہ بھی وہاں ہوگا جا کر ملامت کریں گے کہ کم بخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈبویا اُس وقت) شیطان (جواب میں) کہے گا کہ (مجھ پر تمہاری ملامت ناحق ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی اور کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور (میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور تمہارا طریقہ کفر بھی طریقہ نجات ہے) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائلِ قطعیہ قائم تھے، سو باوجود اس کے تم نے میرے وعدوں کو صحیح

اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا، تو اپنے ہاتھوں تم ڈوبے) اور (اگر تم یوں کہو کہ آخر سچے وعدوں کو جھوٹا سمجھنے اور جھوٹے وعدوں کو سچا سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوا تو بات یہ ہے کہ واقعی میں اغوار کے مرتبہ میں سبب ضرور ہوا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے اغوار کے بعد تم مختار تھے، یا مضطر و مجبور، سو ظاہر ہے کہ) میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو (گمراہی کی طرف) بلایا تھا سو تم نے (باختیار خود) میرا کہنا مان لیا (اگر نہ مانتے تو میں بزور تم کو گمراہ نہ کر سکتا تھا، جب یہ بات ثابت ہے) تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ اصل علت عذاب کی تمہارا ہی فعل ہے اور میرا فعل تو محض سبب ہے جو بعید اور غیر مستلزم ہی، پس ملامت کا تو یہ جواب ہے، اور اگر مقصود اس قول سے استعانت و استمداد ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا، خود ہی مبتلائے مصیبت و محتاج امداد ہو رہا ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے مدد چاہتا کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے بس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہو سکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے طریقۂ شرک کو حق سمجھتا تو بھی اس تعلق کی وجہ سے نصرت کا مطالبہ کرنے کی گنجائش بھی تھی لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی درباره عبادت اصنام وغیرہا میری ایسی اطاعت کرتے تھے جو اطاعت کہ خاصۂ حق تعالیٰ ہے، پس اصنام کو شریک ٹھہرانا بایں معنی شیطان کو شریک ٹھہرانا ہے، پس مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں نہ تم کو استمداد کا کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے (پس عذاب میں پڑے رہو نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو جو میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، پس گفتگو قطع کرو، یہ حاصل ہوا ابلیس کے جواب کا، پس اس سے معبودین غیر اللہ کا بھروسہ بھی قطع ہوا، کیونکہ جو ان معبودین کی عبادت کا اصل بانی و محرک ہے اور در حقیقت عبادت غیر اللہ سے زیادہ راضی وہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر قیامت کے دن دوزخ میں اہل نار اسی سے کہیں سنیں گے، اور کسی معبود غیر اللہ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب دیدیا تو اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے، پس نجات کفار کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اور یہی مضمون مقصود تھا)۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے نیک، باغوں میں جن کے نیچے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی باہم بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی، لقولہ تعالیٰ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ولقولہ تعالیٰ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ الآیۃ)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال بات ستھری جیسے ایک درخت ستھرا اس کی

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ

جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی ہے آسمان میں، لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں۔

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں (یعنی اب معلوم ہو گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمۂ طیبہ کی (یعنی کلمۂ توحید و ایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مراد کھجور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجاوے) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو، کوئی فصل ماری نہ جاتی ہو، اسی طرح کلمۂ توحید یعنی لا الٰہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے، یعنی اعتقاد جو مؤمن کے قلب میں استحکام کے ساتھ جاگیر ہے، اور اس کی کچھ شاخیں ہیں یعنی اعمالِ صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو بارگاہِ قبولیت میں آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ

(اس قسم کی) مثالیں لوگوں (کے بتلانے) کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ (لوگ معانی مقصود کو) خوب سمجھ لیں (کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب توضیح ہو جاتی ہے)

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ

اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندا اکھاڑ لیا اس کو زمین کے اوپر سے

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ

کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ، مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

میں اور آخرت میں اور بچلا دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ جو چاہے،

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ

تو نے نہ دیکھا ان کو جنھوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو

دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

تباہی کے گھر میں، جو دوزخ ہے داخل ہوں گے اس میں اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ع ۴ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمۂ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا باعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور (اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی رکھی ہوتی ہو، یہ أَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابل فرمایا اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تُؤْتِي أُكُلَهَا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمۂ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضمحل و مغلوب ہو جانا مشابہ اسی کے ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی تصریح سے کفر کا یہی اضمحلال و مغلوبیت بتلانا مقصود ہو، اور چونکہ اس کے اعمال مقبول نہیں ہوتے، اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضا میں نہیں پھیلیں، اور چونکہ اس کے

اعمال پر رضائے الٰہی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی ظاہر ہے، اور چونکہ قبول و رضا کا کافر میں بالکل احتمال نہیں اسی لئے مشبہ بہ کی جانب میں شاخوں اور پھل کا ذکر قطعاً متروک فرما دیا ہو، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے، یہ تو دونوں کی مثال ہوگئی، آگے اثر کا بیان ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمۂ طیبہ ثابت الاصل کی برکت) سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمۂ خبیثہ کی نحوست سے) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں پس) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہو کرتا ہے، کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی ان کا حال عجیب ہے) جنھوں نے بجائے نعمتِ الٰہی (کے شکر) کے کفر کیا (مراد اس سے کفار مکہ ہیں، کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی ان کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بُری جگہ ہے (اس میں اشارہ ہوگیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہوگا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ راکھ کی مانند ہیں، جس پر تیز اور سخت ہوا چل جائے تو اس کا ذرّہ ذرّہ ہوا میں منتشر ہوکر بے نشان ہو جائے، پھر کوئی اس کو جمع کر کے اس سے کوئی کام لینا چاہے تو ناممکن ہو جائے، مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِۨشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ، مطلب یہ ہے کہ کافر کے اعمال جو بظاہر اچھے بھی ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لئے سب ضائع اور بیکار ہیں۔

اس کے بعد مذکورہ آیات میں پہلے مؤمن اور اس کے اعمال کی ایک مثال دی گئی ہے پھر کفار و منافقین کے اعمال کی، پہلی آیت میں مؤمن اور اس کے اعمال کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی ہے جس کا تنہ مضبوط اور بلند ہو اور اس کی جڑیں زمین میں گہری گئی ہوئی ہوں اور زیرِ زمین پانی کے چشموں سے سیراب ہوتی ہوں، گہری جڑوں کی وجہ سے اس درخت کو استحکام اور مضبوطی بھی حاصل ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گر نہ جائے، اور سطح زمین سے دُور ہونے کی وجہ سے اس کا پھل گندگی سے پاک صاف رہے، دوسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کی شاخیں بلندی پر

آسمان کی طرف ہوں، تیسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کا پھل ہر وقت ہر حال میں کھایا جاتا ہو۔
یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر زیادہ اقرب یہی کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے، اور روایاتِ حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں، اس کی جڑوں کا زمین کی دُور گہرائی تک پہونچنا بھی معروف و معلوم ہے، اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے، جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی و اچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے، پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح و شام، دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے، اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے، اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے، اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں، اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے، اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔
اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرۃ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ حنظل کا درخت (مظہری)
اور مسند احمد میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپؐ کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے، اس وقت آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے ایک ایسا درخت بھی ہے جو مردِ مؤمن کی مثال ہے، (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر مجلس میں ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے اکابرِ صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی، پھر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔
مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے، جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے، مؤمنین کاملین صحابہ و تابعین بلکہ ہر زمانہ کے پختہ مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں

نہ جان کی پرواکی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت و نظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصۡلُهَا ثَابِتٌ کی مثال ہیں، تیسری وجہ یہ ہو کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں، مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح، تہلیل، قراءۃِ قرآن وغیرہ کرتا ہو یہ صبح شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت ہر حال، ہر موسم میں لیل و نہار کھایا جاتا ہو مؤمن کے اعمالِ صالحہ بھی ہر وقت، ہر موسم اور ہر حال میں صبح شام جاری ہیں، اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کارآمد ہے، مؤمن کا ہر قول و فعل اور حرکت و سکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع و مفید ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیماتِ خدا و رسول کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تُؤۡتِيۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍ میں اُکُل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حِین سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

کفار کی مثال اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شَجَرَةٍ خَبِيۡثَةٍ سے دی گئی، جس طرح كَلِمَةً طَيِّبَةً سے مراد قول لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ایمان ہے، اسی طرح كَلِمَةٍ خَبِيۡثَةٍ سے مراد کلماتِ کفر اور افعالِ کفر ہیں، شجرۂ خبیثہ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے، اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۂ خبیثہ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، اُجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ کے یہی معنی ہیں، کیونکہ اُجۡتُثَّتۡ کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔

کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں، ذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں، دوسرے دنیا کی گندگی سے متاثر ہوتے ہیں، تیسرے ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال و افعال عند اللہ کارآمد نہیں۔

ایمان کا خاص اثر اس کے بعد مؤمن کے ایمان اور کلمۂ طیبہ کا ایک خاص اثر دوسری

آیت میں بیان فرمایا ہے يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ یعنی مؤمن کا کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم درخت کی طرح ایک قول ثابت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، بشرطیکہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اور لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمۂ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے، صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

قبر کا عذاب و ثواب قرآن و حدیث سے ثابت ہے

حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مؤمن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید ربانی اس کلمہ پر قائم رہے گا، اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا، اور پھر فرمایا کہ ارشاد قرآنی يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، (یہ روایت حدیث حضرت براء بن عازبؓ نے نقل فرمائی)۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیر نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں ستّر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے، ان سب حضرات صحابۂ کرام نے آیتِ مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، رہے وہ عامیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے، سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی، مگر موجود ہے، جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں

گرفتار ہوکر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔
اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے، جب خالقِ کائنات نے اپنے رسول کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہونچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی خبر دیدی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔
آخر آیت میں فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کلمہ طیبہ اور قولِ ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے اُن کے لئے راحت کے سامان جمع ہوجاتے ہیں، مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت و امداد نہیں ملتی، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔
وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے" کوئی طاقت نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے، حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو جو چیز حاصل ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا، اسی طرح جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا، اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین و اعتماد نہ ہو تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ یعنی کیا آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں کفر اختیار کرلیا، اور اپنی قوم کو جو اُن کے کہنے پر چلتی تھی ہلاکت و بربادی کے مقام میں اُتار دیا، وہ جہنم میں جلیں گے، اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔
یہاں نِعْمَتَ اللّٰهِ سے اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں بھی مراد ہوسکتی ہیں، جو محسوس و مشاہد ہیں اور جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء، زمین اور مکان وغیرہ اور وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہوسکتی ہیں جو انسان کے رشد و ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں، مثلاً انبیاء اور آسمانی کتابیں اور جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی اپنے وجود کے ہر جوڑ میں پھر زمین اور اس کی بے شمار مخلوقات میں، آسمان اور اس کی ناقابلِ ادراک کائنات میں انسان کی ہدایات کا سامان ہیں۔
ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا اس کی نعمتوں کا شکر گذار ہوکر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا، مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کا

مقابلہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

احکام و ہدایات ان تینوں آیتوں میں توحید اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجامِ بد کا بیان ہوا ہے کہ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائیدِ ایزدی ساتھ ہوتی ہے، اور آخرت اور قبر میں بھی، اور اس سے انکار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عذاب سے بدل ڈالنے کے مرادف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ

اور ٹھہرائے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے، تو کہہ مزا اڑا لو پھر

مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا

تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی، کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں

الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ

نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ

آئے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی، اللہ وہ ہے جس نے بنائے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ

تمھاری میوے، اور کام میں کیا تمھارے کشتی کو کہ چلے

فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگا دیا تمھارے ندیوں کو، اور کام میں لگا دیا تمھارے سورج

وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ

اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمھارے رات اور دن کو، اور دیا تم کو

مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ

ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾

بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

ع ۱۷ / ۷ / ۵

خلاصہ تفسیر

اور (اوپر جو کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے شکرِ نعمت کی جگہ کفر کیا اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا اس کفر اور پہنچانے کا بیان یہ ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں (پس ساجھی قرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے) آپ (ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چندے عیش کرلو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالتِ کفر میں رہنا ہی کیونکہ ہر شخص کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور چندے کفر کرلو یہ تہدید ہے، اور مطلب "کیونکہ" کا یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے کفر سے باز آنا تمہارا مشکل ہے، خیر اور چندے گذار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہو ہی گا اور) جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفر نعمت کے وبال پر متنبہ کرکے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ (نعمتِ آلہی کے اس طرح شکر گذار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (حسب قواعد شرعیہ) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی (مطلب یہ کہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ یہی شکر ہے نعمت کا) اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (و قدرت) سے دریا میں چلے (اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ اسی سے پانی پیو اور آب پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ) اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں، (تاکہ تم کو روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ تم کو معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو) اور جو جو چیز تم نے مانگی (اور

وہ تمہارے مناسبِ حال ہوئی، تم کو ہر چیز دی اور (اشیائے مذکورہ ہی پر کیا منحصر ہے) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اور بالعکس کفر و معصیت کرنے لگتا ہے، جیسا اوپر آیا ہے اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ابراہیم کے شروع میں رسالت و نبوت اور معاد و آخرت کے متعلق مضامین تھے اس کے بعد توحید کی فضیلت اور کلمۂ کفر و شرک کی مذمت کا بیان مثالوں کے ذریعہ کیا گیا، پھر مشرکین کی مذمت اس بات پر کی گئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں کفار و مشرکین کی مذمت اور ان کے انجام بد کا ذکر ہے، دوسری آیت میں مومنین کی فضیلت اور ان کو ادائے شکر کے لئے کچھ احکامِ الٰہیہ کی تاکید کی گئی ہے، تیسری، چوتھی اور پانچویں آیات میں اللہ جل شانہٗ کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرما کر اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف نہ کریں۔

تفسیر و تشریح

اَنۡدَادٌ، نِدٌّ کی جمع ہے، جس کے معنی مثل اور برابر کے ہیں، بتوں کو انداد اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشرکین نے ان کو اپنے عمل میں خدا کی مثل یا برابر قرار دے رکھا تھا، تمتّع کے معنی کسی چیز سے چند روزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے اس غلط نظریہ پر نکیر ہے کہ انھوں نے بتوں کو خدا کے مثل اور اس کا شریک ٹھہرا دیا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو جتلا دیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے فرمایا کہ چند روزہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا لو، مگر تمہارا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

دوسری آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ (کفار مکہ نے تو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اب) آپ میرے مومن بندوں سے فرمادیں کہ نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، پوشیدہ اور علانیہ طور پر۔ اس آیت میں مومن بندوں کے لئے بڑی بشارت اور اعزاز ہے، اوّل تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندہ کہہ کر پکارا، پھر صفت ایمان کے ساتھ موصوف کیا، پھر ان کو دائمی راحت اور اعزاز دینے کی ترکیب بتلائی، کہ نماز کی پابندی کریں، نہ اس کے اوقات میں سستی کریں،

نہ آداب میں کوتاہی، اور اللہ ہی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی راہ میں بھی خرچ کیا کریں، خرچ کرنے کی دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ خیرات کریں یا اعلان و اظہار کے ساتھ کریں، بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفلی صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام و نمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدار نیت اور حالات پر ہے، اگر اعلان و اظہار میں نام و نمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہو جاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان و اظہار جائز ہے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ لفظ خِلَال، خُلَّۃ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں، جیسے قِتَال، دِفَاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کئے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقتِ فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں، اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہو تو اس کی قضاء کریں، اسی طرح آج مال تمہاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کر کے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو، لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی، نہ تمہارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے، نہ تمہاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا، جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کر سکو، اور اس دن میں کوئی بیع و شراء اور خرید و فروخت بھی نہ ہو سکے گی، کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے، کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھا سکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔

"اُس دن" سے مراد بظاہر حشر و قیامت کا دن ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موت کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں، نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے، نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔

احکام و ہدایات

اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض دنیاوی دوستیاں اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے

کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے، اور قرآن عزیز میں ارشاد ہے اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ "یعنی وہ لوگ جو دنیا میں باہم دوست تھے، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے، کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنا گناہ ڈال کر خود بری ہوجائیں، مگر وہ لوگ جو تقویٰ شعار ہیں" کیونکہ اہل تقویٰ وہاں بھی ایک دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کرسکیں گے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کی یاد دہانی کرا کے انسان کو اس کی عبادت واطاعت کی طرف دعوت دیگئی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے جس پر انسانی وجود کی ابتداء اور بقاء موقوف ہے، پھر آسمان سے پانی اتارا جس کے ذریعہ طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے تاکہ وہ تمہارا رزق بن سکیں، لفظ ثَمَرٰتُ، ثمرہ کی جمع ہے، ہر چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لئے لفظ ثمرات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے سہنے کا مکان بنتی ہیں، کیونکہ لفظ رزق جو اس آیت میں مذکور ہے وہ ان تمام ضروریات انسانی پر حاوی اور شامل ہے (مظہری)

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے ہی کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں، لفظ سَخَّرَ جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کردیا ہے، لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار وآلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے، کیونکہ جن چیزوں سے اُن میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی تم نے پیدا کی ہے نہ کرسکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرفات کرکے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کردیا، کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں، دَاۗىِٕـبَيْنِ، دَاَبَ سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا ان دونوں سیاروں کی عادت بنا دی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں،

کیونکہ اگر شمس وقمر کو اس طرح انسان کا مسخر کر دیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے، کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں، اس لئے رب العزت جل شانہ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمتِ خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع وغروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمھارے لئے مسخر کر دیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ، "یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اُس چیز میں سے جو تم نے مانگی"۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　؎　لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج، وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے، اگرچہ تم نے مانگا ہو لیکن اگر الفاظ کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تو ان میں بھی کچھ اشکال نہیں کہ عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو دے ہی دیا جاتا ہے، اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا، مگر علیم وخبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبالِ جان بنجائیگا ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے، مگر انسان اپنے قصورِ علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا، اس لئے غمگین ہوتا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، "یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر اس قدر ہیں کہ سب انسان مل کر ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، انسان کا اپنا وجود خود ایک عالمِ صغر ہے، اُس کی آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں اور بدن کے ہر جوڑ بلکہ ہر رگ وریشہ میں رب العزت کی غیر متناہی نعمتیں مستور ہیں، جن سے یہ چلتی پھرتی سیکڑوں نازک مشینوں کی عجیب وغریب فیکٹری ہر وقت مشغول بکار ہے، پھر آسمان و

زمین اور دونوں کی مخلوقات سمندروں پہاڑوں کی مخلوقات کہ آج کی جدید تحقیقات اور اس میں عمریں کھپانے والے ہزاروں ماہرین بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکے، پھر نعمتیں صرف وہی نہیں جو مثبت صورت میں عام طور پر نعمت سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ہر مرض، ہر تکلیف، ہر مصیبت ہر رنج و غم سے محفوظ رہنا الگ الگ مستقل نعمت ہے، ایک انسان کو کتنی قسم کی بیماریاں اور کتنی اقسام کی بدنی اور ذہنی تکلیفیں دنیا میں پیش آسکتی ہیں انہی کا شمار ایک انسان سے نہیں ہو سکتا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پورے عطیات اور نعمتوں کا شمار کس سے ہو سکتا ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بے شمار نعمتوں کے بدلہ میں بے شمار عبادت اور بے شمار شکر لازم ہوتا، مگر اللہ جل شانہٗ نے ضعیف البنیان انسان کی رعایت فرمائی، جب وہ حقیقت پر نظر کر کے یہ اعتراف کر لے کہ شکر واجب سے سبکدوش ہونا اس کی قدرت میں نہیں، تو اسی اعتراف کو ادائے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ایسے ہی اعتراف پر ارشاد فرمایا کہ الآن قد شکرت یا داؤد، یعنی یہ اعتراف کر لینا ہی ادائے شکر کے لئے کافی ہے۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے"، یعنی مقتضیٰ انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف و مصیبت پیش آئے تو صبر و سکون سے کام لے، زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے، اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے، وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت ہی ہے، اور جب کوئی راحت و نعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گذار ہو، مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہی، کہ ذرا مصیبت و تکلیف پیش آجائے، تو بے صبری میں مبتلا ہو جائیں، اور کہتے پھریں، اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں، اسی لئے مؤمنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صَبَّارٍ اور شَکُوْرٍ بتلائی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور

بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ

میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو، اے رب انھوں نے گمراہ کیا بہت

۱۷

النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٦﴾

لوگوں کو سو جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا ہی اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے،

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے

الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

پاس، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ

تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾

مائل ہوں اُن کی طرف اور روزی دے ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن

اے رب ہمارے تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی

شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٣٨﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ

چیز زمین میں اور نہ آسمان میں، شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا

لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٩﴾

مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسمٰعیل اور اسحٰق، بیشک میرا رب سنتا ہے دعاء کو

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی، اے رب میرے اور قبول

دُعَاءِ ﴿٤٠﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ

کر میری دُعاء، اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس

يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾ ع

دن قائم ہو حساب۔

ع ۶ ۱۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (حضرت

اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کو بحکم الٰہی میدانِ مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعا کے طور پر) کہا کہ اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیجئے (کہ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں، یعنی حرم کر دیجئے) اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت جہلاء میں شائع ہے) بچائے رکھئے (جیسا اب تک بچائے رکھا) اے میرے پروردگار (میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعا اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا، (یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے، اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دعا کرتا ہوں، اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا) پھر (میرے کہنے سننے کے بعد) جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے وعدۂ مغفرت ہے ہی) اور (جو شخص (اس باب میں) میرا کہنا نہ مانے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت (اور) کثیر الرحمۃ ہیں (ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں مقصود اس دعا سے شفاعت مؤمنین کے لئے اور طلبِ ہدایت غیر مؤمنین کے لئے ہے) اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو (یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو) آپ کے معظم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آئے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (بوجہ سنگستان ہونے کے) زراعت کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں اے ہمارے رب (بیت الحرام کے پاس اس لئے آباد کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہی) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے (کہ یہاں آکر رہیں سہیں تاکہ آبادی پر رونق ہو جاوے) اور (چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ (ان نعمتوں کا) شکر کریں، اے ہمارے رب (یہ دعائیں محض اپنی بندگی اور حاجتمندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور (ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا، تاکہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں، چنانچہ فرمایا) تمام حمد (وثناء) خدا کے لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت میں میرا رب دعا کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے (کہ عطائے اولاد کے متعلق میری یہ دعا رَبِّ هَبۡ لِيۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ قبول کر لی، پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ

دعائیں پیش کرتے ہیں) اے میرے رب (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے، اور جیسا اُن کے لئے اہتمام نماز میرا مطلوب ہے اسی طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے، دونوں کے لئے دعا کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعا سب کے لئے نہیں کر سکتا ہوں، پس ان مضامین پر نظر کر کے یہ دعا کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنیوالا رکھئے ، اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب اور میری (یہ) دعا قبول کیجئے (اور) اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے) ۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں عقیدۂ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی جہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ میں زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد تھا، اسی لئے دینِ ابراہیمی کو خاص طور پر دینِ حنیف کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلی ایک آیت اَلَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا میں قریشِ مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنھوں نے تقلیدِ آبائی کی بنا پر ایمان کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمہارے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تاکہ تقلید آبائی کے خوگر اسی پر نظر کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں (بحر محیط)

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد صرف ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں، انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دُہرائے جاتے ہیں۔

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دو دعائیں مذکور ہیں، اوّل رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، یعنی اے میرے پروردگار اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنا دیجئے، سورۂ

بقرہ میں بھی یہی دعاء مذکور ہے، مگر اس میں لفظ بَلَدْ بغیر الف لام کے بَلَدًا فرمایا ہے، جس کے معنی غیر معین شہر کے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ دعاء اُس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی، اس لئے عام الفاظ میں یہ دعاء کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنا دیجئے۔

اور دوسری دعاء اس وقت کی ہے جبکہ مکہ کی بستی بس چکی تھی، تو شہر مکہ کو متعین کر کے دعاء فرمائی، کہ اس کو جائے امن بنا دیجئے، دوسری دعاء یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بُت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، مگر یہاں حضرت خلیل ؑ نے اس دُعاء میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بُت پرستی سے بچانے کی دعاء کرنا تھا، اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شاملِ دعاء فرما لیا۔

اللہ جل شانہٗ نے اپنے خلیل کی دُعاء قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بُت پرستی سے محفوظ رہی، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہلِ مکہ تو عموماً اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان میں تو بُت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عُیَینَہ یہ دیا ہے کہ اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بُت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کر کے اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت وعظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اُٹھا لے گئے تھے، ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رُخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رُخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بُت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعاء کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بُت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر وصلاح سے محروم کر دیا۔

آخر آیت میں فرمایا فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"یعنی ان میں سے جو شخص میرا اتباع کرے یعنی ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جائے وہ تو میرا ہی ہے" مطلب یہ ہے کہ اس پر فضل و کرم کی امید تو ظاہر ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو آپ بہت مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، اس میں نافرمانی سے اگر عملی نافرمانی یعنی بدعملی مراد لی جائے تو معنی ظاہر ہیں، کہ آپ کے فضل سے ان کی بھی مغفرت کی امید ہے، اور اگر نافرمانی سے مراد کفر و انکار لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہونے اور ان کی شفاعت نہ کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہو چکا تھا، پھر ان کی مغفرت کی امید کا اظہار کرنا درست نہیں ہو سکتا، اس لئے بحر محیط میں فرمایا کہ اس جگہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کی سفارش یا دعاء کے الفاظ نہیں اختیار کئے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کی مغفرت کر دیں، البتہ پیغمبرانہ شفقت جس کے دامن میں کافر بھی رہتے ہیں اور ہر پیغمبر کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی کافر بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو اپنی اس طبعی خواہش کا اظہار اس عنوان سے کر دیا کہ "آپ تو بڑے غفور و رحیم ہیں" یوں نہیں فرمایا کہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے کافروں کے بارے میں فرمایا وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "یعنی اگر آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو آپ قوی اور حکمت والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں"

ان دونوں بزرگوں نے کافروں کے معاملہ میں سفارش پر اقدام تو اس لئے نہیں کیا کہ وہ ادب حق کے خلاف تھا، مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ ان کافروں پر آپ عذاب نازل کر دیں بلکہ ادب کے ساتھ ایک خاص عنوان سے ان کے بھی بخشے جانے کی طبعی خواہش کا اظہار کر دیا۔

احکام و ہدایات

دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف و خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن و اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت، کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال و دولت

کی بہتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت و عبادت اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کو کچھ سکون و اطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعاء میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی و اقتصادی اور دینی و اخروی سب داخل ہو گئیں، اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اس دعاء سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسبِ قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترکِ دنیا کے منافی نہیں۔

دوسری دعاء میں بھی بڑی جامعیت ہے، کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک و بت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دُعاء فرما دی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہو سکتا ہے، اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جا سکتے ہیں، اور اگر عبادتِ اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بُت ہے، اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعاء یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آ جاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

ہر خیالِ شہوتے در رہ بُتے ست

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور حکیمانہ دعاء اس طرح مذکور ہے کہ، رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ الآیۃ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت یعنی اہل و عیال کو ایک ایسے دامنِ کوہ میں ٹھہرا دیا ہے جس میں کوئی کھیتی وغیرہ نہیں ہو سکتی (اور بظاہر وہاں زندگی کا کوئی سامان نہیں) یہ دامنِ کوہ آپ کے عظمت والے گھر کے پاس ہے، تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں، اس لئے آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیں، کہ انکے اُنس اور آبادی کا سامان ہو جائے، اور ان کو ثمرات (پھل) عطا فرما دیجئے تاکہ

یہ لوگ شکر گذار ہوں۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعاء کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفانِ نوح میں بے نشان ہوگئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرما کر ان کو ملکِ شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبِ حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہِ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی، دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکِ شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگئے، بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق و دق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعاء سے ہوگا جو بعد میں کی گئی مگر حکمِ ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دیدیں، اور کچھ تسلّی کے الفاظ کہدیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان، مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا، تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کرسکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے، تو آ[illegible] دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے، تب حضرت ابرا[illegible]یم علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہؑ نے یہ سُن کر فرمایا اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا، "یعنی اب کوئی پرواہ نہیں، جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہونچ گئے، جہاں ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہوگئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعاء مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعاء کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے:-

دعاءِ ابراہیمی کے اسرار و حکم

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقامِ خلیل اللّٰہی کا حق ادا کیا، کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملکِ شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لق و دق میدان میں اہلیہ اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربّانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی، اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جاکر تسلّی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربّانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل و عیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن و اطمینان کے ساتھ رہنے کی دُعاء فرمائی، ان کی راحت کا سامان کر دیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیلِ حکم کے ساتھ جو دعاء کی جائے گی بارگاہِ کریم سے وہ ہرگز رَد نہ ہوگی، اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بیکس و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے، بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریاتِ زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہلِ مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسنِ انتظام کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوبُ الحال نہیں ہوتے، اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسانِ کامل بنتا ہے۔

(۲) غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملکِ شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا، اس لئے بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ مَاءٍ نہیں کہا، بلکہ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

(۳) عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، جیسا کہ امام قرطبیؒ نے تفسیر سورۂ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے، جب

ان کو زمین پر اُتارا گیا، تو بطور معجزہ جبلِ سرآندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہونچا یا گیا، اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفانِ نوح میں بیت اللہ کو اٹھا لیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبرئیل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بناءِ ابراہیمی عہدِ جاہلیتِ عرب میں منہدم ہوگئی، تو قریش جاہلیت نے از سرِ نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابوطالب کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوّت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت مُحَرَّمْ ذکر کی گئی ہے، محرم کے معنی معزز کے بھی ہو سکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں، کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے، اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

(۴) لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ، حضرت خلیلؑ نے شروع دعا میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعا کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا و آخرت کی تمام خیرات و برکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنا دیا جائے، اور اگرچہ وہاں اُس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعا میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعا میں ان سب کو شریک کر لیا۔

(۵) اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ، اَفْئِدَہ، فُوَاد کی جمع ہے، جس کے معنی دل کے ہیں، اس جگہ لفظ اَفْئِدَہ کو نکرہ اور اسکے ساتھ حرف مِنْ لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اس لئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعا میں یہ حرف تبعیض و تقلیل نہ ہوتا بلکہ اَفْئِدَۃَ النَّاسِ کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم و غیر مسلم یہود و نصاریٰ اور مشرق و مغرب کے سب آدمی مکہ پر ٹوٹ پڑتے، جو اُن کے لئے باعثِ زحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیشِ نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے۔

(۶) وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، ثمرات، ثمرۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل، اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے دعا کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائیے۔

اور کبھی لفظ ثمرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے، جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اُس کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اُجرت اور تنخواہ کہلائیگی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی، قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعاء میں ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ کا لفظ بھی آیا ہے، اس میں لفظ "شجر" کے بجائے لفظ "شیٔ" لایا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہؑ نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دُعاء نہیں فرمائی، بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعاء مانگی ہے جس میں دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر طرح کی قابلِ انتفاع چیزیں سب داخل ہیں، شاید اس دعاء کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ باوجودیکہ نہ کوئی زراعتی ملک ہے نہ تجارتی یا صنعتی، لیکن دنیا بھر کی ساری چیزیں مشرق و مغرب سے پہنچ کر مکہ معظمہ میں آتی ہیں، جو غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی نصیب نہیں۔

(۷) حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے یہ دعاء نہیں فرمائی کہ مکہ کی زمین کو قابلِ کاشت بنا دیں، ورنہ کچھ مشکل نہ تھا کہ مکہ کی وادی اور سارے پہاڑ سرسبز کر دیئے جاتے، جن میں باغات اور کھیت ہوتے، مگر خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے یہ زراعت کا مشغلہ پسند نہ کیا، اس لئے دعاء فرمائی کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیئے جائیں، جو مشرق و مغرب اور اطرافِ عالم سے یہاں آیا کریں، ان کا یہ اجتماع پوری دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا اور اہلِ مکہ کی خوش حالی کا ذریعہ بنے، اطرافِ عالم کی چیزیں بھی یہاں پہونچ جائیں، اور اہلِ مکہ کو کسبِ مال کے ذرائع بھی ہاتھ آجائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دعاء قبول فرمائی، اور آج تک اہلِ مکہ زراعت اور کاشت سے بے نیاز ہو کر تمام ضروریاتِ زندگی سے مالا مال ہیں۔

(۸) لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ، میں اشارہ کر دیا کہ اولاد کے لئے معاشی راحت و سکون کی دعاء بھی اسی لئے کی گئی کہ یہ شکر گذار بن کر اس پر بھی اجر حاصل کریں، اس طرح دعاء کی ابتداء نماز کی پابندی سے ہوئی، اور انتہا شکر گذاری پر، درمیان میں معاشی راحت و سکون کا ذکر آیا، اس میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے، کہ اس کے اعمال و احوال، خیالات و افکار پر آخرت کی فلاح کا غلبہ ہو، اور دنیا کا کام بقدرِ ضرورت ہو۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ؀

اس آیت میں دُعاء کا تکملہ اللہ جل شانہٗ کے علمِ محیط کا حوالہ دے کر کیا گیا ہے، اور

لفظ رَبَّنَا کو الحاح وزاری کے لئے مکرر لایا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارے ہر حال سے واقف اور ہماری قلبی باطنی کیفیات اور ظاہری عرض و معروض سب سے باخبر ہیں۔

باطنی کیفیات سے مراد وہ رنج و غم اور فکر ہے جو شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو ایک کھلے میدان میں بے سرو سامان فریاد کرتے ہوئے چھوڑنے اور ان کی جدائی سے فطری طور پر لاحق ہو رہا تھا، اور ظاہری عرض و معروض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور حضرت ہاجرہؑ کے وہ کلمات مراد ہیں جو انھوں نے امر الٰہی کی خبر سنکر کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم کیا ہے تو وہ ہمارے لئے بھی کافی ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا، آخر آیت میں علم الٰہی کی اسی وسعت کا مزید بیان ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہی کیا، تمام زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ اس آیت کا مضمون بھی اس دعا کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ دعاء کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا، کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعاء قبول فرماکر اولاد صالح حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام عطا فرمائے۔

اس حمد و ثناء میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار و مددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے، آخر میں حمد و ثناء کا تکملہ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ سے کیا گیا، یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

اس حمد و ثناء کے بعد پھر دعاء میں مشغول ہوگئے، اور فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ، جس میں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نماز کی پابندی پر قائم رہنے کی دعاء کی، اور آخر میں پھر بطور الحاح کے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری یہ دعاء قبول فرمائیے۔

آخر میں ایک جامع دعاء فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مؤمنین کی مغفرت فرما، اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائیگا اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعاء فرمائی، حالانکہ والد یعنی آذر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ دعاء اُس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا، جیسے دوسری جگہ

قرآن کریم میں ہے وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝

احکام وہدایات آیاتِ مذکورہ سے دعاء کے آداب یہ معلوم ہوئے کہ بار بار الحاح وزاری کے ساتھ کی جائے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بھی کی جائے اس طرح دعاء کی قبولیت کی بڑی امید ہو جاتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے اُن کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ

ہے اس دن کے لئے کہ پتھرا جائیں گی آنکھیں، دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر

لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۖ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ﴿۴۳﴾ وَأَنذِرِ

پھر کر نہیں آئیں گی ان کی طرف انکی آنکھیں، اور دل اُن کے اُڑ گئے ہوں گے، اور ڈرا دے

النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا

لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے

أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ

مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک، کہ ہم قبول کرلیں تیری بلانے کو اور پیروی کرلیں رسولوں کی کیا تم

تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَسَكَنتُمْ

پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ٹلنا، اور آباد تھے تم

فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

بستیوں میں انہی لوگوں کی جنھوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَ

ہم نے اُن سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے، اور یہ بنا چکے ہیں اپنے داؤ اور

عِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۖ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے بیشک اللہ زبردست ہے

انْتِقَامٍ ؕ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ

بدلہ لینے والا، جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور

بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ

لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے، اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن

مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى

باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں، کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی

وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ

ہے ان کے منہ کو آگ، تاکہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا، بیشک

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ

اللہ جلد کرنے والا ہے حساب، یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں اس سے

وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔

ع ۱۱ / ۱۹

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی عذاب نہ دینے کی بناء پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں اُن لوگوں کی نگاہیں (مارے حیرت اور ہیبت کے) پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ موقف حساب کی طرف حسب الطلب) دوڑتے ہوں گے (اور فرط حیرت سے) اپنے سر اوپر اٹھا رکھے ہوں گے (اور) ان کی نظر اُن کی طرف ہٹ کر نہ آویگی (یعنی ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ آنکھ نہ جھپکیں گے) اور ان کے دل (شدت ہول سے) بالکل بدحواس ہوں گے اور (جب وہ دن آجاوے گا پھر مہلت نہ ہوگی پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے) سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آپڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک مدت قلیل تک ہم کو (اور) مہلت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھیجدیجئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا

سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی اور) کیا تم نے (اس مہلت کے طول ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جانا ہی نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے، کقولہ تعالیٰ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ لَا یَبْعَثُ اللّٰہُ مَنْ یَّمُوْتُ) حالانکہ (انکار سے باز آجانے کے اسباب سب مجتمع تھے چنانچہ) تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنھوں نے (کفر و انکار قیامت کر کے) اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو (تواترِ اخبار سے) یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا (کہ ان کے کفر و انکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تمکو معلوم ہوسکتا تھا کہ انکار کرنا موجبِ غضب ہے، پس تصدیق واجب ہے، اور ان کے مساکن میں رہنا ہر وقت اُن کے ان حالات کی یاد دلانے کا سبب ہوسکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور (علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے) ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی کتبِ سماویہ میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی ایسے ہی مغضوب و مستحق عذاب ہو گے پس واقعات کا اولاً اخبار سے سننا پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر مماثلت پھر تنبیہ کر دینا یہ سب اسباب مقتضی اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے) اور (ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر و انکار پر سزائیں دیں) ان لوگوں نے (دینِ حق کے مٹانے میں) اپنی سی بہت ہی بڑی بڑی تدبیریں کیں تھیں اور ان کی (یہ سب) تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں (اس کے علم سے مخفی نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ٹل جاویں (مگر پھر بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہوگئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ حق وہی ہے جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کا انکار موجبِ غضب و عذاب ہے، جب قیامت میں ان کا مغلوب ہونا معلوم ہوگیا) پس (اے مخاطب) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنیوالا نہ سمجھنا (چنانچہ قیامت کے دن ان کے منکرین کے عذاب کا وعدہ تھا سو وہ پورا ہوگا، جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل پھر مشیت کا تعلق اوپر معلوم ہوا، پھر خلفِ وعدہ کا کیا احتمال رہا اور یہ بدلہ اس روز ہوگا) جس روز دوسری زمین بدل جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی (دوسرے بدل دیئے جاویں گے ان آسمانوں کے علاوہ کیونکہ اول بار کے نفخ صور سے سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاویں گے، پھر دوسری بار میں از سر نو زمین و آسمان بنیں گے)،

اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہو یعنی قیامت میں بدلہ لیا جاوے گا) اور (اس روز اے مخاطب) تو مجرموں کو (یعنی کافروں کو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا (اور) ان کے کُرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران لپٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے اور قطران درخت چیڑ کا روغن ہوتا ہے، کما فی کتب اللغات والطب) اور آگ اُن کے چہروں پر (بھی) لپٹی ہوگی (یہ سب کچھ اس لئے ہوگا) تاکہ اللہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور گو ایسے مجرم بے انتہا ہونگے مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب و کتاب کچھ دشوار نہیں کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا ہے (سب کا فیصلہ شروع کرکے فوراً ہی ختم کردے گا) یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا ہے (تاکہ مبلّغ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب سے) ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کرلیں۔

معارف و مسائل

سورۂ ابراہیم میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے کچھ حالات و معاملات کی تفصیل اور احکامِ الٰہیہ کی مخالفت کرنے والوں کے انجامِ بد اور آخر میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا، جنھوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اور جن کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی بستی بسائی، اور اس کے بسنے والوں کو ہر طرح کا امن و امان اور غیر معمولی طور پر معاشی سہولتیں عطا فرمائیں، انہی کی اولاد بنی اسمٰعیل قرآن عظیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اوّل ہیں۔

سورۂ ابراہیم کے اس آخری رکوع میں خلاصہ کے طور پر انہی اہلِ مکہ کو پچھلی قوموں کی سرگذشت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین اور اب بھی ہوش میں نہ آنے کی صورت میں قیامت کے ہولناک عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مظلوم کی تسلّی اور ظالم کے لئے سخت عذاب کی دھمکی ہے کہ ظالم اور مجرم لوگ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل دینے سے بے فکر نہ ہو جائیں، اور یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جرائم کی خبر نہیں، اس لئے باوجود جرائم کے وہ پھل پھول رہے ہیں، کوئی عذاب و مصیبت ان پر نہیں آتی، بلکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، مگر وہ اپنی رحمت اور حکمت کے تقاضے سے ڈھیل دے رہے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا، یعنی نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کو غافل، یہ خطاب بظاہر ہر اُس

شخص کے لئے ہے جس کو اس کی غفلت اور شیطان نے اس دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، اور اگر اس کا مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بھی مقصود اس سے امت کے غافلوں کو سنانا اور تنبیہ کرنا ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو حالات سے بے خبر یا غافل سمجھیں۔

دوسری آیت میں بتلایا کہ ان ظالموں پر فوری طور سے عذاب نہ آنا ان کے لئے کچھ اچھا نہیں، کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک قیامت اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے آگے ختم سورۃ تک اس عذاب آخرت کی تفصیلات اور ہولناک وقائع کا بیان ہے۔

يَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ، یعنی اس دن جبکہ پھٹی رہ جائیں گی آنکھیں" مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ " یعنی خوف وحیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تحاشا دوڑ رہے ہوں گے" لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ اُن کی پلکیں نہ جھپکیں گی" وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ، اُن کے دل خالی بدحواس ہوں گے۔

یہ حالات بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنی قوم کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیے جس میں ظالم اور مجرم لوگ مجبور ہو کر پکاریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں کچھ اور مہلت دیدیجئے یعنی پھر دنیا میں چند روز کے لئے بھیجدیجئے تاکہ ہم آپ کی دعوت قبول کرلیں اور آپ کے رسولوں کا اتباع کرکے اس عذاب سے نجات حاصل کرسکیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست کا یہ جواب ہوگا کہ اب تم یہ کہہ رہے ہو کیا تم نے اس سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہماری دولت و شوکت کو زوال نہ ہوگا ہم ہمیشہ دنیا میں یونہی عیش و عشرت میں رہیں گے اور دوبارہ زندگی اور عالم آخرت کا انکار کیا تھا۔

وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ، ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب مشرکین عرب کو ہے، جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے أَنذِرِ النَّاسَ، یعنی ڈراؤ ان لوگوں کو،" اس خطاب میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و انقلابات تمہارے لئے بہترین واعظ ہیں تعجب ہے کہ تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے، حالانکہ تم انھی ہلاک شدہ قوموں کے گھروں میں بستے اور چلتے پھرتے ہو، اور تمہیں کچھ حالات کے مشاہدہ سے کچھ متواتر خبروں سے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیسا سخت عذاب نازل کیا، اور ہم نے بھی تمہارے راہ پر لانے کے لئے بہت سی مثالیں بیان کیں، پھر بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

۱۸

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۔ "یعنی ان لوگوں نے دینِ حق مٹانے اور دعوتِ حق قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذاء پہونچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں، اور اللہ تعالیٰ کے پاس انکی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنا دینے پر قادر ہیں، اگرچہ اُن کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد وثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکینِ عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دوررس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔

اور اکثر مفسرین نے وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ اِنْ کو حرفِ نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن اُن کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں، اور پہاڑ سے مراد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم واستقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد اُمتِ محمدیہ کو سنانے کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر مخاطب کو یہ تنبیہ کی گئی: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ "یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے فتح ونصرت اور کامیابی کے کئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست اور انتقام لینے والا ہے، وہ ضرور اپنے پیغمبروں کے دشمنوں سے انتقام لے گا، اور پیغمبروں سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرے گا۔

اس کے بعد کی آیات میں پھر قیامت کے ہولناک حالات وواقعات کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ "یعنی قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ اس میں موجودہ زمین بھی بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی اور سب کے سب اللہ واحد وقہار کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

زمین وآسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل وصورت بدل دی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنا دی جائے گی، جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہوگی، نہ درخت وغیرہ کی، نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی، قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح فرمایا ہے

لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا، یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آجکل راستے اور سڑکیں مڑ کر گذرتی ہیں، اور کہیں اونچائی ہے کہیں گہرائی، یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہوجائے گا۔

اور تبدیل زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنادیئے جائیں، روایاتِ حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی۔

امامِ حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے (تفسیر مظہری)

صحیحین، بخاری و مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف سفید ہوگی جیسے مَیدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی، جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہوکر ایک سطح مستوی بن جائے گی، اور اس وقت تمام اولادِ آدم اس زمین پر جمع ہوگی، اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی، جس پر وہ کھڑا ہوسکے، پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا، میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا، کہ ان کا حساب کتاب جلد ہوجائے۔

اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہوگی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے، مگر ذاتِ زمین یہی باقی رہے گی، اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہوگی، اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے نفخۂ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں، اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔

تفسیر مظہری میں مسند عبد ابن حمید سے حضرت عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جاوے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعۂ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ و تابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اُس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے، گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا، اور حقیقتِ حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ٭ نینگیختن علت از کارِ تو

آخری آیات میں اہلِ جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے گا، یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یک جا باندھ دیئے جائیں گے، اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہوگا، جس کو تارکول کہا جاتا ہے، اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ سب احوالِ قیامت کا بیان کرنا لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے، تاکہ وہ اب بھی سمجھ لیں کہ قابلِ عبادت و اطاعت صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اور تاکہ جن میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے وہ شرک سے باز آجائیں ٭

سورۂ ابراہیم ختم شد

ایک یادداشت اور اطلاع

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے، نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانوی رحؒ کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ کی بے نظیر متوسط تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمونِ قرآن سمجھنا مشکل ہو نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو، پھر خداداد علم و ذکاوت اور تقویٰ و طہارت کی برکت سے اقوالِ مختلفہ میں ایک کو ترجیح دے کر لکھ دینے کا جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل ہونا مشکل تھا، مگر یہ تفسیر حضرت رحؒ نے اہلِ علم کے لئے انہی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانہ کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کو اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا۔

اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے مضامین عجیبہ کو آجکل کی آسان زبان میں لکھا جائے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

بحکمِ قضاء و قدر اس کی ابتداء اس طرح ہوگئی کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر صاحب نے مجھ پر اصرار کیا کہ ریڈیو پر ایک سلسلہ قرآن کی خاص خاص آیات کا بعنوان "معارف القرآن" جاری کیا جائے، ان کا اصرار اس کام کے آغاز کا سبب بن گیا، اور ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کے روز جمعہ ۳ رشوال سنہ ۱۳۷۳ھ مطابق ۲ رجولائی سنہ ۱۹۵۴ء سے شروع ہو کر ۱۵ رصفر سنہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۵ رجون سنہ ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، جو سورۂ ابراہیم کے اختتام پر منجانب محکمۂ ریڈیو پاکستان ختم کر دیا گیا۔

حق تعالیٰ نے اس کو میرے وہم و گمان سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اور اطرافِ عالم سے اس کو کتابی صورت میں طبع کرنے کا تقاضا ہوا، اس کا ارادہ کیا تو جتنا کام اس وقت تک ہو چکا تھا وہ بھی اس لحاظ سے ناتمام تھا کہ یہ سلسلہ منتخب آیات کا تھا، درمیانی آیات کو جو خالص علمی تھیں ریڈیو پر عوام کو ان کی تفسیر سمجھانا آسان نہ تھا، وہ رہ گئی تھیں، کتابی شکل میں طبع کرنے کے لئے ان کا سلسلہ بھی پورا کرنا تھا، جو بوجہ دوسرے مشاغل کے پورا کرنا مشکل تھا۔

عجائبِ قدرت سے ہے کہ رمضان سنہ ۱۳۸۸ھ میں احقر سخت بیمار ہو کر نقل و حرکت سے معذور صاحبِ فراش ہو گیا، اور موت سامنے محسوس ہونے لگی، تو اس کا افسوس ستانے لگا کہ یہ مسودات یوں ہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرما دیا کہ لیٹے بیٹھے "معارف القرآن" کے مسودات پر نظر ثانی اور درمیانی آیات جو رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کسی طرح اسی حالت میں کر دی جائے۔

ادھر بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا، بیماری نے تمام دوسرے مشاغل پہلے ہی چھڑا دیئے تھے، اب صرف یہی مشغلہ رہ گیا، اس لئے قدرت کے عجیب و غریب انتظام نے اسی بیماری میں بحمد اللہ یہ کام ۲۹ رجب سنہ ۱۳۹۰ھ تک پورا کرا دیا۔

یہاں تک کہ سورۂ ابراہیم کا ختم اور قرآن پاک کے تیرہ ۱۳ پارے اسی ریڈیو کی نشری دروس کے ذریعہ پورے ہو گئے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اگلے حصہ کے لکھنے کی توفیق و ہمت بھی عطا فرما دی، نقل و حرکت سے معذوری کی تکلیف بھی رفع فرما دی، اگرچہ سلسلہ مختلف امراض کا تقریباً مسلسل رہا اور ضعف بھی بڑھتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کی امداد سے ۳۰ شعبان سنہ ۱۳۹۰ھ سے قرآن کے اگلے پاروں کی تفسیر کا لکھنا شروع ہو کر اس وقت جبکہ معارف القرآنؒ کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یعنی ۲۵ صفر سنہ ۱۳۹۱ھ میں اس تفسیر کا مسوّدہ قرآن کریم کی چوتھی منزل سورۂ فرقان انیسویں پارے تک بعون اللہ سبحانہٗ مکمل ہو چکا ہے۔

اس وقت بھی مختلف امراض اور ضعف کا سلسلہ بھی ہے، اور بحمد اللہ یہ کام بھی جاری ہے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرما دیں۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

بندہ محمد شفیع
۲۵ صفر سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ حجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ننانوے آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی ،

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ②

کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان ،

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③

چھوڑدے ان کو کھالیں اور برت لیں اور امید میں لگے رہیں سو آئندہ معلوم کرلیں گے

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ

اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر ، نہ سبقت کرتا ہے

مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤

کوئی فرقہ اپنے وقت مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے۔

الجزء الرابع عشر ١٤

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ ، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور

قرآن واضح کی (یعنی اس کی دونوں صفتیں ہیں، کامل کتاب ہونا بھی اور قرآن واضح ہونا بھی، ان کلمات سے قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے، یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، فرمایا رُبَمَا يَوَدُّ یعنی جب قیامت کے حشر و نشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو) کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار اس لئے کہ جب کوئی نئی شدت و مصیبت دیکھیں گے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی) آپ (دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور) ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے، کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور دنیا میں جو اُن کو ان کے کفر اور بد عملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا) اور ہم نے جتنی بستیاں (کفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لئے ایک معین وقت لکھا ہوا ہوتا رہا ہے اور (ہمارا اصول ہے کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقررہ سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے (بلکہ وقت مقرر پر ہلاک ہوتی ہے، اسی طرح جب اُن کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی)۔

معارف و مسائل

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا الخ سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو مقصد اور اصلی مشغلہ بنا لینا اور دنیا کی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہو کر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی سے ہو سکتا ہے، جن کا آخرت اور اس کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، اور معاش کا بقدر ضرورت سامان کرتا ہے، اور آئندہ کاروبار کے منصوبے بھی بناتا ہے، مگر موت اور فکر آخرت سے غافل ہو کر یہ کام نہیں کرتا، اسی لئے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر رہتی ہے، اور فضول منصوبہ بندی کو مشغلہ نہیں بناتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بدنصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا (یعنی اپنے گناہوں، غفلتوں پر نادم ہو کر نہ رونا) اور سخت دلی، طولِ امل اور دنیا کی حرص (قرطبی عن مسند البزار عن انسؓ)

اور طولِ امل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور حرص میں انہماک اور موت و آخرت سے بے فکری کے ساتھ دور دراز کے منصوبے بنائے جائیں، (قرطبی) جو منصوبے دینی مقاصد

کے لئے یا کسی قوم و ملک کے آئندہ مفاد کے لئے بنائے جاتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ وہ فکرِ آخرت ہی کی ایک صورت ہے۔

اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے پہلے طبقہ کی نجات ایمان کامل اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور آخری امت کے لوگ بخل اور طولِ امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔

اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہو کہ وہ جامع مسجد دمشق کے منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے اہلِ دمشق! کیا تم اپنے ایک ہمدرد خیر خواہ بھائی کی بات سنو گے سن لو! کہ تم سے پہلے بہت بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں، جنھوں نے مال و متاع بہت جمع کیا اور بڑے بڑے شان دار محلات تعمیر کئے اور دور دراز کے طویل منصوبے بنائے، آج وہ سب ہلاک ہو چکے ہیں، اُن کے مکانات اُن کی قبریں ہیں، اور ان کی طویل امیدیں سب دھوکہ اور فریب ثابت ہوئیں، قومِ عاد تمھارے قریب تھی جس نے اپنے آدمیوں سے اور ہر طرح کے مال و متاع سے اور اسلحہ اور گھوڑوں سے ملک کو بھر دیا تھا، آج کوئی ہے جو ان کی وراثت مجھ سے دو درہم میں خریدنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی میں طویل امیدیں باندھتا ہے اس کا عمل ضرور خراب ہو جاتا ہے (قرطبی)

وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْمَا

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے، کیوں نہیں

تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ

لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے، ہم نہیں اتارتے

الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾

فرشتوں کو مگر کام پورا کر کے اور اُس وقت نہ ملے گی اُن کو مہلت۔

خلاصۂ تفسیر

(اِلَّا بِالْحَقِّ میں لفظ حق سے مراد فیصلۂ عذاب ہے، اور بعض مفسرین نے قرآن یا رسالت

کو مراد قرار دیا ہے، بیان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، یہ معنی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہیں، تفسیر آیات یہ ہے):۔

اور ان کفار (مکہ) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) یوں کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نعوذ باللہ) مجنون ہو (اور نبوت کا غلط دعویٰ کرتے ہو ورنہ) اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے (جو ہمارے سامنے تمہارے صدق کی گواہی دیں کقولہ تعالیٰ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جاتی (بلکہ جب ان کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی متیقن ہے تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے جیسا کہ سورۂ انعام کے اوّل رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور (یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا معجزہ ہونا اس پر دلیل ہے، اور قرآن کے ایک اعجاز کا بیان تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسرا اعجاز یہ ہے کہ) ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں (اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا، جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے، یہ ایسا صریح معجزہ ہے جس کو ہر عام و خاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک اَن پڑھ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

مامون کے دربار کا ایک واقعہ

امام قرطبیؒ نے اس جگہ سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مامون کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار

میں علمی مسائل پر بحث و مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے، جس میں ہر اہلِ علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا جو صورت شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تو وہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی، جب مجلس ختم ہوگئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے (امتحان لینے کے لئے) کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔

اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہوگئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا، اور مجلسِ مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سالِ گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا کہ اُس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے، جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہونچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں، جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔

اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہو گیا، قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا، انھوں نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہئے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحییٰ ابن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ قرآن عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ، یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات و انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و

نصاریٰ نے فریضۂ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں مسخ و محرّف ہو کر ضائع ہو گئیں، بخلاف قرآن کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی تو دشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطہ اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا، آج عہد رسالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس ہوچکے ہیں تمام دینی اور اسلامی امور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآن کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان، بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔

حفاظتِ قرآن کے وعدے میں حفاظتِ حدیث بھی داخل ہے

تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآنی کا نام ہے نہ صرف معانیِ قرآن کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامینِ قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامینِ قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا، کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے تو اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحفِ ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی زبان اردو یا انگریزی وغیرہ میں جو صرف ترجمہ قرآن کا شائع کر کے لوگ اس کو اردو یا انگریزی قرآن کا نام دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ وہ قرآن نہیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظِ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزء ہیں، تو حفاظتِ قرآن کی جو ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی اور مضامینِ قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ تعالیٰ ہی نے لے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانیِ قرآن وہی ہیں جن کے تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلا دیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو اُن کے لئے نازل کیا گیا،

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔
یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، اور اسی لئے آپؐ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، یعنی میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانیِ قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپؐ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی، انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیثِ رسولؐ کو غیر محفوظ کہنے والا درحقیقت قرآن کو غیر محفوظ کہتا ہے

جو لوگ آجکل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لئے قابلِ اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں مدوّن کیا گیا ہے۔

اوّل تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہدِ رسالتؐ میں شروع ہو چکی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کے علاوہ حدیثِ رسولؐ درحقیقت تفسیرِ قرآن اور معانیِ قرآن ہیں ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمّہ لی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیثِ رسولؐ) ضائع ہو جائیں؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ
اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں، اور نہیں آتا اُن کے پاس
مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ
کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی، اسی طرح بٹھا دیتے ہیں ہم
فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
اس کو دل میں گنہگاروں کے، یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾
پہلوں کی، اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سارے دن اس میں چڑھتے رہیں
لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع ۱
تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہے ہماری نگاہ کو، نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے

اَللُّغَات اَلشِّیَع جمع شیعہ کی ہے، جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں، اور ایسے فرقہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں، مراد یہ ہو کہ ہم نے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اندر رسول بھیجے ہیں، اس میں لفظ اِلیٰ کے بجائے فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہر گروہ کا رسول اسی گروہ کے لوگوں میں سے بھیجا گیا، تاکہ لوگوں کو اس پر اعتماد کرنا آسان ہو، اور یہ بھی اُن کی طبائع اور مزاج سے واقف ہو کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب پروگرام بنا سکے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی تکذیب سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے آپؐ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا، (اور ان کی یہ حالت تھی کہ) کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا (جو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوا تھا) اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرمین (یعنی کفارِ مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہے کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو درکنار اس سے بڑھ کر، اگر (خود ان کو آسمان پر بھیجدیا جائے اس طرح سے کہ) ہم اُن کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور اونگھ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو، اس (دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جاویں تب بھی یوں کہدیں کہ ہماری نظر بند کر دیگئی تھی (جس سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور واقع میں نہیں چڑھ رہے، اور نظر بندی میں کچھ اسی واقعہ کی تخصیص نہیں) بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے (اگر ہم کو اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا جائے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا)۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿١٦﴾

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا، ان آیات میں جو آگے

آرہی ہیں، اللہ جل شانہٗ کے وجود، توحید، علم، قدرت کے واضح دلائل، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات و مشاہدات سے بیان کئے گئے ہیں، جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا:

اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو (ستاروں سے) آراستہ کیا۔

معارف و مسائل

بُرُوجًا، بُرج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمۂ تفسیر مجاہدؒ، قتادہؒ، ابوصالحؒ وغیرہ نے اس جگہ بُرُوج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جو ان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاءِ آسمانی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنی میں اطلاق عام معروف ہے، جرم آسمان کو بھی سما کہا جاتا ہے اور آسمان سے بہت نیچے جو فضاءِ آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جابجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیارات اور ستاروں کا آسمانوں کے اندر نہیں بلکہ فضاءِ آسمانی میں ہونا اس کی مکمل تحقیق قرآن کریم کی آیات سے نیز قدیم و جدید علم فلکیات کی تحقیق سے انشاء اللہ سورۂ فرقان کی آیت تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا کی تفسیر میں آئے گی۔

وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سُن بھاگا سو

فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ﴿١٨﴾

اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا۔

خلاصۂ تفسیر

آسمان کو (ستاروں کے ذریعہ) ہر شیطان مردود سے محفوظ فرما دیا (کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی)، ہاں مگر کوئی بات (فرشتوں کی) چوری چھپے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے، (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بدحواس ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

شہابِ ثاقب ان آیات سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ شیاطین کی رسائی آسمانوں تک نہیں ہو سکتی ابلیس لعین کا تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت آسمانوں میں ہونا اور آدم و حوا علیہما السلام کو دھوکہ میں مبتلا کرنا وغیرہ یہ سب آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول سے پہلے کے واقعات ہیں، اس وقت تک جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع نہیں تھا، نزولِ آدم علیہ السلام اور اخراج شیطان کے بعد سے یہ داخلہ ممنوع ہوا، سورۂ جن کی آیات میں جو یہ مذکور ہے اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک شیاطین آسمانوں کی خبریں فرشتوں کی باہمی گفتگو سے سن لیا کرتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین آسمانوں میں داخل ہو کر سنتے تھے، نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ کے الفاظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چوروں کی طرح آسمانی فضاء میں جہاں بادل ہوتے ہیں چھپ کر بیٹھ جاتے اور سن لیا کرتے تھے، ان الفاظ سے خود بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ قبل بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا، مگر فضاء آسمانی تک پہونچکر چوری سے کچھ سن لیا کرتے تھے، بعثتِ نبوی کے بعد حفاظتِ وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا۔

رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سن سکتے تھے، سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں، بہت ممکن ہے کہ اجرام سماویہ سماعتِ اصوات سے مانع نہ ہوں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں کبھی کسی وقت یہاں تک اترتے ہیں، اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں، شیاطین اسی فضاء آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورۂ جن میں اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ کی تفسیر میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ: ان آیات میں شہابِ ثاقب کا ہے، قرآنِ کریم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظتِ وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے، تاکہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سن سکیں۔

اس میں ایک اشکال قوی یہ ہو کہ فضاے آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اُٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادّے بھی ہوتے ہیں، اوپر جاکر جب اُن کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہونچتی ہے تو وہ سُلگ اُٹھتے ہیں، اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارا ٹوٹا ہے، اسی لئے محاورات میں اس کو ستارا ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے انقضاض کوکب کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، زمین سے اُٹھنے والے بخارات مشتعل ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہو، مگر بعثت نبویؐ سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا، کہ شیاطین جو فرشتوں کی باتیں چوری سے سننا چاہیں ان کو اس شعلے سے مارا جاتا ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے رُوح المعانی میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور نقل کیا ہے کہ امام حدیث زہریؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں؛ اس پر اس نے سورۂ جن کی مذکورہ آیت معارضہ کے لئے پیش کی؛ تو فرمایا کہ شہابِ ثاقب تو پہلے بھی تھے، مگر بعثتِ نبویؐ کے بعد جب شیاطین پر تشدد کیا گیا تو ان سے شیاطین کے دفع کرنے کا کام لے لیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباسؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپؐ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے، کہ ستارہ ٹوٹا، آپؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم زمانۂ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرے گا، یا پیدا ہوگا، آپؐ نے فرمایا کہ یہ لغو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن

کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں، مقصدِ قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْۢبَتْنَا فِيهَا مِنْ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیئے اس پر بوجھ اور اُگائی اس میں

كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ

ہر چیز اندازے سے، اور بنا دیئے تمہارے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں

لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا

جن کو تم روزی نہیں دیتے، اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور

نُنَزِّلُهٗٓ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢١﴾ وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ

اتارتے ہیں ہم اندازۂ معین پر، اور چلائیں ہم نے ہوائیں رس بھری،

فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوهُ ۚ وَمَآ أَنْتُمْ لَهٗ

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا اور تمہارے پاس نہیں

بِخٰزِنِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿٢٣﴾

اس کا خزانہ، اور ہم ہی ہیں جِلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے،

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ ﴿٢٤﴾

اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو

وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ إِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾ ع

اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس (زمین) میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی (ضرورت کی پیداوار) ایک معین مقدار سے اُگائی، اور ہم نے تمہارے واسطے اس (زمین) میں معاش کے سامان بنائے (جس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے، پہننے

اور رہنے سہنے سے متعلق ہیں) اور (یہ سامانِ معاش اور ضروریاتِ زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا، بلکہ) ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے (یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمھارے ہاتھ سے خورد و نوش اور زندگی گذارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو جانور بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریات معاش حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے برّی اور بحری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامانِ معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور یہ جانور اتنے بے حد و بے شمار ہیں کہ انسان نہ اُن سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کرسکتا ہے) اور جتنی چیزیں (ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں) ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز) کو ایک معیّن مقدار سے اُتارتے رہتے ہیں اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کرکے رکھنے والے نہ تھے، (کہ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے) اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور (سب کے مرنے کے بعد) ہم ہی باقی رہ جاویں گے، اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) محشور فرمادے گا (یہ اس لئے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، اس میں منکرِ توحید کی سزا کی طرف اشارہ کردیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دیگا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے)۔

معارف و مسائل

حکمتِ الٰہیہ، ضروریاتِ معاش میں تناسب و موزونیت

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ترجمہ میں لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر اُگنے والی چیز کی ایک مقدار معیّن اُگائی، جس سے کم ہوجاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہوجاتیں، اور زیادہ ہوجاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی، انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ پھل اگر اتنے زیادہ پیدا ہوجائیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑیں گے، ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا، اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی نہ رہیگی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر

انسان کی زندگی موقوف ہے، ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مفت مل جایا کرتے، اور بے فکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی اُن کے بڑے بڑے ذخیرے پڑے رہتے، لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا، اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے، کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بچیں۔

اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اُگنے والی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تناسب اور موزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس سے اس میں حُسن اور دل کشی پیدا ہوتی ہے، مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل، مختلف سائز اور مختلف شکل، مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آب رسانی اور آبپاشی کا عجیب و غریب نظامِ الٰہی

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ سے مَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ، تک قدرتِ الٰہیہ کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، چرندوں، پرندوں، درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق آب رسانی کا ایسا نظامِ محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں، درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے، اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے، پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، نہ کسی سے مانگی جاتی ہے۔

اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرتِ الٰہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے، کہ سمندر میں بخارات پیدا فرمائے جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں، جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنا دیں، پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہونچانا ہے پہونچا دیں، پھر فرمانِ الٰہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے، اس کے مطابق یہ خودکار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھر بیٹھے مل جائے، اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے، کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے، حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا کرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے

اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں، اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جاکر پڑتا ہے، اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا، اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی بھی مشکل ہو جاتی، اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھارا بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلاظتیں اس میں پہونچ کر بھسم ہو جاتی ہیں، غرض اس حکمت کی بناء پر سمندر کا پانی کھارا بلکہ تلخ بنایا گیا، جو نہ پیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، نظامِ قدرت نے جو پانی کے ہوائی جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اُٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بغیر کسی ظاہری مشین کے پیدا کر دیئے کہ اس پانی کا نمک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا، سورۂ مُرسلٰت میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔
وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّاۗءً فُرَاتًا، اس میں لفظ فرات کے معنی ہیں ایسا میٹھا پانی جس سے پیاس بجھے، معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گذار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تمہارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔

سورۂ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا ہے: اَفَرَءَيْتُمُ الْمَاۗءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَاۗءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ "بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے"۔

یہاں تک تو قدرتِ الٰہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے پورے روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس حسن نظام کیسا تھ پہونچایا کہ ہر خطہ کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ اُن جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں، گھر بیٹھے پانی پہونچا دیا، اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہونچا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا کیونکہ پانی انکی ایسی ضرورت ہے جس کی احتیاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے، اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہوا کرتی، لیکن اس صورت میں اُن کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی، مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا، اس کا اندازہ کسی اہل تجربہ کے لئے مشکل نہیں، سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطّل پیدا کرتی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جاتے کہ اس کا پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جاتے، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ

مقرر کرکے اس کے سپرد کیا جاتے کہ وہ اپنے کوٹہ اور حصہ کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔
اندازہ لگائیے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا جن میں تین یا چھ مہینہ کی ضرورت کا پانی جمع کرکے رکھ لے، اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر کہ چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جاتا، اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا، اس لئے قدرتِ الٰہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقتِ ضرورت ہر جگہ مل جانے کا ایک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا، کہ جو پانی برسایا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں، کھیتوں اور انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آہی جاتا ہے، کچھ کھلے تالابوں، جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بحرِ منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے، جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی، پھر اگر وہ پانی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعے کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہونچ جانے کا خطرہ رہتا، پرندے جانوروں کے اس میں گرنے مرنے کا اندیشہ رہتا، جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا، مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بحرِ منجمد (برف) بنا کر پہاڑوں پر لاد دیا جہاں سے تھوڑا تھوڑا رِس کر وہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور پھر چشموں کی صورت میں ہر جگہ پہونچ جاتا ہے، اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی تہہ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہے اور کنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ آب رسانی کا یہ نظامِ الٰہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اوّل تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے، پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہونچانا دوسری نعمت ہے، پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنا دینا تیسری نعمت ہے، پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے، پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظامِ محکم پانچویں نعمت ہے، پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے، کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ اُن کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو، قرآن کریم کی آیت فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ۝ میں انہی نعماءِ الٰہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے میں درجات کا فرق

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ میں مستقدمین اور مستاخرین کی چند تفسیریں ائمہ صحابہ و تابعین سے مختلف منقول ہیں:- مستقدمین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستاخرین وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے (قتادہ و عکرمہ) مستقدمین سے مراد اموات ہیں اور مستاخرین سے وہ لوگ جو اب

زندہ ہیں (ابن عباس وضحاک) مستقدمین سے مراد امتِ محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستاخرین سے امتِ محمدیہ (مجاہد) مستقدمین سے مراد اہلِ طاعت وخیر ہیں اور مستاخرین سے اہلِ معصیت وغفلت (حسن وقتادہ) مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوف یا جہاد کی صفوف اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستاخرین وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں، حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ کا علم محیط ان تمام اقسام کے مستقدمین ومستاخرین پر حاوی ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیت سے نماز میں صفِ اوّل اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان کہنے اور نماز کی صفِ اوّل میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہے تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعبؓ آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید اگلی صفوف میں اللہ کا کوئی بندہ اس شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے، انتہیٰ کلامہٗ۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اصل فضیلت تو صفِ اوّل ہی میں ہے، جیسا کہ آیتِ قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا، لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صفِ اوّل میں جگہ نہ ملی تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید اگلی صفوف کے کسی نیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے، اور آیتِ مذکورہ میں جیسے نماز کی صفِ اوّل کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صفِ اوّل کی افضیلت بھی ثابت ہو گئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۶﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے،

وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ

اور جنّ کو بنایا ہم نے اس سے پہلے لُو کی آگ سے، اور جب کہا

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے ،

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

پھر جب ٹھیک کروں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر ، مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ

يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ

ہو سجدہ کرنے والوں کے ، فرمایا ، اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا

السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ

سجدہ کرنے والوں کے ، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کھنکھناتے

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ

سنے ہوئے گارے سے ، فرمایا تو تو نکل یہاں سے تجھ پر مار ہے ، اور تجھ پر

عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى

پھٹکار ہے اُس دن تک کہ انصاف ہو ، بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اُس دن تک کہ

يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ

مُردے زندہ ہوں ، فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی ، اسی مقرر وقت کے دن

الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

تک ، بولا اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو ، مگر جو تیرے چُنے ہوئے بندے ہیں ،

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی ، جو میرے بندے ہیں تیرا اُن پر کچھ

سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ

زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا بہکے ہوؤں میں ، اور دوزخ پر وعدہ ہے ان

اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ

سب کا ، اس کے سات دروازے ہیں ، ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے

جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ع

ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا

۳ ع ۱۹ ۳

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصلِ اوّل آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا (یعنی اوّل گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بُو آنے لگی، پھر وہ خشک ہوگیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹکی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پُتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابوالجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے (مطلب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزاء دخانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی، کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزاء کثیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۭ) اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پُتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضاءِ جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنا لیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر و ذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے کیونکہ میں نورانی مادۂ آتش

سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کروں، ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل، کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہیگی (جیسا دوسری آیت میں ہے عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ، یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے بعید رہے گا، توبہ کی توفیق نہ ہوگی اور مقبول و مرحوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ قیامت تک جو محل رحمت نہ ہو تو پھر قیامت میں تو مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں، پس جس وقت تک احتمال تھا اس کی نفی کر دی، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ مقصود قیامت تک عمر دینا نہیں ہے کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیات دنیویہ میں تو ملعون ہے گو وہ قیامت تک ممتد کیوں نہ ہو) کہنے لگا (کہ اگر مجھ کو آدمؑ کی وجہ سے مردود کیا ہے) تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدمؑ اور اولاد آدم کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے اُن بندوں کے جو اُن میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ (منتخب ہو جانا جس کا طریقہ اعمال صالحہ و اطاعت کاملہ ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر ہمارا مقرب ہو جاتا ہے) واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے سے)

معارف و مسائل

بدنِ انسانی میں نفخِ رُوح اور اس کو مسجودِ ملائکہ بنانے کی مختصر تحقیق

روح کوئی جسم ہے یا جوہر مجرّد، اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبدالرءوف مناوی نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہونچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جاسکتا، امام غزالیؒ امام رازیؒ اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرد ہے، امام رازی نے اس کے بارہ ۱۲ دلائل پیش کئے ہیں۔

مگر جمہور علماء امت رُوح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی پھونک مارنے

کے ہیں، اگر بقول جمہور رُوح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جوہر مجرّد مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)

روح اور نفس کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہؒ کی تحقیق

یہاں اس طویل الذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفاء کیا جاتا ہے جو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ رُوح کی دو قسم ہیں، علوی اور سفلی، روحِ علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہل کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے، اور رُوح علوی بنظر کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، سِر، خفی، اخفیٰ، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔

اور رُوحِ سفلی وہ بخار لطیف ہی جو بدنِ انسانی کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس رُوحِ سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے، ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے، اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہی، اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح ارواحِ علویہ اگرچہ اپنے تجرّد کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع اور بہت مسافتِ بعیدہ پر ہیں مگر ان کا عکس اس رُوحِ سفلی کے آئینہ میں آکر ارواحِ علویہ کی کیفیات و آثار اس میں منتقل کر دیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہوجاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے ارواحِ تجزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ رُوحِ سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدنِ انسانی میں سب سے پہلے مضغہ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، رُوحِ سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہی، یہ روحِ سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو شرائین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدنِ انسانی کے ہر حصّہ میں پہونچ جاتی ہے۔

رُوحِ سفلی کے بدنِ انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخ رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کو اپنی طرف منسوب کرکے مِنْ رُّوْحِیْ اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روحِ انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے، کیونکہ وہ بغیر مادّہ کے محض امر الٰہی سے پیدا ہوئی ہے، نیز اس میں تجلّیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی رُوح میں نہیں ہے۔

اور انسان کی پیدائش میں اگرچہ عنصر غالب مٹی کا ہے، اور اسی لئے قرآن عزیز میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ دس چیزوں کا جامع ہے جن میں پانچ عالمِ خلق کی ہیں اور پانچ عالمِ امر کی، عالمِ خلق کے چار عنصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، اور پانچواں ان چاروں سے پیدا ہونے والا ابخار لطیف جس کو رُوحِ سفلی یا نفس کہا جاتا ہے، اور عالمِ امر کی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی قلب، روح، سر، خفی، اخفی۔

اسی جامعیت کے سبب انسان خلافتِ الٰہیہ کا مستحق بنا، اور نورِ معرفت اور نارِ عشق و محبت کا متحمل ہوا، جس کا نتیجہ بے کیف معیتِ الٰہیہ کا حصول ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ، "یعنی ہر انسان اس فرد کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے"۔

اور انسان میں تجلّیاتِ الٰہیہ کی قابلیت اور معیتِ الٰہیہ کا جو درجہ اس کو حاصل ہے، اسی کی وجہ سے حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا جائے، ارشاد ہوا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

حکمِ سجدہ فرشتوں کو ہوا تھا ابلیس اس میں تبعاً شامل قرار دیا گیا

سورۂ اعراف میں ابلیس کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا ہے مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ ابلیس کو بھی دیا گیا تھا، اسی لئے اس سورت کی جو آیات ابھی آپ نے پڑھی ہیں جن سے بظاہر اس حکم کا فرشتوں کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اصالۃً یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کے اندر موجود تھا، اس لئے تبعاً وہ بھی اس حکم میں شامل تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لئے جب اللہ تعالیٰ کی بزرگ ترین مخلوق فرشتوں کو حکم دیا گیا تو دوسری مخلوق کا تبعاً اس حکم میں داخل ہونا بالکل ظاہر تھا، اسی لئے ابلیس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کا حکم دیا ہی نہیں گیا تو عدم تعمیل کا جرم مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اور شاید قرآن کریم کے الفاظ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ اَبٰٓى اَنْ يَّسْجُدَ کے بجائے اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ذکر فرمایا جس سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل ساجدین تو فرشتے ہی تھے، مگر عقلاً لازم تھا کہ

ابلیس بھی جب ان میں موجود تھا تو وہ بھی ملائکہ ساجدین کے ساتھ شامل ہو جاتا، اس کے عدم شمول پر عتاب فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کے معنی

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا، مگر اسی واقعہ آدم میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدم و حوا پر اس کا فریب چل گیا، اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا (آل عمران) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب و عقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا، کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے۔

اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں، کیونکہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ کی، اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہ ؓ نے بھی توبہ کر لی تھی، اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلاء ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

جہنم کے سات دروازے

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، امام احمدؒ، ابن جریر طبریؒ اور بیہقی نے بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ لکھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے اوپر نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے، ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا (قرطبی)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

پرہیزگار رہیں باغوں میں اور چشموں میں، کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے جمع خاطر سے

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ

اور نکال ڈالی ہم نے جو ان کے جیوں میں تھی خفگی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے

مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴿۴۸﴾

آمنے سامنے، نہ پہنچے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ
خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں اصل بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب
الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾
وہی عذاب دردناک ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہلِ ایمان) باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے، (خواہ اول ہی سے اگر معصیت نہ ہو یا معاف ہوگئی ہو اور خواہ سزائے معصیت بھگتنے کے بعد، ان سے کہا جائے گا کہ) تم ان (جنّات وعیون) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو (یعنی اس وقت بھی ہر ناپسند چیز سے سلامتی ہے، اور آئندہ بھی کسی شر کا اندیشہ نہیں) اور (دنیا میں طبعی تقاضے سے) ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب (ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے کے قبل ہی) دور کردینگے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے، تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے مطلع ہو کر ایمان اور تقویٰ کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب سے پہلے ان کے سامنے پانی کے دو چشمے پیش کئے جائیں گے، پہلے چشمہ سے وہ پانی پئیں گے تو ان سب کے دلوں سے باہمی رنجش جو کبھی دنیا میں پیش آئی تھی، اور طبعی طور پر اس کا اثر آخر تک موجود رہا وہ سب دھل جائے گی، اور سب کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا ہوجائیگی، کیونکہ باہمی رنجش بھی ایک تکلیف و عذاب ہے، اور جنت ہر تکلیف سے پاک ہے۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کینہ کسی مسلمان سے ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا، اس سے مراد وہ کینہ اور بغض ہے جو دنیوی غرض سے اور اپنے قصد و اختیار سے ہو اور اس کی وجہ سے یہ شخص اس کے درپے رہے کہ جب موقع پائے

اپنے دشمن کو تکلیف اور نقصان پہونچائے، طبعی انقباض جو خاصہ بشری اور غیر اختیاری ہے وہ اس میں داخل نہیں، اسی طرح جو کسی شرعی بنیاد پر مبنی ہو ایسے ہی بغض و انقباض کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اہلِ جنت کے دلوں سے ہر طرح کا انقباض اور رنجش دور کردی جائے گی۔

اسی کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ: "مجھے امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے دلوں کا غبار جنت میں داخلہ کے وقت دور کردیا جائے گا" اشارہ اُن اختلافات و مشاجرات کی طرف ہے جو ان حضرات اور حضرت علیؓ کے درمیان پیش آئے تھے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ اس آیت سے جنت کی دو خصوصیات معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہوگا، بخلاف دنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے، خالص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی، نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے اس شخص کو نکالا جائے گا، سورۃ صٓ میں ارشاد ہے اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ، یعنی یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اس آیت میں فرمایا وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ، یعنی ان کو کبھی ان نعمتوں راحتوں سے نکالا نہیں جائے گا، بخلاف معاملاتِ دنیا کے کہ یہاں اگر کوئی کسی کو بڑے سے بڑا انعام و راحت دے بھی دے تو یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ جس نے یہ انعامات دیئے ہیں وہ کسی وقت ناراض ہو کر یہاں سے نکال دے گا۔

ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اُکتا جائے اور باہر جانا چاہے، قرآنِ عزیز نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کردیا ہے کہ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا، یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا

اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا، جب چلے آئے اس کے گھر میں اور بولے

سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا

سلام وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، بولے ڈر مت ہم تجھ کو

وقف لازم

نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ

خوش خبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی ، بولا کیا خوش خبری سناتے ہو مجھ کو جب پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا

فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾

اب کاہے پر خوش خبری سناتے ہو ، بولے ہم نے تجھ کو خوش خبری سنائی سچی سو مت ہو تو نا امیدوں میں ،

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ

بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں ، بولا پھر

فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ

کیا مہم ہے تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوؤ ، بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم

مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ

گنہگار پر ، مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچا لیں گے سب کو ، مگر ایک اسکی عورت

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾

ہم نے ٹھہرالیا ، وہ ہے رہ جانے والوں میں ، پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا

بولا تم لوگ ہو اوپرے ، بولے نہیں پر ہم لیکر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں

فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

وہ جھگڑتے تھے ، اور ہم لائے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں ،

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ

سو لے نکل اپنے گھر والوں کو کچھ رات رہے سے ، اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ

تم میں سے کوئی ، اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے ، اور مقرر کر دی ہم نے اس کو

ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ

یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے ، اور

جَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ

آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے ، لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں

فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ

سو مجھ کو رسوا مت کرو، اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ، بولے کیا ہم نے تجھ کو منع

نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾ؕ

نہیں کیا جہان کی حمایت سے، بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے،

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں، پھر آپکڑا ان کو چنگھاڑ

الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ۙ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا

نے سورج نکلتے وقت، پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے

عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ان پر پتھر کھنگر کے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنیوالوں کو

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ؕ

اور وہ بستی واقع ہے سیدھی راہ پر، البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (لوگوں) کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجئے (وہ قصہ اسوقت واقع ہوا تھا) جب کہ وہ (مہمان جوکہ واقع میں فرشتے تھے، اور بشکلِ انسانی ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان سمجھا) ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے پھر (آکر) انھوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے لئے کھانا تیار کر کے لائے، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے، انھوں نے کھایا نہیں تب) ابراہیم (علیہ السلام دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے کیونکہ وہ فرشتے بشکلِ بشر تھے ان کو بشر ہی سمجھا اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں مخالف نہ ہوں اور) کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے ہیں منجانب اللہ ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور) آپ کو ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ

علم انبیاء کو ہوتا ہے، مراد اس فرزند سے اسحٰق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے) ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بوڑھاپا آ گیا سو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (مطلب یہ کہ یہ امر فی نفسہٖ عجیب ہے، نہ یہ کہ قدرت سے بعید ہے) وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی تولّدِ فرزند یقیناً ہونے والا ہے) سو آپ نا امید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے اسباب عادیہ پر نظر کرنے سے وساوس نا امیدی کے غالب ہوتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون نا امید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت سے کب موصوف ہو سکتا ہوں، محض مقصود اس امر کا عجیب ہونا ہے، باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہے، بعد اس کے فراستِ نبوّت سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے علاوہ بشارت کے اور بھی کوئی مہم عظیم مقصود ہے اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرائن سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمھارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے) تو (یہ بتلاؤ کہ) اب تم کو کیا مہم درپیش ہے اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچا لیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلا دیں گے کہ ان مجرموں سے علیحدہ ہو جائیں) بجز اُن کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بی بی کے کہ اس کی نسبت ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہو گی)۔

پھر جب وہ فرشتے خاندانِ لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ بشکلِ بشر تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی (معلوم ہوتے) ہو، (دیکھئے شہر والے تمھارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں) انھوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں، سو آپ رات کے کسی حصّہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر (یہاں سے) چلے جائیے، اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لَوٹ نہ جائے، اور آپ کے رُعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت کر دی گئی ہے) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں)، اور جس جگہ (جانے کا) تم کو حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (تفسیر درمنثور میں بحوالۂ سدّی نقل کیا ہے

کہ وہ جگہ ملکِ شام ہے، جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرات کو حکم دیا گیا تھا) اور ہم نے ان فرشتوں کے واسطے سے) لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی بالکل اُن کی جڑ کٹ جائیگی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہو جائیں گے، فرشتوں کی یہ گفتگو وقوع کے اعتبار سے اس قصہ کے بعد ہوئی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے، لیکن اس کو ذکر کرنے میں اس لئے مقدم کر دیا کہ قصہ بیان کرنے سے جو بات مقصود ہے، یعنی نافرمانوں پر عذاب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی وہ پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہو جائے، اگلا قصہ یہ ہے) اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں حسین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسد نیت اور بُرے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر پہونچے) لوط (علیہ السلام) نے (جو اب تک ان کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے ان کے فاسد ارادوں کا احساس کر کے) فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کر کے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان پردیسیوں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں، اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہے) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں) وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں آپنے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ ان کو مہمان بنایا) کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں (کو اپنا مہمان بنانے سے (بارہا) منع نہیں کر چکے (نہ آپ ان کو مہمان بناتے نہ اس رسوائی کی نوبت آتی) لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو بتلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، قضاءِ شہوت کے طبعی تقاضے کے لئے) یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں اگر تم میرا کہنا کرو (تو شریفانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سنتے تھے) آپ کی جان کی قسم، (اپنی مستی میں مدہوش تھے، پس سورج نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدبایا (یہ ترجمہ مُشرقین کا ہے، اس سے پہلے جو مُصبحین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی صبح ہوتے ہوتے کے ہیں، ان دونوں کا اجتماع اس اعتبار سے ممکن ہو کہ صبح سے ابتدا ہوئی اور اشراق تک خاتمہ ہوا) پھر (اس سخت آواز کے بعد) ہم نے ان بستیوں (کی زمین کو اُلٹ کر اُن) کا اوپر کا تختہ (تو) نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہل بصیرت کے لئے (مثلاً ایک تو یہ کہ بُرے فعل کا نتیجہ آخر کار بُرا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور ڈھیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت و عزت

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کر کے فریب میں مبتلا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ وغیر ذلک

معارف و مسائل

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اعزاز و اکرام قولہٗ لَعَمۡرُكَ روح المعانی میں جمہور مفسرین کا قول یہ نقل کیا ہے کہ لَعَمۡرُكَ کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات کی قسم کھائی ہے، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور ابو نعیم و ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات و کائنات میں کسی کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت و مرتبہ عطا نہیں فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر یا کسی فرشتے کی حیات پر کبھی قسم نہیں کھائی اور اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر و حیات کی قسم کھائی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے، کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے، اور ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو (رواہ ابو داؤد والنسائی عن ابی ہریرۃ)

اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا کہ "خبردار رہو اللہ تعالیٰ باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کرے ورنہ خاموش رہے (قرطبی، مائدہ)

لیکن یہ حکم عام مخلوقات کے لئے ہے، اللہ جل شانہٗ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں، یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے اس چیز کا اشرف اور عظیم النفع ہونا بیان کرنا ہے، اور عام مخلوق کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں، کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے

مخصوص ہے۔

جن بستیوں پر عذاب نازل ہوا ان سے عبرت حاصل کرنا چاہئے	اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ۚ وَ اِنَّہَا لَبِسَبِیۡلٍ مُّقِیۡمٍ ۔ اس میں حق تعالیٰ نے ان بستیوں کا محلِ وقوع بیان فرمایا جو عرب سے شام

تک جانے والے راستہ پر ہیں، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ان میں اہلِ بصیرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ان کے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے لَمۡ تُسۡکَنۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا، یعنی یہ بستیاں عذابِ الٰہی کے ذریعہ ویران ہونے کے بعد پھر دوبارہ آباد نہیں ہوئیں بجز چند بستیوں کے"، اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان بستیوں اور ان کے مکانات کو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بنایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان مقامات سے گذرے ہیں تو آپ پر ہیبتِ حق کا ایک خاص حال ہوتا تھا جس سے سرِ مبارک جھک جاتا تھا، اور آپ اپنی سواری کو اُن مقامات میں تیز کر کے جلد عبور کرنے کی سعی فرماتے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے یہ سنت قائم کر دی کہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے اُن کو تماشاگاہ بنانا بڑی قساوت ہے بلکہ ان سے عبرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور اس کے عذاب کا خوف طاری ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تختہ اُلٹا گیا ہے، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق عرب سے شام کو جانے والے راستہ پر اردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطح سمندر سے کافی گہرائی میں ایک عظیم صحراء کی صورت میں موجود ہے، اس کے ایک بہت بڑے رقبہ پر ایک خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، اس پانی میں کوئی مچھلی، مینڈک وغیرہ جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحرِ میّت اور بحرِ لوط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اس میں پانی کے اجزاء بہت کم اور تیل کی قسم کے اجزاء زیادہ ہیں، اس لئے اس میں کوئی دریائی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آجکل آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنا دیئے ہیں، اور آخرت سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آجکل اس کو ایک سیرگاہ بنایا ہوا ہے، لوگ تماشے کے طور پر اسے دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم نے اسی غفلت شعاری پر تنبیہ کیلئے آخر میں فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ، یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشمِ بصیرت رکھنے والے کیلئے عبرت آموز ہیں لیکن اس عبرت سے فائدہ اٹھانیوالے مؤمنین ہی ہوتے ہیں، دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر رد آ ہو جاتے ہیں

وَإِنْ كَانَ أَصْحَٰبُ ٱلْأَيْكَةِ لَظَٰلِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَٱنتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَإِنَّهُمَا

اور تحقیق تھے بَن کے رہنے والے گنہگار ، سو ہم نے بدلہ لیا اُن سے اور یہ دونوں

لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَٰبُ ٱلْحِجْرِ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾

بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر ، اور بیشک جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو ،

وَءَاتَيْنَٰهُمْ ءَايَٰتِنَا فَكَانُوا۟ عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا۟ يَنْحِتُونَ مِنَ

اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں سو رہے ان سے مُنہ پھیرتے ، اور تھے کہ تراشتے تھے

ٱلْجِبَالِ بُيُوتًا ءَامِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ ٱلصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾

پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ ، پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے صبح ہونے کے وقت

فَمَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ

پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا ، اور ہم نے بنائے نہیں آسمان

وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ إِلَّا بِٱلْحَقِّ ۗ وَإِنَّ ٱلسَّاعَةَ

اور زمین اور جو اُن کے بیچ میں ہے بغیر حکمت ، اور قیامت بیشک

لَءَاتِيَةٌ ۖ فَٱصْفَحِ ٱلصَّفْحَ ٱلْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

آنے والی ہے سو کنارہ کر اچھی طرح کنارہ ، تیرا رب جو ہے وہی ہے

ٱلْخَلَّٰقُ ٱلْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾

پیدا کرنے والا خبر دار۔

وقف لازم ۵ ع ۱۹ ۵

خلاصۂ تفسیر

قصۂ اصحابِ ایکہ اور اصحابِ حجر

اور بَن والے (یعنی شعیب علیہ السلام کی امت بھی) بڑے ظالم تھے سو ہم نے ان سے (بھی) بدلہ لیا (اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا) اور (دونوں (قوم کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں (اور شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں) اور حِجر (کبسر حاء) والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھوٹا بتلایا (کیونکہ جب صالح علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا) اور ہم نے انکو اپنی (طرف سے) نشانیاں دیں (جن سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور

حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوتی تھی مثلاً دلائل توحید اور ناقہ کہ معجزہ صالح علیہ السلام کا تھا) سو وہ لوگ ان (نشانیوں) سے روگردانی (ہی) کرتے رہے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ (ان میں سب آفات سے) امن میں رہیں سو ان کو صبح کے وقت (خواہ اوّل ہی صبح میں یا دن چڑھے، علی الاحتمالین) آواز سخت نے آپکڑا سو ان کے (دنیوی) ہنر ان کے کچھ بھی کام آئے (ان ہی مستحکم گھروں میں عذاب سے کام تمام ہوگیا، اس آفت سے اُن کے گھروں نے نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو احتمال بھی نہ تھا، اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتے)۔

معارف ومسائل

آیکہ، بَن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مَدیَن کے پاس ایک بَن تھا، اس لئے آیکہ اصحابِ مَدیَن ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحابِ آیکہ اور اصحابِ مَدیَن دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں، ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

تفسیر رُوح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ: "اِنَّ مَدْیَنَ وَ اَصْحَابَ الْاَیْکَۃِ اُمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَیْہِمَا شُعَیْبًا"، واللہ اعلم

اور حِجر ایک وادی ہے جو حجاز وشام کے درمیان واقع ہے، اس میں قوم ثمود آباد تھی۔

شروع سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفارِ مکہ کو جو شدید عناد و مخالفت تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جارہا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

بقیہ خلاصۂ تفسیر اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کے عناد و خلاف سے غم نہ کیجئے کیونکہ اس کا ایک روز فیصلہ ہونے والا ہے، اور وہ روزِ قیامت ہے، جس کی آمد کے متعلق ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صانعِ عالم کے وجود اور وحدت و عظمت پر استدلال کر کے اس کے احکام کی اطاعت کریں، اور بعد اقامت اس حجت کے جو ایسا نہ کرے وہ معذب ہو) اور (دنیا میں پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے اس کے لئے قیامت مقرر ہے پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو بھگتا یا جائے گا) سو آپ (کچھ غم نہ کیجئے بلکہ) خوبی کے ساتھ (ان کی شرارتوں سے) درگذر کیجئے (درگذر کا مطلب یہ ہے کہ اس غم میں نہ پڑیئے، اس کا خیال نہ کیجئے، اور خوبی یہ کہ شکوہ و شکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ)

بلاشبہ آپ کا رب (چونکہ) بڑا خالق (ہے اس سے ثابت ہوا کہ) بڑا عالم (بھی) ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے آپ کے صبر کا بھی، ان کی شرارت کا بھی، اس لئے ان سے پورا پورا بدلہ لے لے گا)۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿٨٧﴾ لَا تَمُدَّنَّ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا، مت ڈال اپنی

عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٩﴾

اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے، اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانیوالا کھول کر

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾

جیسا ہم نے بھیجا ہے ان بانٹنے والوں پر، جنھوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے، جو کچھ وہ کرتے تھے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ

سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پروا نہ کر مشرکوں کی، ہم بس ہیں تیری طرف سے

الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ

ٹھٹھے کرنے والوں کو، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی،

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ

سو عنقریب معلوم کرلیں گے، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رُکتا ہے ان کی

بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾

باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنیوالوں سے

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾

اور بندگی کئے جا اپنے رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

الربع

ع ۲ ۶

خلاصۂ تفسیر

اور (آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ موجب غم ہوتا ہے، ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے، کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر لطف و عنایت ہے چنانچہ) ہم نے آپ کو (ایک بڑی بھاری نعمت یعنی) سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع مضامین عظیمہ ہونے کے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جاوے کہ) قرآن عظیم دیا (مراد اس سے سورۂ فاتحہ ہے، جس کی عظمت کی وجہ سے اس کا نام اُمّ القرآن بھی ہے، پس اس نعمت اور منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ آپ کا قلب مسرور و مطمئن ہو، ان لوگوں کے عناد و خلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور) آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے (نہ بلحاظ افسوس نہ بلحاظ نارضگی) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ مجوس اور مشرکین کو) برتنے کے لئے دے رکھی ہے (اور بہت جلد اُن سے جُدا ہو جاوے گی) اور ان (کی حالتِ کفر) پر (کچھ) غم نہ کیجئے (بلحاظ نارضگی نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ وہ دشمن خدا ہیں اس لئے بوجہ بُغض فی اللہ غصہ آوے کہ ایسی نعمتیں ان کے پاس نہ ہوتیں، اس کے جواب کی طرف مَتَّعْنَا میں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں کہ ان مبغوضین کے پاس نہ ہوتیں، یہ تو متاع فانی ہے، بہت جلد جاتا رہے گا، اور بلحاظ افسوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آئیں، اس کا جواب لَا تَحْزَنْ میں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اُن کی طینت میں حد درجہ عناد ہے، ان سے کسی طرح توقع نہیں، اور حزن ہوتا ہے خلافِ توقع پر جب توقع نہیں تو پھر حزن بے وجہ ہے، اور بہ لحاظ حرص نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر و غم میں نہ پڑیئے) اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے) اور (کافروں کے لئے چونکہ فکر مصلحت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے، اور اتنا) کہہ دیجئے کہ میں کھلم کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں (اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (مختلف اوقات گذشتہ میں) نازل کیا ہے جنھوں نے (احکام الٰہی کے) حصّے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے (ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا جو مرضی کے خلاف ہوا اس سے

انکار کردیا، مراد اس سے سابق یہود و نصاریٰ ہیں جن پر مخالفتِ انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے عذابوں کا ہونا مثل مسخ بصورتِ بندر وخنزیر، قید، قتل اور ذلت مشہور ومعروف تھا، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا امر بعید نہیں، پہلے ہو چکا ہے اگر تم پر بھی ہو جاوے تو تعجب کی کونسی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں، اور جب تقریر مذکور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح پچھلے لوگ مخالفتِ انبیاء کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں) سو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب (اگلوں اور پچھلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے) غرض (حاصل کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے) کا حکم کیا گیا ہے اس کو (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور (اگر یہ نہ مانیں تو) ان مشرکوں (کے نہ ماننے کی مطلق) پروانہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے جیسا اوپر آیا ہے لَا تَحْزَنْ، اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے کہ یہ مخالف بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں چنانچہ آپ پر تو) ہنستے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان (کے شر وایذاء) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (کہ استہزاء اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاہے کا خوف ہے) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر واستہزاء کی) باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے اور (نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آجاوے (یعنی مرتے دم تک ذکر وعبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر وثواب کے علاوہ یہ خاصیت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج وغم اور تکلیف ومصیبت ہلکی ہو جاتی ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا متن اور خلاصہ ہے ان آیات میں سورۂ فاتحہ کو قرآن عظیم کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک حیثیت سے پورا قرآن ہے، کیونکہ اصولِ اسلام سب اس میں سموئے ہوئے ہیں۔

محشر میں سوال کس چیز کا ہوگا آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا ہے

کہ ان سب اگلوں پچھلوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی۔

صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملہ کے متعلق ہوگا، تو آپ نے فرمایا قول لا الٰہ الا اللہ کے متعلق، تفسیر قرطبی میں اس روایت کو نقل کرکے فرمایا ہو کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد اس عہد کو عملی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کیونکہ زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و ہیئت بنانے سے اور دین محض تمنائیں کرنے سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا ہو اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہؐ اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان کو اللہ کے محارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے (قرطبی)

تبلیغ و ارشاد میں تدریج بقدر استطاعت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ، اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ بھی خفیہ ہی ایک ایک دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار و اعلان میں کفار کی ایذاء رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے استہزاء کرنے والے اور ایذاء دینے والے کفار کی ایذاء سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی، اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان و اظہار کے ذریعہ تلاوت و عبادت اور تبلیغ و دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ، میں جن لوگوں کا ذکر ہو، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، عاص بن وائل اسود بن المطلب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، حارث بن الطُلاطِلَہ، یہ پانچوں معجزانہ طور پر ایک ہی وقت میں حضرت جبرئیلؑ کے اشارے سے ہلاک کر دیئے گئے، اس واقعہ سے تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں یہ حاصل ہوا کہ اگر انسان کسی ایسے مقام یا ایسے حال میں مبتلا ہو جائے کہ وہاں حق بات کو علی الاعلان کہنے سے اُن لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہونچنے کی توقع نہ ہو اور اپنے آپ کو نقصان و تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ کام خفیہ طور پر کرنا بھی درست اور جائز ہے، البتہ جب اظہار و اعلان کی قدرت ہو جائے تو پھر اعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

دشمنوں کی ایذاء سے تنگدلی کا علاج

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اِلٰى فَسَبِّحْ سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دشمنوں کی باتوں سے رنج پہونچے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دُور فرما دیں گے۔

سُورۂ حجر تمام شد

سُوْرَةُ النَّحْلِ

سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ نحل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

آپہنچا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ

اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں

اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ②

کہ خبردار کر دو کہ کسی کی بندگی نہیں سوا میرے، سو مجھ سے ڈرو

خلاصۂ تفسیر

اس سورۃ کا نام سورۂ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب و غریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے، اس کا دوسرا نام سورۂ نِعَم بھی ہے (قرطبی) نِعَم بکسر نون نعمت کی جمع ہے، اس لئے کہ اس سورۃ میں خاص طور پر اللہ جل شانہٗ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی سزائے کفر کا وقت قریب) آپہنچا سو تم اس میں (منکرانہ) جلدی مت مچاؤ (بلکہ توحید اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے وہ اللہ تعالیٰ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہیں (یعنی انبیاء پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ (ہے) کہ لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت

نہیں سو مجھ سے ہی ڈرتے رہو (یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ورنہ سزا ہوگی)۔

معارف و مسائل

اس سورۃ کو بغیر کسی خاص تمہید کے ایک شدید وعید اور ہیبت ناک عنوان سے شروع کیا۔ جس کی وجہ مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیامت سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غالب کرنے اور مخالفوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں تو یہ کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آتا، اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "آپہونچا حکم اللہ کا تم جلد بازی نہ کرو"

حکمُ اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے کیا ہے، کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جاوے گا، اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہوگی، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہیبت ناک لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حکم اللہ کا آپہنچا، یعنی پہونچنے ہی والا ہے جس کو تم عنقریب دیکھ لوگے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں حکم اللہ سے مراد قیامت ہے، اس کے آپہونچنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کا وقوع قریب ہے، اور پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قیامت کا قریب ہونا یا آپہونچنا بھی کچھ بعید نہیں رہتا (بحر محیط)

اس کے بعد کے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو حق تعالیٰ کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں یہ کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں (بحر)

اس آیت کا خلاصہ ایک وعید شدید کے ذریعہ توحید کی دعوت دینا ہے، دوسری آیت میں دلیل نقلی سے توحید کا اثبات ہے، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کے مختلف خطوں، مختلف زمانوں میں جو بھی رسول آیا ہے، اس نے یہی عقیدۂ توحید پیش کیا ہے، حالانکہ ایک کو دوسرے کے حال اور تعلیم کی بظاہر اسباب کوئی اطلاع بھی نہ تھی، غور کرو کہ کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار حضرات عقلاء، جو مختلف اوقات میں مختلف ملکوں مختلف خطوں میں پیدا ہوں اور وہ سب ایک ہی بات کے قائل ہوں تو فطرۃً انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہو سکتی، ایمان لانے کے لئے تنہا یہ دلیل بھی کافی ہے۔

لفظ رُوح سے مراد اس آیت میں بقول ابن عباسؓ وحی اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہے (بحر) اس آیت میں توحید کا روایتی اور نقلی ثبوت پیش کرنے کے بعد اگلی آیتوں میں اسی عقیدۂ توحید کو عقلی طور سے حق تعالیٰ کی نعمتیں پیش نظر

کر کے ثابت کیا جاتا ہے، ارشاد ہے :-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ③ خَلَقَ
بنائے آسمان اور زمین ٹھیک ٹھیک وہ برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے، بنایا

الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ④ وَالْاَنْعَامَ
آدمی کو ایک بوند سے پھر جب ہی ہو گیا جھگڑا کرنیوالا بولنے والا، اور چوپائے

خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑤ وَلَكُمْ
بنا دیئے تمھارے واسطے ان میں جڑاول ہے اور کتنے فائدے اور بعضوں کو کھاتے ہو، اور تم کو

فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ⑥ وَتَحْمِلُ
ان سے عزت ہے جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لیجاتے ہو، اور اٹھائے چلتے ہیں

اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ
بوجھ تمھارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہونچتے وہاں مگر جان مار کر،

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑦ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ
بیشک تمھارا رب بڑا شفقت کرنیوالا مہربان ہے، اور گھوڑے پیدا کئے اور خچریں اور گدھے

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑧
کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے اور پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے

لغات کی تشریح خصیم، خصومت سے مشتق ہے، بمعنی جھگڑالو، انعام، نَعَم (بفتح نون) کی جمع ہے، چوپایوں میں سے اونٹ، بکری، گائے کو کہا جاتا ہے (مفردات راغب)

دِفْءٌ، گرمی اور گرمائی حاصل کرنے کی چیز، مراد اُون ہے، جس کے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں، تُرِيْحُوْنَ، رواح سے اور تَسْرَحُوْنَ سراح سے مشتق ہے، چوپائے جانوروں کے صبح کے وقت چراگاہ کی طرف جانے کو سراح اور شام کو گھر میں واپس آنے کو رواح کہا جاتا ہے، بِشِقِّ الْاَنْفُسِ، جان کی محنت و مشقت۔

خلاصۂ تفسیر

(اللہ تعالیٰ نے) آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور) انسان کو نطفہ سے بنایا پھر وہ اچانک کھلّم کھلّا (خدا ہی کی ذات وصفات میں) جھگڑنے لگا (یعنی بعض ایسے بھی ہوئے، مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ نعمتیں اور انسان کی طرف سے ناشکری) اور اسی نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمھارے جاڑے کا بھی سامان ہے (جانوروں کے بال اور کھال سے انسان کے پوستین اور کپڑے بنتے ہیں) اور بھی بہت سے فائدے ہیں (دودھ، سواری، باربرداری وغیرہ) اور ان میں (جو کھانے کے قابل ہیں ان کو) کھاتے بھی ہو اور ان کی وجہ سے تمھاری رونق بھی ہے جب کہ شام کے وقت (جنگل سے گھر) لاتے ہو اور جب کہ صبح کے وقت (گھر سے جنگل کو) چھوڑ دیتے ہو اور وہ تمھارے بوجھ بھی (لاد کر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدونِ جان کو محنت میں ڈالے ہوئے نہیں پہونچ سکتے، واقعی تمھارا رب بڑی شفقت و رحمت والا ہے (کہ تمھارے آرام کے لئے کیا کیا سامان پیدا کئے) اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کئے تاکہ ان پر سوار ہو اور نیز زینت کے لئے بھی، اور وہ ایسی ایسی چیزیں (تمھاری سواری وغیرہ کے لئے) بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں ؛

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تخلیقِ کائنات کی عظیم نشانیوں سے حق تعالیٰ کی توحید کا اثبات ہے، اوّل تو سب سے پہلی مخلوق آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا اس کے بعد تخلیقِ انسان کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدومِ کائنات بنایا ہے، انسان کی ابتداء ایک حقیر نطفے سے ہونا بیان کرکے فرمایا فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ، یعنی جب اس ضعیف الخلقت انسان کو طاقت اور قوّتِ گویائی عطا ہوئی تو خدا ہی کی ذات وصفات میں جھگڑے نکالنے لگا۔

انسان کے بعد اُن اشیاء کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو انسان کے فائدے کے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی ہیں، اور قرآن کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے، اور عرب کی معیشت کا بڑا مدار پالتو چوپاؤں اونٹ، گائے، بکری پر تھا، اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا پھر اَنْعَام سے جو فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں ان میں سے دو فائدے خاص طور سے بیان کردیئے، ایک لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ، یعنی اُن جانوروں کے اُون سے انسان اپنے کپڑے اور کھال سے پوستین اور ٹوپیاں وغیرہ تیار کرکے جاڑے کے موسم میں گرمائی حاصل کرتا ہے۔

دوسرا فائدہ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ، یعنی انسان ان جانوروں کو ذبح کرکے اپنی خوراک بھی

بنا سکتا ہے، اور جب تک زندہ ہے ان کے دودھ سے اپنی بہترین غذا پیدا کرتا ہے، دودھ، دہی مکھن، گھی اور ان سے بننے والی تمام اشیاء اس میں داخل ہیں۔

اور باقی عام فوائد کے لئے فرمایا وَمَنَافِعُ ، یعنی بے شمار منافع اور فوائد انسان کے جانوروں کے گوشت، چمڑے، ہڈی، اور بالوں سے وابستہ ہیں، اس ابہام و اجمال میں ان سب نئی سے نئی ایجادات کی طرف بھی اشارہ ہے جو حیوانی اجزاء سے انسان کی غذاء، لباس، دوا، استعمالی اشیاء کے لئے اب تک ایجاد ہو چکی ہیں، یا آئندہ قیامت تک ہوں گی۔

اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ایک اور فائدہ عرب کے مذاق کے مطابق یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمہارے لئے جمال اور رونق کا ذریعہ ہیں، خصوصاً جب وہ شام کو چراگاہوں سے تمہارے مویشی خانوں کی طرف آتے ہیں یا صبح کو گھروں سے چراگاہوں کی طرف جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت مویشی سے ان کے مالکان کی خاص شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

آخر میں ان جانوروں کا ایک اور اہم فائدہ یہ بیان کیا کہ یہ جانور تمہارے بوجھل سامان دور دراز شہروں تک پہونچا دیتے ہیں جہاں تمہاری اور تمہارے سامان کی رسائی جان جوکھوں میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھی، اونٹ اور بیل خاص طور سے انسان کی یہ خدمت بڑے پیمانے پر انجام دیتے ہیں، آج ریل گاڑیوں، ٹرکوں، ہوائی جہازوں کے زمانے میں بھی انسان ان جانوروں سے مستغنی نہیں، کتنے مقامات دنیا میں ایسے ہیں جہاں یہ تمام نو ایجاد سواریاں باربرداری کا کام نہیں دے سکتیں وہاں پھر انہی کی خدمات حاصل کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔

اَنْعَام یعنی اونٹ اور بیل وغیرہ کی باربرداری کا ذکر آیا تو اس کے بعد اُن چوپایہ جانوروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوا جن کی تخلیق ہی سواری اور باربرداری کے لئے ہے، ان کے دودھ یا گوشت سے انسان کا فائدہ متعلق نہیں، کیونکہ از روئے شرع وہ اخلاقی بیماریوں کا سبب ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں، فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ، "یعنی ہم نے گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کئے، تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو، اس میں باربرداری بھی ضمناً آگئی، اور ان کو اس لئے بھی پیدا کیا کہ یہ تمہارے لئے زینت بنیں"۔ زینت سے وہی شان و شوکت مراد ہے جو عرفاً ان جانوروں کے مالکان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں ریل، موٹر ہوائی جہاز کا ذکر

آخر میں سواری کے تین جانور گھوڑے، خچر، گدھے کا خاص طور سے بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی سواریوں کے متعلق بصیغۂ استقبال فرمایا:۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ، "یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے"۔

اس میں وہ تمام نو ایجاد سواری گاڑیاں بھی داخل ہیں جن کا زمانۂ قدیم میں نہ وجود تھا نہ کوئی تصوّر، مثلاً ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں داخل ہیں جو آئندہ زمانے میں ایجاد ہوں گی، کیونکہ تخلیق ان سب چیزوں کی درحقیقت خالقِ مطلق ہی کا فعل ہے، سائنس قدیم وجدید کا اس میں صرف اتنا ہی کام ہو کہ قدرت کی پیدا کی ہوئی دھاتوں میں قدرت ہی کی دی ہوئی عقل وفہم کے ذریعہ جوڑ توڑ کر کے ان کے مختلف کَل پُرزے بنالے، اور پھر اس میں قدرت الٰہیہ کی بخشی ہوئی ہَوا، پانی، آگ وغیرہ سے برقی رَو پیدا کرے، یا قدرت ہی کے دیئے ہوئے خزانوں میں سے پیٹرول نکال کر ان سواریوں میں استعمال کرلے، سائنس قدیم وجدید مل کر بھی نہ کوئی لوہا، پیتل پیدا کرسکتی ہے، نہ ایلومونیم قسم کی ہلکی دھاتیں بنا سکتی ہے، نہ لکڑی پیدا کرسکتی ہے، نہ ہَوا اور پانی پیدا کرنا اس کے بس میں ہو، اس کا کام اس سے زائد نہیں کہ قدرتِ الٰہیہ کی پیدا کی ہوئی قوتوں کا استعمال سیکھ لے، دنیا کی ساری ایجادات صرف اسی استعمال کی تفصیل ہیں، اس لئے جب ذرا بھی کوئی غور وفکر سے کام لے تو ان سب نئی ایجادات کو تخلیقِ خالقِ مطلق کہنے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ نظر ہے کہ پچھلی تمام اشیاء کی تخلیق میں لفظ ماضی خَلَقَ استعمال فرمایا گیا ہے، اور معروف سواریوں کا ذکر کرنے کے بعد بصیغۂ مستقبل یَخْلُقُ ارشاد ہوا ہے، اس تغییرِ عنوان سے واضح ہوگیا کہ یہ لفظ ان سواریوں اور دوسری اشیاء کے متعلق ہی جو ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگلے زمانے میں کیا کیا سواریاں اور دوسری اشیاء پیدا کرنا ہیں، ان کا اظہار اس مختصر جملے میں فرمادیا۔

حق جل شانہٗ یہ بھی کرسکتے تھے کہ آئندہ وجود میں آنے والی تمام نئی ایجادات کا نام لیکر ذکر فرمادیتے، مگر اس زمانے میں اگر ریل، موٹر، طیارہ وغیرہ کے الفاظ ذکر بھی کردیتے جاتے، تو اس سے بجز تشویشِ ذہن کے کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ ان اشیاء کا اُس وقت تصور کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا، اور نہ یہ الفاظ ان چیزوں کے لئے اس وقت کہیں مستعمل ہوتے تھے، کہ اس سے کچھ مفہوم سمجھا جاسکے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ریل کا ذکر موجود ہے، اور اسی آیت سے استدلال فرمایا، اس وقت تک موٹریں عام نہ ہوئی تھیں اور ہوائی جہاز ایجاد

نہ ہوئے تھے اس لئے ریل کے ذکر پر اکتفاء فرمایا۔

مسئلہ: قرآن کریم نے اوّل اَنْعَام یعنی اونٹ، گائے، بکری کا ذکر فرمایا، اور ان کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ان کا گوشت کھانا بھی قرار دیا، پھر اس سے الگ کر کے فرمایا:

وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ، ان کے فوائد میں سواری لینے اور ان سے اپنی زینت حاصل کرنے کا تو ذکر کیا، مگر گوشت کھانے کا یہاں ذکر نہیں کیا، اس میں یہ دلالت پائی جاتی ہے کہ گھوڑے، خچر، گدھے کا گوشت حلال نہیں، خچر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے پر تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے، اور ایک مستقل حدیث میں ان کی حرمت کا صراحۃً بھی ذکر آیا ہے، مگر گھوڑے کے معاملہ میں حدیث کی دو روایتیں متعارض آئی ہیں، ایک سے حلال اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے فقہائے امت کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہو گئے، بعض نے حلال قرار دیا بعض نے حرام، امام اعظم ابوحنیفہ رحؒ نے اسی تعارض دلائل کی وجہ سے گھوڑے کے گوشت کو گدھے اور خچر کی طرح حرام تو نہیں کہا مگر مکروہ قرار دیا (احکام القرآن جصاص)

مسئلہ: اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تفاخر و تکبر حرام ہیں، فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے، نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے، اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے وہ حرام ہے (بیان القرآن)

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۭ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ		
اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے اور اگر وہ چاہے تو سیدھی راہ		
	اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾	
	دے تم سب کو۔	

ع ۱/۷

خلاصۂ تفسیر

اور (دلائل مذکورہ سابقہ ولاحقہ سے جو) سیدھا رستہ (دین کا ثابت ہوتا ہے وہ خاص) اللہ تک پہنچتا ہے اور بعضے رستے (جو کہ دین کے خلاف ہیں) ٹیڑھے بھی ہیں (کہ ان سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں، پس بعض تو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھے پر) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو

(منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا) مگر وہ اسی کو پہنچاتے ہیں جو صراطِ مستقیم کا طالب بھی ہو وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا، اس لئے تم کو چاہئے کہ دلائل میں غور کرو اور ان سے حق کو طلب کرو کہ تم کو منزلِ مقصود تک رسائی عطا ہو)

معارف ومسائل

ان آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم الشان نعمتوں کا ذکر فرما کر توحید کے عقلی دلائل جمع کئے گئے، آگے بھی انہی نعمتوں کا ذکر ہے، درمیان میں یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے لائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدۂ قدیمہ کی بناء پر اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ لوگوں کے لئے وہ صراطِ مستقیم واضح کردے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے، اسی لئے نعماءِ الٰہیہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کے دلائل جمع کئے جا رہے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف کچھ لوگوں نے دوسرے ٹیڑھے راستے بھی اختیار کر رکھے ہیں، وہ ان تمام واضح آیات اور دلائل سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو سیدھے راستہ پر مجبور کر کے ڈال دیں، تو ان کے اختیار میں تھا، مگر حکمت ومصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جبر نہ کیا جائے، دونوں راستے سامنے کر دیئے جائیں، چلنے والا جس راستہ پر چلنا چاہے چلا جائے، صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ اور جنت تک پہونچائے گا، اور ٹیڑھے راستے جہنم پر پہونچائیں گے، انسان کو اختیار دیدیا کہ جس کو چاہے انتخاب کرلے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّـكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّمِنۡهُ شَجَرٌ

وہی ہے جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لئے پانی اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے

فِیۡهِ تُسِیۡمُوۡنَ ﴿۱۰﴾ یُنۡۢبِتُ لَـكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ

ہیں جس میں چراتے ہو، اُگاتا ہے تمہارے واسطے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں

وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ‌ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ

اور انگور اور ہر قسم کے میوے، اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کو

یَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَسَخَّرَ لَـكُمُ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ؕ

جو غور کرتے ہیں، اور تمہارے کام میں لگا دیا رات اور دن اور سورج اور چاند کو

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو سمجھ رکھتے ہیں ،

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

اور جو چیزیں پھیلائیں تمہارے واسطے زمین میں رنگ برنگ کی اس میں نشانی ہے ان

لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا

لوگوں کو جو سوچتے ہیں ، اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو کہ کھاؤ اس میں سے گوشت

طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ

تازہ اور نکالو اس میں سے گہنا جو پہنتے ہو ، اور دیکھتا ہے تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی

فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاَلْقٰى

پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ احسان مانو ، اور رکھ دیئے

فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

زمین پر بوجھ کہ کبھی جھک پڑے تم کو لے کر اور بنائیں ندیاں اور راستے تاکہ تم

تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

راہ پاؤ ، اور بنائیں علامتیں اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس (کے سبب) سے درخت (پیدا ہوتے) ہیں، جن میں تم (اپنے مواشی کو) چرنے چھوڑ دیتے ہو (اور) اس (پانی) سے تمہارے (فائدے کے) لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل (زمین سے) اگاتا ہے بیشک اس (مذکور) میں سوچنے والوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور اس (اللہ) نے تمہارے (فائدہ کے) لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا اور (اسی طرح اور) ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر (قدرت) ہیں بیشک اس (مذکور) میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لئے (توحید کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں اور (اسی طرح) ان چیزوں کو بھی مسخر (قدرت) بنایا جن کو تمہارے (فائدہ کیلئے)

اس طور پر پیدا کیا ہے کہ ان کے اقسام (یعنی اجناس وانواع واصناف) مختلف ہیں (اس میں تمام حیوانات ونباتات وجمادات، مفردات ومرکبات داخل ہوگئے) بیشک اس (مذکور) میں (بھی) سمجھدار لوگوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے دریا کو (بھی) مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس میں سے تازہ تازہ گوشت (یعنی مچھلی نکال نکال کر) کھاؤ اور (تاکہ) اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم (مرد وعورت سب) پہنتے ہو اور (اے مخاطب اس دریا کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ) تو کشتیوں کو (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی جیسے بڑے جہاز تو ان کو) دیکھتا ہے کہ اس (دریا) میں (اس کا) پانی چیرتی ہوئی چلی جارہی ہیں اور (نیز اس لئے دریا کو مسخر قدرت بنایا) تاکہ تم (اس میں مالِ تجارت لے کر سفر کرو اور اس کے ذریعہ سے) خدا کی روزی تلاش کرو اور (تاکہ ان سب فائدوں کو دیکھ کر اس کا) شکر (ادا) کرو اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تاکہ وہ (زمین) تم کو لے کر ڈگمگانے (اور ہلنے) نہ لگے اور اس نے (چھوٹی چھوٹی) نہریں اور رستے بنائے تاکہ (ان رستوں کے ذریعہ سے اپنے) منزلِ مقصود تک پہنچ سکو اور (ان رستوں کی پہچان کے لئے) بہت سی نشانیاں بنائیں (جیسے پہاڑ، درخت، تعمیرات وغیرہ جن سے رستہ پہچانا جاتا ہے ورنہ اگر تمام زمین کی سطح یکساں حالت پر ہوتی تو رستہ ہرگز نہ پہچانا جاتا) اور ستاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں (چنانچہ ظاہر ومعلوم ہے)۔

معارف ومسائل

مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ، لفظ شجر اکثر درخت کے لئے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، گھاس اور بیل وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے، اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔

تُسِيْمُوْنَ، اسامت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چرنے کیلئے چھوڑنا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، ان تمام آیات میں نعمائے الٰہیہ اور عجیب و غریب حکمت کے ساتھ تخلیقِ کائنات کا ذکر ہے، جس میں غور وفکر کرنے والوں کو ایسے دلائل اور شواہد ملتے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی توحید کا گویا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، اسی لئے ان نعمتوں کا ذکر کرتے کرتے بار بار اس پر متنبہ کیا گیا ہے، اس آیت کے اخیر میں فرمایا کہ اس میں سوچنے والوں کے لئے دلیل ہے، کیونکہ کھیتی اور درخت اور ان کے پھل پھول وغیرہ کا تعلق اللہ جل شانہٗ کی صنعت وحکمت کے ساتھ کسی قدر غور وفکر چاہتا ہے، کہ آدمی یہ سوچے کہ دانہ یا گٹھلی زمین کے

اندر ڈالنے اور پانی دینے سے تو خود بخود یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں سے ایک عظیم الشان درخت نکل آئے اور اس پر رنگارنگ کے پھول لگنے لگیں، اس میں کسی کاشتکار زمیندار کے عمل کا کوئی دخل نہیں، یہ سب قادر مطلق کی صنعت و حکمت سے وابستہ ہے، اور اس کے بعد لیل و نہار اور ستاروں کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع چلنے کا ذکر آیا تو آخر میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ، یعنی ان چیزوں میں چند دلائل ہیں عقل والوں کے لئے" اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ ان چیزوں کا حکم الٰہی کا مسخر ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس میں بہت کچھ غور و فکر کی ضرورت نہیں، جسکو ذرا بھی عقل ہوگی وہ سمجھ لے گا، کیونکہ نباتات اور درختوں کے اگانے میں تو بظاہر کچھ نہ کچھ انسانی عمل کا دخل تھا بھی یہاں وہ بھی نہیں۔

اس کے بعد زمین کی دوسری مختلف انواع و اقسام کی پیداوار کا ذکر فرما کر فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ، کہ اس میں دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑتے ہیں، مراد یہ ہے کہ یہاں بھی بہت گہرے فکر و نظر کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی دلالت بالکل کھلی ہوئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اس کی طرف توجہ سے دیکھے، اور نصیحت حاصل کرے، ورنہ بیوقوف بے فکر آدمی جو ادھر دھیان ہی نہ دے اس کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ، رات اور دن کو مسخر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو انسان کے کام میں لگانے کے لئے اپنی قدرت کا مسخر بنا دیا، کہ رات انسان کو آرام کے سامان مہیا کرتی ہے، اور دن اس کے کام کے راستے ہموار کرتا ہے، ان کے مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ رات اور دن انسان کے حکم کے تابع چلیں۔

هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا ، آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان میں انسان کے منافع اور فوائد بیان کرنے کے بعد بحر محیط (سمندر) کے اندر حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ سے انسان کے لئے کیا کیا فوائد ہیں ان کا بیان ہے، کہ دریا میں انسان کی خوراک کا کیسا اچھا انتظام کیا گیا ہے کہ مچھلی کا تازہ گوشت اس کو ملتا ہے۔

لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا ، کے الفاظ میں مچھلی کو تازہ گوشت قرار دینے سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دوسرے جانوروں کی طرح اس میں ذبح کرنے کی شرط نہیں وہ گویا بنا بنایا گوشت ہے۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ، یہ دریا کا دوسرا فائدہ بتلایا گیا ہے، کہ اس میں غوطہ لگا کر انسان اپنے لئے حِلیَہ نکال لیتا ہے، حِلیَہ کے لفظی معنی زینت کے ہیں، مراد وہ موتی، مونگا اور جواہرات ہیں جو سمندر سے نکلتے ہیں اور عورتیں ان کے ہار بنا کر گلے میں یا دوسرے طریقوں

سے کانوں میں پہنتی ہیں، یہ زیور اگرچہ عورتیں پہنتی ہیں، لیکن قرآن نے لفظ مذکر استعمال فرمایا
تَلْبَسُوْنَهَا یعنی تم لوگ پہنتے ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عورتوں کا زیور پہننا درحقیقت
مردوں ہی کے مفاد کے لئے ہیں، عورت کی زینت درحقیقت مرد کا حق ہے، وہ اپنی بیوی کو زینت کا لباس
اور زیور پہننے پر مجبور بھی کرسکتا ہے، اس کے علاوہ جواہرات کا استعمال مرد بھی انگوٹھی وغیرہ میں کرسکتے ہیں
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ، یہ تیسرا فائدہ دریا کا بتلایا گیا ہے
فُلک کے معنی کشتی، اور مَوَاخِر، ماخرہ کی جمع ہے، مخر کے معنی پانی کو چیرنے کے ہیں، مراد وہ کشتیاں
اور بحری جہاز ہیں جو پانی کی موجوں کو چیرتے ہوئے مسافت طے کرتے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ دریا کو اللہ تعالیٰ نے بلادِ بعیدہ کے سفر کا راستہ بنایا ہے، دور دراز
کے ملکوں میں دریا ہی کے ذریعہ سفر کرنا اور تجارتی مال کی درآمد و برآمد کرنا آسان فرما دیا ہے، اور اس
کو حصول رزق کا عمدہ ذریعہ قرار دیا، کیونکہ دریا کے راستہ سے تجارت سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ، رَوَاسِیَ، رَاسِیَۃ کی جمع ہے، بھاری پہاڑ
کو کہا جاتا ہے، تَمِیْدَ، مَیْد مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈگمگانا یا مضطربانہ قسم کی حرکت کرنا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ زمین کے کرہ کو حق تعالیٰ نے بہت سی حکمتوں کے ماتحت ٹھوس اور
متوازن اجزاء سے نہیں بنایا، اس لئے وہ کسی جانب سے بھاری کسی جانب سے ہلکی واقع ہوئی ہے
اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زمین کو عام فلاسفروں کی طرح ساکن مانا جائے یا کچھ قدیم و جدید فلاسفروں
کی طرح حرکت مستدیرہ کے ساتھ متحرک قرار دیا جائے، دونوں حال میں زمین کے اندر ایک
اضطرابی حرکت ہوتی، جس کو اردو میں کانپنے یا ڈگمگانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس اضطرابی حرکت
کو روکنے اور اجزاء زمین کو متوازن کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کا وزن رکھ دیا
تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کرسکے، باقی رہا مسئلہ حرکت مستدیرہ کا، جیسے تمام سیارات کرتے ہیں،
اور قدیم فلاسفہ میں سے فیثاغورث کی یہی تحقیق تھی، اور جدید فلاسفر سب اس پر متفق ہیں اور
نئے تجربات نے اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا ہے تو قرآن کریم میں نہ کہیں اس کا اثبات ہے نہ
اس کی نفی، بلکہ یہ اضطرابی حرکت جس کو پہاڑوں کے ذریعہ بند کیا گیا ہے اس حرکت مستدیرہ کے
لئے اور زیادہ معین ہوگی جو سیارات کی طرح زمین کے لئے ثابت کی جاتی ہے، واللہ اعلم

وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ، اوپر چونکہ تجارتی سفر کا ذکر آیا ہے تو مناسب
ہوا کہ ان آسانیوں کا بھی ذکر کیا جائے جو حق تعالیٰ نے مسافروں کی قطع مسافت اور منزلِ مقصود
تک پہونچانے کے لئے زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس لئے فرمایا وَعَلٰمٰتٍ، یعنی ہم نے
زمین میں راستہ پہچاننے کے لئے بہت سی علامات پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، مکانوں وغیرہ کے

ذریعہ قائم کر دی ہیں، ظاہر ہے کہ اگر زمین ایک سپاٹ کرہ ہوتا تو انسان کسی منزل تک پہونچنے کے لئے کس طرح راستے میں بھٹکتا۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ، یعنی سفر کرنے والے جیسے زمینی علامات سے راستہ پہچانتے ہیں اسی طرح ستاروں کے ذریعے بھی سمت معلوم کرکے راستہ پہچان لیتے ہیں، اس عنوان میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق کا اصل مقصد تو کچھ اور ہے، اس کے ساتھ ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان سے راستے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٧﴾ وَإِنْ تَعُدُّوا

بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے، کیا تم سوچتے نہیں، اور اگر شمار کرو

نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکو گے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے

مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿١٩﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ

جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوائے

اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿٢٠﴾ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ

کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، مُردے ہیں جن میں جان نہیں

وَمَا يَشْعُرُونَ ۙ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٢١﴾ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ

اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے، معبود تمہارا معبود ہے اکیلا،

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ

سو جن کو یقین نہیں آخرت کی زندگی کا ان کے دل نہیں مانتے اور وہ

مُسْتَكْبِرُونَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

مغرور ہیں، ٹھیک بات ہے اللہ جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿٢٣﴾

کچھ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ نہیں پسند کرتا غرور کرنے والوں کو

ع ۲ (۱۲) ۸

خلاصۂ تفسیر

سو (جب اللہ تعالیٰ کا خالق اشیاء مذکورہ ہونا اور اس میں اس کا منفرد ہونا ثابت ہو چکا تو) کیا جو شخص پیدا کرتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ اس جیسا ہو جاوے گا جو پیدا نہیں کر سکتا (کہ تم دونوں کو معبود سمجھنے لگے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی اہانت ہے کہ اس کو بتوں کے برابر کر دیا) پھر کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے اور (اللہ تعالیٰ نے جو اوپر دلائل توحید میں اپنی نعمتیں بتلائی ہیں ان پر کیا حصر ہے وہ تو اس کثرت سے ہیں کہ) اگر تم اللہ تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو گننے لگو تو (کبھی) نہ گن سکو (مگر مشرکین شکر اور قدر نہیں کرتے اور یہ جرم اتنا عظیم تھا کہ نہ معاف کرانے سے معاف ہوتا اور نہ اصرار پر آگے کو یہ نعمتیں ملتیں لیکن) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ کوئی شرک سے توبہ کرے تو مغفرت ہو جاتی ہے اور نہ کرے جب بھی تمام نعمتیں حیات تک منقطع نہیں ہوتیں) اور (یہاں نعمتوں کے فائض ہونے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کبھی سزا نہ ہوگی، بلکہ آخرت میں سزا ہوگی کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری احوال سب جانتے ہیں (پس ان کے موافق سزا دیں گے یہ تو حق تعالیٰ کے خالق اور منعم ہونے کا بیان تھا) اور جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود ہی مخلوق ہیں (اور اوپر قاعدۂ کلیہ ثابت ہو چکا ہے کہ غیر خالق اور خالق مساوی نہیں، پس یہ معبودین کیسے مستحق عبادت ہو سکتے ہیں اور) وہ (معبودین) مردے (بے جان) ہیں (خواہ دواماً جیسے بت یا فی الحال جیسے وہ لوگ جو مر چکے ہیں یا فی المآل جو مریں گے مثلاً جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم) زندہ (رہنے والے) نہیں (پس خالق تو کیا ہوتے) اور ان (معبودین) کو (اتنی بھی) خبر نہیں کہ (قیامت میں) مُردے کب اٹھائے جائیں گے (یعنی بعض کو تو علم ہی نہیں اور بعض کو تعیین معلوم نہیں، اور معبود کے لئے علم تو محیط چاہیے، خصوصاً قیامت کا کہ اس پر جزا ہوگی عبادت و عدم عبادت کی تو اس کا علم تو معبود کے لئے بہت ہی مناسب ہے، پس خدا کے برابر تو علم میں کیا ہوں گے، اس تقریر سے ثابت ہوا کہ) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو (اس ایضاح حق پر بھی) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے (اور اسی لئے ان کو ڈر نہیں کہ توحید کو قبول کریں معلوم ہوا کہ) ان کے دل (ہی ایسے ناقابل ہیں کہ معقول بات کے) منکر ہو رہے ہیں اور (معلوم ہوا کہ) وہ قبولِ حق سے تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے احوال پوشیدہ وظاہر جانتے ہیں (اور یہ بھی) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (پس جب ان کا تکبر معلوم ہے تو ان کو بھی ناپسند کریں گے اور سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں کا اور تخلیق کائنات کا مفصل ذکر کرنے کے بعد اس بات پر تنبیہ فرمائی جس کے لئے ان سب نعمتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور وہ ہے توحید حق تعالیٰ کی کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس لئے فرمایا کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تنہا زمین و آسمان بنائے، کوہ و دریا بنائے، نباتات و حیوانات بنائے، درخت اور ان کے پھول پھل بنائے تو کیا وہ ذات پاک جو ان سب چیزوں کی خالق ہے ان بتوں کی مانند ہو جائے گی جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾

اور جب کہے ان سے کہ کیا اتارا ہے تمہارے رب نے تو کہیں کہانیاں ہیں پہلوں کی،

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ

تاکہ اٹھائیں بوجھ اپنے پورے دن قیامت کے اور کچھ بوجھ ان کے جن کو

يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ

بہکاتے ہیں بلا تحقیق سنتا ہے برا بوجھ ہے جو اٹھاتے ہیں، البتہ دغا بازی کر چکے ہیں

مِن قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ

جو تھے ان سے پہلے پھر پہنچا حکم اللہ کا ان کی عمارت پر بنیادوں سے پھر گر پڑی ان پر

السَّقْفُ مِن فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

چھت اوپر سے اور آیا ان پر عذاب جہاں سے ان کو خبر نہ تھی،

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ

پھر قیامت کے دن رسوا کرے گا ان کو اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن پر تم کو

تُشَاقُّونَ فِيهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ

بڑی ضد تھی، بولیں گے جن کو دی گئی تھی خبر بیشک رسوائی آج کے دن

وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۷ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ	
اور بُرائی منکروں پر ہے جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اور وہ بُرا کر رہے ہیں	
اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ	
اپنے حق میں تب ظاہر کریں گے اطاعت کہ ہم تو کرتے نہ تھے کچھ بُرائی کیوں نہیں اللہ	
عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ	
خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے ، سو داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے رہا کرو سدا	
فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹	
اسی میں سو کیا بُرا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا ۔	

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (یعنی کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے یا کوئی واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے) کہ تمھارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے (یعنی قرآن جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا فرماتے ہیں آیا یہ صحیح ہے) تو کہتے ہیں کہ (صاحب وہ رب کا نازل کیا ہوا کہاں ہے) وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں (یعنی اہلِ ملل پہلے سے توحید و نبوّت و معاد کے مدعی ہوتے آئے ہیں ان ہی سے یہ بھی نقل کرنے لگے باقی یہ دعوے خدا کے تعلیم دیئے ہوئے نہیں) نتیجہ اس (کہنے) کا یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا (گمراہ کرنے سے مراد یہی کہنا ہے اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کا کیونکہ اس سے دوسرے آدمی کا اعتقاد خراب ہوتا ہے، اور جو شخص کسی کو گمراہ کیا کرتا ہے اس گمراہ کو تو گمراہی کا گناہ ہوتا ہے اور اس گمراہ کرنے والے کو اس کی گمراہی کے سبب بن جانے کا، اس حصۂ تسبّب کو کچھ بوجھ فرمایا گیا، اور اپنے گناہ کا کامل طور پر اٹھانا ظاہر ہے) خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو یہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ بُرا بوجھ ہے (اور انھوں نے جو گمراہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ دوسروں کو ایسی باتیں کر کے بہکاتے ہیں، سو یہ تدبیریں حق کے مقابلہ میں نہ چلیں گی، بلکہ خود انہی پر ان کا وبال و نکال عود کرے گا، چنانچہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں انھوں نے (انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان (کی تدبیروں) کا بنا بنایا گھر جڑ بنیاد

سے ڈھا دیا پھر (وہ ایسے ناکام ہوئے جیسے گویا) اوپر سے ان پر (اس گھر کی) چھت آپڑی (ہو یعنی جس طرح چھت آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل خائب و خاسر ہوئے) اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر (خدا کا) عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (کیونکہ توقع تو اس تدبیر میں کامیابی کی تھی خلافِ توقع ان پر ناکامی سے بڑھ کر عذاب آ گیا جو کوسوں بھی ان کے ذہن میں نہ تھا، کفار سابقین پر عذابوں کا آنا معلوم و معروف ہے، یہ حالت تو ان کی دنیا میں ہوئی) پھر قیامت کے دن (ان کے واسطے یہ ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور (اس میں سے ایک رسوائی یہ ہوگی کہ ان سے) یہ کہے گا کہ (تم نے جو) میرے شریک (بنا رکھے تھے) جن کے بارے میں تم (انبیاء واہلِ ایمان سے) لڑائی جھگڑا کرتے تھے (وہ اب) کہاں ہیں (اس حالت کو دیکھ کر حق کے) جاننے والے کہیں گے کہ آج پوری رسوائی اور عذاب کافروں پر ہے جن کی جان فرشتوں نے حالتِ کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے شاید ان اہلِ علم کا قول بیچ میں اس لئے بیان فرمایا ہو کہ کفار کی رسوائی کا عام اور علانیہ ہونا معلوم ہو جائے) پھر کافر لوگ (اپنے شرکاء کے جواب میں) صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) کہ (شرک جو اعلیٰ درجہ کی برائی اور مخالفت حق تعالیٰ کی ہے ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اس کے مرتکب ہوتے) ہم تو کوئی برا کام (جس میں ادنیٰ مخالفت بھی حق تعالیٰ کی ہو) نہ کرتے تھے (اس کو صلح کا مضمون اس لئے کہا گیا کہ دنیا میں شرک کا جو کہ مخالفت یقینیہ ہے بڑے جوش و خروش سے اقرار تھا، کقولہ تعالیٰ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا، اور شرک کا اقرار مخالفت کا اقرار تھا خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو خود صریح مخالفت کے مدعی تھے وہاں اس شرک کے انکار سے مخالفت کا انکار کریں گے، اس لئے اس کو صلح فرمایا اور یہ ایسا ہی جیسا دوسری آیت میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، حق تعالیٰ ان کے اس قول کو رد فرمائیں گے کہ) کیوں نہیں (بلکہ واقعی تم نے بڑے بڑے کام مخالفت کے کئے) بیشک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے سو (اچھا) جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ (اور) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو غرض (حق سے) تکبر (اور مخالفت اور مقابلہ) کرنے والوں کا وہ برا ٹھکانا ہے (یہ عذاب آخرت کا ذکر ہو گیا، پس حاصل آیات کا یہ ہوا کہ تم نے اپنے سے پہلے کافروں کا حال خسارہ و عذاب دنیا و آخرت کا سن لیا، اسی طرح جو تدبیر و مکر دین حق کے مقابلہ میں تم کر رہے ہو اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہو یہی انجام تمہارا ہوگا) ۞

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور تخلیق عالم میں یکتا ہونے کا ذکر کر کے مشرکین کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، ان آیات میں دوسروں کو گمراہ کرنے اور اس کے عذاب کا بیان ہے، اور اس سے پہلے ایک سوال قرآن سے متعلق ہے، اور اس سوال کے مخاطب یہاں تو مشرکین ہیں اور انہی کا جاہلانہ جواب یہاں ذکر کر کے ان پر وعید بیان کی گئی ہے، اور پانچ آیتوں کے بعد یہی سوال مؤمنین متقین کو خطاب کر کے کیا گیا اور ان کا جواب اور اس پر وعدۂ انعامات کا ذکر ہے۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کھولا کہ سوال کرنے والا کون تھا، اس لئے مفسرین کے اس میں اقوال مختلف ہیں، کسی نے کافروں کو سوال کرنے والا قرار دیا، کسی نے مسلمانوں کو کسی نے ایک سوال مشرکین کا اور دوسرا مؤمنین کا قرار دیا، لیکن قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس بحث میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ سوال کس کی طرف سے تھا، دیکھنا تو جواب اور اس کے نتیجہ کا ہے جن کا قرآن نے خود بیان کر دیا ہے۔

مشرکین کی طرف سے خلاصہ جواب یہ ہے کہ انھوں نے اسی کو تسلیم نہیں کیا کہ کوئی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا بھی ہے، بلکہ قرآن کو پچھلے لوگوں کی کہانیاں قرار دیا، قرآن کریم نے اس پر یہ وعید سنائی کہ یہ ظالم قرآن کو کہانیاں بتلا کر دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ان کو بھگتنا پڑے گا، کہ قیامت کے روز اپنے گناہوں کا پورا وبال تو اُن پر پڑنا ہی ہے، جن کو یہ گمراہ کر رہے ہیں ان کا بھی کچھ وبال ان پر پڑے گا، اور پھر فرمایا کہ گناہوں کے جس بوجھ کو یہ لوگ اپنے اوپر لاد رہے ہیں، وہ بہت بڑا بوجھ ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ

اور کہا پرہیزگاروں کو کیا اتارا تمھارے رب نے بولے نیک بات جنھوں نے

أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ

بھلائی کی اس دنیا میں ان کو بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے، اور کیا خوب

دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

گھر ہے پرہیزگاروں کا، باغ ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے بہتی ہیں انکے نیچے سے

الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾

نہریں، ان کے واسطے وہاں ہے جو چاہیں ایسا بدلہ دیگا اللہ پرہیزگاروں کو

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا

جن کی جان قبض کرتے ہیں فرشتے اور وہ ستھرے ہیں کہتے ہیں فرشتے سلامتی تم پر جاؤ

الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ

بہشت میں بدلہ ہے اس کا جو تم کرتے تھے، کیا کام اب اس کے منتظر ہیں کہ آئیں اُن پر

الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

فرشتے یا پہنچے حکم تیرے رب کا اسی طرح کیا تھا ان سے اگلوں نے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ

اور اللہ نے ظلم نہ کیا اُن پر لیکن وہ خود اپنا بُرا کرتے رہے، پھر پڑے ان کے

سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

سر اُن کے بُرے کام اور اُلٹ پڑا ان پر جو ٹھٹھا کرتے تھے۔

ع ۹/۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان سے (جو قرآن کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ بڑی خیر (اور برکت کی چیز) نازل فرمائی ہے جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں (جس میں یہ قول مذکور اور تمام اعمالِ صالحہ آگئے) ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے (وہ بھلائی ثواب کا وعدہ و بشارت ہے) اور عالمِ آخرت تو (بوجہ اس کے کہ وہاں اس وعدہ کا تحقق و ظہور ہو جائے گا) اور زیادہ بہتر (اور موجبِ سرور) ہے! اور واقعی وہ شرک سے بچنے والوں کا اچھا گھر ہے وہ گھر (کیا ہے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے ان باغوں کے (اشجار و عمارات کے) نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا وہاں ان کو ملے گی (اور خاص انہی کی کیا تخصیص ہے جن کا قول اس مقام پر مذکور رہے بلکہ) اسی طرح کا عوض اللہ تعالیٰ سب شرک سے بچنے والوں کو دے گا، جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک (صاف) ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ مرتے دم تک توحید

قائم رہتے ہیں اور) وہ (فرشتے) کہتے جاتے ہیں السلام علیکم تم (قبض روح کے بعد) جنت میں چلے جانا اپنے اعمال کے سبب یہ لوگ (جو اپنے کفر و عناد و جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور باوجود وضوح دلائل حق کے ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف) اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس (موت کے) فرشتے آجائیں یا آپ کے پروردگار کا حکم (یعنی قیامت) آجائے (یعنی کیا موت کے وقت یا قیامت میں ایمان لائیں گے جبکہ ایمان قبول نہ ہوگا، گو اس وقت تمام کفار بوجہ انکشاف حقیقت کے توبہ کریں گے جیسا اصرار کفر پر یہ لوگ کر رہے ہیں) ایسا ہی اُن سے پہلے جو لوگ تھے انھوں نے بھی (کفر پر اصرار) کیا تھا اور (اصرار کی بدولت سزایاب ہوئے سو) ان پر اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا، لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے (کہ سزا کے کام جان جان کے کرتے تھے) آخر ان کے اعمال بد کی ان کو سزائیں ملیں اور جس عذاب (کی خبر پانے) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی (عذاب نے) آگھیرا (بس ایسا ہی تمہارا حال ہوگا)۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ
اور بولے شرک کرنے والے اگر چاہتا اللہ نہ پوجتے ہم اس کے سوا کسی
شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ
چیز کو اور نہ ہمارے باپ اور نہ حرام ٹھہرا لیتے ہم بدون اس کے حکم کے کسی چیز کو
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
اسی طرح کیا ان سے اگلوں نے سو رسولوں کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا
الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
صاف صاف، اور ہم نے اٹھائے ہیں ہر اُمت میں رسول کہ بندگی کرو اللہ کی
وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ
اور بچو ہڑدنگے سے پھر کسی کو ان میں سے ہدایت کی اللہ نے اور کسی پر
حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ
ثابت ہوئی گمراہی، سو سفر کرو ملکوں میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ
جھٹلانے والوں کا، اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی تو

اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقْسَمُوْا

اللہ راہ نہیں دیتا جس کو بچلاتا ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار ، اور قسمیں کھاتے ہیں

بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا

اللہ کی سخت قسمیں کہ نہ اٹھائے گا اللہ جو کوئی مرجائے کیوں نہیں وعدہ

عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ

ہو چکا ہے اس پر پکا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ، اٹھائے گا تاکہ ظاہر کردے اُنپر

الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ كَانُوْا

جس بات میں جھگڑتے ہیں اور تاکہ معلوم کرلیں کافر کہ وہ جھوٹے

كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

تھے ، ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے

ع ۵ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

اور مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہوتا (کہ ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے اصول میں سے ہے اور بعض اشیاء کی تحریم نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے فروع میں سے ہے مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ اصول و فروع کو ناپسند کرتے) تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بدون (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا طریقہ پسند ہے ورنہ ہم کو کیوں کرنے دیتے، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے مغموم نہ ہوں کیونکہ یہ بیہودہ مجادلہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ) جو (کافر) ان سے پہلے ہوتے ہیں ایسی ہی حرکت انہوں نے بھی کی تھی (یعنی بیہودہ مجادلات اپنے پیغمبروں سے کئے تھے) سو پیغمبروں (کا اس سے کیا بگڑا اور وہ جس طریق کی طرف بلاتے ہیں اس کو کیا ضرر پہنچا ان) کے ذمہ تو (احکام کا) صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (صاف صاف یہ کہ دعویٰ واضح ہو اور دلیل صحیح اس پر قائم ہو اسی طرح آپ کے ذمہ بھی یہی کام تھا جو آپ کر رہے ہیں، پھر اگر براہِ عناد دعویٰ اور دلیل میں غور نہ کریں تو آپ کی بلا سے) اور (جس طرح ان کا معاملہ آپ کے ساتھ یعنی مجادلہ کوئی نئی بات نہیں اسی طرح آپ کا معاملہ ان کے ساتھ یعنی توحید و دینِ حق کی طرف بلانا کوئی نئی بات نہیں

بلکہ اس کی تعلیم بھی قدیم سے چلی آئی ہے چنانچہ) ہم ہر اُمت میں (امم سابقہ سے) کوئی نہ کوئی پیغمبر (اس بات کی تعلیم کے لئے) بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے رستہ) سے (کہ وہ شرک و کفر ہے) بچتے رہو (اس میں اشیاء کی وہ تحریم بھی آ گئی جو مشرکین اپنی رائے سے کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ شعبہ شرک و کفر کا تھا) سو ان میں بعضے وہ ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت دی (کہ انھوں نے حق کو قبول کر لیا) اور بعضے ان میں وہ ہوئے جن پر گمراہی کا ثبوت ہو گیا۔

(مطلب یہ کہ کفار اور انبیاء میں یہ معاملہ اسی طرح چلا آ رہا ہے، اور ہدایت و اضلال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ہمیشہ سے یوں ہی جاری ہے کہ مجادلہ کفار کا بھی قدیم اور تعلیم انبیاء علیہم السلام کی بھی قدیم اور سب کا ہدایت نہ پانا بھی قدیم پھر آپ کو غم کیوں ہو!؟ یہاں تک تسلی فرمائی گئی جس میں اخیر کے مضمون میں ان کے شبہ کا اجمالی جواب بھی ہو گیا کہ ایسی باتیں کرنا گمراہی ہے جس کے گمراہی ہونے کی آگے تائید اور جواب کی زیادہ توضیح ہے، یعنی اگر مجادلہ مع الرسل کا گمراہی ہونا تم کو معلوم نہ ہو) تو (اچھا) زمین میں چلو پھرو پھر (آثار سے) دیکھو کہ (پیغمبروں کے) جھٹلانے والوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا (پس اگر وہ گمراہ نہ تھے تو ان پر عذاب کیوں نازل ہوا، اور واقعاتِ اتفاقیہ ان کو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ خلافِ عادت ہوئے اور انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئی کے بعد ہوئے اور مومنین اس سے بچے رہے، پھر اس کے عذاب ہونے میں کیا شک ہو، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے کسی فرد کی گمراہی سے بھی سخت صدمہ پہنچتا تھا اس لئے آگے پھر آپ کو خطاب ہے کہ جیسے پہلے بعضے لوگ ہوئے ہیں جن پر گمراہی قائم ہو چکی تھی، اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں سو) ان کے راہِ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو (کچھ نتیجہ نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کیا کرتا جس کو (اس شخص کے عناد کے سبب) گمراہ کرتا ہے (البتہ اگر وہ عناد کو چھوڑ دے تو ہدایت کر دیتا ہے، لیکن یہ عناد کو چھوڑیں گے نہیں، اس لئے ان کو ہدایت بھی نہ ہوگی) اور (ضلالت و عذاب کے بارے میں اگر ان کا یہ گمان ہو کہ ہمارے معبود اس حالت میں بھی عذاب سے بچا لیں گے تو وہ سمجھ رکھیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (یہاں تک ان کے پہلے شبہ کے جواب کی تقریر تھی، آگے دوسرے شبہ کے متعلق کلام ہے) اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (اور قیامت نہ آئے گی، آگے جواب ہے) کیوں نہیں زندہ کرے گا (یعنی ضرور زندہ کرے گا) (اس وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے، لیکن اکثر لوگ (باوجود قیام دلیل صحیح کے اس پر) یقین نہیں لاتے (اور یہ دوبارہ زندہ کرنا اس لئے ہوگا) تاکہ (دین کے متعلق) جس چیز میں

یہ لوگ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے (اور انبیاء کے فیصلہ سے راستہ پر نہ آتے تھے) انکے روبرو اس (کی حقیقت) کا (بطور معاینہ کے) اظہار کردے اور تاکہ (اس اظہار حقیقت کے وقت) کافر لوگ (پورا) یقین کرلیں کہ واقعی (وہی جھوٹے تھے (اور انبیاء و مؤمنین سچے تھے، پس قیامت کا آنا یقینی اور عذاب سے فیصلہ ہونا ضروری ہے، یہ جواب ہوگیا لَا یَبْعَثُ اللّٰہُ کا اور چونکہ وہ لوگ قیامت کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ مرکر زندہ ہونا ان کے خیال میں کسی کے بس میں نہ تھا، اس لئے آگے اپنی قدرتِ کاملہ کے اثبات سے ان کے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت ایسی عظیم ہے کہ) ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں (ہمیں اس میں کچھ محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی) بس اس سے ہمارا (اتنا ہی کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو (پیدا) ہوجا بس وہ (موجود) ہوجاتی ہے (تو اتنی بڑی قدرت کاملہ کے روبرو بے جان چیزوں میں دوبارہ جان کا پڑجانا کونسا دشوار ہے، جیسے پہلی بار ان میں جان ڈال چکے ہیں، اب دونوں شبہوں کا پورا جواب ہوچکا وللّٰہ الحمد)

معارف و مسائل

ان کفار کا پہلا شبہ تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اگر ہمارا کفر و شرک اور ناجائز کام پسند نہیں تو وہ ہمیں زبردستی اس سے روک کیوں نہیں دیتے۔

اس شبہ کی بیہودگی واضح تھی، اس لئے اس کا جواب دینے کے بجائے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی پر اکتفا کیا گیا، کہ ایسے بیہودہ سوالات سے آپ غمگین نہ ہوں، اور شبہ کی بیہودگی کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ دنیا کا نظام ہی اس بنیاد پر قائم فرمایا ہے کہ انسان کو بالکل مجبور نہیں رکھا گیا، ایک قسم کا اختیار اس کو دیا گیا، اسی اختیار کو وہ اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے تو ثواب اور نافرمانی میں استعمال کرے تو عذاب کے وعدے اور وعید فرمائے، اسی کے نتیجہ میں قیامت اور حشر و نشر کے سارے ہنگامے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو مجبور کرکے اپنی اطاعت کرائیں تو کس کی مجال تھی کہ اطاعت سے باہر جاتا، مگر بتقاضائے حکمت مجبور کردینا درست نہ تھا، اس لئے انسان کو اختیار دیا گیا، تو اب کافر کا یہ کہنا کہ اگر اللہ کو ہمارا طریقہ پسند نہ ہوتا تو ہمیں مجبور کیوں نہ کردیتے ایک احمقانہ اور معاندانہ سوال ہے۔

کیا ہندوستان پاکستان میں بھی اللہ کا کوئی رسول آیا ہے؟

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا، اس آیت سے نیز دوسری آیت وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ سے ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے علاقوں میں بھی اللہ کے پیغمبر ضرور آئے ہوں گے

خواہ وہ یہیں کے باشندے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں اور ان کے نائب اور مبلغ یہاں پہونچے ہوں، اور آیت لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس امت کی طرف بھیجے گئے ہیں ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا، اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بظاہر وہ قوم عرب ہے جو آپ کی بعثت و نبوت کی سب سے پہلے مخاطب ہوئی، کہ ان میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہیں آیا تھا، اسی لئے ان لوگوں کا لقب قرآن کریم میں اُمِّيّٖنَ رکھا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی دنیا میں بھی آپ سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہو، واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ

اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ظلم اٹھایا البتہ ان کو ہم ٹھکانا

فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ؀ (۴۱)

دیں گے دنیا میں اچھا اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہے اگر ان کو معلوم ہوتا،

(وقف لازم)

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ؀ (۴۲)

جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن (مکہ) چھوڑ دیا (اور حبشہ چلے گئے) بعد اس کے کہ ان پر (کفار کی طرف سے) ظلم کیا گیا (کیونکہ ایسی مجبوری میں وطن چھوڑنا بڑا شاق گذرتا ہے) ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے (یعنی ان کو مدینہ پہنچا کر خوب امن و راحت دیں گے چنانچہ بعد چندے مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا اور اس کو وطن اصلی قرار دیا گیا، اس لئے اس کو ٹھکانا کہا اور ہر طرح کی وہاں ترقی ہوئی اس لئے حَسَنَة کہا گیا اور حبشہ کا قیام عارضی تھا اس لئے اس کو ٹھکانا نہیں فرمایا) اور آخرت کا ثواب (اس سے) بدرجہا بڑا ہے (کہ خیر بھی ہے اور ابقیٰ بھی) کاش (اس اجر آخرت کی) ان (بے خبر کافروں) کو (بھی) خبر ہوتی (اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت سے مسلمان ہو جاتے) وہ (مہاجرین ان وعدوں کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ) ایسے ہیں جو (ناگوار واقعات پر) صبر کرتے ہیں (چنانچہ وطن کا چھوڑنا گوان کو ناگوار ہے، لیکن بدون اس کے دین پر عمل نہیں کرسکتے تھے، دین کے لئے وطن چھوڑا،

اور صبر کیا) اور (وہ ہر حال میں) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (وطن چھوڑنے کے وقت یہ خیال نہیں کرتے کہ کھائیں پئیں گے کہاں سے) ؏

معارف ومسائل

تشریح وتفسیر اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا، ہجرت سے مشتق ہے، ہجرت کے لغوی معنی ترکِ وطن کے ہیں، ترکِ وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت و عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا، یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں"

یہ ہجرت بعض صورتوں میں فرض و واجب اور بعض صورتوں میں مستحب و افضل ہوتی ہے، اس کے مفصل احکام تو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۷ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کے تحت میں بیان ہوچکے ہیں، اس جگہ صرف ان وعدوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے کئے ہیں۔

کیا ہجرت دنیا میں بھی فراخیِ عیش کا سبب ہوتی ہے؟ آیاتِ مذکورہ میں چند شرائط کے ساتھ مہاجرین کے لئے دو عظیم الشان وعدے کئے گئے ہیں، اول تو دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینے کا، دوسرے آخرت کے بے حساب ثواب عظیم کا، "دنیا میں اچھا ٹھکانا" ایک نہایت جامع لفظ ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مہاجر کو سکونت کے لئے مکان اور پڑوسی اچھے ملیں، یہ بھی داخل ہے کہ اس کو رزق اچھا ملے، دشمنوں پر فتح و غلبہ نصیب ہو، عام لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف اور بھلائی ہو، عزت و شرف ملے جو ان کے خاندان اور اولاد تک چلے (قرطبی)

آیت کا شانِ نزول اصالۃً وہ پہلی ہجرت ہے جو صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف کی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہجرتِ حبشہ اور اس کے بعد کی ہجرتِ مدینہ منورہ دونوں اس میں داخل ہوں آیت میں یہاں انہی مہاجرین حبشہ یا مہاجرینِ مدینہ کا ذکر ہے، اس لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ وعدہ انہی حضرات صحابہ کے لئے تھا، جنھوں نے حبشہ کی طرف یا پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دنیا میں پورا ہوچکا، جس کا سب نے مشاہدہ کرلیا، کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ان کا کیسا اچھا ٹھکانا بنادیا، ایذاء دینے والے پڑوسیوں کے بجائے غمخوار، ہمدرد و جاں نثار پڑوسی ملے، دشمنوں پر فتح و غلبہ نصیب ہوا، ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ گذرنے کے بعد ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے، فقراء و مساکین مالدار ہوگئے، دنیا کے ممالک فتح ہوئے، ان کے حسنِ اخلاق، حسنِ عمل کے کارنامے رہتی دنیا تک ہر موافق و مخالف کی زبان پر ہیں، ان کو اور انکی

نسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت و شرف بخشا، یہ تو دنیا میں ہونے والی چیزیں تھیں جو ہو چکیں، اور آخرت کا وعدہ پورا ہونا بھی یقینی ہے، لیکن تفسیر بحر محیط میں ابو حیان کہتے ہیں:۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا عَامٌّ فِی الْمُهَاجِرِیْنَ کَائِنًا مَّا کَانُوْا فَیَشْمَلُ اَوَّلَهُمْ وَاٰخِرَهُمْ۔ (ص ۴۹۲، ج ۵)

"اَلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا کا لفظ تمام مہاجرین عالم کے لئے عام اور شامل ہے، کسی بھی خطے اور زمانہ کے مہاجر ہوں، اس لئے یہ لفظ مہاجرین اوّلین کو بھی شامل ہے اور قیامت تک اللہ کے لئے ہر ہجرت کرنے والا اس میں داخل ہے"۔

عام تفسیری ضابطہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آیت کا شانِ نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ اور خاص جماعت ہو مگر اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، اس لئے اس وعدہ میں تمام دنیا کے اور ہر زمانہ کے مہاجرین بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں وعدے تمام مہاجرین کے لئے پورا ہونا امر یقینی ہے۔

اسی طرح کا ایک وعدہ مہاجرین کے لئے سورۂ نساء کی اس آیت میں کیا گیا ہے وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَةً، جس میں وسعت مکانی اور فراخی عیش خاص طور سے موعود ہیں، مگر قرآن کریم نے ان وعدوں کے ساتھ مہاجرین کے کچھ اوصاف اور ہجرت کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائی ہیں، اس لئے ان وعدوں کے مستحق وہی مہاجرین ہو سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہوں اور جنھوں نے مطلوبہ شرائط پوری کر دی ہوں۔

ان میں سب سے پہلی شرط تو فِی اللّٰهِ کی ہے، یعنی ہجرت کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو، اس میں دنیاوی منافع تجارت، ملازمت وغیرہ اور نفسانی فوائد پیش نظر نہ ہوں، دوسری شرط ان مہاجرین کا مظلوم ہونا ہے، مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا، تیسرا وصف ابتدائی تکالیف و مصائب پر صبر اور ثابت قدم رہنا ہے اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا، چوتھا وصف تمام مادی تدبیروں کا اہتمام کرتے ہوئے بھی بھروسہ صرف اللہ پر رکھنا ہے، کہ فتح و نصرت اور ہر کامیابی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مشکلات و تکالیف تو ہر کام میں ہوا ہی کرتی ہیں، ان کو عبور کرنے کے بعد بھی اگر کسی مہاجر کو اچھا ٹھکانا اور اچھے حالات نہیں ملے تو قرآن کے وعدے میں شبہ کرنے کے بجائے اپنی نیت و اخلاص اور اس حُسنِ عمل کا جائزہ لے جس پر یہ وعدے کئے گئے ہیں تو اس کو معلوم ہو گا کہ قصور اپنا ہی تھا، کہیں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، کہیں صبر و ثبات اور توکل کی کمی ہوتی ہے۔

ترکِ وطن اور ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام

امام قرطبی نے اس جگہ ہجرت اور ترکِ وطن کی قسمیں اور ان کے کچھ احکام پر ایک مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، اتمامِ فائدہ کے لئے اس کو نقل کرتا ہوں

قرطبی نے بحوالۂ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں، اور اس کی چھ قسمیں ہیں ۔

اول، یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا یہ قسم سفر عہدِ رسالتؐ میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرط استطاعت وقدرت فرض ہے (جبکہ دار الکفر میں اپنے جان و مال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گناہگار ہوگا۔

دوسرا دار البدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں جس میں سلف صالحین پر سب وشتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی مُنکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ۔

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ، ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ

پانچواں سفر آب وہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے، شریعتِ اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب وہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابو عبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دار الخلافہ اُردُن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب وہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں

اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

إِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَّ أَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَّ لَسْتُمْ بِهَا فَلَا تَهْبِطُوا عَلَيْهَا (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

"جب کسی خطہ میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو"

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے گا نہیں اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چھٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں:-

۱۔ سفر عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت وسفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے: فَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

۲۔ سفرِ حج: اس کا چند شرائط کے ساتھ فرض اسلامی ہونا سب کو معلوم ہے۔

۳۔ سفرِ جہاد: اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

۴۔ سفرِ معاش: جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہوسکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کرکے دوسری جگہ تلاش روزگار کرے۔

۵۔ سفرِ تجارت: یعنی قدرِ ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ابتغاءِ فضل سے مراد اس آیت میں تجارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج میں بھی تجارت کی اجازت دیدی ہے، تو تجارت کے لئے ہی سفر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوا۔

۶۔ طلبِ علم کے لئے سفر: اس کا بقدرِ ضرورتِ دین فرضِ عین ہونا، اور زائد از ضرورت کا فرضِ کفایہ ہونا معلوم ومعروف ہے۔

۷۔ کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا: یہ بجز تین مسجدوں کے درست نہیں، مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) مسجدِ نبوی (مدینہ طیبہ) مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) (یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دوسرے اکابر علماءِ سلف وخلف نے عام مقاماتِ متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، محمد شفیع)۔

۸۔ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر: جس کو رباط کہا جاتا ہے، احادیثِ کثیرہ میں اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔

۹۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لئے سفر: حدیث میں اس کو بھی باعثِ اجر وثواب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقرباء واحباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والے کے لئے فرشتوں کی دعاء کا ذکر فرمایا گیا ہے (یہ جب ہی کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو کوئی مادی غرض نہ ہو) واللہ اعلم (قرطبی، ص ۳۴۹ تا ۳۵۱ ج ۵، سورۂ نساء)

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيٓ إِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوٓا أَهْلَ

اور تجھ سے پہلے بھی ہم نے یہی مرد بھیجے تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کی طرف سو پوچھو یاد رکھنے

الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنَٰتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَأَنزَلْنَآ

والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں، بھیجا تھا ان کو نشانیاں دیکر اور ورقے اور اتاری ہم نے

إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾

تجھ پر یاد داشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری اُن کے واسطے تاکہ وہ غور کریں

خلاصۂ تفسیر

اور (یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت و نبوت کا اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر اور انسان ہیں، اور نبی و رسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہ ہونا چاہئے، یہ ان کا جاہلانہ خیال ہے، کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں کہ ان پر وحی بھیجا کرتے تھے (تو اے مکہ والو منکرین) اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو (جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور وہ تمہارے خیال میں بھی مسلمانوں کی طرفداری نہ کریں، اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر) آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایات (آپ کے واسطے سے) لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں اور تاکہ وہ ان میں غور و فکر کیا کریں۔

معارف و مسائل

رُوح المعانی میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مشرکین مکہ نے اپنے قاصد مدینہ طیبہ کے یہود کے پاس دریافتِ حال کے لئے بھیجے کہ کیا یہ بات واقعی ہے کہ پہلے بھی سب انبیاء جنسِ بشر و انسان سے ہوتے آئے ہیں۔

اگرچہ لفظ اہل الذکر میں اہلِ کتاب اور مؤمنین سب داخل تھے مگر یہ ظاہر ہے کہ مشرکین کا اطمینان غیر مسلموں ہی کے بیان سے ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ خود رسولِ کریم کی بات پر مطمئن نہیں تھے، تو دوسرے مسلمانوں کی بات کیسے مان سکتے تھے۔

اَهْلَ الذِّكْرِ، لفظ ذکر چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تورات کو بھی ذکر فرمایا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ میں قرآن مراد ہے، اس لئے اہل الذکر کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے، اور یہاں اہلِ علم سے کون لوگ مراد ہیں، اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ قول ابن عباس، حسن، السدی وغیرہ کا ہے، اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لے کر اہل الذکر کی تفسیر اہلِ قرآن سے کی ہے، اس میں زیادہ واضح بات

رمانی، زجاج، ازہری کی ہے، وہ کہتے ہیں المراد باھل الذکر علماء اخبار الامم السالفۃ کائنا من کان فالذکر بمعنی الحفظ کانہ قیل اسألوا المطلعین علی اخبار الامم یعلموکم بذلک، اس تحقیق کی بنا پر اس میں اہل کتاب بھی داخل ہیں اور اہل قرآن بھی۔

بَیِّنٰتُ کے معنی معروف ہیں اور مراد اس سے یہاں معجزات ہیں، زُبُر، دراصل زبرۃ کی جمع ہے جو لوہے کے بڑے ٹکڑوں کے لئے بولا جاتا ہے، "اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ" ٹکڑوں کو جوڑنے کی مناسبت سے لکھنے کو زَبَر کہا جاتا ہے، اور لکھی ہوئی کتاب کو زبر اور زبور بولتے ہیں یہاں مراد اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں تورات، انجیل، زبور، قرآن سب داخل ہیں۔

ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے آیت مذکورہ کا یہ جملہ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے، مگر الفاظ عام ہیں جو تمام معاملات کو شامل ہیں، اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام کو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے، کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں، اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقع اجماع کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر مذکور ہیں، اور علماء صحابہ و تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں، ان احکام میں وہ علماء براہِ راست قرآن و حدیث اور اجماع پر عمل کریں، ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید کی ضرورت نہیں، لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں، یا جن میں آیاتِ قرآن اور روایاتِ حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے، یا جن میں صحابہ و تابعین کے درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے، یہ مسائل و احکام محلّ اجتہاد ہوتے ہیں، ان کو اصطلاح میں مُجْتَہَدْ فِیْہِ مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جس عالم

کو درجۂ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے، محض اپنی ذاتی رائے کے بھروسہ پر ایک آیت یا روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جو احکام قرآن وسنت میں صراحۃً مذکور نہیں ان کو قرآن وسنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی انہی مجتہدینِ امت کا کام ہے جن کو عربی زبان عربی لغت اور محاورات اور طرقِ استعمال کا نیز قرآن وسنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع وتقویٰ کا اونچا مقام حاصل ہو، جیسے امام اعظم ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ یا اوزاعیؒ، فقیہ ابو اللیثؒ وغیرہ، جن میں حق تعالیٰ نے قربِ زمانۂ نبوت اور صحبت صحابہؓ وتابعین کی برکت سے شریعت کے اصول ومقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور منصوص احکام سے غیر منصوص کو قیاس کر کے حکم نکالنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا، ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید لازم ہے، ائمۂ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطاء ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء محدثین وفقہاء امام غزالیؒ، رازیؒ، ترمذیؒ، طحاویؒ، مزنیؒ، ابن ہمام، ابن قدامہ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف وخلف باوجود علومِ عربیت وعلومِ شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمۂ مجتہدین کی تقلید ہی کے پابند رہے ہیں، سب مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں سمجھا۔

البتہ ان حضرات کو علم وتقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا، کہ مجتہدین کے اقوال وآراء کو قرآن وسنت کے دلائل سے جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمۂ مجتہدین میں جس امام کے قول کو وہ کتاب وسنت کے ساتھ اقرب پاتے، اس کو اختیار کر لیتے تھے، مگر ائمۂ مجتہدین کے مسلک سے خروج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے، تقلید کی اصل حقیقت اتنی ہی ہے۔

اس کے بعد روز بروز علم کا معیار گھٹتا گیا، اور تقویٰ وخداترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں، ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دی جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کر لیں اور جس میں چاہیں کسی دوسرے کا قول لے لیں تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباعِ شریعت کا نام لے کر اتباعِ ہویٰ میں مبتلا ہو جائیں، کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین وشریعت کا اتباع نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اغراض واہواء کا اتباع ہوگا، جو باجماعِ امت حرام ہے، علامہ شاطبی نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ابن تیمیہ نے بھی

عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع کو اپنے فتاویٰ میں باجماع امت حرام کہا ہے، اس لئے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنے والوں کو کسی ایک ہی امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے، یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے، جس سے دین کا انتظام قائم رہے اور لوگ دین کی آڑ میں اتباعِ ہویٰ کے شکار نہ ہو جائیں، اس کی مثال بعینہٖ وہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ نے باجماعِ صحابہ قرآن کے سبعۃ احرف (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کر دینے میں کیا، کہ اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغات تھے، جبرئیل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماعِ صحابہ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے، حضرت عثمان غنیؓ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطرافِ عالم میں بھجوائے، اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے، بلکہ انتظامِ دین اور حفاظتِ قرآن از تحریف کی بناء پر صرف ایک لغت اختیار کر لیا گیا، اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے معیّن کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معیّن کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابلِ تقلید نہیں، بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کر لیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیم اور ڈاکٹروں میں سے کسی ایک کو اپنے علاج کے لئے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھ کر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لئے کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے ڈاکٹر ماہر نہیں، یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں۔

حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی، اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باہمی جدال و شقاق کی گرم بازاری نہ کوئی دین کا کام ہے نہ کبھی اہلِ بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا، اور بعد میں طعن و طنز تک نوبت آگئی، پھر جاہلانہ جنگ و جدال نے وہ نوبت پہونچا دی جو آج عموماً دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا، فالی اللہ المشتکی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

تنبیہ: مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ یہاں لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے، جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل موجود ہیں خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد رابع باب الاجتہاد، اور علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد، اس مسئلے میں خاص طور سے قابلِ دید ہیں، اہلِ علم ان کی طرف مراجعت فرمائیں۔

قرآن فہمی کے لئے حدیثِ رسول ضروری ہے، حدیث کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ، اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق قرآن کریم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان اور وضاحت لوگوں کے سامنے کردیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے، اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسبِ منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے،

علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے، کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے، وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ، اور حضرت صدیقہ عائشہؓ نے اس خلقِ عظیم کی تفسیر یہ فرمائی کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن، اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، بعض تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتے ہیں، جن کو عام اہلِ علم جانتے ہیں، اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ حسبِ تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات سب کی سب بوحیِ خداوندی اور بحکمِ قرآن ہیں، اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو بالآخر وحیِ الٰہی سے یا اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کردی جاتی ہے، اس لئے وہ بھی بحکمِ وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر و بیان کو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ جمعہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد بعثت کو ذکر کیا گیا ہے، اب وہ ذخیرۂ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین تک امت کے باکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہونچایا ہے، اور اس کی چھان بین میں عمریں صرف کر کے روایاتِ حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں، اور جس روایت کو بحیثیت سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکامِ شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے، اس کو ذخیرۂ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں، جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابلِ اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرۂ حدیث کو کسی حیلے بہانے سے ناقابلِ اعتماد کہتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ مضامین قرآن کو بیان نہیں کیا، یا یہ کہ آپ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، بہر دو صورت قرآن بحیثیت معنے کے محفوظ نہ رہا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے؛ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ، اس کا یہ دعویٰ اس نصِ قرآن کے خلاف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنتِ رسولؐ کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت قرآن ہی کا منکر ہے، نعوذ باللہ

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ

سو کیا نڈر ہو گئے وہ لوگ جو بُرے فریب کرتے ہیں اس سے کہ دھنسا دیوے اللہ ان کو

الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

زمین میں یا آپہنچے ان پر عذاب جہاں سے خبر نہ رکھتے ہوں،

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ

یا پکڑ لے ان کو چلتے پھرتے سو وہ نہیں ہیں عاجز کرنے والے، یا

يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ۭ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

پکڑ لے ان کو ڈرانے کے بعد، سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان

النصف

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (دینِ حق کے باطل کرنے کو) بری بری تدبیریں کرتے ہیں (کہ کہیں اس میں شبہات و اعتراض نکالتے ہیں اور حق کا انکار کرتے ہیں کہ ضلال ہے کہیں دوسروں کو روکتے ہیں کہ اضلال ہے) کیا ایسے لوگ (یہ کارروائیاں کفر کی کرکے) پھر بھی اس بات سے بے فکر (بیٹھے ہوئے) ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو (ان کے کفر کے وبال میں) زمین میں غرق کردے، یا اُن پر ایسے موقع سے عذاب آپڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو (جیسے جنگِ بدر میں ایسے بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی کہ کبھی ان کو اس کا احتمال عقلی بھی نہ ہوتا کہ یہ ہم پر غالب آسکیں گے) یا ان کو چلتے پھرتے (کسی آفت میں) پکڑلے (جیسے کوئی مرض ہی دفعۃً آ کھڑا ہو) سو (اگر ان امور میں سے کوئی امر ہو جائے تو) یہ لوگ خدا کو ہرا (بھی) نہیں سکتے، یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑلے (جیسے قحط و وبا پڑے اور تدریجاً خاتمہ ہو جاوے، یعنی نڈر ہونا نہیں چاہئے، خدا کو سب قدرت ہے، مگر مہلت جو دی رکھی ہے) سو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تمہارا رب شفیق مہربان بڑا ہے (اس لئے مہلت دی ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور فلاح اور نجات کا طریق اختیار کرلو)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں کفار کو عذابِ آخرت سے ڈرایا گیا تھا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ ان آیات میں ان کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جس زمین پر بیٹھے ہو اسی کے اندر دھنسا دیئے جاؤ، یا اور کسی بے گمان راستہ سے اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جیسے غزوۂ بدر میں ایک ہزار بہادر مسلح نوجوانوں کو چند بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ایسی سزا ملی جس کا ان کو کبھی وہم و گمان بھی نہ ہوسکتا تھا، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چلتے پھرتے کسی عذابِ الٰہی میں پکڑے جاؤ کہ کوئی بیماری جان لیوا آ کھڑی ہو، یا کسی اونچی جگہ سے گر کر یا کسی سخت چیز سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاؤ، اور عذاب کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ دفعۃً عذاب نہ آئے مگر مال اور صحت اور تندرستی اور اسبابِ راحت و سکون گھٹتے چلے جائیں، اسی طرح گھٹاتے گھٹاتے اس قوم کا خاتمہ ہو جائے۔

لفظ تخوّف جو اس آیت میں آیا ہے بظاہر خوف سے مشتق ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اسی معنی کے اعتبار سے یہ تفسیر کی ہے کہ ایک جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے تاکہ دوسری جماعت ڈر جائے، اسی طرح دوسری جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے جس سے تیسری جماعت

ڈر جائے، یوں ہی ڈراتے ڈراتے سب کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر مفسر القرآن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہاں لفظ تخوّف کو تنقص کے معنی میں لیا ہے، اور اسی معنی کے اعتبار سے ترجمہ گھٹاتے گھٹاتے کیا گیا ہے۔

حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو بھی اس لفظ کے معنی میں تردد پیش آیا تو آپ نے بر سر منبر صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لفظ تخوّف کے آپ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ عام مجمع خاموش رہا، مگر قبیلۂ ہذیل کے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! یہ ہمارے قبیلہ کا خاص لغت ہے، ہمارے یہاں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی بتدریج گھٹانا، فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس نے عرض کیا کہ ہاں، اور اپنے قبیلہ کے شاعر ابو کبیر ہذلی کا ایک شعر پیش کیا، جس میں یہ لفظ بتدریج گھٹانے کے معنی میں لیا گیا تھا، اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ: لوگو! تم اشعارِ جاہلیت کا علم حاصل کرو، کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن فہمی کے لئے معمولی عربی دانی کافی نہیں

اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ معمولی طور پر عربی زبان بولنے لکھنے کی قابلیت قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس میں اتنی مہارت اور واقفیت ضروری ہے جس سے قدیم عرب جاہلیت کے کلام کو پورا سمجھا جا سکے، کیونکہ قرآن کریم اسی زبان اور انہی کے محاورات میں نازل ہوا ہے، اس درجہ کا ادبِ عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

عربی ادب سیکھنے کے لئے شعراءِ جاہلیت کا کلام پڑھنا جائز ہے اگرچہ وہ خرافات پر مشتمل ہو

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے زمانۂ جاہلیت کی عربی زبان اور اس کا لغت و محاورات سمجھنے کے لئے شعراءِ جاہلیت کا کلام پڑھنا پڑھانا جائز ہے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ شعراءِ جاہلیت کا کلام جاہلانہ رسموں اور خلافِ اسلام جاہلانہ افعال و اعمال پر مشتمل ہوگا، مگر قرآن فہمی کی ضرورت سے اس کا پڑھنا پڑھانا جائز قرار دیا گیا۔

دنیا کا عذاب بھی ایک طرح کی رحمت ہے

آیاتِ مذکورہ میں دنیا کے مختلف اقسامِ عذاب کا ذکر کرنے کے بعد خاتمہ آیات پر فرمایا فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ اس میں اوّل تو لفظ رَبّ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے عذاب انسان کو متنبہ کرنے کے لئے شانِ ربوبیت کے تقاضے سے ہیں، پھر لام تاکید کے ساتھ حق تعالیٰ کا مشفق و مہربان ہونا بتلا کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ دنیا کی تنبیہات درحقیقت شفقت و رحمت ہی کے داعیہ سے ہیں تاکہ غافل انسان متنبہ ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح کرلے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ

کیا نہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ ڈھلتے ہیں سائے اس کے داہنی طرف

وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

سے اور بائیں طرف سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اور وہ عاجزی میں ہیں ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو

فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ

آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جان داروں سے اور فرشتے اور وہ

لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

تکبر نہیں کرتے ، ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں جو

يُؤْمَرُونَ ﴿٥٠﴾ ع وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ

السجدۃ ع ۱۲

حکم پاتے ہیں ، اور کہا ہے اللہ نے مت پکڑو معبود دو وہ معبود

إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٥١﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

ایک ہی ہے ، سو مجھ سے ڈرو ، اور اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین

وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا ۚ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُم مِّن

میں اور اسی کی عبادت ہے ہمیشہ سو کیا سوائے اللہ کے کسی سے ڈرتے ہو، اور جو کچھ تمہارے پاس

نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿٥٣﴾

ہے نعمت سو اللہ کی طرف سے، پھر جب پہنچتی ہے تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو،

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

پھر جب کھول دیتا ہے سختی تم سے اسی وقت ایک فرقہ تم میں سے اپنے رب کیساتھ لگتا ہے شریک بتانے

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ وَ

تاکہ منکر ہو جائیں اس چیز سے جو کہ ہم نے ان کو دی ہے سو مزے اڑالو آخر معلوم کر لوگے ، اور

يَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ

ٹھہراتے ہیں ان کے لئے جن کی خبر نہیں رکھتے ایک حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے قسم اللہ کی

۲۳

لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ
تم سے پوچھنا ہے جو تم بہتان باندھتے ہو، اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں
سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾
وہ اس سے پاک ہے اور اپنے لئے جو دل چاہتا ہے

خلاصۂ تفسیر

کیا (ان) لوگوں نے اللہ کی ان پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھا (اور دیکھ کر توحید پر استدلال نہیں کیا) جن کے سائے کبھی ایک طرف کو کبھی دوسری طرف کو اس طور پر جھکتے جاتے ہیں کہ (بالکل) خدا کے (حکم کے) تابع ہیں (یعنی سائے کے اسباب کہ آفتاب کا نورانی ہونا اور سایہ دار جسم کا کثیف ہونا ہے، اور حرکتِ سایہ کا سبب کہ آفتاب کی حرکت ہے، پھر سایہ کے خواص، یہ سب بحکمِ الٰہی ہے) اور وہ (سایہ دار) چیزیں بھی (اللہ کے روبرو) عاجز (اور تابع حکم) ہیں، اور (جس طرح یہ اشیاء مذکورہ جن میں حرکت ارادیہ نہیں جیسا کہ یَتَفَیَّؤُا کی اسناد ظلال کی طرف اس کا قرینہ ہے، کیونکہ متحرک بالارادہ میں سایہ کی حرکت خود اس متحرک بالارادہ کی حرکت سے ہوتی ہے بحکمِ خدا کے تابع ہیں اسی طرح) اللہ ہی کے مطیع (حکم ہیں) جتنی چیزیں (بالارادہ) چلنے والی آسمانوں میں (جیسے فرشتے) اور زمین میں (جیسے حیوانات) موجود ہیں اور (بالخصوص) فرشتے (بھی) اور وہ (فرشتے باوجود علوِ مکان و رفعتِ شان کے اطاعتِ خداوندی سے) تکبر نہیں کرتے (اور اسی لئے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا باوجودے کہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ میں داخل تھے) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالادست ہے، اور ان کو جو کچھ (خدا کی طرف سے) حکم کیا جاتا ہے وہ اس کو کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے (تمام مکلفین کو بواسطۂ رسل کے) فرمایا ہے کہ دو (یا زیادہ) معبود مت بناؤ پس ایک معبود ہی ہے (اور جب یہ بات ہے) تو تم لوگ خاص مجھ ہی سے ڈرا کرو (کیونکہ جب الوہیت میرے ساتھ خاص ہے تو جو جو اس کے لوازم ہیں کمالِ قدرت وغیرہ وہ بھی میرے ہی ساتھ خاص ہوں گے تو انتقام وغیرہ کا خوف مجھ ہی سے چاہئے اور شرک انتقام کو مستدعی ہے، پس شرک نہ کرنا چاہئے) اور اسی کی (ملک) ہیں سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور لازمی طور پر اطاعت بجا لانا اسی کا حق ہے (یعنی وہی اس امر کا مستحق ہے کہ سب اس کی اطاعت بجا لاویں جب یہ بات ثابت ہے) تو کیا پھر بھی اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو، (اور ان سے ڈر کر انکو پوجتے ہو)

اور (جیسا ڈرنے کے قابل سوائے خدا کے کوئی نہیں ایسا ہی نعمت دینے والا اور امید کے قابل بجز خدا کے کوئی نہیں چنانچہ) تمہارے پاس جو کچھ (کسی قسم کی بھی) نعمت ہو وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تم کو (ذرا) تکلیف پہنچتی ہے تو (اس کے رفع ہونے کے لئے) اسی (اللہ) سے فریاد کرتے ہو (اور کوئی بُت وغیرہ اس وقت یاد نہیں آتا جس سے توحید کا حق ہونا اس وقت تمہارے اقرار حال سے بھی معلوم ہو جاتا ہے لیکن) پھر جب (اللہ تعالیٰ) تم سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہے تو تم میں کی ایک جماعت (اور وہی بڑی جماعت ہے) اپنے رب کے ساتھ (بدستور سابق) شرک کرنے لگتی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمت کی (کہ وہ تکلیف کا رفع کرنا ہے) ناشکری کرتے ہیں (جو کہ عقلاً بھی قبیح ہے) خیر چندے روزہ عیش اڑا لو (دیکھو) اب جلدی (مرتے ہی) تم کو خبر ہوئی جاتی ہے (اور ایک جماعت اس لئے کہا گیا کہ بعضے اس حالت کو یاد رکھ کر توحید و ایمان پر قائم ہو جاتے ہیں کقولہ تعالیٰ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ) اور (منجملہ ان کے شرک کے ایک یہ ہو کہ) یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ان (معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے (معبود ہونے کے) متعلق ان کو کچھ علم (اور ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل و سند) نہیں (جیسا اس کی تفصیل پارۂ ہشتم کے رکوع سوم آیت وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ الخ میں گزری ہے) قسم ہو خدا کی تم سے تمہاری ان افترا پردازیوں کی (قیامت میں) ضرور باز پرس ہوگی (اور ایک شرک ان کا یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، سبحان اللہ (کیسی مہمل بات ہو) اور (اس پر یہ طرہ کہ) اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے) پسند کرتے ہیں)۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ

اور جب خوش خبری ملے ان میں کسی کو بیٹی کی سارے دن رہے منہ اس کا سیاہ اور جی میں

كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ

گھٹتا رہے، چھپتا پھرے لوگوں سے مارے برائی اس خوش خبری کے جو سُنی اس کو رہنے دے

عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

ذلت قبول کر کے یا اس کو داب دے مٹی میں سنتا ہو بُرا فیصلہ کرتے ہیں،

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ

جو نہیں مانتے آخرت کو ان کی بُری مثال ہے اور اللہ کی مثال

ع ۱۰/۷ ۱۳

الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾
سب سے اوپر اور وہی ہے زبردست حکمت والا ۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان میں کسی کو بیٹی (پیدا ہونے) کی خبر دی جائے (جس کو اللہ کے لئے تجویز کرتے ہیں) تو (اس قدر ناراض ہو کر) سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے (یعنی تولدِ دختر) اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے (اور دل میں اتار چڑھاؤ کرے کہ) آیا اس (مولود جدید) کو ذلت (کی حالت) پر لئے رہے، یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گاڑ دے، خوب سُن لو ان کی یہ تجویز بہت بُری ہے (کہ اوّل تو خدا کے لئے اولاد ثابت کرنا، یہی کس قدر بُری بات ہے، پھر اولاد بھی وہ جس کو خود اس قدر ذلیل وموجب عار سمجھیں پس) جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بُری حالت ہے (دنیا میں بھی کہ ایسے جہل میں مبتلا ہیں اور آخرت میں بھی کہ مبتلائے عقوبت و ذلت ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو بڑے اعلیٰ درجہ کے صفات ثابت ہیں (نہ وہ جو کہ یہ مشرکین بکتے ہیں) اور وہ بڑے زبردست ہیں (اگر ان کو دنیا میں شرک کی سزا دینا چاہیں تو کچھ مشکل نہیں، لیکن ساتھ ہی) بڑی حکمت والے (بھی ہیں بمقتضائے حکمت بعد موت تک سزا کو مؤخر فرما دیا ہے)۔

معارف ومسائل

ان آیتوں میں کفارِ عرب کی دو خصلتوں پر مذمت کی گئی ہے کہ اوّل تو وہ اپنے گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو اتنا بُرا سمجھتے ہیں کہ شرمندگی کے سبب لوگوں سے چھپتے پھریں، اور اس سوچ میں پڑ جائیں کہ لڑکی پیدا ہونے سے جو میری ذلت ہو چکی ہے اس پر صبر کروں یا اس کو زندہ درگور کر کے پیچھا چھڑاؤں، اور اس پر مزید جہالت یہ ہے کہ جس اولاد کو اپنے لئے پسند نہ کریں، اللہ جل شانہ کی طرف اسی کو منسوب کریں کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیں۔

دوسری آیت کے آخر میں اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ کا مفہوم تفسیر بحر محیط میں بحوالہ ابن عطیہ یہی دونوں خصلتیں قرار دی ہیں کہ اوّل تو ان کا یہ فیصلہ ہی بُرا فیصلہ ہے کہ لڑکیوں کو ایک عذاب اور ذلت سمجھیں، دوسرے پھر جس چیز کو اپنے لئے ذلت سمجھیں، اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں۔

تیسری آیت کے اخیر میں وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ

لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھنا اور چھپتے پھرنا حکمت خداوندی کا مقابلہ کرنا ہے، کیونکہ مخلوق میں نر و مادہ کی تخلیق عین قانونِ حکمت ہے (روح البیان)

مسئلہ:- ان آیتوں میں واضح اشارہ پایا گیا کہ گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھنا جائز نہیں یہ کفار کا فعل ہے، تفسیر روح البیان میں بحوالہ شرعہ لکھا ہے کہ مسلمان کو چاہئے کہ لڑکی پیدا ہونے سے زیادہ خوشی کا اظہار کرے تاکہ اہلِ جاہلیت کے فعل پر رد ہو جائے، اور ایک حدیث میں ہے وہ عورت مبارک ہوتی ہے جس کے پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہو، قرآن کریم کی آیت يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ میں بھی اناث کو مقدم کرنے سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہونا افضل ہے۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس کو ان لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ سابقہ پڑے اور پھر وہ ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے تو یہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائیں گی (روح البیان)

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے کو بُرا سمجھنا جاہلیت کی بُری رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور اس کے بالمقابل جو اللہ کا وعدہ ہے اس پر مطمئن اور مسرور رہنا چاہئے۔ واللہ اعلم

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ

اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر نہ چھوڑے زمین پر ایک چلنے والا،

لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ

لیکن ڈھیل دیتا ہے ان کو ایک وقت موعود تک، پھر جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ نہ پیچھے سرک سکیں گے

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَ

ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے، اور کرتے ہیں اللہ کے واسطے جس کو اپنا جی نہ چاہے اور

تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ

بیان کرتی ہیں زبانیں ان کی جھوٹ کہ ان کے واسطے خوبی ہے، آپ ثابت ہو کہ ان کے واسطے

النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ

آگ ہو اور وہ بڑھائے جا رہے ہیں، قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے مختلف فرقوں میں

مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ

تجھ سے پہلے پھر اچھے کر کے دکھلائے ان کو شیطان نے ان کے کام سو وہی رفیق ان کا ہے آج اور

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ

ان کے واسطے عذاب دردناک ہے، اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے تو

لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں اور سیدھی راہ سمجھانے کو اور واسطے بخشش ایمان لانے والوں کے

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ

اور اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی پھر اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے،

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ ع

اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سنتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ (ظالم) لوگوں پر ان کے ظلم (یعنی شرک و کفر) کے سبب (فی الفور دنیا میں پوری) دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی (حس و) حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے (بلکہ سب کو ہلاک کر دیتے) لیکن (فی الفور دارو گیر نہیں فرماتے بلکہ) ایک میعادِ معین تک مہلت دے رہے ہیں (تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو گنجائش ہو) پھر جب ان کا (وہ) وقتِ معین (نزدیک) آ پہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً سزا ہو جاوے گی) اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ امور تجویز کرتے ہیں جن کو خود (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں (جیسا اوپر آیا ہے وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ) اور (پھر) اس پر اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے جاتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے (بر تقدیر وقوعِ قیامت) ہر طرح کی بھلائی ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھلائی کہاں سے آئی تھی بلکہ) لازمی بات ہے کہ ان کے لئے (قیامت کے دن) دوزخ ہے اور بیشک وہ لوگ (دوزخ میں) سب سے پہلے بھیجے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے کفر و جہالت پر کچھ غم نہ کیجئے، کیونکہ) بخدا آپ (کے زمانہ) سے پہلے جو امتیں ہو گذری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا (جیسا کہ آپ کو ان کے پاس بھیجا ہے) سو (جس طرح یہ لوگ اپنی کفریات کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قائم ہیں اسی طرح) ان کو بھی شیطان نے ان کے اعمال (کفریہ) مستحسن کر کے

دکھلائے پس وہ (شیطان) آج (یعنی دنیا میں) ان کا رفیق ہے (یعنی رفیق تھا کہ ان کو بہکاتا سکھاتا تھا پس دنیا میں تو ان کو یہ خسارہ ہوا) اور (پھر قیامت میں) ان کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے (غرض یہ لاحقین بھی ان سابقین کی طرح کفر کر رہے ہیں اور انہی کی طرح ان کو سزا بھی ہوگی، آپ کیوں غم میں پڑے) اور ہم نے آپ پر یہ کتاب (جس کا نام قرآن ہے اس واسطے نازل نہیں کی کہ سب کا ہدایت پر لانا آپ کے ذمہ ہو تاکہ بعض کے ہدایت پر نہ آنے سے آپ مغموم ہوں، بلکہ) صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں (مثل توحید و معاد و احکام حلال و حرام) آپ (عام) لوگوں پر اس کو ظاہر فرما دیں (یہ فائدہ تو قرآن کا عام ہے) اور ایمان والوں کی ہدایت (خاصہ) اور رحمت کی غرض سے (نازل فرمایا ہے سو یہ امور بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ کیا (یعنی اس کی قوت نامیہ کو بعد اس کے کہ خشک ہو جانے سے کمزور ہو گئی تھی تقویت دی) اس (امر مذکور) میں ایسے لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو (جی سے ان باتوں کو) سنتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ

اور تمہارے واسطے چوپاؤں میں سوچنے کی جگہ ہے، پلاتے ہیں ہم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں

فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (۶۶)

سے گوبر اور لہو کے بیچ میں سے دُودھ ستھرا خوشگوار پینے والوں کے لئے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (نیز) تمہارے لئے مواشی میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ کہ ایک حصہ خون کا ہے، بعد ہضم کے جدا کر کے تھن کے مزاج سے ان کا رنگ بدل کر اس کو) صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

بُطُوْنِهٖ کی ضمیر اَنْعَام کی طرف راجع ہے لفظ اَنْعَام جمع مونث ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ بُطُوْنِهَا کہا جاتا جیسا کہ سورۂ مؤمنون میں اسی طرح نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا فرمایا گیا ہے۔

قرطبی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ سورۂ مؤمنون میں معنی جمع کی رعایت کر کے ضمیر مؤنث لائی گئی، اور سورۂ نحل میں لفظ جمع کی رعایت سے ضمیر مذکر استعمال ہوئی، اور محاوراتِ عرب میں اس کی نظیریں بے شمار ہیں کہ لفظ جمع کی طرف ضمیر مفرد راجع کی جاتی ہے۔

گوبر اور خون کے درمیان سے صاف دودھ نکالنے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جانور جو گھاس کھاتا ہے جب وہ اس کے معدہ میں جمع ہو جاتی ہے تو معدہ اس کو پکاتا ہے معدہ کے اس عمل سے غذا کا فُضلہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اوپر دودھ ہو جاتا ہے، اور اس کے اوپر خون' پھر قدرت نے یہ کام جگر کے سپرد کیا ہے کہ ان تینوں قسموں کو الگ الگ ان کے مقامات میں تقسیم کر دیتا ہے، خون کو الگ کر کے رگوں میں منتقل کر دیتا ہے، اور دودھ کو الگ کر کے جانور کے تھنوں میں پہونچا دیتا ہے اور اب معدہ میں صرف فضلہ باقی رہ جاتا ہے جو گوبر کی صورت میں نکلتا ہے۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لذیذ اور شیریں کھانے کا استعمال زہد کے خلاف نہیں ہے جبکہ اس کو حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، اور اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ کی گئی ہو، حضرت حسن بصری نے ایسا ہی فرمایا ہے (قرطبی)

مسئلہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کوئی کھانا کھاؤ تو یہ کہو اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَاَطْعِمْنَا خَيْرًا مِّنْهُ (یعنی یا اللہ اس میں ہمارے لئے برکت عطا فرما اور آئندہ اس سے اچھا کھانا نصیب فرما) ——— اور فرمایا کہ جب دودھ پیو تو یہ کہو اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ، (یعنی یا اللہ ہمارے لئے اس میں برکت دیجئے اور زیادہ عطا فرمائیے) اس سے بہتر کا سوال اس لئے نہیں کیا کہ انسانی غذا میں دودھ سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے، اسی لئے قدرت نے ہر انسان و حیوان کی پہلی غذا دودھ ہی بنائی ہے جو ماں کی چھاتیوں سے اسے ملتی ہے (قرطبی)

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا

اور میووں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور

وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

روزی خاصی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (نیز) کھجور اور انگوروں (کی حالت میں غور کرنا چاہئے کہ ان) کے پھلوں سے تم لوگ

نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں (جیسے خرمائے خشک کشمش اور شربت اور سرکہ) بناتے ہو بیشک اس میں (بھی توحید اور منعم ہونے کی) ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دودھ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذاء انسان کے لئے عطاء کر دی جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نُسْقِيْكُمْ استعمال فرمایا کہ ہم نے پلایا دودھ۔

اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں سے اپنی غذاء اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا بھی کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزقِ حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور اس سے اپنی غذاء وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور چیز یعنی شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت تو نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا گیا کہ "سَکَر" کے مقابل "رزق حسن" رکھا جس سے معلوم ہوا کہ "سَکَر" اچھا رزق نہیں ہے، "سَکَر" کے معنی جمہور[۱] مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں (روح المعانی، قرطبی، جصاص)

---

[۱] بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص و قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

یہ آیات باتفاقِ امت مکی ہیں اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزولِ آیت کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی، اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحۃً شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہوگئے (ہذا ملخص مافی الجصاص والقرطبی)

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ

اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنالے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں

الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ

اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں، پھر کھا ہر طرح کے میووں سے پھر چل

سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ

راستوں میں اپنے رب کے صاف پڑے ہیں نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف

اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ

رنگ ہیں اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کیلئے

یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

جو دھیان کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ) آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر (یعنی چھتہ) بنالے اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں (بھی چھتہ لگالے چنانچہ ان سب موقعوں پر وہ چھتہ لگاتی ہے) پھر ہر قسم کے (مختلف) پھلوں سے (جو تجھ کو مرغوب ہوں) چوستی پھر، پھر (چوس کر چھتہ کی طرف واپس آنے کے لئے) اپنے رب کے راستوں میں چل جو (تیرے لئے باعتبار چلنے کے اور یاد رہنے کے) آسان ہیں، (چنانچہ بڑی بڑی دور سے بے راستہ بھولے ہوئے اپنے چھتے کو لوٹ آتی ہے، پھر جب چوس کر اپنے چھتہ کی طرف لوٹتی ہے تو) اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (یعنی شہد) جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں کہ اس میں لوگوں (کی بہت سی بیماریوں) کیلئے شفاء ہے اس میں (بھی) ان لوگوں کیلئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں۔

معارف ومسائل

اَوْحىٰ، وحی یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہی، بلکہ لغوی معنی میں ہے، وہ یہ کہ متکلم مخاطب کو کوئی خاص بات مخفی طور پر اس طرح سمجھا دے کہ دوسرا شخص اس بات کو نہ سمجھ سکے
النَّحل، شہد کی مکھی اپنی عقل وفراست اور حسن تدبیر کے لحاظ سے تمام حیوانات میں ممتاز جانور ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان کا کیا ہے، باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے طریقہ پر اَعْطىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى فرمایا، لیکن اس ننھی سی مخلوق کے بارے میں خاص کر کے اَوْحىٰ رَبُّكَ فرمایا جس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ دوسرے حیوانات سے بہ نسبت عقل وشعور اور سوجھ بوجھ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔
شہد کی مکھیوں کی فہم وفراست کا اندازہ ان کے نظامِ حکومت سے بخوبی ہوتا ہے، اس ضعیف جانور کا نظامِ زندگی انسانی سیاست وحکمرانی کے اصول پر چلتا ہے، تمام نظم ونسق ایک بڑی مکھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جو تمام مکھیوں کی حکمران ہوتی ہے، اس کی تنظیم اور تقسیم کار کی وجہ سے پورا نظام صحیح سالم چلتا رہتا ہے، اس کے عجیب وغریب نظام اور مستحکم قوانین وضوابط کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، خود یہ "ملکہ" تین ہفتوں کے عرصہ میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے، یہ اپنی قد وقامت اور وضع وقطع کے لحاظ سے دوسری مکھیوں سے ممتاز ہوتی ہے یہ ملکہ تقسیمِ کار کے اصول پر اپنی رعایا کو مختلف امور پر مامور کرتی ہے، ان میں سے بعض دربانی کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور کسی نامعلوم اور خارجی فرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتیں، بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، بعض نابالغ بچوں کی تربیت کرتی ہیں، بعض معماری اور انجینئرنگ کے فرائض ادا کرتی ہیں، ان کے تیار کردہ اکثر چھتوں کے خانے بیس ہزار سے تیس ہزار تک ہوتے ہیں، بعض موم جمع کر کے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہیں جن سے وہ اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں یہ موم نباتات پر جمے ہوئے سفید قسم کے سفوف سے حاصل کرتی ہیں، گنے پر یہ مادہ بکثرت نظر آتا ہے، ان میں سے بعض مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں پر بیٹھ کر اس کو چوستی ہیں، جو ان کے پیٹ میں شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے، یہ شہد ان کی اور ان کے بچوں کی غذا ہے، اور یہی ہم سب کے لئے بھی لذت وغذا کا جوہر اور دوا وشفاء کا نسخہ ہے، یہ مختلف پارٹیاں نہایت سرگرمی سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور اپنی "ملکہ" کے حکم کو دل وجان سے قبول کرتی ہیں، ان میں سے اگر کوئی گندگی پر بیٹھ جائے تو چھتے کے دربان اسے باہر روک لیتے ہیں، اور ملکہ اس کو قتل کر دیتی ہے، ان کے اس حیرت انگیز نظام اور حسن کارکردگی کو دیکھ کر انسان

حیرت میں پڑجاتا ہے (از الجواہر)

بُيُوْتًا - آدمی رنگ سے جو ہدایت دی گئی ہے ان میں سے یہ پہلی ہدایت ہے جس میں گھر بنانے کا ذکر ہے، یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہر جانور اپنے رہنے سہنے کے لئے گھر تو بناتا ہی ہے، پھر اس اہتمام سے "گھروں" کی تعمیر کا حکم مکھیوں کو دینے میں کیا خصوصیت ہے، پھر یہاں لفظ بھی "بیوت" کا استعمال فرمایا جو عموماً انسانی رہائش گاہوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے اشارہ ایک تو اس طرف کر دیا کہ مکھیوں کو چونکہ شہد تیار کرنا ہے، اس کے لئے پہلے سے ایک محفوظ گھر بنالیں، دوسرا اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو گھر یہ بنائیں گی وہ عام جانوروں کے گھروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ساخت و بناوٹ غیر معمولی قسم کی ہوگی، چنانچہ ان کے گھر عام جانوروں کے گھروں سے ممتاز ہوتے ہیں، جن کو دیکھ کر انسانی عقل بھی ششدر رہ جاتی ہے، اُن کے گھر مسدس شکل کے ہوتے ہیں، پرکار اور مسطر سے بھی اگر ان کی پیمائش کی جائے تو بال برابر بھی فرق نہیں رہتا، مسدس شکل کے علاوہ وہ دوسری کسی شکل مثلاً مربع اور مخمس وغیرہ کو اس لئے اختیار نہیں کرتیں کہ ان کے بعض کونے بیکار رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو محض گھر بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا محل وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ کسی بلندی پر ہونا چاہئے، کیونکہ ایسے مقامات پر شہد کو تازہ اور صاف چھنی ہوئی ہوا پہنچتی رہتی ہے وہ گندی ہوا سے بچا رہتا ہے، اور توڑ پھوڑ سے بھی محفوظ رہتا ہے، چنانچہ فرمایا:

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ، یعنی ان گھروں کی تعمیر پہاڑوں، درختوں اور بلند عمارتوں پر ہونی چاہئے، تاکہ شہد بالکل محفوظ طریقہ سے تیار ہو سکے۔

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ، یہ دوسری ہدایت ہے جس میں مکھی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق پھل پھول سے رس چوسے، یہاں مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فرمایا، لیکن بظاہر یہاں لفظ "کل" سے دنیا بھر کے پھل پھول مراد نہیں ہیں، بلکہ جن تک آسانی سے اس کی رسائی ہو سکے، اور مطلب حاصل ہو سکے، "کل" کا یہ لفظ ملکۂ سبا کے واقعہ میں بھی وارد ہوا ہے وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی استغراق کلی مراد نہیں ہے، کہ ملکۂ سبا کے پاس ہوائی جہاز اور ریل موٹر ہونا بھی لازم آئے، بلکہ اس وقت کی تمام ضروریات و مناسبات مراد ہیں، یہاں بھی مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے یہی مراد ہے، ــــــ یہ مکھی ایسے ایسے لطیف اور قیمتی اجزاء چوستی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں مشینوں سے بھی وہ جوہر نہیں نکالا جا سکتا۔

فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا، یہ مکھی کو تیسری ہدایت دی جا رہی ہے کہ اپنے رب کے ہموار کئے ہوئے راستوں پر چل پڑ، یہ جب گھر سے دور دراز مقامات پر پھل پھول کا رس چوسنے

کے لئے کہیں جاتی ہے، تو بظاہر اس کا اپنے گھر میں واپس آنا مشکل ہونا چاہیے تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے راہوں کو آسان بنا دیا ہے، چنانچہ وہ میلوں دُور جاتی ہے اور بغیر بھولے بھٹکے اپنے گھر واپس پہنچ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فضاء میں اس کے لئے راستے بنا دیئے ہیں، کیونکہ زمین کے پیچ دار راستوں میں بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فضاء کو اس حقیر و ناتوان مکھی کے لئے مسخر کر دیا، تاکہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے گھر آسانی سے آجا سکے۔

اس کے بعد وحی کے اس حکم کا جو حقیقی ثمرہ تھا، اس کو بیان فرمایا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ، "کہ اس کے پیٹ میں سے مختلف رنگ کا مشروب نکلتا ہے، جس میں تمہارے لئے شفاء ہے،" رنگ کا اختلاف غذاء اور موسم کے اختلاف کی بناء پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی خاص علاقے میں کسی خاص پھل پھول کی کثرت ہو تو اس علاقہ کے شہد میں اس کا اثر و ذائقہ ضرور ہوتا ہے، شہد عموماً چونکہ سیال مادہ کی شکل میں ہوتا ہے، اس لئے اس کو شراب (پینے کی چیز) فرمایا، اس جملے میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کی قاطع دلیل موجود ہے، کہ ایک چھوٹے سے جانور کے پیٹ سے کیسا منفعت بخش اور لذیذ مشروب نکلتا ہے، حالانکہ وہ جانور خود زہریلا ہے، زہر میں سے یہ تریاق واقعی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی عجیب مثال ہے، پھر قدرت کی یہ بھی عجیب صنعت گری ہے کہ دودھ دینے والے حیوانات کا دودھ موسم اور غذاء کے اختلاف سے سرخ و زرد نہیں ہوتا اور مکھی کا شہد مختلف رنگوں کا ہوجاتا ہے۔

فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ، شہد جہاں قوت بخش غذاء اور لذت و طعم کا ذریعہ ہے، وہاں امراض کے لئے نسخۂ شفاء بھی ہے، اور کیوں نہ ہو، خالقِ کائنات کی یہ لطیف گشتی مشین جو ہر قسم کے پھل پھول سے مقوّی عرق اور پاکیزہ جوہر کشید کر کے اپنے محفوظ گھروں میں ذخیرہ کرتی ہے اگر جڑی بوٹیوں میں شفاء و دواء کا سامان ہے تو ان کے جوہر میں کیوں نہ ہوگا، بلغمی امراض میں بلا واسطہ اور دوسرے امراض میں دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر بطور دواء شہد کا استعمال ہوتا ہے، اطباء معجونوں میں بطورِ خاص اس کو شامل کرتے ہیں، اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ خود بھی خراب نہیں ہوتا اور دوسری اشیاء کی بھی طویل عرصہ تک حفاظت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہزارہا سال سے اطباء اس کو الکحل کی جگہ استعمال کرتے آئے ہیں، شہد مسہل ہے اور پیٹ سے فاسد مادہ نکالنے میں بہت مفید ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی نے اپنے بھائی کی بیماری کا حال بیان کیا تو آپؐ نے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، دوسرے دن پھر آکر اس نے بتلایا کہ بیماری بدستور ہے، آپؐ نے پھر وہی مشورہ دیا، تیسرے دن جب

اس نے پھر کہا کہ اب بھی کوئی فرق نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا: صَدَقَ اللّٰهُ وَكَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ یعنی اللہ کا قول بلاریب سچا ہے، تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے" مراد یہ ہے کہ دوا کا قصور نہیں بلکہ مریض کے مزاج خاص کی وجہ سے جلدی اثر ظاہر نہیں ہوا، اس کے بعد پھر پلایا تو بیمار تندرست ہوگیا۔

یہاں قرآن کریم میں شِفَآءٌ نکرہ تحت الاثبات ہے، جس سے اس کا ہر مرض کے لئے تو شفاء ہونا معلوم نہیں ہوتا، لیکن شفاء کی تنوین جو تعظیم کے لئے ہے اس بات پر ضرور دلالت کرتی ہے کہ شہد کی شفاء عظیم اور ممتاز نوعیت کی ہے ____ اور اللہ تعالیٰ کے بعض اہل دل بندے وہ بھی ہیں جن کو شہد کے کسی بھی مرض کے لئے شفاء ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ان کو اپنے رب کے قول کے اس ظاہری پر اس قدر مستحکم یقین اور مضبوط اعتقاد ہے کہ وہ پھوڑے اور آنکھ کا علاج بھی شہد سے کرتے ہیں اور جسم کے دوسرے امراض کا بھی ____ حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایات میں ہے کہ ان کے بدن پر اگر پھوڑا بھی نکل آتا تو اس پر شہد کا لیپ کرکے علاج کرتے، بعض لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں جیسا ان بندوں کا اپنے رب کے متعلق اعتقاد ہوتا ہے، حدیث قدسی میں فرمایا:- اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ جو کچھ مجھ سے گمان رکھتا ہے میں اس کے پاس ہوتا ہوں (یعنی اس کے مطابق کر دیتا ہوں)۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی مذکورہ بالا مثالیں بیان فرمانے کے بعد انسان کو پھر غور و فکر کی دعوت دی ہے، کہ قدرت کی ان مثالوں میں غور و فکر کرکے تو دیکھ لو، اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو پانی برسا کر زندہ کر دیتا ہے، وہ غلاظت و نجاست کے درمیان سے تمہارے لئے صاف و شفاف اور خوشگوار دودھ کی نالیاں بہاتا ہے، وہ انگور و کھجور کے درختوں پر شیریں پھل پیدا کرتا ہے، جن سے تم لذیذ شربتیں اور مزے دار مربّے بناتے ہو، وہ ایک چھوٹے سے زہریلے جاندار کے ذریعہ تمہارے لئے لذت و طعم اور غذاء و شفاء کا بہترین سامان مہیا کرتا ہے ____ کیا اب بھی تم دیوی، دیوتاؤں کو پکارو گے؟ کیا اب بھی تمہاری عبادت و وفاء اپنے خالق و مالک کے بجائے پتھر اور لکڑی کی بے جان مورتیوں کے لئے ہوگی؟ اور خوب سمجھ لو! کیا یہ بھی تمہاری عقل میں آسکتا ہے کہ یہ سب کچھ اندھے، بہرے اور بے شعور مادّے کی کرشمہ سازی ہو؟ صنعت و کاریگری کے یہ بے شمار شاہکار، حکمت و تدبیر کے یہ حیرت انگیز کارنامے اور عقل و دانش

کے یہ بہترین فیصلے اپنی زبانِ حال سے پکار پکار کر گویا ہیں کہ ہمارا ایک خالق ہے، یکتا و حکمت والا خالق، وہی عبادت و وفا کا مستحق ہے، وہی مشکل کشاء ہے، اور شکر و حمد اسی کو سزاوار ہے۔

فوائد (۱) آیت سے معلوم ہوا کہ عقل و شعور انسانوں کے علاوہ دوسرے جانداروں میں بھی ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، البتہ عقل کے درجات مختلف ہیں انسانوں کی عقل تمام ذی حیات اشیاء کی عقول سے زیادہ کامل ہے، اسی وجہ سے وہ احکامِ شرعیہ کا مکلّف ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر جنون کی وجہ سے انسان کی عقل میں فتور آجائے تو دوسری مخلوقات کی طرح وہ بھی مکلّف نہیں رہتا۔

(۲) شہد کی مکھی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی فضیلت میں حدیث وارد ہوئی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلذُّبَابُ کُلُّهَا فِی النَّارِ یَجْعَلُهَا عَذَابًا لِّاَهْلِ النَّارِ اِلَّا النَّحْلَ،
(نوادر الاصول بحوالۂ قرطبی)

"یعنی دوسرے ایذاء رساں جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جائیں گی، جو وہاں جہنّمیوں پر بطور عذاب مسلّط کر دی جائیں گی، مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جائے گی"۔

نیز ایک اور حدیث میں آپؐ نے اس کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابو داؤد)

(۳) اطباء کا اس میں کلام ہے کہ شہد مکھی کا فضلہ ہے، یا اس کا لعاب ہے، ارسطاطالیس نے شیشے کا ایک نفیس چھتّہ بنا کر مکھیوں کو اس میں بند کر دیا تھا، وہ ان کے نظامِ کار کو جاننا چاہتا تھا، لیکن ان مکھیوں نے سب سے پہلے برتن کے اندرونی حصّہ پر موم اور کیچڑ کا پردہ چڑھا دیا اور جب تک پوری طرح پردہ پوش نہیں ہو گئیں اُس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دنیا کی حقارت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

اَشْرَفُ لِبَاسِ بَنِیْٓ اٰدَمَ فِیْهِ لُعَابُ دُوْدَةٍ وَّاَشْرَفُ شَرَابِهٖ رَجِیْعُ نَحْلَةٍ،

"انسان کا بہترین ریشمی لباس اس کائنات کے ایک چھوٹے سے کیڑے کا لعاب ہے اور اس کا نفیس لذت بخش مشروب مکھی کا فضلہ ہے"۔

(۴) فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دواء سے مرض کا علاج کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بطور انعام ذکر کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ، حدیث میں دواء استعمال کرنے اور علاج کرنے کی ترغیب آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض حضرات نے سوال کیا کہ کیا ہم دوا استعمال کریں؟ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں، علاج کرلیا کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی مرض پیدا کیا ہے اس کے لئے دوا بھی پیدا فرمائی ہے، مگر ایک مرض کا علاج نہیں، انھوں نے سوال کیا وہ مرض کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا بڑھاپا (ابوداؤد والترمذی بحوالۂ قرطبی)

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ جو ہم جھاڑ پھونک کا عمل کرتے ہیں یا دوا سے اپنا علاج کرتے ہیں، اسی طرح بچاؤ اور حفاظت کے جو انتظامات کرتے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا یہ بھی تو تقدیر الٰہی ہی کی صورتیں ہیں۔

غرض یہ کہ علاج کرنے اور دوا استعمال کرنے کے جواز پر تمام علماء متفق ہیں، اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی اولاد میں اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تھا تو اُسے تریاق پلاتے تھے، اور جھاڑ پھونک سے اس کا علاج فرماتے، آپ نے لقوہ کے مریض پر داغ لگا کر اس کا علاج کیا (قرطبی)

بعض صوفیاء کے متعلق منقول ہے کہ وہ علاج کو پسند نہیں کرتے تھے، اور حضرات صحابہ میں سے بھی بعض کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے، مثلاً روایت ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور ان سے پوچھا، آپ کو کیا شکایت ہے؟ انھوں نے جواب دیا مجھے اپنے گناہوں کی فکر ہے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا پھر کس چیز کی خواہش ہے؟ فرمایا میں اپنے رب کی رحمت کا طلب گار ہوں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا آپ پسند کریں تو میں طبیب کو بلوا لیتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا، طبیب ہی نے تو مجھے لٹایا ہے (یہاں مجازی طور پر طبیب سے مراد اللہ تعالیٰ شانہٗ ہیں)

لیکن اس قسم کے واقعات اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ حضرات علاج کو مکروہ سمجھتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت اُن کے ذوق کو گوارہ نہیں تھا، اس لئے طبیعت کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے پسند نہیں کیا، یہ وقتی طور پر غلبۂ حال کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کو علاج کے ناجائز یا مکروہ ہونے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، حضرت عثمانؓ کا حضرت ابن مسعودؓ سے درخواست کرنا کہ میں آپ کے لئے طبیب لے آتا ہوں خود اس بات کی دلیل ہے کہ علاج جائز ہے، بلکہ بعض صورتوں میں یہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے نکمی عمر

الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿٧٠﴾ ع ۹ ۱۵

کو تاکہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے، اللہ خبردار ہے قدرت والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا پھر (عمر ختم ہونے پر) تمہاری جان قبض کرتا ہے (جن میں بعض تو ہوش و حواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں (جن میں نہ قوتِ جسمانیہ رہی نہ قوت عقلیہ رہی) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے (جیسا کہ اکثر ایسے بوڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتلائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھ رہے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مصلحت جانتے ہیں، اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں، اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں، پس یہ بھی دلیل ہے توحید کی)۔

معارف و مسائل

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے پانی، نباتات، چوپایے اور شہد کی مکھی کے مختلف احوال بیان فرما کر انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ اور مخلوق کے لئے اپنے انعامات پر متنبہ کیا، اب ان آیات سے اس کو اپنے اندرونی حالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کچھ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود کی دولت سے نوازا پھر جب چاہا موت بھیج کر وہ نعمت ختم کر دی، اور بعضوں کو تو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے، ان کے ہاتھ پاؤں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کوئی بات سمجھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھی ہوئی یاد رکھ سکتے ہیں، یہ آفاقی اور انفسی تغیر و تبدل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم و قدرت اسی ذات کے خزانہ میں ہے جو خالق و مالک ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ، مَنْ يُّرَدُّ کے لفظ سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان پر پہلے بھی ایک ضعف اور کمزوری کا وقت گزر چکا ہے، یہ اس کے بچپن کا ابتدائی دور تھا جب

میں یہ کسی سوجھ بوجھ کا مالک نہ تھا، اس کے قویٰ بالکل ضعیف و ناتواں تھے، یہ اپنی بھوک پیاس کو دور کرنے اور اپنے اُٹھنے بیٹھنے میں غیروں کا محتاج تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جوانی عطا کی یہ اُس کی ترقی کا زمانہ ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑھاپے کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جس میں یہ بالکل اسی طرح کمزوری، ضعف اور اضمحلال کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جیسا کہ بچپن میں تھا۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ مختل ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْٓءِ الْعُمُرِ وَفِیْ رِوَایَةٍ مِّنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ،	"یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بُری عمر سے، اور ایک روایت میں ہے کہ پناہ مانگتا ہوں ارذلِ عمر سے"

ارذل العمر کی تعریف میں کوئی تعیین نہیں ہے، البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے، جس کی طرف قرآن نے بھی لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش و حواس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔

ارذل العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں، بعض نے اسّی سال کی عمر کو ارذل العمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوّے سال کو، حضرت علیؓ سے بھی پچھتّر سال کا قول منقول ہے، (صحیحین بحوالہ مظہری)

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا، پیرانہ سالی کے انتہائی درجہ میں پہنچنے کے بعد آدمی میں نہ قوتِ جسمانیہ رہتی ہے اور نہ ہی عقلیہ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے، وہ تمام معلومات بھول کر بالکل کل کے بچے کی مانند ہو جاتا ہے، جس کو نہ علم و خبر ہے اور نہ ہی فہم و فراست، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی قدرت والے ہیں۔
(علم سے ہر شخص کی عمر کو جانتے ہیں اور قدرت سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، اگر چاہیں تو طاقت ور نوجوان پر ارذل العمر کے آثار طاری کر دیں، اور چاہیں تو سَو سال کا معمّر انسان بھی طاقت ور جوان رہے، یہ سب کچھ اسی ذات کے دستِ قدرت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو

فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ

بڑائی دی وہ نہیں پہنچادیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک اُن کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب

سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

اس میں برابر ہوجائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اثباتِ توحید کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں سنو کہ) اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق (کے باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنا دیا، کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو دے نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے (کہ ان کے پاس مال بھی ہو اور غلام بھی ہیں) وہ (لوگ) اپنے حصّہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہوجائیں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کرکے دیا تو مساوات ممکن ہو مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بُت وغیرہ جب باعترافِ مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے معبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہوجائیں گے، اس میں شرک کی انتہائی تقبیح ہے کہ جب تمہارے غلام تمہارے شریکِ رزق نہیں ہوسکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریکِ الوہیت کیسے ہوسکتے ہیں) کیا (یہ مضامین سنکر) پھر بھی (خدائے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں:

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفاتِ علم و قدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا، اس آیت میں اسی مضمونِ توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسانی مصالح کے پیش نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا، بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور مختلف درجات قائم فرمائے، کسی کو ایسا غنی بنا دیا جو ساز و سامان کا مالک ہے، حشم و خدم، غلام و خدمتگار رکھتا ہے، وہ خود بھی اپنی منشاء کے مطابق خرچ کرتا ہے، اور غلاموں، خدمتگاروں کو بھی اس کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو غلام و خدمتگار بنا دیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا ہے، اور کسی کو متوسط الحال بنایا، نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے، نہ اتنا فقیر و محتاج کہ اپنی ضروریات میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا یہ اثر سب کے مشاہدہ میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں، خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہو جائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بُت اور دوسری مخلوقات جن کی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک اپنے خالق و مالک کے برابر ہو جائیں، کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں دیکھ کر اور یہ مضامین سنکر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور برابر قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود تراشیدہ بُت کا یا کسی انسان اور جِن کا کوئی دخل نہیں ہے تو پھر اُن چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے؟

یہی مضمون سورۂ رُوم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ، (سورۂ روم آیت ۲۸) "تمہارے لئے تم ہی میں سے ایک مثال دی ہے، جو لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں تمہارے شریک ہیں کہ تم اس میں برابر ہو گئے ہو"۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے برابر ہو جائیں۔

معاش میں درجات کا اختلاف انسانوں کے لئے رحمت ہے اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنیٰ اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہے کوئی امیر

کوئی متوسط الحال۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہے اور انسانی مصالح کا مقتضیٰ اور انسانوں کے لئے رحمت ہی، اگر یہ صورت نہ رہے اور مال و سامان میں سب انسان برابر ہوجائیں تو نظامِ عالم میں خلل اور فساد پیدا ہوجائے گا، اسی لئے جب سے دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب انسان مال و متاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے، اور نہ ہوسکتے ہیں، اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہوجائے گا، حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل و دماغ اور قوت و طاقت اور صلاحیتِ کار میں مختلف مزاجوں پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں ادنیٰ، اعلیٰ، متوسط کی اقسام ہیں، جس کا کوئی صاحبِ عقل انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال و متاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا صلہ پائے، اور اگر اہلِ صلاحیت اور نااہل کو برابر کردیا گیا تو اہلِ صلاحیت کی حوصلہ شکنی ہوگی، جب معیشت میں اس کو نااہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کونسا داعیہ ہے جو اسے جد و جہد اور فکر و عمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیتِ کار کو برباد کرنا ہوگا۔

ارتکازِ دولت کے خلاف قرآنی احکام

البتہ خالقِ کائنات نے جہاں عقلی اور جسمانی قوتوں میں بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں تفاوت قائم فرمایا، وہیں معاش کا یہ نظامِ محکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسبِ معاش کے مرکزوں پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کرلے، دوسرے اہلِ صلاحیت کے کام کرنے کا میدان ہی باقی نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر معاش میں ترقی کرسکیں، اس کے لئے قرآن کریم سورۂ حشر میں ارشاد فرمایا: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ، "یعنی ہم نے تقسیمِ دولت کا قانون اس لئے بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے"۔

آجکل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے وہ اس ربانی قانونِ حکمت کو نظرانداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے، ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر سود و قمار کے راستہ سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام بنانے پر مجبور کردیتی ہیں، ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا، وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود صنعت و تجارت کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم و جور کے رد عمل کے طور پر ایک متضاد نظامِ اشتراکیت کمیونزم یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے، جس کا نعرہ غریب و امیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب

میں مساوات پیدا کرنا ہے، ظالمانہ سرمایہ داری کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا، معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، اور غریب اپنی غربت اور فقر و فاقہ کے ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترام انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا، نظامِ اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر قیمت مشین کے ایک پُرزے سے زائد نہیں، کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں، اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں، بلکہ سب ریاست کی مشین کے کل پُرزے ہیں جن کو مشین سٹارٹ ہوتے ہی اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا نہ اس کا کوئی ضمیر ہے نہ آواز، ریاست کے جبر و تشدد اور ناقابلِ برداشت محنت سے کراہنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے، جس کی سزا موت ہے، خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظامِ اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا، ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں، کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنا سکتے مترادف ہے۔

قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور احمقانہ اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت عامۂ مخلوق کو اپنا غلام نہ بنا سکے، اور مصنوعی گرانی اور قحط میں مبتلا نہ کر سکے، سُود اور جوئے کو حرام قرار دے کر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی، پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا، جو غریبوں پر احسان نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے، آیت فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اس پر شاہد ہے، پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افرادِ خاندان میں تقسیم کر کے ارتکازِ دولت کا خاتمہ کر دیا، قدرتی چشموں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خودرو پیداوار کو تمام خلقِ خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا، جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں، جب کہ سرمایہ داری نظام میں یہ سب چیزیں صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دیدی گئی ہیں۔

چونکہ علمی عملی صلاحیتوں کا متفاوت اور مختلف ہونا ایک امر فطری ہے، اور تحصیل معاش بھی انہی صلاحیتوں کے تابع ہے، اس لئے مال و دولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے، جس کو دنیا کا کچھ بھی عقل و شعور ہو وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور مساوات کے نعرے لگانے والے بھی چند قدم چلنے کے بعد اس مساوات کے دعوے

کو چھوڑنے اور معیشت میں تفاوت و تفاضل پیدا کرنے پر مجبور ہوگئے۔

خروشیف نے ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو سپریم سویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں، ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں، یہ لینن کی تعلیم ہے، اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا"

(سویٹ ورلڈ، ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدمِ مساوات تو ابتدا ہی سے سامنے آگئی تھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدمِ مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکتِ روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

لیون شیڈ و لکھتا ہے:

"شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا تفاوت ہو جتنا روس میں ہے"

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ کی جبری تصدیق منکرین کی زبانوں سے کرادی وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ یہاں اس آیت کے تحت تو صرف اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق ہے، باقی تقسیمِ دولت کے اسلامی اصول اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اس کا امتیاز تو ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ زخرف پارہ نمبر ۲۵ آیت نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ کے تحت میں آئے گا، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ "اسلام کا نظام تقسیمِ دولت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ بھی کافی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں اور دیئے تم کو تمہاری

اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ

عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دیں تم کو ستھری چیزیں سو کیا جھوٹی

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَيَعْبُدُوْنَ

باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے، اور پوجتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کے سوائے ایسوں کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین سے

شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ

کچھ بھی اور نہ قدرت رکھتے ہیں، سومت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں، بیشک

اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اللہ نے بتلائی ایک مثال ایک بندہ

مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ

پرایا مال نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے خاصی روزی سو

يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ

وہ خرچ کرتا ہے اس میں سے چھپاکر اور سب کے روبرو، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہے، پر

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ

بہت لوگ نہیں جانتے، اور بتائی اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں

اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ

ایک گونگا کچھ کام نہیں کرسکتا، اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب پر

اَيْنَـمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ

جس طرف اس کو بھیجے نہ کر کے لائے کچھ بھلائی، کہیں برابر ہے وہ اور ایک وہ شخص جو حکم

بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ ع

کرتا ہے انصاف سے اور ہے سیدھی راہ پر۔

ع ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور (منجملہ دلائلِ قدرت و وجوہِ نعمت کے ایک بڑی نعمت اور دلیلِ قدرت اللہ تعالیٰ کی خود تمہارا وجود و بقاءِ شخصی و نوعی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے (یعنی تمہاری جنس اور نوع سے) تمہارے لئے بیبیاں بنائیں اور (پھر) ان بیبیوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے

(کہ یہ بقاء نوعی ہے) اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں (کہ یہ بقاءِ شخصی ہوا اور چونکہ بقاء موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا) کیا (یہ سب دلائل و نعم سنکر) پھر بھی بے بنیاد چیز پر (یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل ہو) ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بے قدری) کرتے رہیں گے، اور (مطلب اس ناشکری کا یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو اُن کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش برسانے کا ان کو اختیار ہے نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی) قدرت رکھتے ہیں (اس کی نفی سے زیادہ مبالغہ ہوگیا، کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص بالفعل تو با اختیار نہیں ہو، لیکن جد وجہد سے اختیارات حاصل کرلیتا ہے، اس لئے اس کی بھی نفی فرمادی) سو (جب شرک کا بطلان ثابت ہوگیا تو) تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گھڑو (کہ اللہ تعالیٰ کی مثال بادشاہانِ دنیا کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے عرض حاجت نہیں کرسکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں کہ عوام ان سے عرضِ حاجت کرتے ہیں، پھر وہ سلاطین سے عرض کرتے ہیں کذا فی الکبیر و یؤخذ من قولہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا۔ وَهٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں محض مہمل ہیں) اور تم (بوجہ عدمِ تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو بک ڈالتے ہو اور) اللہ تعالیٰ (شرک کے بطلان ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو) غلام ہے (کسی کا) مملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا (بلا اجازتِ آقا) اختیار نہیں رکھتا اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی تو اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے (اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہوسکتے ہیں (بس جب مالکِ مجازی و مملوکِ مجازی برابر نہیں ہوسکتے، تو مالکِ حقیقی و مملوکِ حقیقی تو کب برابر ہوسکتے ہیں اور استحقاقِ عبادت موقوف ہے مساوات پر، اور وہ ہے نہیں) ساری تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں (کیونکہ کامل الذات والصفات وہی ہیں، پس معبود بھی وہی ہوسکتا ہے، مگر پھر بھی مشرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے) بلکہ ان میں اکثر تو (بوجہ عدمِ تدبر کے) جانتے ہی نہیں (اور چونکہ عدمِ علم کا سبب خود ان کا عدمِ تدبر ہے اس لئے معذور نہ ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ (اس کی توضیح کے لئے) ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں ایک تو (علاوہ غلام ہونے کے) گونگا (بہرا بھی) ہے (اور بوجہ بہرے اندھے بے عقل ہونیکے)

کوئی کام نہیں کر سکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبالِ جان ہے (کہ وہ مالک ہی اس کے سارے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک) اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا، (یعنی خود تو کیا کرتا دوسروں کی تعلیم سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا ہو) کیا یہ شخص اور (ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو (جس سے اس کا ناطق، عاقل، صاحبِ قوتِ علمیہ ہونا معلوم ہوتا ہے) اور خود بھی (ہر امر میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو، (جس سے قوتِ عملیہ منتظمہ معلوم ہوتی ہے، جب مخلوق مخلوق میں باوجود اشتراکِ ماہیت واشتراکِ اوصاف کے یہ تفاوت ہے تو کجا مخلوق و خالق، اور لَا یَقۡدِرُ کے ترجمہ میں بلا اجازتِ آقا کی قید سے جو سابقہ آیات میں ہے فقہی شبہات مندفع ہوگئے، اور کوئی وسوسہ میں نہ پڑے کہ شاید معبودِ غیر اللہ کو بھی اذن ہوگیا ہو، جواب یہ ہے کہ ربوبیت کے لئے کسی کو اذن نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا، اس آیت میں ایک اہم نعمت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس اور قوم میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں، تاکہ باہمی موانست بھی پوری ہو، اور نسلِ انسانی کی شرافت و بزرگی بھی قائم رہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ تمھاری بیبیاں تمھاری ہی جنس کی ہیں، انکی ضروریات اور جذبات بھی تمھارے ہی جیسے ہیں، ان کی رعایت تم پر لازم ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَحَفَدَةً، یعنی تمھاری بیبیوں سے ہم نے تمھارے بیٹے پوتے پیدا کئے"

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اولاد تو ماں باپ دونوں ہی سے مل کر پیدا ہوتی ہے، اس آیت میں اس کو صرف ماؤں سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ بچہ کی تولید و تخلیق میں بہ نسبت باپ کے ماں کا دخل زیادہ ہے، باپ سے تو صرف ایک قطرۂ بے جان نکلتا ہے اس قطرہ پر مختلف قسم کے دَور گذرتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہونا اور اس میں جان پڑنا قدرت کے ان سارے تخلیقی کارناموں کا محل تو ماں کا پیٹ ہی ہے، اسی لئے حدیث میں ماں کے حق کو باپ کے حق پر مقدّم رکھا گیا ہے۔

اس جملے میں بیٹوں کے ساتھ پوتوں کا ذکر فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس جوڑے بنانے کا اصل مقصد نسلِ انسانی کی بقا ہے کہ اولاد پھر اولاد کی اولاد ہوتی رہے، تو یہ انسان کی بقاءِ نوعی کا سامان ہوا۔

پھر وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ میں اس کی بقاءِ شخصی کے سامان کا ذکر فرمادیا کہ انسان پیدا ہو جائے تو پھر اس کی بقاءِ شخصی کے لئے غذاء کی ضرورت ہے، وہ بھی حق تعالیٰ نے مہیّا فرمادی، آیت میں لفظ حَفَدَةً کے اصلی معنی مددگار اور خدمت گار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہئے (قرطبی)

فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں ایک اہم حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس سے غفلت برتنا ہی تمام کافرانہ شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حق تعالیٰ کو اپنے بنی نوعِ انسان پر قیاس کر کے ان میں سے اعلیٰ ترین انسان مثلاً بادشاہ و فرمانروا کو اللہ تعالیٰ کی مثال قرار دیتے ہیں، اور پھر اس غلط بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے نظامِ قدرت کو بھی انسانی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کر کے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح کسی سلطنت و حکومت میں اکیلا بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے افسروں کو اختیارات سپرد کر کے ان کے ذریعہ نظمِ مملکت چلایا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے ماتحت کچھ اور معبود بھی ہوں جو اللہ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں، یہی تمام بت پرست اور مشرکین کا عام نظریہ ہے، اس جملے نے ان کے شبہات کی جڑ قطع کر دی، کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق کی مثالیں پیش کرنا خود بے عقلی ہے، وہ مثال و تمثیل اور ہمارے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔

آخری دو آیتوں میں انسان کی جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں سے پہلی مثال میں تو آقا اور غلام یعنی مالک اور مملوک کی مثال دے کر بتلایا کہ جب یہ دونوں ایک ہی جنس، ایک ہی نوع کے ہوتے ہوئے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے تو کسی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیسے برابر ٹھہراتے ہو۔

اور دوسری مثال میں ایک طرف ایک انسان ہے، جو لوگوں کو عدل و انصاف اور اچھی باتیں سکھاتا ہے، جو اس کی قوّتِ علمیہ کا کمال ہے، اور خود بھی معتدل اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے، جو اس کی قوّتِ عملیہ کا کمال ہے، اس علمی اور عملی قوت میں مکمل انسان کے بالمقابل وہ انسان ہے جو نہ خود اپنا کام کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کوئی کام درست کر سکتا ہے، یہ دونوں قسم کے انسان ایک ہی جنس ایک ہی نوع ایک ہی برادری کے ہونے کے باوجود آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، تو خالق و مالکِ کائنات جو حکیمِ مطلق اور قادرِ مطلق اور علیم و خبیر ہے اس کے ساتھ کوئی مخلوق کیسے برابر ہو سکتی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ

اور اللہ ہی کے پاس ہیں بھید آسمانوں اور زمین کے اور قیامت کا کام تو ایسا ہے جیسے لپک

الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ

نگاہ کی یا اس سے بھی قریب اللہ ہر چیز پر قادر ہے ، اور اللہ نے تم کو نکالا

مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان اور

الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى

آنکھیں اور دل ، تاکہ تم احسان مانو ، کیا نہیں دیکھے

الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ

اُڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوا میں کوئی نہیں تھام رہا ان کو سوائے اللہ کے اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ، اور اللہ نے بنا دیئے تم کو تمہارے گھر

سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ

بسنے کی جگہ اور بنا دیئے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن

ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ

سفر میں ہو اور جس دن گھر میں ہو ، اور بھیڑوں کی اُون سے اور اونٹوں کی برلوں سے اور بکریوں کی بالوں

اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا

سے کتنے اسباب اور استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ، اور اللہ نے بنا دیئے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سائے

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ

اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں اور بنا دیئے تم کو کرتے جو بچاؤ ہیں

الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

گرمی میں اور کرتے جو بچاؤ ہیں لڑائی میں ، اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ

تاکہ تم حکم مانو ، پھر اگر پھر جائیں تو تیرا کام تو یہی ہے کھول کر سنا دینا ، پہچانتے ہیں

نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں اور بہت ان میں ناشکر ہیں۔

ع ۱۱ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں (جو کسی کو معلوم نہیں باعتبار علم کے اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں (تو صفتِ علم میں وہ کامل ہیں) اور (قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیوب میں سے جو ایک امر عظیم ہے یعنی) قیامت (اس) کا معاملہ بس ایسا (جھٹ پٹ) ہو گا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدی (قیامت کے معاملہ سے مراد ہے۔ مُردوں میں جان پڑنا اور اس کا بہ نسبت آنکھ جھپکنے کے جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت زمانی ہوتی ہے، اور جان پڑنا آنی ہے، اور آنی ظاہر ہے کہ زمانی سے اسرع ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور اثباتِ قدرت کے لئے تخصیص قیامت کی شاید اس وجہ سے کی ہو کہ وہ منجملہ غیوب خاصہ کے بھی ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں کی دلیل ہے، قبل الوقوع تو علم اور بعد الوقوع قدرت کی) اور (منجملہ دلائل قدرت و وجوہِ نعمت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے (اس درجہ کا نام فلاسفہ کی اصطلاح میں عقلِ ہیولانی ہے) اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (استدلال علی القدرت کے لئے) کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تلے) فضا میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) ان کو (اس جگہ) کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے (ورنہ ان کے اجسام کا ثقیل ہونا اور مادۂ ہوا کا رقیق و لطیف ہونا طبعاً مقتضی اس کو ہے کہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس امر مذکور میں) ایمان والوں کے لئے (قدرتِ الٰہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں (چند نشانیاں اس لئے فرمایا کہ پرندوں کو خاص وضع پر پیدا کرنا جس سے اڑنا ممکن ہو، ایک دلیل ہے، پھر فضا کو ایسے طرز پر پیدا کرنا جس میں اڑنا ممکن ہو دوسری دلیل ہے، پھر بالفعل اس طیران کا وقوع تیسری دلیل ہے اور جن اسباب کو طیران میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان اسباب پر مسبّب یعنی طیران کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیتِ الٰہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی

ہوتا ہو کہ کسی چیز کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَا يُمْسِكُهُنَّ الخ فرمایا گیا، اور منجملہ وجوہِ نعمت و دلائلِ قدرت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالتِ حضر میں) تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالتِ سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب سہل معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اُون اور ان کے رُوؤں اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عادۃً یہ سامان بہ نسبت رُوئی کے کپڑوں کے دیرپا ہوتا ہے، اور منجملہ دلائلِ قدرت و وجوہِ نعمت کے ایک یہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعضی مخلوقات کے سائے بنائے (جیسے درخت و مکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی سردی، بارش، موذی دشمن جانور، آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کُرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (مراد اس سے زرہیں ہیں) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح کی اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے کہ تم (ان نعمتوں کے شکریہ میں) فرمانبردار رہو، (اور ہرچند کہ مذکورہ نعمتوں میں بعض مصنوعاتِ عباد بھی ہیں، مگر ان کا مادّہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے منعمِ حقیقی وہی ہیں پھر ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں آپ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) آپ کے ذمّہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں ایسے ہی ناشکرے ہیں ؛

معارف و مسائل

قولہ تعالیٰ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، اس میں اشارہ ہو کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے، جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلّم کا، سب سے پہلے اس کو رونا سکھایا، اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے، بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے، سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے، کوئی اور تکلیف

پہونچے تو رو دیتا ہے، قدرت نے اس کی ضروریات کے لئے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈال دی کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلایا کرے، اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لئے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے، اگر یہ تعلیم فطری اور بلاواسطہ نہ ہوتی تو کس معلّم کی مجال تھی جو اس نومولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا، اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں قدرت نے اس کو بلاواسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے آس پاس کے آدمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے، اور پھر اُن سُنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا کے بعد فرمایا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ، یعنی اگرچہ ابتداءِ پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کردیئے تھے، ان آلات میں سب سے پہلے سمع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا، جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے راستہ سے آتا ہے، شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے مگر کان سنتے ہیں، اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سُنی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھ سے دیکھی ہوئی معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر اُن معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سُنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور و فکر کر کے معلوم کرتا ہے، اور یہ کام قرآنی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے، اس لئے تیسرے نمبر میں اَفْـِٕدَة فرمایا، جو فُؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی قلب کے ہیں، فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد قرآنی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم و ادراک کا اصل مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے، اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے، گویائی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں، بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ سمع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آگیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گونگا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے، اور

شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں، جس کو سُن کر بولنا سیکھے، واللہ اعلم۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا، بیوت، بیت کی جمع ہے، جس مکان میں رات گذاری جائے اس کو بیت کہتے ہیں، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

كُلُّ مَا عَلَاكَ فَأَظَلَّكَ فَهُوَ سَقْفٌ وَسَمَاءٌ، وَكُلُّ مَا أَقَلَّكَ فَهُوَ أَرْضٌ وَكُلُّ مَا سَتَرَكَ مِنْ جِهَاتِكَ الْأَرْبَعِ فَهُوَ جِدَارٌ فَإِذَا انْتَظَمَتْ وَاتَّصَلَتْ فَهُوَ بَيْتٌ،	"جو چیز تمہالے سر سے بلند ہو اور تم پر سایہ کرے وہ چھت یا سماء کہلاتی ہے، اور جو چیز تمہارے وجود کو اپنے اوپر اٹھائے وہ زمین ہے، اور جو چیز چاروں طرف سے تمہارا پردہ کرے وہ دیواریں ہیں اور جب یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ بیت ہے"،

گھر بنانے کا اصل مقصد قلب جسم کا سکون ہے اس میں حق تعالیٰ نے انسان کے بیت یعنی گھر کو سَکَن فرما کر گھر بنانے کا فلسفہ اور حکمت واضح فرمادی، کہ اس کا اصل مقصد جسم اور قلب کا سکون ہے، عادۃً انسان کا کسب وعمل گھر سے باہر ہوتا ہے، جو اس کی حرکت سے وجود میں آتا ہے، اس کے گھر کا اصلی منشاء یہ ہے کہ جب حرکت وعمل سے تھک جائے تو اس میں جاکر آرام کرے، اور سکون حاصل کرے اگرچہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں بھی حرکت وعمل میں مشغول رہتا ہے مگر یہ عادۃً کم ہے۔

اس کے علاوہ سکون اصل میں قلب و دماغ کا سکون ہے، وہ انسان کو اپنے گھر میں ہی حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ انسان کے مکان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اس میں سکون ملے، آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے، اور ان میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بے حد خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو، بعض اوقات تو مصنوعی تکلفات خود ہی آرام وسکون کو برباد کردیتے ہیں، اور وہ بھی نہ ہو تو گھر میں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس سکون کو ختم کردیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ جھگی اور جھونپڑی اچھی ہے جس کے رہنے والے کے قلب وجسم کو سکون حاصل رہا ہو۔

قرآن کریم ہر چیز کی رُوح اور اصل کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے بڑی غرض وغایت سکون کو قرار دیا، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون قرار دیا ہے لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا، جس ازدواجی زندگی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ اس کے اصل فائدے سے محروم ہے، آج کی دنیا میں ان چیزوں میں رسمی اور غیر رسمی تکلفات اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد نہیں رہی، اور مغربی تمدّن ومعاشرت نے ان چیزوں میں ظاہری زیب وزینت کے سارے سامان جمع کردیئے، مگر سکونِ قلب وجسم سے قطعاً محروم کر ڈالا۔

قولہ مِنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ وقولہ مِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا، سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی کھال اور بال اور اُون سب کا استعمال انسان کے لئے حلال ہے، اس میں یہ بھی قید نہیں کہ جانور مذبوح ہو یا مردار اور نہ یہ قید ہے کہ اس کا گوشت حلال ہے یا حرام، ان سب قِسم کے جانوروں کی کھال دباغت دے کر استعمال کرنا حلال ہے، اور بال اور اُون پر تو جانور کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، وہ بغیر کسی خاص صنعت کے حلال اور جائز ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، البتہ خنزیر کی کھال اور اس کے تمام اجزاء ہر حال میں نجس اور ناقابلِ انتفاع ہیں۔

سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ، یہاں انسان کو کُرتے کی غرض گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے، حالانکہ کُرتہ انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے، اس کا ایک جواب تو امام قرطبیؒ اور دوسرے مفسرین نے یہ دیا ہے کہ قرآن حکیم عربی زبان میں آیا ہے، اس کے اوّلین مخاطب عرب ہیں، اس لئے اس میں عرب کی عادات وضروریات کا لحاظ رکھ کر کلام کیا گیا ہے، عرب ایک گرم ملک ہے، وہاں برف باری اور سردی کا تصوّر ہی مشکل ہے، اس لئے گرمی سے بچانے کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا، حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ فرما کر لباس کے ذریعہ سردی سے بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دفع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں ایک بتلانے والا پھر حکم نہ ملے منکروں کو

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اور نہ اُن سے توبہ لی جائے، اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ

ہلکا نہ ہوگا اُن سے اور نہ اُن کو ڈھیل ملے، اور جب دیکھیں

اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ

مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو

كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۚ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾

ہم پکارتے تھے تیرے سوا تب وہ اُن پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو،

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾

اور آپڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں جو جھوٹ باندھتے تھے،

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

جو لوگ منکر ہوئے ہیں اور روکتے رہے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھادیں گے عذاب پر

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ

عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے، اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں

شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ

ایک بتلانے والا ان پر انہی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر،

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت

وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾

اور خوش خبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

ع ۱۲ / ۱۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہی) جس دن ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اس امت کا پیغمبر ہوگا) قائم کریں گے (جو ان کے اعمال سیئہ کی شہادت دیں گے) پھر ان کافروں کو (عذر و معذرت کرنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم توبہ یا کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کر لو، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ آخرت دار الجزاء ہے دار العمل نہیں) اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے) تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں) کچھ مہلت دیئے جائیں گے (کہ چند روز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے) اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے) دیکھیں گے تو (بطور اقرار جرم کے) کہیں گے کہ

اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک یہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے سو وہ (شرکاء ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو (اصل مطلب ان کا یہ ہوگا کہ ہمارا تمھارا کوئی تعلق نہیں جس سے مقصود اپنی حفاظت ہے، اب خواہ یہ مطلب ان کا صحیح ہو جیسا اگر مقبولین مثل ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کے یہ بات کہیں تو صحیح ہے، کقولہ تعالیٰ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ اور خواہ یہ غلط ہو جیسے خود شیاطین کہنے لگیں، اور خواہ ان کو صحیح غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو، جیسے اصنام و اشجار وغیرہ کہنے لگیں) اور یہ مشرک اور کافر لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پردازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گے (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے (اور دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر (کہ کفر کے مقابلہ میں ہوگی) دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہِ خدا سے روکتے تھے) بڑھا دیں گے۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرنے کا ہے) جس دن ہم ہر ہر امت کے ایک ایک گواہ جو اُنہی میں کا ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے اور انہی میں کا ہونا عام ہے خواہ باعتبار شرکت نسب کے ہو خواہ باعتبار شرکت سکنیٰ کے ہو) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس اخبارِ شہادت سے جو آپ کی رسالت کا اجمالاً مفہوم ہوتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (علاوہ معجز ہونے کے جو کہ مدار ہے اثباتِ رسالت کا اُن خوبیوں کا جامع ہے) کہ تمام (دین کی) باتوں کا (بواسطہ یا بلا واسطہ عامۃ الناس کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے۔

معارف و مسائل

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ، اس میں کتاب یعنی قرآن کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے، مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی و نبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈھنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی تو سب مسائل مذکور نہیں تو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کہنا کیسے درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول اللہ ﷺ ان مسائل کا بیان کرتی ہیں، اور کچھ تفصیلات کو اجماع و قیاس شرعی

کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع و قیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے اور تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور (کسی پر) ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اور مامورات و منہیات مذکورہ میں تمام اعمال صالحہ اور سیئہ آگئے، اس جامعیت کی وجہ سے قرآن کا تبیان ہونا صاف ظاہر ہے اور) اللہ تعالیٰ تم کو (امور مذکورہ کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو (اور عمل کرو، کیونکہ ہدیٰ اور رحمت اور بشریٰ ہونا اسی پر موقوف ہے)۔

معارف و مسائل

یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے، اسی لئے سلفِ صالحین کے عہد مبارک سے آج تک دستور چلا آرہا ہے کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت سورۂ نحل میں یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ (ابن کثیر)

اور حضرت اکثم بن صیفیؓ تو اسی آیت کی بنا پر اسلام میں داخل ہوئے، امام ابن کثیر نے حافظِ حدیث ابویعلیٰ کی کتاب معرفۃ الصحابہ میں سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی اپنی قوم کے سردار تھے، جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اشاعتِ اسلام کی خبر ملی تو ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، آپ کا خود جانا مناسب نہیں، اکثمؓ نے کہا کہ اچھا تو قبیلہ کے دو آدمی منتخب کرو جو وہاں جائیں، اور حالات کا جائزہ لے کر مجھے بتلائیں، یہ دونوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اکثم بن صیفی کی طرف سے دو باتیں دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں، اکثم کے دو سوال یہ ہیں:

آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟	مَنْ اَنْتَ وَمَا اَنْتَ ،

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ میں محمد بن عبداللہ ہوں اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے بعد آپؐ نے سورۃ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیۃ ان دونوں قاصدوں نے درخواست کی کہ یہ جملے ہمیں پھر سنایئے، آپؐ اس آیت کی تلاوت کرتے رہے یہاں تک کہ ان قاصدوں کو آیت یاد ہوگئی۔

قاصد واپس اکثم بن صیفی کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم نے پہلے سوال میں یہ چاہا تھا کہ آپ کا نسب معلوم کریں، مگر آپؐ نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی صرف باپ کا نام بیان کر دینے پر اکتفاء کیا، مگر جب ہم نے دوسروں سے آپؐ کے نسب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے عالی نسب شریف ہیں، اور پھر بتلایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کچھ کلمات بھی سنائے تھے وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

ان قاصدوں نے آیت مذکورہ اکثم بن صیفی کو سنائی، آیت سنتے ہی اکثمؓ نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکارم اخلاق کی ہدایت کرتے ہیں اور بُرے اور رذیل اخلاق سے روکتے ہیں، تم سب اُن کے دین میں جلد داخل ہو جاؤ تاکہ تم دوسرے لوگوں سے مقدم اور آگے رہو، پیچھے تابع بن کر نہ رہو (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں میں نے لوگوں کے کہنے سننے سے شرما شرمی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک آپؐ پر نزولِ وحی کے آثار ظاہر ہوئے، اور بعض عجیب حالات کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قاصد میرے پاس آیا، اور یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی، حضرت عثمان بن مظعونؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اور آیت سن کر میرے دل میں ایمان مضبوط و مستحکم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، (ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے تلاوت فرمائی تو اس کا تاثر یہ تھا جو اس نے اپنی قوم قریش کے سامنے بیان کیا:

خدا کی قسم اس میں ایک خاص حلاوت ہے اور	واللہ ان لہ لحلاوۃ وان

علیہ لطلاوۃ وان اصلہ لمورق واعلاہ لمثمر وماھو بقول بشر	اس کے اوپر ایک خاص رونق اور نور ہے اس کی جڑ سے شاخیں اور پتے نکلنے والے ہیں اور شاخوں پر پھل لگنے

والا ہے، یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا"

تین چیزوں کا حکم اور تین چیزوں کی ممانعت

اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے، عدل، احسان، اور اہل قرابت کو بخشش، اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، فحش کام، اور ہر برا کام، اور ظلم و تعدی، ان چھ الفاظ کی شرعی مفہوم اور اس کے حدود کی تشریح یہ ہے:

عدل، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے، جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضاجوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہونچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہو کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبداللہ رازیؒ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہو کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (بحر محیط)

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور بُرے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

اَلْاِحْسَان، اس کے اصل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ فعل یا خُلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے، دوسرے یہ کہ کسی دوسری شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف اِلَی استعمال ہوتا ہے، جیسا ایک آیت میں اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فرمایا ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبرئیلؑ کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر استحضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزء ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر کائنات کا کوئی ذرّہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عادات کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اوّل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا وصول کرلے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کرلو، اسی طرح دوسرا کوئی تمھیں ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہونچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کردو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرّع کے طور پر ہوا۔

اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی، تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ہے، ایتاء کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قربٰی کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربیٰ کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتاء ذی القربیٰ کے معنی ہوئے رشتہ دار کو کچھ دینا، یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ، یعنی دو رشتہ دار کو اس کا حق" ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظِ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت و حرمت کے احکام ہیں:۔

وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے فحشاء اور منکر اور بغی سے، فحشاء ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو بُرا سمجھے، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو، اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے، یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی بُرائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لئے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں

تک متعدی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ و جدل تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہونچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیدیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیئے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللہ تعالیٰ اتباعہ۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے

تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا

کے بعد، اور تم نے کیا ہے اللہ کو اپنا ضامن اللہ جانتا ہے جو تم

تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ

کرتے ہو، اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کاتا ہوا محنت کے بعد

اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ

ٹکڑے ٹکڑے کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو

اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ

چڑھا ہوا دوسرے سے یہ تو اللہ پرکھتا ہے تم کو اس سے اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو

الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

قیامت کے دن، جس بات میں تم جھگڑ رہے تھے، اور اللہ چاہتا تو سب کو

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے،

وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ

اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے، اور نہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دھوکا،

بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ

آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے اور تم چکھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ

اللہ کی راہ سے اور تم کو بڑا عذاب ہو، اور نہ لو اللہ کے عہد پر

اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مول تھوڑا سا، بیشک جو اللہ کے یہاں ہو وہی بہتر ہے تمھارے حق میں اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ

جانتے ہو، جو تمھارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہوگا، اور ہم بدلہ میں دیں گے

الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

صبر کرنیوالوں کو ان کا حق اچھے کاموں پر جو کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

ایفاءِ عہد کا حکم اور عہد شکنی کی مذمت

اور تم اللہ کے عہد کو (یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو) پورا کرو (اس سے وہ نکل گیا جو خلافِ شرع عہد ہو اور باقی سب عہود مشروعہ خواہ متعلق حقوق اللہ کے ہوں یا متعلق حقوق العباد کے ہوں اس میں داخل ہو گئے) جبکہ تم اس کو (تخصیصاً یا تعمیماً) اپنے ذمہ کرلو (تخصیصاً یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعمیماً یہ کہ ایمان لائے تو تمام احکام واجبہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آگئی) اور (بالخصوص جن عہود میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابلِ اہتمام ہیں، سو ان میں) قسموں کو بعد ان کے مستحکم کرنے کے (یعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے) مت توڑو اور تم (ان قسموں کی وجہ سے ان عہود میں) اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو (یہ قیدیں بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اور وَقَدْ جَعَلْتُمْ، قید واقعی ہیں وفاءِ عہد پر تنبیہ کے لئے تصریح کی گئی) بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو (خواہ وفاء یا عہد شکنی پس اسی کے موافق تم کو جزاء و سزا دے گا) اور تم (نقضِ عہد کرکے) اس (مکہ میں رہنے والی پاگل) عورت کے

مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتے پیچھے بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا کہ (اس کی طرح) تم (بھی) اپنی قسموں کو (بعد درستی کے توڑ کر ان کو) آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم و عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو برانگیختگی پیدا ہوتی ہے، اور یہ اصل ہے فساد کی اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے (یعنی مثلاً کفار کے دو گروہ ہوں میں باہم مخالفت ہو اور تمہاری ایک سے صلح ہو جائے پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہوا دیکھ کر جس گروہ سے صلح کی تھی اس سے غدر کر کے دوسرے گروہ سے سازش کرلے، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہدِ اسلام کو توڑ کر مرتد ہو جائے، اور یہ جو ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتا ہے، تو) بس اس (زائد ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے (کہ دیکھیں وفاءِ عہد کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر اُدھر ڈھل جاتے ہو) اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمہارے سامنے (عملاً) ظاہر کر دے گا (کہ حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی، آگے اس اختلاف کی حکمت بطور جملہ معترضہ کے اجمالاً بیان فرماتے ہیں) اور (ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن (بمقتضائے حکمت جس کی تفصیل و تعیین یہاں ضروری نہیں) جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ منجملہ ہدایت کے وفائے عہد اور منجملہ ضلالت کے نقضِ عہد بھی ہے) اور (یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے ہرگز نہیں بلکہ قیامت میں) تم سے تمہارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہو گی اور (جیسا نقضِ عہد و قسم سے محسوس ضرر ہوتا ہے جس کا اوپر بیان تھا، اسی طرح اس سے معنوی ضرر بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے یعنی) تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو) کبھی اس کو دیکھ کر کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے، (یعنی دوسرے بھی تمہاری تقلید کریں، اور عہد شکنی کرنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہ خدا سے مانع ہوئے تکلیف بھگتنا پڑے (کیونکہ وفاءِ عہد راہِ خدا ہے تم اس کے توڑنے کے سبب بن گئے اور یہی ہے وہ معنوی ضرر کہ دوسروں کو بھی عہد شکن بنایا اور تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں) تم کو بڑا عذاب ہوگا اور (جس طرح گروہ غالب میں شامل ہو کر جاہ حاصل کرنے کی غرض سے نقضِ عہد

ممنوع ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اسی طرح تحصیلِ مال کی غرض سے جو عہد توڑا ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ) اور تم لوگ عہدِ خداوندی کے عوض میں (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو (عہدِ خداوندی کے معنی تو شروع آیت میں معلوم ہوئے اور ثمن قلیل سے مراد دنیا ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ) پس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرۂ آخرت) وہ تمہارے لئے (متاعِ دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (پس متاعِ آخرت کثیر ہوئی اور متاعِ دنیوی خواہ کتنی بھی ہو قلیل ہوئی) اور (علاوہ تفاوتِ قلیل وکثیر کے دوسرا تفاوت یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جائے گا، خواہ زوال سے یا موت سے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ (وفائے عہد وغیرہ احکامِ دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی نعمتِ باقیہ مذکورہ) ان کو ضرور دیں گے (پس وفائے عہد کر کے دولتِ کثیرہ غیر فانیہ کو حاصل کرو اور قلیل فانی کے لئے نقضِ عہد مت کرو)

معارف و مسائل

عہد شکنی حرام ہے لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔

اور یہ آیات درحقیقت آیتِ سابقہ کی تشریح و تکمیل ہیں، آیتِ سابقہ میں عدل و احسان کا حکم تھا، لفظ عدل کے مفہوم میں ایفاءِ عہد بھی داخل ہے (قرطبی)

کسی سے عہد معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر کوئی کفارہ مقرر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدانِ حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی اس کے خلاف کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، آخرت میں وبالِ عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے (قرطبی)

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ، اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہو کہ جس جماعت سے تمہارا معاہدہ ہو جائے اس معاہدہ کو دنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو مثلاً تمہیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے یہ کمزور اور تعداد میں قلیل ہی،

یا مال کے اعتبار سے مفلس ہو، اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے، یا مال و دولت والی ہے، تو صرف اس طمع سے کہ قوی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیادہ ہوں گے، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع وضرر کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے، البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے، وہ اگر خلاف شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس کا عہد توڑ دینا واجب ہے، بشرطیکہ واضح طور پر ان کو جتلا دیا جائے کہ ہم اب اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے، جیسا کہ آیت فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ میں مذکور ہے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورتِ حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں، کہ یہ اپنے نفس کی اغراض و خواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ ڈالتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

کسی کو دھوکہ دینے کے لئے قسم کھانے میں سلب ایمان کا خطرہ ہے وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا ، اس آیت میں ایک اور عظیم گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے، وہ یہ کہ قسم کھاتے وقت ہی سے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم کھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے، فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا ، کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

رشوت لینا سخت حرام اور اللہ سے عہد شکنی ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ، یعنی اللہ کے عہد کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے میں نہ توڑو، یہاں تھوڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور اس کے منافع ہیں وہ مقدار میں کتنے بھی بڑے ہوں، آخرت کے منافع کے مقابلہ میں ساری دنیا اور اس کی ساری دولتیں بھی قلیل ہی ہیں، جس نے آخرت کے بدلے میں دنیا لے لی اس نے انتہائی خسارہ کا سودا کیا ہے، کہ ہمیشہ رہنے والی اعلیٰ ترین نعمت و دولت کو بہت جلد فنا ہونے والی گھٹیا قسم کی چیز کے عوض بیچ ڈالا کوئی سمجھ بوجھ والا انسان گوارا نہیں کر سکتا۔

ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمہ ہے، اس کے پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے اسی طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کو کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروّجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لے کر مفوضہ

خدمت پوری کروں گا، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ٹلائے تو یہ عہد اللہ کو توڑ رہا ہے، اسی طرح جس کام کا اس کو محکمہ کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر ڈالنا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے (بحر محیط)

رشوت کی جامع تعریف

ابن عطیہ کے اس کلام میں رشوت کی جامع مانع تعریف بھی آگئی، جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے:

اخذ الاموال علیٰ فعل ما یجب علی الاٰخذ فعلہ او فعل مَا یجب علیہ ترکہ	"یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہو اس کے

کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (تفسیر بحر محیط، ص ۵۳۳ ج ۵)

اور پوری دنیا کی ساری نعمتوں کا قلیل ہونا اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، یعنی جو کچھ تمھارے پاس ہے (مراد اس سے دنیوی منافع ہیں) وہ سب ختم اور فنا ہونے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (مراد اس سے آخرت کا ثواب و عذاب ہی) وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

دنیا کی راحت و کلفت، دوستی، دشمنی سب فنا ہونے والے ہیں اور ان کے ثمرات و نتائج جو اللہ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں

مَا عِنْدَكُمْ کے لفظ سے عام طور پر ذہن صرف مال و متاع کی طرف جاتا ہے، استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لفظ مَا لغت کے اعتبار سے عام ہے اور عموم کے معنی مراد لینے سے کوئی امر شرعی مانع نہیں، اس لئے اس میں دنیا کا مال و متاع بھی داخل ہے، اور اس میں پیش آنے والے تمام حالات و معاملات، خوشی اور غم، رنج اور راحت، بیماری اور صحت، نفع اور نقصان کسی کی دوستی یا دشمنی یہ سب چیزیں شامل ہیں کہ سب کی سب فنا ہونے والی ہیں، البتہ ان حالات و معاملات پر جو آثار مرتب ہونے والے ہیں اور قیامت میں اُن پر عذاب و ثواب ہونے والا ہو وہ سب باقی رہنے والے ہیں، فنا ہو جانے والے حالات و معاملات کی دُھن میں لگا رہنا اور اپنی زندگی اور اس کی توانائی کو اسی کی فکر میں لگا کر دائمی عذاب و ثواب سے غفلت برتنا کسی ذی عقل کا کام نہیں ؎

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت — تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد — بر گردنِ وے بماند و بر ما بگذشت

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً
جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک
طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾
اچھی زندگی اور بدلے میں دیں گے اُن کو حق اُن کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیات میں ایفاء عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے اس آیت میں تمام اعمالِ صالحہ اور عاملین صالحین کا عمومی بیان ہے مضمون آیت کا یہ ہے، کہ آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا کی برکات صرف ایفائے عہد میں منحصر نہیں اور نہ کسی عامل کی تخصیص ہے بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیونکہ کافر کے اعمالِ صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں اُن کا اجر دیں گے۔

معارف و مسائل

حیاتِ طیبہ کیا چیز ہے؟ جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیاتِ طیبہ سے مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطف زندگی ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے، اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر و فاقہ یا بیماری پیش نہ آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مومن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر و فاجر کے کہ اگر اس کو تنگدستی اور بیماری پیش آتی ہے، تو اس کے لئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، بعض اوقات خودکشی کی نوبت آجاتی ہے، اور اگر اس کو فراخی عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کروڑپتی ہو جاتا ہے، تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے۔

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مؤمنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی وہ فرحت و انبساط اور پُرلطف زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت

تو ان کی زندگی کا پُرلطف ہونا ظاہر ہے ہی، خصوصاً اس بناء پر کہ بلا ضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے، اور اگر تنگدستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اُن کا مکمل یقین اور مشکل کے بعد آسانی، کلفت کے بعد راحت ملنے کی قوی اُمیدان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشتکار کھیت بولنے اور اس کی پرورش کے وقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا صلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی محنت و مشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے، مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مؤمن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے رنج و راحت اور سرد و گرم سب کو آسانی سے برداشت کرلیتا ہے، اس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشوش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جو مؤمن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ

اس کا زور تو انہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو

بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

شریک مانتے ہیں۔

۱۳ ع ۱۱ ۱۹

ربطِ آیات سابقہ آیات میں اوّل ایفاءِ عہد کی تاکید اور مطلقاً اعمالِ صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا ہے، انسان کو ان احکام میں غفلت اغواءِ شیطانی سے پیدا ہوتی ہے،

اس لئے اس آیت میں شیطانِ رجیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے، جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہے، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قراءتِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تلاوتِ قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے ؎

دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں خوانند

اور بعض خاص آیات اور سورتیں بالخاصہ شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے مجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے (بیان القرآن)، اس کے باوجود جب تلاوتِ قرآن کے ساتھ شیطان سے تعوّذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا۔

اس کے علاوہ خود تلاوتِ قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے، کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے، تدبر و تفکر اور خشوع خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوسِ شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا (ابن کثیر، مظہری وغیرہ)

خلاصۂ تفسیر

(اور جب عمل صالح کی فضیلت معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی شیطان اس میں خلل ڈالتا ہے، کبھی وفائے عہد میں بھی خلل ڈالتا ہے اور کبھی دوسرے عمل مثل قراءتِ قرآن میں بھی) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے واسطے آپ کی امت سن لیں کہ) جب آپ (کیسا ہی نیک کام کرنا چاہیں حتیٰ کہ) قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں (اصلاً تو دل سے خدا پر نظر رکھنا ہے اور یہی حقیقت استعاذہ کی واجب ہے، اور قراءت میں پڑھ لینا زبان سے بھی مسنون ہے، اور پناہ مانگنے کا حکم ہم اس لئے دیتے ہیں کہ) یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (چلتا ہے) جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

ابن کثیرؒ نے مقدمۂ تفسیر میں فرمایا کہ انسان کے دشمن دو قسم کے ہیں، ایک خود نوعِ انسانی میں سے جیسے عام کفار، دوسرے جنات میں سے جو شیطان نافرمان ہیں، پہلی قسم کے دشمن کے ساتھ اسلام نے جہاد و قتال کے ذریعہ مدافعت کا حکم دیا ہے، مگر دوسری قسم کے لئے صرف اللہ سے پناہ مانگنے کا حکم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قسم کا دشمن اپنی ہی جنس و نوع سے ہے اس کا حملہ ظاہر ہو کر ہوتا ہے اس لئے اس سے جہاد و قتال فرض کر دیا گیا، اور دشمن شیطانی نظر نہیں آتا، اس کا حملہ بھی انسان پر آمنا سامنے

نہیں ہوتا، اس لئے اس کی مدافعت کے لئے ایک ایسی ذات کی پناہ لینا واجب کیا گیا جو نہ انسان کو نظر آتی ہے نہ شیطان کو، اور شیطان کی مدافعت کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جو اس سے مغلوب ہوجائے وہ اللہ کے نزدیک راندۂ درگاہ اور مستحق عذاب ہے، بخلاف عدوِ انسانی یعنی کفار کہ انکے مقابلہ میں کوئی شخص مغلوب ہوجائے یا مارا جائے تو وہ شہید اور مستحق ثواب ہے، اس لئے عدوِ انسانی کا مقابلہ اعضاء و جوارح کیساتھ ہر حال میں نفع ہی نفع ہے، یا دشمن غالب آگیا اسکی قوت کو ختم کردیگا یا پھر خود شہید ہو کر عند اللہ ماجور ہوگا۔

مسئلہ :۔ تلاوتِ قرآن سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کا پڑھنا اس آیت کی تعمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مگر کبھی کبھی اس کا ترک کرنا بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے جمہور علماء امت نے اس حکم کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے، اور ابن جریر طبریؒ نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے، اس معاملے میں روایاتِ حدیث قولی اور عملی، تلاوت سے پہلے اکثر حالات میں اعوذ باللہ پڑھنے کی اور بعض حالات میں نہ پڑھنے کی یہ سب ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے شروع میں مبسوط ذکر کی ہیں۔

مسئلہ :۔ نماز میں تعوّذ (یعنی اعوذ باللہ) صرف پہلی رکعت کے شروع میں پڑھا جائے یا ہر رکعت کے شروع میں، اس میں ائمۂ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں پڑھنا چاہئے، اور امام شافعیؒ ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں، دونوں کے دلائل تفسیر مظہری میں مبسوط لکھے گئے ہیں (ص ۳۹ ج ۵)

مسئلہ :۔ تلاوتِ قرآن نماز میں ہو یا خارج نماز دونوں صورتوں میں تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے، مگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو آگے جتنا پڑھتا رہے وہی ایک تعوّذ کافی ہے، البتہ تلاوت کو درمیان میں چھوڑ کر کسی دنیوی کام میں مشغول ہوگیا اور پھر دوبارہ شروع کیا، تو اس وقت دوبارہ تعوّذ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ :۔ تلاوتِ قرآن کے علاوہ کسی دوسرے کلام یا کتاب پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں، وہاں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہئے، (درمختار، شامی)

البتہ مختلف اعمال اور حالات میں تعوّذ کی تعلیم حدیث میں منقول ہے، مثلاً جب کسی کو غصہ زیادہ آئے تو حدیث میں ہے کہ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنے سے شدتِ غضب فرو ہوجاتی ہے (ابن کثیر)

نیز حدیث میں ہے کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ، پڑھنا مستحب ہے (شامی)

اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل شیطانی تسلط سے نجات کا راستہ ہے

اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو برائی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار و قدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور رہا، اسی لئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال و اعمال میں اپنی قوت ارادی کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچانے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراضِ نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اُسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا، اور ہر برائی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

یہی مضمون سورۂ حجر کی آیت کا ہے جس میں شیطان کے دعوے کے مقابلہ میں خود حق تعالیٰ نے یہ جواب دیدیا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ، "یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا ہاں اس پر ہوگا جو خود ہی گمراہ ہو اور تیرا اتباع کرنے لگے"۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کہتے ہیں تُو تو

اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ

بنا لاتا ہے یہ بات نہیں، پر اکثروں کو اُن میں خبر نہیں، تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک

الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّ

فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلا شبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور

بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ

خوشخبری مسلمانوں کے واسطے، اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو سکھلاتا ہے،

بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ

ایک آدمی، جس کی طرف تعریض کرتے ہیں اس کی زبان ہے عجمی اور یہ قرآن زبان

عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿١٠٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ

عربی ہے صاف ، وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں ان کو اللہ راہ

اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا

نہیں دیتا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے ، جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾

نہیں اللہ کی باتوں پر اور وہی لوگ جھوٹے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات اس سے پہلی آیت میں تلاوتِ قرآن کے وقت اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت تھی، جس میں اشارہ ہے کہ شیطان تلاوت کے وقت انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، مذکورہ آیات میں اسی طرح کے وساوس شیطانی کا جواب ہے۔

نبوت پر کفار کے شبہات کا جواب مع تہدید اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک آیت کو لفظاً یا معنیً منسوخ کرکے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیجدیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالےٰ جو حکم (پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ) بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے (کہ جن کو حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی، پھر حالت بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہوگئی) تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ (خدا پر) افترا کرنے والے ہیں (کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا۔ اور یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ بعض اوقات سب حالات کا علم ہونے کے باوجود پہلی حالت پیش آنے پر پہلا حکم دیا جاتا ہے اور دوسری حالت پیش آنے کا اگرچہ اس وقت بھی علم ہے مگر بتقاضائے مصلحت اس دوسری حالت کا حکم اس وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ جب وہ حالت پیش آجاتی ہے اس وقت بیان کیا جاتا ہے، جیسے طبیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال سے حالت بدلے گی، اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر مریض کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں بتلاتا، یہی حقیقت نسخِ احکام کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے، جو حقیقت سے واقف نہیں وہ باغوائے شیطانی نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفتری نہیں) بلکہ انہی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ احکام میں نسخ کو بلا کسی دلیل کے کلام الٰہی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں) آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں احکام کی تبدیلی بمقتضائے حکمت و مصلحت ہو اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تاکہ ایمان والوں کو (ایمان پر) ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری (کا ذریعہ) ہو جائے (اس کے بعد کفار کے ایک اور لغو شبہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی روم کا باشندہ لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مقیس تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جی لگا کر سنتا تو حضورؐ کبھی اس کے پاس جا بیٹھتے اور وہ کچھ انجیل وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات چلتی کی کہ یہی شخص حضورؐ کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، کذا فی الدر المنثور، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو مجموعہ الفاظ و معانی کا نام ہے تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم عربی زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمھیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالفرض قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آ گئی، کیونکہ جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے۔ (کوئی عجمی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی ہوگی تو اس کا واضح جواب اس تحدّی (چیلنج) سے پوری طرح ہو چکا ہے جو سورۃ بقرہ میں آ چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذنِ خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دیا تھا، کہ اگر تمھارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہو تو تم بھی انسان ہو اور بڑی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجودے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان و مال قربان کرنے کو تیار تھا، مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے بعد منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں پر وعید و تہدید ہے کہ) جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ آپ کو مفتری کہتے ہیں) جھوٹ افترا کرنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ
جو کوئی منکر ہوا اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا

مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا
دل برقرار ہے ایمان پر ولیکن جو کوئی دل کھول منکر ہوا

فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ
سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے، یہ

بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ
اس واسطے کہ انھوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى
رستہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو، یہ وہی ہیں کہ مہر کردی اللہ نے ان کے

قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
دل پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اور یہی ہیں بے ہوش،

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں کفر بالرسول اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں)، مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے (کہ اگر تو کفر کا فلاں کلام یا فلاں قول نہیں کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کردیں گے مثلاً اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں)، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور بُرا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمۂ کفر یا فعلِ کفر میں مبتلا ہوجانا ایک عذر کی بنا پر ہے، اس لئے جو وعید ارتداد کی آگے آرہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں)، لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کفر کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور

ان کو بڑی سزا ہوگی (اور) یہ (غضب و عذاب) اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو (جو دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں بلکہ مجموعہ سبب ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ عزم فعل کے بعد عادۃ اللہ یہ ہے کہ خلق فعل ہوتا ہے جس پر صدور فعل مرتب ہوتا ہے، یہاں استحبوا سے عزم اور لایہدی سے خلق کی طرف اشارہ ہے، اور اس مجموعہ پر فعل قبیح کا صدور مرتب ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ (دنیا میں ان کے اصرار علی الکفر کی حالت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھاٹے میں رہیں گے۔

معارف ومسائل

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ اگر یہ کلمہ نہ کہے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور یہ بھی بظن غالب معلوم ہو کہ دھمکی دینے والے کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے تو ایسے اکراہ کی حالت میں اگر وہ زبان سے کلمۂ کفر کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو اور اس کلمہ کو باطل اور برا جانتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگی (قرطبی و مظہری)

یہ آیت اُن صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ یا وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات حضرت عمار اور ان کے والدین یاسر اور سمیہ اور صہیب اور بلال اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسرؓ اور ان کی زوجہ سمیہ رضی اللہ عنہا نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسرؓ کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو دوڑایا گیا، جس سے اُن کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو کر شہید ہوئیں، اور یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح حضرت خبابؓ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمارؓ نے جان کے خوف سے زبانی اقرار کفر کا کر لیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب یہ دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج و غم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمھارے دل کا کیا حال تھا، انھوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن

کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپؐ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی و مظہری)

اکراہ کی تعریف و تحدید | اکراہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔

دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مسلوب الاختیار اور مجبور محض کر دے، ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (مظہری)

مسئلہ: معاملات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری ہے، جیسے خرید و فروخت و ہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملہ کے لئے شرط ہے بنص قرآن اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ، یعنی کسی دوسرے شخص کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو"، اور حدیث میں ہے:

لَا يَحِلُّ مَالُ امۡرِءٍ مُّسۡلِمٍ اِلَّا بِطِيۡبِ نَفۡسٍ مِّنۡهُ	"یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو"

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرا لئے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضا سے باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے، دل

کا قصد و ارادہ یا رضا و خوشی شرط معاملہ نہیں، مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ، ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے، ثلٰث جدّهن جدّ وھزلهن جدّ النکاح والطلاق والرجعۃ، رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ (یعنی اگر دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہوجائے گا، اور طلاق پڑجائے گی، نیز رجعت صحیح ہوجائے گی (مظہری)

امام اعظم ابوحنیفہ، شعبی، زہری، نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق مکرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ حالتِ اکراہ میں اگرچہ وہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظِ طلاق کہہ دیئے، اور وقوعِ طلاق کا تعلق صرف الفاظِ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد و ارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیثِ مذکور سے ثابت ہے، اس لئے یہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

مگر امام شافعی اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک حالتِ اکراہ کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں ہے:

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ، رواہ الطبرانی عن ثوبانؓ	"یعنی میری امت سے خطاء اور نسیان اور جس چیز پر ان کو مضطر و مجبور کر دیا جائے سب اٹھا دیئے گئے"

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حدیث احکامِ آخرت کے متعلق ہے، کہ خطاء یا نسیان سے یا اکراہ کی حالت میں جو کوئی قول و فعل شریعت کے خلاف کرلیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، باقی رہے احکامِ دنیا اور وہ نتائج جو اس فعل پر مرتب ہو سکتے ہیں ان کا وقوع تو محسوس و مشاہد ہے، اور دنیا میں اس وقوع پر جو آثار و احکام مرتب ہوتے ہیں وہ ہو کر رہیں گے، مثلاً کسی نے کسی کو خطاءً قتل کر دیا تو اس کو قتل کا گناہ اور آخرت کی سزا تو بے شک نہ ہوگی، مگر جس طرح قتل کا محسوس اثر مقتول کی جان کا چلا جانا واقع ہے اسی طرح اس کا یہ شرعی اثر بھی ثابت ہوگا کہ اس کی بیوی عدت کے بعد نکاحِ ثانی کر سکے گی، اس کا مال وراثت میں تقسیم ہوجائے گا، اسی طرح جب الفاظِ طلاق یا نکاح یا رجعت زبان سے ادا کر دیئے تو ان کا شرعی اثر بھی ثابت ہوجائے گا (مظہری وقرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جٰهَدُوا

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انھوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ مصیبت اٹھائی پھر جہاد کرتے

وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۱۰﴾ يَوْمَ تَأْتِي

رہے اور قائم رہے بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے ، جس دن آئے گا

كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ

ہر جی جواب سوال کرتا اپنی طرف سے اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کمایا اور ان پر

لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۱۱﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً

ظلم نہ ہوگا ، اور بتلائی اللہ نے ایک مثال ایک بستی تھی ، چین

مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ

امن سے چلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے پھر ناشکری کی اللہ کے

اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۱۲﴾

احسانوں کی پھر چکھایا اس کو اللہ نے مزہ کہ انکے تن کے کپڑے ہوگئے بھوک اور ڈر بدلہ اس کا جو وہ کرتے تھے ،

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَاَخَذَهُمُ

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آپکڑا ان کو

الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُونَ ﴿۱۱۳﴾

عذاب نے اور وہ گنہگار تھے ۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتداد کا کفر، اس کے بعد کی مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں قیامت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ جزاء و سزا سب قیامت کے بعد ہی ہونے والی ہے، تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا کہ کفر و معاصی کی اصلی سزا تو قیامت کے بعد

ہی ملے گی، مگر بعض گناہوں کی سزا، دنیا میں بھی کچھ مل جاتی ہے، تینوں آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:۔
پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آویں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے
کہ جنھوں نے مبتلاء کفر ہونے کے بعد (ایمان لاکر) ہجرت کی پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر) قائم
رہے تو آپ کا رب (ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت
کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہوجاویں گے
اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے، کفر سے پہلے کے
گناہ تو صرف ایمان سے معاف ہوجاتے ہیں، جہاد وغیرہ اعمالِ صالحہ شرط معافی نہیں لیکن
اعمالِ صالحہ درجاتِ جنت ملنے کے اسباب ہیں، اس لئے اس کے ساتھ ذکر کردیا گیا)

اور یہ جزاء وسزاء مذکور اس روز واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری
میں گفت گو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی
نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، گو اللہ کی رحمت سے زیادتی ہوجانے کا امکان ہے اور بدی کے بدلے
میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہوجاوے، یہی مطلب ہے اس کا
کہ) اُن پر ظلم نہ کیا جاوے گا (اس کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ کفر و معصیت کی پوری سزا
حشر کے بعد ہوگی، مگر کبھی دنیا میں بھی اس کا وبال عذاب کی صورت میں آجاتا ہے) اور اللہ
تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں رہتے
تھے (اور) ان کے کھانے پینے پہننے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس
پہونچا کرتی تھیں (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ) انھوں نے خدا کی نعمتوں
کی بے قدری کی (یعنی کفر و شرک اور معصیت میں مبتلا ہوگئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان
کی حرکتوں کے سبب سے ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال و دولت کی فراوانی سلب
ہوکر قحط اور بھوک میں مبتلا ہوگئے، اور دشمنوں کا خوف مسلط کرکے ان کی بستیوں کا
امن و اطمینان بھی سلب کرلیا) اور (اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں کی گئی
بلکہ اوّل اس کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے) ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھی (منجانب
اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال خود اپنی قوم میں ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح
معلوم تھا) سو اس (رسول) کو (بھی) انھوں نے جھوٹا بتایا تب ان کو عذاب نے آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی
ظلم پر کمر باندھنے لگے ۞

معارف و مسائل

آخری آیت میں بھوک اور خوف کا مزہ چکھانے کے لئے لفظ لباس استعمال فرمایا کہ لباس بھوک اور خوف کا ان کو چکھایا گیا، حالانکہ لباس چکھنے کی چیز نہیں، مگر یہاں لباس کا لفظ محیط اور ہمہ گیر ہونے کے لئے تشبیہاً استعمال ہوا ہے، کہ یہ بھوک اور خوف اُن سب کے سب پر ایسا چھا گیا کہ جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم ملزوم ہو جاتا ہے، یہ بھوک اور خوف بھی ان پر اسی طرح مسلّط کر دیئے گئے۔

یہ مثال جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک تو عام مثال ہے، کسی خاص بستی سے اس کا تعلق نہیں، اور اکثر حضرات نے اس کو مکہ مکرمہ کا واقعہ قرار دیا کہ وہ سات سال تک شدید قحط میں مبتلا رہے، کہ مردار جانور اور کتے اور غلاظتیں کھانے پر مجبور ہو گئے، اور مسلمانوں کا خوف اُن پر مسلّط ہو گیا، پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کفر و نافرمانی کے قصوروار تو مرد ہیں، عورتیں، بچے تو بے قصور ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مدینہ طیبہ سے کھانے وغیرہ کا سامان بھجوا دیا۔ (مظہری)

اور ابو سفیان نے بحالتِ کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تو صلہ رحمی اور عفو و درگذر کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعاء کیجئے کہ یہ قحط ہم سے دُور ہو جائے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعاء فرمائی اور قحط ختم ہوا (قرطبی)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کو پوجتے ہو، اللہ نے تو یہی حرام کیا ہے تم پر مُردار اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

لہو اور سُوَر کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور مت کہو اپنی زبانوں کے

تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا

جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

بہتان باندھو، بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا

لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى

بھلا نہ ہوگا، تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے، اور جو

الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا

لوگ یہودی ہیں ان پر حرام کیا تھا جو تجھ کو پہلے سنا چکے، اور ہم نے

ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ

ان پر ظلم نہیں کیا پر وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے، پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب

لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ

ان لوگوں پر جنھوں نے برائی کی نادانی سے پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور

اَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع

سنوارا اپنے آپ کو، سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۵ ع ۹ ۲۱

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیت میں اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اول تو مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ ناشکری نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے جو حلال نعمتیں ان کو دی ہیں ان کو شکر کے ساتھ استعمال کریں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی ایک خاص صورت یہ بھی اختیار کر رکھی تھی کہ بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حلال کیا تھا، اپنی طرف سے ان کو حرام کہنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ نے حرام کہا تھا ان کو حلال کہنے لگے، مسلمانوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسا نہ کریں، کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا صرف اس ذات کا حق ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے اپنی طرف سے ایسا کرنا خدائی اختیارات میں دخل دینا اور اللہ تعالیٰ پر افترا کرنا ہے،

آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے جہالت سے اس طرح کے جرائم کئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر وہ توبہ کرلیں اور صحیح ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیں گے، مختصر تفسیر آیات کی یہ ہے:-

سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال اور پاک دی ہیں ان کو (حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جاہلانہ رسم ہے بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو، تم پر تو (منجملہ اُن چیزوں کے جن کو تم حرام کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے) صرف مُردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے نامزد کردیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (مارے فاقہ کے) بالکل بے قرار ہو جاوے، بشرطیکہ طالبِ لذت نہ ہو، اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے اگر وہ ان چیزوں کو کھالے) بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے، اور جن چیزوں کے متعلق محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، (اور اس پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں) اُن کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ربع کے قریب آیات وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے، (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں یا صرف آخرت میں) یہ (دنیا میں) چند روزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) اُن کے لئے دردناک سزا ہے اور (یہ مشرکین ملتِ ابراہیمی کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں، جن کو انھوں نے حرام قرار دیدیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد اُن اشیاء میں سے) صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم اس کے قبل (سورۂ انعام میں) آپ سے کرچکے ہیں (اور ان کی تحریم میں بھی) ہم نے اُن پر (صورۃً بھی) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کرکے) زیادتی کیا کرتے تھے (تو معلوم ہوا کہ اشیاء طیبہ کو بالقصد تو کبھی حرام نہیں کیا گیا اور شریعتِ ابراہیمی میں کسی وقتی ضرورت کی وجہ سے بھی نہیں ہوئی پھر یہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا)۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے بُرا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کرلیا پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کرلئے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

معارف ومسائل

محرماتِ مذکورہ میں حصر اضافی ہے حقیقی نہیں اس آیت میں لفظ اِنَّمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں جو آیت میں مذکور ہیں، اور اس سے زیادہ صریح طور پر آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا الآیۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں، حالانکہ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق باجماعِ امت اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ عام حرام وحلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشرکین جاہلیت نے جو بہت سی چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا ان کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ تمھاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرّمات کے احکام کا مفصل بیان سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں "معارف القرآن" جلد اوّل صفحہ ۳۵۸ سے صفحہ ۳۷۰ تک آچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

توبہ سے گناہ کی معافی عام ہے خواہ بے سمجھی سے کرے یا جان بوجھ کر آیت ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ میں لفظ جہل نہیں بلکہ جہالت استعمال فرمایا ہے، جہل تو علم کے بالمقابل آتا ہے اور بے علمی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور جہالت کا لفظ جاہلانہ حرکت کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہوگیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ مقید نہیں۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ

کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

راہ پر، اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں

لِمَنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ

اچھے لوگوں میں ہے ، پھر حکم بھیجا تجھ کو ہم نے کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ

اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں ، ہفتہ کا دن جو مقرر کیا سو انہی پر جو اس

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

میں اختلاف کرتے تھے ، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اختلاف کرتے تھے ۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات پچھلی آیات میں اصولِ شرک وکفر یعنی انکار توحید وانکار رسالت پر رَد اور کفر و شرک کے بعض فروع ، یعنی تحلیلِ حرام اور تحریم حلال پر ردّ و ابطال کی تفصیل تھی ، اور مشرکین مکہ جو قرآن کریم کے پہلے اور بلا واسطہ مخاطب تھے ، اپنے کفر و بت پرستی کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی کے پابند ہیں ، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ہیں ، اس لئے مذکورہ چار آیتوں میں ان کے اس دعوے کی تردید اور انہی کے مسلّمات سے ان کے جاہلانہ خیالات کا ابطال اس طرح کیا گیا کہ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام اقوامِ عالم کا مسلّم مقتدا ہونا بیان فرمایا ، جو نبوّت و رسالت کا اعلیٰ مقام ہی، اس سے ان کا عظیم الشان نبی و رسول ہونا ثابت ہوا ، اس کے ساتھ ہی مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا ۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گذار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرما کر ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو ؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب وبامراد ہونا اور چوتھی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صحیح ملتِ ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرما کر یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا ۔

پانچویں آیت اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ میں اشارۃً یہ بیان فرمایا کہ ملتِ ابراہیمی میں اشیاء طیبہ حرام نہیں تھیں، جن کو تم نے خود اپنے اوپر حرام کرلیا ہے، مختصر تفسیر آیاتِ مذکورہ کی یہ ہے :-

بیشک ابراہیم (علیہ السلام جن کو تم بھی مانتے ہو) بڑے مقتدا (یعنی نبی اولوالعزم اور اُمّتِ عظیمہ کے متبوع و مقتدا) اللہ تعالیٰ کے (پورے) فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو، اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے، (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکرگذار تھے (پھر تم شرک و کفر میں مبتلا ہو کر ناشکری کیوں کرتے ہو، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کرلیا تھا اور ان کو سیدھے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثل نبوت و رسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی (اعلیٰ درجہ کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور وہ طریقہ اب منحصر ہے طریقہ محمدیہ میں، جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے چلئے (اور چونکہ اس زمانہ کے وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے مکرر فرمایا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے موجودہ طریقہ پر بھی رَد ہو جائے جو شرک سے خالی نہیں، اور چونکہ یہ لوگ تحریم طیبات کی جاہلانہ و مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، اس لئے فرمایا کہ) بس ہفتہ کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت جو تحریم طیبات کی ایک فرد ہے وہ تو) صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنھوں نے اس میں (عملاً) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے مانا اور عمل کیا، کسی نے اس کے خلاف کیا، مراد اس سے یہود ہیں، کہ تحریم طیبات کی یہ صورت مثل دوسری صورتوں کے صرف یہود کے ساتھ مخصوص تھی، ملتِ ابراہیمی میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں، آگے احکام الٰہیہ میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملاً) فیصلہ کر دے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

معارف و مسائل

لفظ اُمّت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں، اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک امت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں، اور ایک معنی لفظ امت کے مقتدائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور قانت کے معنی تابع فرمان کے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور آپ کی ملت کے اتباع کو عزت و فخر جانتے ہیں، یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، مشرکین عرب بت پرستی کے باوجود اس بت شکن کے معتقد اور ان کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں، اور قانت و مطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گذرے ہیں، آتش نمرود، اہل و عیال کو لق و دق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوؤں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی قربانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ملت ابراہیمی کا اتباع حق تعالیٰ نے جو شریعت و احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی، اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو مفضول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں،

اول تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے، اور معلوم و معروف ہو چکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے بقول علامہ زمخشری یہ حکم اتباع بھی منجملہ اکرام و اعزاز خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے، اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ ثُمَّ سے اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل و کمالات ایک طرف اور ان سب پر فائق یہ کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے افضل رسول و حبیب کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم فرمایا۔

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم

بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ

دے ان کو جس طرح بہتر ہو تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا اس کی راہ سے

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم

اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو راہ پر ہیں ، اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف

بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ

پہنچائی جائے ، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو ، اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے

إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾

اللہ ہی کی مدد سے اور نہ اُن پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے ،

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

اللہ ساتھ ہے اُن کے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں ۔

۱۶ ع ۹ ۲۲

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات سے مقصود یہ تھا کہ اُمت آپ کے احکام کی تعمیل کرکے رسالت کے حقوق ادا کریں، مذکورہ آیات میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادائے رسالت کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے، جس کے عموم میں تمام مؤمنین شریک ہیں، مختصر تفسیر یہ ہے :-

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بُلائیے (حکمت سے وہ طریقۂ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو سکے، اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے بات کہی جائے، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو، دل خراش توہین آمیز نہ ہو) اور اُن کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو وہ بھی شدت اور خشونت سے اور مخاطب پر الزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے، بس اتنا کام آپ کا ہے، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیئے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور (اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی جدال اور ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو بدلہ لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی پس) اگر (پہلی صورت اختیار کرو یعنی)

بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمھارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو) اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجر عظیم ہی) اور (صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ) آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیق خاص سے ہے (اس لئے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپ کو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہوجیے (ان کی مخالف تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو احسان اور تقویٰ کی صفات حاصل ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار رہتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں ۔

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے اصول اور مکمل نصاب

اس آیت میں دعوت و تبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سموئی ہوئی ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم ابن حیانؒ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیے، تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۃ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں، کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دعوۃ کے لفظی معنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بُلانا ہے، پھر تمام تعلیماتِ نبوت و رسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں، قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے، وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب ۴۶) يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ (احقاف ۳۱)

اُمت پر بھی آپؐ کے نقشِ قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۰۴)	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوتِ دین (یعنی) نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے روکیں۔

اور ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ	"گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہو سکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا"

تعبیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی دعوت الی الخیر کا اور کبھی دعوت الی سبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہی ہے، کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دین اور صراطِ مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ ، اس میں اللہ جل شانہ کی خاص صفت رَبّ ، اور پھر اُس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفتِ ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ جل شانہ، نے آپؐ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے، جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کر کے وہ طرز اختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تاثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہونچا دینا اور سُنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا، جس سے مخاطب کو وحشت و نفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا گیا ہو۔

بِالْحِكْمَةِ ، لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن کریم بعض نے قرآن وسنت بعض نے حجتِ قطعیہ کو قرار دیا ہے، اور رُوح المعانی نے بحوالہ بحر محیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے :

انها الكلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع (رح)	"یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اُتر جائے"

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں، اور صاحبِ رُوح البیان نے بھی تقریباً یہی مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحۃً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو۔

اَلْمَوْعِظَةُ، موعظۃ اور وعظ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو ایسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و فوائد اور نہ کرنے کے عذاب و مفاسد ذکر کئے جائیں (قاموس و مفردات راغب)

اَلْحَسَنَةُ کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے شکوک و شبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کرے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

مَوْعِظَةٌ کے لفظ سے خیر خواہی کی بات مؤثر انداز میں کہنا تو واضح ہو گیا تھا، مگر خیر خواہی کی بات بعض اوقات دل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی اہانت محسوس کرے (روح المعانی) اس طریقہ کو چھوڑنے کے لئے لفظ حسنہ کا اضافہ کر دیا گیا۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، لفظ جادل، مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقہ سے ہونا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں تاکہ مخاطب کے شکوک دور ہوں، اور وہ ہٹ دھرمی کے رستہ پر نہ پڑ جائے، اور قرآن کریم کی دوسری آیات اس پر شاہد ہیں، کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے، وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو قَوْلًا لَّهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

دعوت کے اصول و آداب

آیت مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اول حکمت، دوسرے موعظۂ حسنہ، تیسرے مجادلہ بالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بناء پر ہیں، دعوت بالحکمۃ، اہل علم و فہم کے لئے، دعوت بالموعظۃ، عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں شکوک و شبہات ہوں، یا جو عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاق آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے، انتہی،

ظاہر یہ ہے کہ یہ آدابِ دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے ہیں، کہ دعوت میں سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے لانا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرزِ بیان و کلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصلحت اور خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں، مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

البتہ صاحبِ رُوح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ دعوت اصل میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، تیسری چیز مجادلہ، اصولِ دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریقِ دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحبِ روح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اصولِ دعوت ہوتیں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عطف کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا، بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ والجدال الاحسن، مگر قرآن حکیم نے حکمت و موعظت کو تو عطف کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اختیار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم دراصل دعوت الی اللہ کا رکن یا شرط نہیں بلکہ طریقِ دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریقِ دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصولِ دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء و خواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑجاتا ہے جو شکوک و اوہام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثہ پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کی قید لگا کر بتلا دیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب

دعوت الی اللہ دراصل انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے، اُمّت کے علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں، جو دعوت اُن طریقوں پر نہ رہے وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ و جدال کا موجب ہو جاتی ہے۔

دعوتِ پیغمبرانہ کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے لئے نقل کی گئی ہے کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى "یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے" یہ ہر داعیِ حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علمِ الٰہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتار کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں، آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر ہادی و داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب سے سخت کلامی کریں اس پر فقرے کسیں، اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعنہ زنی کرنیوالوں کے جواب میں کوئی ثقیل کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:۔

سورۂ اعراف کے ساتویں رکوع میں آیات ۵۹ سے ۶۷ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت سست الزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طولِ عمر دنیا میں مشہور ہے، ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بدبخت قوم میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کا کوئی مدعیِ دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس کا لب ولہجہ کیسا ہوتا، اندازہ لگائیے، پھر دیکھئے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیرخواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اعراف)	"ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں"

ادھر سے اللہ کے پیغمبر بجائے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں کا پردہ چاک کرتے جواب میں کیا فرماتے ہیں:۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	"میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں میں تو رب العٰلمین کا رسول اور قاصد ہوں (تمہارے فائدہ کی باتیں بتلاتا ہوں)"

ان کے بعد آنے والے دوسرے اللہ کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے معجزات دیکھنے کے باوجود ازراہِ عناد کہا کہ آپ نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی، اور ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں (بتوں) کو چھوڑنے والے نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کی شان میں بے ادبی کی ہے، اس کی وجہ سے تم جنون میں مبتلا ہو گئے ہو حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ سُن کر جواب دیا:

اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ

"یعنی میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اُن بتوں سے بَری اور بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک مانتے ہو (سورۂ ہودؑ)

اور سورۂ اعراف میں ہے کہ ان کی قوم نے اُن کو کہا:۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (اعراف)

"ہم تو آپ کو بیوقوفی میں مبتلا سمجھتے ہیں، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں"

قوم کے اس دل آزار خطاب کے جواب میں اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نہ ان پر کوئی فقرہ کستے ہیں، نہ اُن کی بے راہی اور کذب وافتراء علی اللہ کی کوئی بات کہتے ہیں، جواب کیا ہے صرف یہ کہ:۔

یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (اعراف)

"اے میری برادری کے لوگو! مجھ میں کوئی بے وقوفی بالکل نہیں، میں تو رب العٰلمین کا رسول ہوں"

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو حسب دستور انبیاء اللہ کی طرف دعوت دی اور ان میں جو بڑا عیب ناپ تول میں کمی کرنے کا تھا اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو ان کی قوم نے تمسخر کیا، اور توہین آمیز خطاب کیا:۔

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ۝

"اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، اور یہ کہ جن اموال کے ہم مالک ہیں ان میں اپنی مرضی کے موافق جو چاہیں نہ کریں، واقعی آپ ہیں بڑے عقلمند دین پر چلنے والے"

انھوں نے ایک تو یہ طعنہ دیا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو یہی تمہیں بے وقوفی کے کام سکھاتی ہے دوسرے یہ کہ مال ہمارے ہیں، اُن کی خرید و فروخت کے معاملات میں تمھارا یا خدا کا کیا دخل ہو، ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کا حق رکھتے ہیں، تیسرا جملہ تمسخر و استہزا رکا یہ کہا کہ آپ ہیں بڑے عقلمند بہت دین پر چلنے والے۔

معلوم ہوا کہ یہ لادینی معاشیات کے پجاری صرف آج نہیں پیدا ہوئے ان کے بھی کچھ اسلاف ہیں جن کا نظریہ وہی تھا جو آج کے بعض نام کے مسلمان کہہ رہے ہیں، کہ ہم مسلمان ہیں اسلام کو مانتے ہیں، مگر معاشیات میں ہم سوشلزم کو اختیار کرتے ہیں، اس میں اسلام کا کیا دخل ہے، بہرحال اس ظالم قوم کے اس مسخرے پن اور دل آزار گفتگو کا جواب اللہ کا رسول کیا دیتا ہے، دیکھئے :-

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ؁ (سورۂ ھود، آیت ۸۸)

"اے میری قوم! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمدہ دولت یعنی نبوت دی ہو تو پھر میں کیسے اس کی تبلیغ نہ کروں، اور میں خود بھی تو اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتا، جو تمہیں بتلاتا ہوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو جو کچھ اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور تمام امور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کے وقت جو نرم گفتار کی ہدایت منجانب اللہ دی گئی تھی اس کی پوری تعمیل کرنے کے باوجود فرعون کا خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تھا:

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ؁ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ؁ (سورۂ شعراء)

"فرعون کہنے لگا (آہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا، اور تم اس عمر میں برسوں ہمارے پاس رہا سہا کئے، اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناشکرے ہو"

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلایا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہے، پھر یہ احسان بھی جتلایا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدّت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبطی بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا اس پر غصّہ و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں کافروں میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو احسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ فرعون خود خدائی کا دعویدار تھا، تو جو اس کی خدائی کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنئے، جو پیغمبرانہ آدابِ دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو اُن سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبطی کو ہٹانے کے لئے ایک مُکّا اس کے مارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گو یہ قتل عمداً ارادۃً نہیں تھا، مگر کوئی دینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعتِ موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اعتراف فرمایا:-

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (سورۂ شعراء)	"یعنی میں نے یہ کام اُس وقت کیا تھا، جبکہ میں ناواقف تھا"

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطاءِ نبوّت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا، جب کہ مجھے اس بارہ میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ (سورۂ شعراء)	"پھر مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی، اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں شامل کر دیا"

پھر اس کے احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتانا صحیح نہیں، کیونکہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم و عدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہونچنے کی نوبت آئی، فرمایا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ	(رہا احسان جتلانا پرورش کا) سو یہ

عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ○ (سورۂ شعراء)	وہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہو کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال رکھا تھا "

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، یعنی رب العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور استہزاء کے حاضرین سے کہا اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ، یعنی تم سن رہے ہو کہ یہ کیسی بے عقلی کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ ○	"یعنی تمھارا اور تمھارے باپ دادوں کا بھی وہی رب پروردگار ہے "

اس پر فرعون نے جھنجلا کر کہا:

اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○	"یعنی یہ جو تمھاری طرف اللہ کے رسول ہونے کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے "

مجنون دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا، اور اپنا عاقل ہونا ثابت کرتے اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العٰلمین کی ایک اور صفت بیان فرمادی:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَہُمَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○	"وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو"

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے، جو سورۂ شعراء کے تین رکوع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کو اوّل سے آخر تک دیکھئے، نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلمہ ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلہ میں کئے گئے ہیں، اور مجادلہ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہے۔

مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان و تعبیر میں حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں، اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور پائیدار بنانے کے لئے جو طرزِ عمل

اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی رُوح ہے، اس کی تفصیلات تو تمام تعلیمات نبوی علیہ السلام میں پھیلی ہوئی ہیں، نمونے کے طور پر چند چیزیں دیکھئے:

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بار نہ ہونے پائے، صحابۂ کرام جیسے عشاقِ رسولؐ جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپؐ کی باتیں سننے سے اُکتا جائیں گے، اُن کے لئے بھی آپؐ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اُکتا نہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا (صحیح بخاری، کتاب العلم)	"لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو، اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سُناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ ربانی، حکماء، علماء اور فقہاء بنو، صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ربّانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے وہ عالم ربانی ہے، آجکل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی سُبکی یا رُسوائی نہ ہو، اسی لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور بُرے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے

مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَّفْعَلُوْنَ كَذَا	"لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں کام کرتے ہیں"

اس عام خطاب میں جس کو سُنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سُن لیتا، اور دل میں شرمندہ

ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۂ یٰسین میں ہے وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ، یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں"۔ ظاہر ہے کہ یہ قاصدِ رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سُنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغولِ عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا نہیں، اور یہ بُلانا اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر یٰقَوْمِ سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے جتلا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے، کہ ہم تم تو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہرقل شاہِ روم کے نام بھیجا، اس میں اوّل تو شاہ روم کو "عظیم الروم" کے لقب سے یاد فرمایا، جس میں اس کا جائز اکرام ہے، کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لئے اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ، (سورۂ آل عمران)	"اے اہل کتاب! اس کلمہ کی طرف جلدی سے آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے"۔

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطۂ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اسی طرح کے آداب و اصول ملیں گے، آجکل اوّل تو دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انھوں نے صرف بحث و مباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقرے کسنے اور اس کی تحقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلافِ سنّت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے

اسلام کی بڑی خدمت کی، اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

مروجہ مجادلات کی دینی اور دنیوی مضرتیں

آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصودِ شرع دعوت الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں، حکمت اور موعظت حسنہ، مجادلہ کی صورت کبھی سر آپڑے تو اس کے لئے بھی احسن کی قید لگا کر اجازت دیدی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تدبیر ہے جس میں قرآن کریم نے بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلا دیا ہے کہ وہ نرمی، خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائلِ واضحہ مخاطب کے مناسبِ حال بیان کرنا چاہئے مخاطب کی توہین و تحقیر سے کلّی اجتناب کرنا چاہئے، اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود متکلم کے لئے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاقِ رذیلہ حسد، بغض، تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہ کبیرہ ہیں، اور آجکل کے بحث و مباحثہ مناظرہ، مجادلہ میں شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پائے تو ممکن ہے ورنہ عادۃً ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جس طرح شراب اُمّ الخبائث ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ میں جب مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنا علمی تفوّق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کیلئے اُمّ الخبائث ہے، جس کے نتیجہ میں بہت سے رُوحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اُس کی بُرائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبولِ حق سے استکبار، دوسرے کے قول پر انصاف و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب دہی کی فکر، خواہ اس میں قرآن و سنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء ہی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین میں پہونچتا ہے تو دست و گریبان اور جنگ و جدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، اِنّا للہ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:۔

"علم تو اہلِ علم و فضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتۂ اخوت و برادری) ہے، تو وہ لوگ جنھوں نے علم ہی کو عداوت بنا لیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے مذہب کی اقتداء کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، اُن کے پیشِ نظر دوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر اُن سے باہمی انس و مودّت اور مروّت کا تصور کیسے کیا کیا جا سکتا ہے، اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور بُرائی اور

کیا ہو گی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کر دے، اور مومنین متقین کے اخلاق سے محروم کر دے"۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ علم دین اور دعوتِ حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصولِ صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادتِ ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوتِ ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَالِمٌ لَّمْ یَنْفَعْہُ اللّٰہُ بِعِلْمِہٖ

"سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو"

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاھُوْا بِہِ الْعُلَمَآءَ وَلِتُمَارُوْا بِہِ السُّفَھَآءَ وَلِتَصْرِفُوْا بِہٖ وُجُوْہَ النَّاسِ اِلَیْکُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَھُوَ فِی النَّارِ (ابن ماجہ من حدیث جابر باسناد صحیح کذا فی الاحیاء للغزالی)

"علم دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں فخر و عزت حاصل کرو یا کم علم لوگوں سے جھگڑے کرو یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرلو اور جو ایسا کرے گا وہ آگ میں ہے"

اسی لئے ائمہ فقہاء اور اہل حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے، دعوتِ حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطاء پر سمجھے اس کو نرمی اور خیرخواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطاء پر متنبہ کر دے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلی احتراز کرے، حضرت امام مالکؒ کا ارشاد ہے:-

کَانَ مَالِکٌ یَقُوْلُ الْمِرَآءُ وَالْجِدَالُ فِی الْعِلْمِ یَذْھَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ وَقِیْلَ لَہٗ رَجُلٌ لَّہٗ عِلْمٌ بِالسُّنَّۃِ فَھَلْ یُجَادِلُ عَنْھَا قَالَ لَا وَلٰکِنْ یُّخْبِرُ بِالسُّنَّۃِ فَاِنْ قُبِلَ مِنْہُ وَاِلَّا سَکَتَ (اوجز المسالک شرح مؤطا ص ۱۵ ج ۱)

"امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نور علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو گیا وہ حفاظتِ سنت کیلئے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے"

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہوگئے ہیں، اور قبولِ حق کی توفیق کم ہوگئی ہے، اور بعض تو اس قہر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اُوندھے ہو جائیں گے، بھلے بُرے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اُٹھ جائے گا۔

اور دوسرا سبب یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوتِ حق کے فرائض سے غفلت عام ہوگئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر خواص علماء وصلحاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اپنے اعمال درست کرلئے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ اُن کی اولاد، بیوی، بھائی، دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ ہر شخص کے ذمہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ اور پھر اگر کچھ لوگ دعوت و اصلاح کے فریضہ کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوتِ پیغمبرانہ کے اصول و آداب سے ناآشنا ہیں، بے سوچے سمجھے جس کو جس وقت جو چاہا کہہ ڈالا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور احکامِ دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقیص اور استہزاء و تمسخر تک پہونچ جاتے ہیں، حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:

"جس شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگر تم نے اس کو تنہائی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے، اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو رسوا کیا تو یہ فضیحت ہے"

آجکل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں تک دعوت کے اصول اور آداب کا بیان ہوا، اس کے بعد فرمایا:

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ یہ جملہ داعیانِ دین کی تسلّی کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مذکور الصدر آدابِ دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری

ہو جائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے، اس لئے اس جملے میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو صولِ صحیحہ کے مطابق ادا کر دینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے نہ آپ کی ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہمت نہ ہاریں مایوس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا تکملہ ہے۔

داعی حق کو کوئی ایذا پہونچائے تو بدلہ لینا بھی جائز ہی مگر صبر بہتر ہے

اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم ہدایت ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے سخت دل جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور خیر خواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہو جاتے ہیں، زبان درازی کر کے ایذا پہونچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کر کے ان کو جسمانی تکلیف پہونچانے بلکہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس کے لئے وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ الخ میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیا گیا کہ جو آپ پر ظلم کرے آپ کو بھی اس سے اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقدارِ ظلم سے تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اُتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔

اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہے لیکن صبر کریں اور انتقام نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیات مذکورہ کا شانِ نزول اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کی طرف سے تعمیلِ حکم

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوۂ اُحد میں ستر صحابہ کی شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مُثلہ کرنے کے واقعہ میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے بروایت ابن عباس رضؓ نقل کیا ہے کہ:

"غزوۂ اُحد میں جب مشرکین لوٹ گئے تو صحابۂ کرام میں سے ستر اکابر کی لاشیں سامنے آئیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہؓ بھی تھے، چونکہ مشرکین کو اُن پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد اُن کی لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان، اور دوسرے اعضاء کاٹے گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ پہنچا، اور آپؐ نے فرمایا کہ میں حمزہؓ کے بدلے میں مشرکین کے ستر آدمیوں کا اسی طرح مُثلہ کروں گا، جیسا انھوں نے حمزہؓ کو کیا ہے، اس واقعہ میں یہ تین آیات

نازل ہوئیں، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ الخ (تفسیر قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ دوسرے حضرات صحابہ کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ مُثلہ کرنے کا کیا تھا۔

(کمار واہ الترمذی واحمد وابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحہا عن ابی بن کعبؓ)

اس میں چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ غم سے بلا لحاظ تعداد ان صحابہ کے بدلے میں ستر مشرکین کے مُثلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ کے نزدیک اس اصول عدل ومساوات کے مطابق نہ تھا جس کو آپ کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مقدار اور پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلا لحاظ تعداد چند کا بدلہ ستر سے لینا درست نہیں، دوسرے آپ کو مکارم اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ نصیحت کی گئی کہ برابر سرابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور مجرموں پر احسان کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا (مظہری عن البغوی) فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے قبضہ میں تھے، یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم وارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ اُحد کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل اختیار کیا گیا، شاید اسی بناء پر بعض روایات میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرر ہوا ہو، اول غزوۂ اُحد میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں (کما حکاہ المظہری عن ابن الحصار)

مسئلہ: اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا جو کسی کا ہاتھ یا پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل کر ڈالے تو ولیِ مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ یا پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔

البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیتِ قتل کی صحیح مقدار متعین نہیں کی جا سکتی کہ کتنی ضربوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملہ میں حقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو تلوار ہی سے قتل کیا جائے گا (جصاص)

مسئلہ : آیت کا نزول اگرچہ جسمانی تکالیف اور جسمانی نقصان پہونچانے کے متعلق ہوا ہے مگر الفاظ عام ہیں جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی سے اس کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے، یا چوری کر کے لیلے بشرطیکہ جو مال لیا ہو وہ اپنے حق کی جنس سے ہو مثلاً نقد روپیہ لیا ہو تو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقد روپیہ اس سے غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلّہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلّہ کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے، خواہ جنسِ حق سے ہو یا کسی دوسری جنس سے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیلی بحث کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ میں عام قانون مذکور تھا جس میں سب مسلمانوں کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز مگر صبر کرنا افضل و بہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین و ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپ کی شانِ عظیم اور منصبِ بلند کے لئے دوسروں کی نسبت سے وہی زیادہ موزوں و مناسب ہے، اس لئے فرمایا وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ، یعنی آپ تو انتقام کا ارادہ ہی نہ کریں، صبر ہی کو اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ آپ کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوگا، یعنی صبر کرنا آپ کے لئے آسان کر دیا جائے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حاصل ہونے کا یہ بتلا دیا :-

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو دو صفتوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ دوسرے احسان، تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور احسان کا مفہوم اس جگہ خلقِ خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں، حق تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معیّت (نصرت) حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے :

الحمد للہ سورۂ نحل کی تفسیر آج ۲۵ رشعبان ۱۳۸۹ھ شب شنبہ میں پوری ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا۔

سُورۂ نحل تمام شد

سُورَۃ بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡل

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْل

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّةٌ وَّهِیَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰی عَشْرَةَ اٰیَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا

سورہ بنی اسرائیل مکہ میں اُتری اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد

الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ

حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

دکھلائیں اسکو کچھ اپنی قدرت کے نمونے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں، چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے۔ غرض اُس مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائباتِ قدرت دکھلا دیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کرلینا اور سب انبیاء سے ملاقات کرنا اور اُن کی باتیں سننا وغیرہ اور بعض آگے کے متعلق ہیں۔ مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں کے

عجائبات کا مشاہدہ کرنا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب اُن کو یہ خاص امتیاز اور اعزاز بخشا اور اپنے قرب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہیں ملا)

معارف و مسائل

اس آیت میں واقعہ معراج کا بیان ہے جو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خصوصی اعزاز اور امتیازی معجزہ ہے لفظ اَسْرٰی اسراء سے مشتق ہے جسکے لغوی معنی رات کو لیجانا ہیں اس کے بعد لَيْلًا کے لفظ سے صراحۃً بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا اور لفظ لَيْلًا کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس تمام واقعہ میں پوری رات بھی صرف نہیں بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے۔ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسراء کہتے ہیں اور یہاں سے سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے اسراء اس آیت کی نص قطعی سے ثابت ہے اور معراج کا ذکر سورۂ نجم کی آیات میں ہے اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے بِعَبْدِهٖ اس مقام اعزاز واکرام میں لفظ بِعَبْدِهٖ ایک خاص محبوبیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرما دیں کہ یہ میرا بندہ ہے اس سے بڑھ کر کسی بشر کا بڑا اعزاز نہیں ہوسکتا حضرت حسن دہلوی نے خوب فرمایا ہے

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ توام   تو بزبان خود بگو بندہ نواز کیستی

یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک دوسری آیت میں عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ فرما کر اپنے مقبولان بارگاہ کا اعزاز بڑھانا مقصود ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبد کامل بن جائے اسلئے کہ خصوصی اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفتِ عبدیت کو اختیار کیا گیا اور اس لفظ سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی مقصود ہے کہ اس حیرت انگیز سفر سے جسمیں اول سے آخر تک سب خرق العادت معجزات ہی ہیں کسی کو خدائی کا وہم نہ ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے اس لئے لفظ عَبْدٌ کہکر یہ بتلا دیا کہ ان تمام صفات و کمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے ہی ہیں خدا نہیں۔

معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن وسنت کے دلائل اور اجماع قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے جنکا ذکر آگے آتا ہے ثابت ہے کہ اسراء و معراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سُبْحٰنَ میں اسطرف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کونسی عجیب بات ہے خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا فلاں

فلاں کام کیجئے۔

دوسرا اشارہ لفظ عَبۡد سے اسی طرف ہے کیونکہ عَبۡد صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ۔

واقعہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ ہانی رضؓ کو بتلایا تو انھوں نے حضورؐ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفارِ مکہ نے تکذیب کی اور مذاق اڑایا یہاں تک کہ بعض نو مسلم اس خبر کو سنکر مُرتد ہو گئے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے اور بعد میں کوئی معراج روحانی بصورتِ خواب بھی ہوئی ہو جمہور امت کے نزدیک آیت قرآن وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِيۡٓ اَرَيۡنٰكَ میں رُءۡيَا سے مراد رویت ہے مگر اس کو بلفظ رُءۡيَا (جو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر رُؤیا کہا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رؤیا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پیچھے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ ام المومنین رضؓ سے جو اس کا واقعہ خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسراء کی متواتر ہیں اور نقاش نے بیس صحابہ کرام کی روایات اس باب میں نقل کی ہیں اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور زیادہ تفصیل دی ہے۔ (قرطبی)

اور امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری جرح و تعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے پھر پچیس صحابہ کرام کے اسماء ذکر کئے ہیں جن سے یہ روایات منقول ہیں ان کے اسماء یہ ہیں۔ حضرت عمر[1] ابن خطاب علی[2] مرتضیٰ ابن مسعود[3]۔ ابوذر[4] غفاری۔ مالک[5] بن صعصعہ۔ ابوہریرہ[6]۔ ابوسعید[7]۔ ابن عباس[8] شداد[9] بن اوس۔ ابی[10] بن کعب۔ عبدالرحمٰن[11] بن قرظ۔ ابوحبہ[12]۔ ابو[13]لیلیٰ۔ عبداللہ[14] بن عمر۔ جابر[15] بن عبداللہ حذیفہ[16] بن یمان۔ بریدہ[17]۔ ابوایوب[18] انصاری۔ ابوامامہ[19]۔ سمرہ[20] بن جندب۔ ابوالحمراء[21]۔ صہیب[22] الرومی ام ہانی[23]۔ عائشہ[24] ام المومنین۔ اسماء[25] بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے بعد ابن کثیر نے فرمایا۔

فَحَدِيۡثُ الۡاِسۡرَاۤءِ اَجۡمَعَ عَلَيۡهِ الۡمُسۡلِمُوۡنَ وَاَعۡرَضَ عَنۡهُ الزَّنَادِقَةُ وَالۡمُلۡحِدُوۡنَ۔ (ابن کثیر)	واقعہ اسراء کی حدیث پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے صرف ملحد و زندیق لوگوں نے اس کو نہیں مانا۔

مختصر واقعۂ معراج ابن کثیرؒ کی روایت سے

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیثِ متعلقہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفرِ اسراء بیداری میں پیش آیا خواب میں نہیں، مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا، جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا جسمیں نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے اُس زینہ کے ذریعہ آپ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زینہ کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا آجکل بھی زینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں ایسے زینے بھی ہیں جو خود حرکت میں لفٹ کی صورت کے زینے بھی ہیں اس معجزانہ زینہ کے متعلق کسی شک وشبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں) ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپکا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پھر آپ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں قلم تقدیر کے لکھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جس پر اللہ جل شانہٗ کے حکم سے سونے کے پروانے اور مختلف رنگ کے پروانے گر رہے تھے اور جسکو اللہ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا اسی جگہ حضرت جبرئیل امین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی اصلی شکل میں دیکھا جن کے چھ سو بازو تھے اور وہیں پر ایک رفرف سبز رنگ کا دیکھا جسنے افق کو گھیرا ہوا تھا۔ رفرف مسند سبز، ہرے رنگ کی پالکی اور آپ نے بیت المعمور کو بھی دیکھا جسکے پاس بانیٔ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار سے کمر لگائے بیٹھے ہوئے تھے اس بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جنکی باری دوبارہ داخل ہونے کی قیامت تک نہیں آتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بچشم خود معائنہ فرمایا۔ اس وقت آپ کی اُمت پر اوّل پچاس نمازوں کے فرض ہونے کا حکم ملا پھر تخفیف کر کے پانچ کر دیگئیں، اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ واپس بیت المقدس میں اُترے اور جن انبیاء علیہم السلام کیساتھ مختلف آسمانوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی آپ کے ساتھ اترے (گویا آپکو رخصت کرنے کے لئے بیت المقدس تک ساتھ آئے اس وقت آپ نے نماز کا وقت ہو جانے پر سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا کیونکہ

آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعہ میں یہ منقول ہے کہ سب انبیاء سے جبرئیل امین نے آپکا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہو چکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور یوں بھی ظاہر یہی ہے کہ اس سفر کا اصل مقصد ملاء اعلیٰ میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے پھر جب اس اصل کام سے فراغت ہوئی تو تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے ساتھ مشایعت (رخصت) کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپ کو جبرئیل امین کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت اور سب پر فضیلت کا عملی ثبوت دیا گیا۔

اس کے بعد آپ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہو کر اندھیرے وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

واقعہ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابونعیم اصبہانی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں محمد بن عمر واقدیؒ کی سند سے بروایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نامۂ مبارک دیکر حضرت دحیہ ابن خلیفہ رضؓ کو بھیجا اس کے بعد حضرت دحیہ رضؓ کے خط پہونچانے اور شاہ روم تک پہونچنے اور اس کے صاحب عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا۔ (جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے جسکے آخر میں ہے کہ شاہِ روم ہرقل نے نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے شاہ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جنکی تفصیل صحیح بخاری وسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادہ سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جسکا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں۔ البتہ مجھے اسوقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جسکا جھوٹ ہونا

ــــہ واقدیؒ کو روایت حدیث میں محدثین نے ضعیف کہا ہے لیکن امام ابن کثیر جیسے محتاط محدث نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے اسلئے کہ اس معاملہ کا تعلق عقائد یا حلال و حرام سے نہیں اور ایسے تاریخی معاملات میں انکی روایت معتبر ہے۔ ۱۲۔ منہ

بادشاہ خود سمجھ لیگا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کر لینگے کہ وہ جھوٹ ہے۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

ایلیار (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سرہانے پر قریب کھڑا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپکو اسکا علم کیسے اور کیونکر ہوا اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اسوقت تک سوتا نہیں تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کر دئے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا تو میں نے اپنے عملہ کے لوگوں کو بلایا انھوں نے ملکر کوشش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہو سکا دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں میں نے عاجز ہو کر کاریگروں اور نجاروں کو بلوایا۔ انھوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازہ کی عمارت کا بوجھ پڑ گیا ہے اب صبح سے پہلے اس کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جاوے۔ میں مجبور ہو کر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روزن کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھا گیا ہے اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس لئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپ نے ہماری مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں (ابن کثیر صـ۲۳ ج ۳)

اسراء و معراج کی تاریخ

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ معراج کی تاریخ میں روایات بہت مختلف ہیں موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا اور حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ام المومنینؓ کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا واقعہ بعثت نبوی کے سات سال بعد ہوا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ واقعہ معراج بعثت نبوی سے پانچ سال بعد میں ہوا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعہ معراج ہجرت مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حربی کہتے ہیں کہ واقعہ اسراء و معراج ربیع الثانی کی ستائیسویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے اور ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ حضرات

محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور عام طور پر یہ ہے کہ ماہ رجب کی ستائیسویں شب، شب معراج ہے واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

مسجد حرام اور مسجد اقصٰی

حضرت ابوذر غفاری رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ "مسجد حرام" پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کونسی تو آپ نے فرمایا "مسجد اقصٰی" میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے تو آپ نے فرمایا چالیس سال پھر فرمایا کہ مسجدوں کی ترتیب تو یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنادیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں نماز ادا کرلیا کرو۔ (رواہ مسلم)

امام تفسیر مجاہد رح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر تک پہنچی ہوئی ہیں اور مسجد اقصٰی کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے (رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمر رضؓ) (تفسیر قرطبی ص۱۳۷ ج ۴)

اور مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہوجاتا ہے کہ بعض روایات میں آپکا اسراء کے لئے تشریف لیجانا حضرت ام ہانی کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے اگر مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ کچھ مستبعد نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی رضؓ کے مکان میں ہوں وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے سفر اسراء کی ابتدا ہوئی واللہ اعلم۔

مسجد اقصٰی اور ملک شام کی برکات

آیت میں بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ میں حَوْلَ سے مراد پوری زمین شام ہے ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اسمیں سے فلسطین کی زمین کو تقدس خاص عطا فرمایا ہے (روح المعانی)

اس کی برکات دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ دینی برکات تو یہ ہیں کہ وہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن و مدفن ہے اور دنیوی برکات اسکی زمین کا سرسبز ہونا اور اسمیں عمدہ چشمے، نہریں باغات وغیرہ کا ہونا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ملک شام تو تمام شہروں میں سے میرا منتخب خطہ ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو پہونچاؤں گا۔ (قرطبی)

اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ دجال ساری زمین میں پھر یگا مگر چار مسجدوں تک اس کی رسائی نہ ہوگی۔

مسجد مدینہ، مسجد مکہ مکرمہ۔ مسجد اقصیٰ۔ مسجد طور۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اُس کو ہدایت بنی اسرائیل

اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴿۲﴾

کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کارساز

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا

تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ بے شک وہ تھا بندہ

شَكُوْرًا ﴿۳﴾

حق ماننے والا۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی اور ہم نے اُس کو بنی اسرائیل کے لئے (آلہ) ہدایت بنایا (جس میں اور احکام کے ساتھ یہ توحید کا عظیم الشان حکم بھی تھا) کہ تم میرے سوا (اپنا) کوئی کارساز مت قرار دو، اے اُن لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (ہم تم سے خطاب کر رہے ہیں تاکہ اس نعمت کو یاد کرو کہ اگر ہم اُن کو کشتی پر سوار کر کے نہ بچاتے تو آج تم اُن کی نسل کہاں ہوتے اور نعمت کو یاد کر کے اس کا شکر کرو جس کی بڑی فرد توحید ہے اور) وہ نوح (علیہ السلام) بڑے شکر گذار بندہ تھے (پس جب انبیاء شکر کرتے رہے تو تم کیسے اُس کے تارک ہو سکتے ہو۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ

اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے

فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴﴾ فَاِذَا

ملک میں دو بار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی پھر جب

جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ

آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی

شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا

والے پھر پھیل پڑے شہروں کے بیچ اور وہ وعدہ

مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ

ہونا ہی تھا پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری اُن پر اور قوت دی تم کو

بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ

مال سے اور بیٹوں سے اور اُس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر اگر بھلائی کی تم نے

اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ

تو بھلا کیا اپنا اور اگر بُرائی کی تو اپنے لئے پھر جب پہنچا

وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسٗۗـــٴُـوْا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ

وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اُداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں

كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷

جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ

بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر اور اگر پھر وہی کروگے تو ہم پھر وہی کریں گے اور

جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸

کیا ہے ہم نے دوزخ کو قیدخانہ کافروں کا۔

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں (خواہ توریت میں یا دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں) یہ بات (بطور پیشین گوئی کے) بتلا دی تھی کہ تم سرزمین (شام) میں دو مرتبہ (گناہوں کی کثرت سے) خرابی کروگے (ایک مرتبہ شریعتِ موسویہ کی مخالفت اور دوسری مرتبہ شریعتِ عیسویہ کی مخالفت) اور دوسروں پر بھی بڑا زور چلانے لگوگے (یعنی ظلم و زیادتی کروگے

اس طرح لَتُفْسِدُنَّ میں حقوق اللہ کے ضائع کرنے کی طرف اور لَتَعْلُنَّ میں حقوق العباد ضائع کرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی بتلا دیا تھا کہ دونوں مرتبہ سخت سزاؤں میں مبتلا کئے جاؤ گے، پھر جب ان دو مرتبہ میں سے پہلی مرتبہ کی میعاد آئے گی تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے پھر وہ (تمہارے) گھروں میں گھس پڑیں گے (اور تم کو قتل و قید اور غارت کر دیں گے) اور یہ (وعدہ سزا) ایک وعدہ ہے جو ضرور ہو کر رہے گا پھر (جب تم اپنے کئے پر نادم و تائب ہو جاؤ گے) تو ہم پھر اُن پر تمہارا غلبہ کر دیں گے (گو بواسطہ سہی کہ جو قوم ان پر غالب آئے گی وہ تمہاری حامی ہو جائے گی اس طرح تمہارے دشمن اس قوم سے اور تم سے دونوں سے مغلوب ہو جائیں گے) اور مال اور بیٹوں سے (جو کہ قید اور غارت کئے گئے تھے) ہم تمہاری امداد کریں گے (یعنی یہ چیزیں تمکو واپس مل جائیں گی جن سے تمہیں قوت پہونچے گی) اور ہم تمہاری جماعت (یعنی تابعین) کو بڑھا دیں گے (پس جاہ و مال اور اولاد و متبعین سب میں ترقی ہوگی اور اس کتاب میں بطور نصیحت یہ بھی لکھا تھا کہ، اگر (اب آئندہ) اچھے کام کرتے رہوگے تو اپنے ہی نفع کے لئے اچھے کام کروگے (یعنی دنیا و آخرت میں اس کا نفع حاصل ہوگا) اور اگر (پھر) تم برے کام کروگے تو بھی اپنے ہی لئے (برائی کروگے یعنی پھر سزا ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا جسکا آگے بیان ہے کہ) پھر جب (مذکورہ دو مرتبہ کے فساد میں سے) آخری مرتبہ کا وقت آئے گا (اور اس وقت تم شریعت عیسویہ کی مخالفت کروگے) تو پھر ہم دوسروں کو تم پر مسلط کر دیں گے تاکہ (وہ تمہیں مار مار کر) تمہارا چہرہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ (پہلے) لوگ مسجد (بیت المقدس) میں (لوٹ مار کے ساتھ) گھسے تھے یہ (پچھلے لوگ بھی) اس میں گھس پڑیں گے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب کو (ہلاک و) برباد کر ڈالیں۔ (اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس دوسری مرتبہ کے بعد جب دور شریعت محمدیہ کا ہو تم مخالفت و معصیت سے باز آکر شریعت محمدیہ کا اتباع کرلو تو) عجب نہیں (یعنی امید بمعنی وعدہ ہے) کہ تمہارا رب تم پر رحم فرماوے (اور تم کو ادبار و ذلت سے نکال دے) اور اگر تم پھر وہی (شرارت) کروگے تو ہم بھی پھر وہی (سزا کا برتاؤ) کریں گے (چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انھوں نے آپ کی مخالفت کی تو پھر قتل و قید اور ذلیل ہوئے یہ تو دنیا کی سزا ہوگئی) اور (آخرت میں) ہم نے جہنم کو (ایسے) کافروں کا جیلخانہ بنا ہی رکھا ہے۔

ربط آیات

اس سے پہلی آیات جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ میں احکام شرعیہ اور ہدایاتِ الٰہیہ کے اتباع و اطاعت کی ترغیب تھی اور مذکور الصدر آیات میں ان کی مخالفت سے ترہیب و زجر کا مضمون ہے ان آیات میں بنی اسرائیل کے دو واقعے عبرت و نصیحت کے لئے ذکر کئے گئے کہ انھوں نے ایک مرتبہ معاصی اور حکم ربانی کی مخالفت میں انہماک کیا تو اللہ تعالیٰ نے انکے دشمنوں کو اُن پر مسلط کر دیا جنھوں نے ان کو تباہ کیا پھر ان کو کچھ تنبیہ ہو گئی اور شرارت

کم کر دی تو سنبھل گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی شرارتیں اور بداعمالیاں انمیں پھیل گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُن کے دشمن کے ہاتھ سے سزا دلائی قرآن کریم میں دو واقعوں کا ذکر ہے مگر تاریخ میں اسطرح کے چھ واقعات مذکور ہیں۔

پہلا واقعہ | حضرت سلیمان علیہ السلام بانی مسجد اقصیٰ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد پیش آیا کہ بیت المقدس کے حاکم نے بے دینی اور بدعملی اختیار کر لی تو مصر کا ایک بادشاہ اس پر چڑھ آیا اور بیت المقدس کا سامان سونے چاندی کا لوٹ کرلے گیا مگر شہر اور مسجد کو منہدم نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ | اس سے تقریباً چارسو سال بعد کا ہے کہ بیت المقدس میں بسنے والے بعض یہودیوں نے بت پرستی شروع کر دی اور باقیوں میں نااتفاقی اور باہمی جھگڑے ہونے لگے اسکی نحوست سے پھر مصر کے کسی بادشاہ نے ان پر چڑھائی کر دی اور کسی قدر شہر اور مسجد کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا پھر انکی حالت کچھ سنبھل گئی۔

تیسرا واقعہ | اسکے چند سال بعد جب بُخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر کو فتح کر کے بہت سامال لوٹ لیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کرلے گیا اور پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے قائمقام کی حیثیت سے اس شہر کا حاکم بنا دیا۔

چوتھا واقعہ | اس نئے بادشاہ نے جو بت پرست اور بدعمل تھا بخت نصر سے بغاوت کی تو بخت نصر دوبارہ چڑھ آیا اور کشت وخون اور قتل وغارت کی کوئی حد نہ رہی شہر میں آگ لگا کر میدان کر دیا یہ حادثہ تعمیر مسجد سے تقریباً چار سو پندرہ سال کے بعد پیش آیا اس کے بعد یہودی یہاں سے جلا وطن ہو کر بابل چلے گئے جہاں نہایت ذلت وخواری سے رہتے ہوئے ستر سال گذر گئے اس کے بعد شاہ ایران نے شاہ بابل پر چڑھائی کر کے بابل فتح کر لیا پھر شاہ ایران کو ان جلا وطن یہودیوں پر رحم آیا اور انکو واپس ملک شام میں پہنچا دیا اور ان کا لوٹا ہوا سامان بھی واپس کر دیا۔ اب یہود اپنے اعمال بد اور معاصی سے تائب ہو چکے تھے یہاں نئے سرے سے آباد ہوئے تو شاہ ایران کے تعاون سے پھر مسجد اقصیٰ کو سابق نمونہ کے مطابق بنا دیا۔

پانچواں واقعہ | یہ پیش آیا کہ جب یہود کو یہاں اطمینان اور آسودگی دوبارہ حاصل ہو گئی تو اپنے ماضی کو بھول گئے اور پھر بدکاری اور بداعمالی میں منہمک ہو گئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سو ستر سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس بادشاہ نے انطاکیہ آباد کیا تھا اس نے چڑھائی کر دی اور چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا چالیس ہزار کو قیدی اور غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور مسجد کی بھی بہت بے حرمتی کی مگر عمارت مسجد کی بچ گئی مگر پھر اس بادشاہ کے جانشینوں نے شہر اور مسجد کو بالکل میدان کر دیا اس کے کچھ عرصہ کے بعد بیت المقدس پر سلاطین روم کی حکومت ہو گئی انھوں نے مسجد کو پھر درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

چھٹا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صعود اور رفع جسمانی کے چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے اپنے حکمران سلاطین روم سے بغاوت اختیار کر لی رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کو تباہ کر کے وہی حالت بنا دی جو پہلے تھی اس وقت کے بادشاہ کا نام طیطس تھا جو نہ یہودی تھا نہ نصرانی کیونکہ اس کے بہت روز کے بعد قسطنطین اوّل عیسائی ہوا ہے اور اس کے بعد سے حضرت عمر بن خطاب رضؓ کے زمانہ تک یہ مسجد ویران پڑی رہی، یہاں تک کہ آپ نے اس کی تعمیر کرائی۔ یہ چھ واقعات تفسیر بیان القرآن میں بحوالہ تفسیر حقانی لکھے گئے ہیں۔

اب یہ بات کہ قرآن کریم نے جن دو واقعوں کا ذکر کیا ہے وہ ان میں سے کون سے ہیں اس کی قطعی تعیین تو مشکل ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ انہیں سے جو واقعات زیادہ سنگین اور بڑے ہیں جنمیں یہود کی شرارتیں بھی زیادہ ہوئیں اور سزا بھی سخت ملی اُن پر محمول کیا جائے اور وہ چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے۔ تفسیر قرطبی میں یہاں ایک طویل حدیث مرفوع بروایت حذیفہ رضؓ نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تعیین ہوتی ہے کہ ان دو واقعوں سے مراد چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے اس طویل حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت حذیفہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظیم القدر مسجد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دنیا کے سب گھروں میں ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے چاندی اور جواہرات یاقوت و زمرد سے بنایا تھا اور یہ اس طرح کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی تو حق تعالیٰ نے جنات کو اُن کے تابع کر دیا۔ جنات نے یہ تمام جواہرات اور سونے چاندی جمع کر کے ان سے مسجد بنائی۔ حضرت حذیفہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ پھر بیت المقدس سے یہ سونا چاندی اور جواہرات کہاں اور کس طرح گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہوگئے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر بادشاہ کو مسلط کر دیا جو مجوسی تھا اس نے سات سو برس بیت المقدس پر حکومت کی اور قرآن کریم میں آیت فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىہُمَا بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ سے یہی واقعہ مراد ہے۔ بخت نصر کا لشکر مسجد قدس میں داخل ہوا مردوں کو قتل اور عورتوں بچوں کو قید کیا اور بیت المقدس کے تمام اموال اور سونے چاندی جواہرات کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں میں بھر کر لے گیا اور اپنے ملک بابل میں رکھ لیا۔ اور سو برس تک ان بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح کی بامشقت خدمت ذلت کے ساتھ ان سے لیتا رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیا جس نے بابل کو فتح کیا اور باقیماندہ بنی اسرائیل کو بخت نصر کی قید سے آزاد کرایا اور جتنے اموال وہ

بیت المقدس سے لایا تھا وہ سب واپس بیت المقدس میں پہنچادیئے اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اگر تم پھر نافرمانی اور گناہوں کی طرف لوٹ جاؤ گے تو ہم بھی پھر قتل و قید کا عذاب تم پر لوٹا دیں گے آیت قرآن عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا سے یہی مراد ہے۔

پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس میں لوٹ آئے (اور سب اموال و سامان بھی قبضہ میں آگیا) تو پھر معاصی اور بداعمالیوں کی طرف لوٹ گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو مسلط کر دیا آیت فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ سے یہی مراد ہے شاہ روم نے ان لوگوں سے بری اور بحری دونوں راستوں پر جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل اور قید کیا اور پھر تمام ان اموال بیت المقدس کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں پر لاد کر لے گیا اور اپنے کنیسۃ الذہب میں رکھدیا یہ سب اموال ابھی تک وہیں ہیں اور وہیں رہیں گے یہاں تک کہ حضرت مہدیؑ پھران کو بیت المقدس میں ایک لاکھ ستر ہزار کشتیوں میں واپس لائیں گے اور اسی جگہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو جمع کر دیں گے۔ (الحدیث بطولہ رواہ القرطبی فی تفسیرہ)

بیان القرآن میں ہے کہ دو واقعے جنکا ذکر قرآن میں آیا ہے اس سے مراد دو شریعتوں کی مخالفت ہے پہلے شریعت موسوی کی مخالفت اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شریعت عیسویہ کی مخالفت ہے اس طرح پہلی مخالفت میں وہ سب واقعات درج ہو سکتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ واقعات کی تفصیل کے لئے آیات مذکورہ کی تفسیر دیکھئے۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر واقعات کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ وہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے دین و دنیا میں فائز المرام اور کامیاب رہیں گے اور جب کبھی دین سے انحراف کریں گے ذلیل و خوار کئے جاوینگے اور دشمنوں کافروں کے ہاتھوں ان پر مار ڈالی جائے گی اور صرف یہی نہیں کہ دشمن ان پر غالب ہو کر ان کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں بلکہ ان کے ساتھ ان کا قبلہ جو بیت المقدس ہے وہ بھی اس دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہے گا ان کے کافر دشمن مسجد بیت المقدس میں گھس کر اس کی بے حرمتی اور توڑ پھوڑ کریں گے یہ بھی بنی اسرائیل کی سزا ہی کا ایک جز ہوگا۔ قرآن کریم نے ان کے دو واقعے بیان فرمائے۔ پہلا واقعہ شریعت موسویہ کے زمانے کا ہے دوسرا شریعت عیسویہ کے زمانہ کا ان دونوں میں بنی اسرائیل نے اپنے وقت کی شریعت الٰہیہ سے انحراف کر کے سرکشی اختیار کی تو پہلے واقعہ میں ایک مجوسی کافر بادشاہ کو ان پر اور بیت المقدس پر مسلط کر دیا گیا جسنے تباہی مچائی اور دوسرے واقعہ میں ایک رومی بادشاہ کو

مسلط کیا جس نے ان کو قتل و غارت کیا اور بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا اسی کے ساتھ یہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے کہ دونوں مرتبہ جب بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں پر نادم ہو کر تائب ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ملک و دولت اور آل و اولاد کو بحال کر دیا۔

ان دونوں واقعات کے ذکر کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں اپنا ضابطہ بیان فرما دیا وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا یعنی اگر تم پھر نافرمانی اور سرکشی کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر اسی طرح کی سزا و عذاب تم پر لوٹا دیں گے یہ ضابطہ قیامت تک کے لئے ارشاد ہوا ہے اور اس کے مخاطب وہ بنی اسرائیل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے جس میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جس طرح پہلے شریعت موسویہ کی مخالفت سے اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت سے تم لوگ سزا و عذاب میں گرفتار ہوتے تھے اب تیسرا دور شریعت محمدیہ کا ہے جو قیامت تک چلیگا اس کی مخالفت کرنے کا بھی وہی انجام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان لوگوں نے شریعت محمدیہ اور اسلام کی مخالفت کی تو مسلمانوں کے ہاتھوں جلا وطن اور ذلیل و خوار ہوئے اور بالآخر انکے قبلہ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ فرق یہ رہا کہ پچھلے بادشاہوں نے ان کو بھی ذلیل و خوار کیا تھا اور ان کے قبلہ بیت المقدس کی بے حرمتی بھی کی تھی اب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو مسجد بیت المقدس جو صدیوں سے منہدم اور غیر آباد پڑی تھی اس کو از سر نو تعمیر کیا اور اس قبلہ انبیاء کے احترام کو بحال کیا۔

واقعات بنی اسرائیل مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں موجودہ واقعہ بیت المقدس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے بنی اسرائیل کے یہ واقعات قرآن کریم میں بیان کرنے اور مسلمانوں کو سنانے سے بظاہر مقصد یہی ہے کہ مسلمان بھی اس ضابطۂ الٰہیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دنیا و دین میں ان کی عزت و شوکت اور مال و دولت اطاعت خداوندی کے ساتھ وابستہ ہیں جب وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان کے دشمنوں اور کافروں کو ان پر غالب اور مسلط کر دیا جائے گا جن کے ہاتھوں ان کے معابد و مساجد کی بے حرمتی بھی ہوگی۔

آجکل جو حادثہ فاجعہ بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ کا اور پھر اس کو آگ لگانے کا سارے عالم اسلام کو پریشان کئے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی قرآنی ارشاد کی تصدیق ہو رہی ہے مسلمانوں نے خدا و رسول کو بھلایا آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی شان و شوکت میں لگ گئے اور قرآن و سنت کے احکام سے بیگانہ ہو گئے تو وہی ضابطہ قدرت الٰہیہ سامنے آیا کہ کروڑوں عربوں پر چند لاکھ یہودی غالب آ گئے انھوں نے ان کی جان و مال کو بھی نقصان پہنچایا اور شریعت اسلام کی رو سے دنیا کی تین عظیم الشان مسجدوں میں سے ایک جو تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے وہ ان

سے چھین لیا گیا اور ایک ایسی قوم غالب آگئی جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھی جاتی رہی ہے یعنی یہود۔ اس پر مزید یہ مشاہدہ ہے کہ وہ قوم نہ تعداد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ مسلمانوں کے مجموعی موجودہ سامان حرب کے مقابلہ میں انکی کوئی حیثیت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ واقعہ یہود کو کوئی عزت کا مقام نہیں دیتا البتہ مسلمانوں کے لئے ان کی سرکشی کی سزا ضرور ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری بداعمالیوں کی سزا کے طور پر ہوا اور اس کا علاج بجز اسکے کچھ نہیں کہ ہم پھر اپنی بداعمالیوں پر نادم ہو کر سچی توبہ کریں احکام الٰہیہ کی اطاعت میں لگ جائیں سچے مسلمان بنیں غیروں کی نقالی اور غیروں پر اعتماد کے گناہ عظیم سے باز آجائیں تو حسب وعدہ ربانی انشاء اللہ تعالیٰ بیت المقدس اور فلسطین پھر ہمارے قبضہ میں آئے گا مگر افسوس یہ ہے کہ آجکل کے عرب حکمران اور وہاں کے عام مسلمان ابتک بھی اس حقیقت پر متنبہ نہیں ہوئے وہ اب بھی غیروں کی امداد پر سہارا لگائے ہوئے بیت المقدس کی واپسی کے پلان اور نقشے بنا رہے ہیں. جسکا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

وہ اسلحہ اور سامان جس سے بیت المقدس اور فلسطین پھر مسلمانوں کو واپس مل سکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع، آخرت پر یقین، احکام شرعیہ کا اتباع اپنی معاشرت اور سیاست میں غیروں پر اعتماد اور ان کی نقالی سے اجتناب اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے خالص اسلامی اور شرعی جہاد ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عرب حکمرانوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمادیں۔

ایک عجیب معاملہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اپنی عبادت کے لئے دو جگہوں کو عبادت کرنے والوں کا قبلہ بنایا ہے ایک بیت المقدس دوسرا بیت اللہ مگر قانون قدرت دونوں کے متعلق الگ الگ ہے بیت اللہ کی حفاظت اور کفار کا اس پر غالب نہ آنا یہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذمہ لے لیا ہے اسیکا نتیجہ وہ واقعہ فیل ہے جو قرآن کریم کی سورۂ فیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ یمن کے نصرانی بادشاہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تو اللہ تعالیٰ نے معہ اس کے ہاتھیوں کی فوج کے بیت اللہ کے قریب تک جانے سے پہلے ہی پرندے جانوروں کے ذریعہ ہلاک و برباد کر دیا۔

لیکن بیت المقدس کے متعلق یہ قانون نہیں بلکہ آیات مذکورہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب مسلمان گمراہی اور معاصی میں مبتلا ہوں گے تو ان کی سزا کے طور پر ان سے یہ قبلہ بھی چھین لیا جائے گا اور کفار اس پر غالب آجائیں گے۔

کافر بھی اللہ کے بندے ہیں مگر اس کے مقبول نہیں مذکور الصدر پہلے واقعہ میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اہل دین فتنہ و فساد پر اتر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دینگے جو ان کے گھروں میں گھس کر ان کو قتل و غارت کریں گے اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عِبَادًا لَّنَا

فرمایا ہے عبادنا نہیں کہا حالانکہ وہ مختصر تھا حکمت یہ ہے کہ کسی بندہ کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف ہوجانا اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے جیسا کہ اسی سورۃ کے شروع میں اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کے تحت میں یہ بتلایا جاچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انتہائی اعزاز اور غایتِ قرب شب معراج میں نصیب ہوا قرآن نے اس واقعہ کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی یا کوئی صفت بیان کرنے کے بجائے صرف عَبْدِہٖ کہکر یہ بتلا دیا کہ انسان کا آخری کمال اور انتہائی اونچا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنا بندہ کہکر نوازیں آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی سزا کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو عِبَادَنَا کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے اضافت و نسبت کو توڑ کر عِبَادًا لَّنَآ فرمایا جسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت و اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاسکے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو

الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾

جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ اُن کے لئے ہے ثواب بڑا

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو اُن کے لئے تیار کیا ہے ہم نے عذاب

اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ

دردناک اور مانگتا ہے آدمی برائی جیسے مانگتا ہے بھلائی اور ہے

الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

انسان جلد باز۔

ع ۱

ربطِ آیات

شروع سورت میں معجزۂ معراج سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کا بیان تھا ان آیات میں معجزۂ قرآن سے اُسکا اثبات ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام) اور (اس طریقہ کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزاء وسزا بھی بتلاتا ہے کہ) اُن ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لئے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور (بعض) انسان (جیسے کفار ہیں، برائی (یعنی عذاب) کی ایسی دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کی دعا (کیجاتی ہے) اور انسان کچھ (کچھ طبعًا ہی) جلد باز (ہوتا) ہے۔

معارف ومسائل

طریق اقوم قرآن جس طریقہ کی ہدایت کرتا ہے اُس کو اقوم کہا گیا ہے اقوم کی تفسیر یہ ہے کہ وہ راستہ جو منزل مقصود تک پہونچانے میں قریب بھی ہو۔ آسان بھی ہو۔ خطرات سے خالی بھی ہو۔ (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ان تینوں اوصاف کے جامع ہیں اگرچہ انسان اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بعض اوقات اس راستہ کو دشوار یا پُرخطر سمجھنے لگے لیکن رب العالمین جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم رکھتا ہے اور ماضی و مستقبل اس کے سامنے یکساں ہے وہ ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ انسان کا نفع کس کام اور کس صورت میں زیادہ ہے اور خود انسان چونکہ مجموعی حالات سے واقف نہیں وہ اپنے بھلے بُرے کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکتا۔

شاید اسی مناسبت سے مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ انسان تو بعض اوقات جلد بازی میں اپنے لئے ایسی دعا مانگ لیتا ہے جو اس کے لئے تباہی و بربادی کا سبب ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کی ایسی دعا کو قبول فرمالیں تو یہ برباد ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ اکثر ایسی دعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ خود انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری یہ درخواست غلط اور میرے لئے سخت مضر تھی اور آیت کے آخری جملہ میں انسان کی ایک طبعی کمزوری کو بطور ضابطہ کے بھی ذکر فرمایا کہ انسان اپنی طبیعت سے ہی جلد باز واقع ہوا ہے سرسری نفع نقصان پر نظر رکھتا ہے انجام بینی اور عاقبت اندیشی میں کوتاہی کرتا ہے فوری راحت چاہے تھوڑی ہو اسکو بڑی اور دائمی راحت پر ترجیح دینے لگتا ہے اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں عام انسانوں کی ایک طبعی کمزوری کا بیان ہے۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے اس آیت کو ایک خاص واقعہ کے متعلق قرار دیا ہے وہ یہ کہ نضر بن حارث نے اسلام کی مخالفت میں ایک مرتبہ یہ دعا کر ڈالی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یعنی یا اللہ اگر آپ کے نزدیک یہ اسلام ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔ اس صورت میں انسان سے یہ خاص انسان یا جو اس کے ہم طبع ہوں مراد ہوں گے۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ

اور ہم نے بنائے رات اور دن دو نمونے پھر مٹا دیا رات کا نمونہ اور بنا دیا

اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا

دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو

عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿١٢﴾

گنتی برسوں کی اور حساب اور سب چیزیں سنائیں ہم نے کھول کر

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ

اور جو آدمی ہے لگا دی ہم نے اسکی بُری قسمت اُس کی گردن سے اور نکال دکھائیں گے اس کو

الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿١٣﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ

قیامت کے دن ایک کتاب کہ دیکھے گا اسکو کھلی ہوئی پڑھ لے کتاب اپنی تو ہی بس ہے

الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿١٤﴾ۭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ

آج کے دن اپنا حساب لینے والا جو کوئی راہ پر آیا تو آیا اپنے ہی بھلے کو

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ

اور جو کوئی بہکا رہا تو بہکا رہا اپنے ہی بُرے کو اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے

اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾

کا اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا، سو رات کی نشانی (یعنی خود رات) کو ہم نے دھندلا بنادیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا (کہ اس میں سب چیزیں بے تکلف دکھائی دیں) تاکہ (دن میں) اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور (رات اور دن کی آمد و رفت اور دونوں کے رنگ میں امتیاز کہ ایک روشن دوسرا اندھیرا ہے اور دونوں کی مقدار دن میں اختلاف سے) برسوں کا شمار اور (دوسرے چھوٹے چھوٹے) حساب معلوم کرلو (جیسا کہ سورۂ یونس کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے) اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (لوح محفوظ میں تو تمام کائنات کی مکمل تفصیل بغیر کسی استثناء کے ہے اور قرآن کریم میں تفصیل بقدرِ ضرورت ہے اس لئے یہ بیان دونوں کی طرف منسوب ہوسکتا ہے) اور ہم نے ہر (عمل کرنے والے) انسان کا عمل (نیک ہو یا بد) اس کے گلے کا ہار بنا رکھا ہے (یعنی ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ لازم و ملازم ہے) اور (پھر) قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے (دیکھنے کے) واسطے نکال کر سامنے کردیں گے جسکو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا (اور اس سے کہا جاویگا کہ لے) اپنا اعمال نامہ (خود) پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ تیرے اعمال کو کوئی دوسرا آدمی گنا دے بلکہ تو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھتا جا اور حساب لگاتا جا کہ تجھے کتنی سزا اور کتنی جزا ملنی چاہیئے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی عذاب سامنے نہیں آیا مگر وہ ٹلنے والا نہیں ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسان اپنے سب اعمال کو کھلی آنکھوں دیکھ لیگا، اور عذاب کی حجت اس پر قائم ہوجائے گی اور) جو شخص (دنیا میں سیدھی) راہ پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے (وہ اُس وقت اس کا خمیازہ بھگتے گا کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھادے گا (اور جس کسی کو کوئی سزا دیجاتی ہے وہ اس پر حجت تمام کرنے کے بعد دیجاتی ہے کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جبتک کسی رسول کو (اس کی ہدایت کے لئے) نہیں بھیج لیتے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں اوّل رات اور دن کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا اور پھر بتلایا کہ رات کو تاریک اور دن کو روشن کرنے میں بڑی حکمتیں ہیں۔ رات کے تاریک کرنے کی

حکمت تو اس جگہ بیان نہیں فرمائی۔ دوسری آیات میں مذکور ہے کہ رات کی تاریکی نیند اور آرام کے لئے مناسب ہے اور قدرت نے ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر انسان اور جانور کو اسی رات کی تاریکی میں نیند آتی ہے پورا عالم بیک وقت محو خواب ہوتا ہے اگر مختلف لوگوں کی نیند کے مختلف اوقات ہوتے تو جاگنے والوں کے شور و شغب اور کام کاج کی وجہ سے سونے والوں کی نیند بھی حرام ہو جاتی۔

اور دن کو روشن کرنے کی اس جگہ دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں اوّل یہ کہ دن کی روشنی میں آدمی اپنی روزی تلاش کر سکتا ہے محنت مزدوری صنعت و حرفت سب کے لئے روشنی کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ رات دن کی آمد و رفت سے سالوں اور برسوں کی تعداد معلوم کیجا سکے کہ تین سو ساٹھ دن پورے ہونے پر مثلاً ایک سال پورا ہوگیا۔

اسی طرح دوسرے سب حسابات بھی رات دن کی آمد و رفت سے متعلق ہیں اگر رات دن کا یہ اختلاف نہ ہو تو مزدوری کی مزدوری ملازم کی ملازمت معاملات کی میعادیں متعین کرنا سب مشکل ہو جائے گا۔

نامۂ اعمال گلے کا ہار ہونے کا مطلب

یہ ہے کہ انسان کسی جگہ کسی حال میں رہے اس کا صحیفۂ عمل اس کے ساتھ رہتا ہے اس کا عمل لکھا جاتا رہتا ہے جب وہ مرتا ہے تو بند کر کے رکھدیا جاتا ہے پھر قیامت کے روز یہ صحیفۂ عمل ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا کہ خود پڑھ کر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کرلے کہ وہ مستحق ثواب ہے یا مستحق عذاب حضرت قتادہؒ سے منقول ہے کہ اس روز بے پڑھا آدمی بھی نامۂ اعمال پڑھ لیگا۔ اس موقع پر اصبہانی نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض لوگوں کا نامۂ اعمال جب ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ دیکھے گا کہ اس کے بعض اعمال صالحہ اسمیں لکھے ہوئے نہیں ہیں تو عرض کرے گا کہ میرے پروردگار اسمیں میرے فلاں فلاں عمل درج نہیں ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا کہ ہم نے اُن اعمال کو اس لئے مٹا دیا کہ تم لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے (مظہری)

بعثتِ رسل کے بغیر عذاب نہ ہونے کی تشریح

اس آیت کی بنا پر بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک ان لوگوں کو کفر کے باوجود کوئی عذاب نہیں ہوگا جن کے پاس کسی نبی اور رسول کی دعوت نہیں پہنچی اور بعض ائمہ کے نزدیک جو اسلامی عقائد عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اس کی توحید وغیرہ ہیں جو لوگ اسکے منکر ہوں گے ان کو کفر پر عذاب ہوگا اگرچہ ان کو کسی نبی و رسول کی دعوت نہ پہنچی ہو البتہ عام معاصی اور گناہوں پر سزا بغیر دعوت و تبلیغ انبیاء کے نہیں ہوگی اور بعض حضرات نے اس جگہ رسول سے مراد عام لی ہے خواہ وہ رسول و نبی ہو خواہ انسانی عقل کہ وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ

کا رسول ہی ہے۔

اولاد مشرکین کو عذاب نہ ہوگا آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کے تحت تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین و کفار کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مرجائیں ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کے کفر سے وہ سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس مسئلہ میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا

اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیجدیا اُس کے عیش کرنے والوں کو پھر انھوں نے

فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ

نافرمانی کی اُس میں تب ثابت ہوگئی اُن پر بات پھر اکھاڑ مارا ہم نے ان کو اُٹھاکر اور بہت

اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ

غارت کردیئے ہم نے قرن نوح کے پیچھے اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہ

عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

جاننے والا دیکھنے والا۔

ربطِ آیات اس سے پہلی آیات میں اس کا بیان تھا کہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات نہ پہنچ جائیں اور پھر بھی وہ اطاعت نہ کریں اس وقت تک اُن پر عذاب نہیں بھیجتے مذکورہ آیات میں اس کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جب کسی قوم کے پاس رسول اور اللہ کے پیغام پہنچ گئے اور پھر بھی انھوں نے سرکشی سے کام لیا تو اس پر عذاب عام بھیجدیا جاتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ہم کسی بستی کو (جو اپنے کفر و نافرمانی کی وجہ سے بمقتضائے حکمتِ الٰہیہ ہلاک کرنے کے قابل ہو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو (اُسکو بعثتِ رسل سے پہلے ہلاک نہیں کرتے بلکہ پہلے کسی رسول کی معرفت) اس (بستی) کے خوش عیش (یعنی امیر و رئیس) لوگوں کو (خصوصاً اور دوسرے عوام کو عموماً ایمان و اطاعت کا) حکم دیتے ہیں پھر (جب) وہ لوگ (کہنا نہیں مانتے بلکہ) وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہوجاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں اور (اسی عادت کے موافق) ہم نے بہت سی

اُمتوں کو نوح (علیہ السلام) کے (زمانہ کے) بعد (اُن کے کفر و معصیت کے سبب) ہلاک کیا ہے (جیسے عاد و ثمود وغیرہ اور نوح علیہ السلام کی قوم کا غرق ہو کر ہلاک ہونا مشہور و معروف ہے اس لئے مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ پر اکتفا کیا گیا خود قوم نوح کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شروع سورت میں آیت ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ میں لفظ حَمَلْنَا سے طوفان نوح کی طرف اشارہ موجود ہے اس کو قوم نوح کی ہلاکت کا بیان قرار دیکر یہاں ما بعد نوح (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا گیا) اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔ (توجیسا کسی قوم کا گناہ ہوتا ہے ویسی سزا دیتا ہے)

معارف و مسائل

ایک شبہ اور اُسکا جواب

الفاظ آیت اِذَآ اَرَدْنَآ اور اس کے بعد اَمَرْنَا کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصود خداوندی تھا اس لئے اُن کو اوّل بذریعہ انبیاء ایمان و اطاعت کا حکم دینا پھر ان کے فسق و فجور کو عذاب کا سبب بنانا یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تو اس صورت میں یہ بیچارے معذور و مجبور رہے اس کے جواب کی طرف ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر کے ضمن میں یہ اشارہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و اختیار دیا اور عذاب و ثواب کے راستے متعین کر دیئے جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کے کام کا عزم کرے تو عادت اللہ یہ ہے کہ وہ اسی عذاب کے اسباب مہیا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود ان کا عزم اور قصد ہے کفر و معصیت کا نہ کہ محض ارادہ اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

آیت مذکورہ کی ایک دوسری تفسیر

لفظ اَمَرْنَا کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی حکم دیا ہم نے لیکن اس آیت میں اس لفظ کی قراءتیں مختلف ہیں ایک قراءت میں جسکو ابو عثمان نہدی ابو رجاء ابو العالیہ اور مجاہد نے اختیار کیا ہے یہ لفظ بتشدید میم آیا ہے یعنی اَمَّرْنَا جسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے امیر و حاکم بنا دیا خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور سب قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔

اور حضرت علی و ابن عباس رضؓ کی ایک قراءت میں یہ لفظ آمَرْنَا پڑھا گیا جس کی تفسیر انھیں حضرات سے اَکْثَرْنَا نقل کی گئی ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کی کثرت کر دیجاتی ہے اور وہ اپنے فسق و فجور کے ذریعہ پوری قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بنجاتے ہیں۔

انمیں سے پہلی قراءت کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنا دیا جاتا ہے اور دوسری قراءت کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں سے یہ معلوم ہوا کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں

عذابِ الٰہی کی علامت ہے حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوتے ہیں اور اس کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے حاکم و رئیس ایسے لوگ بنا دیئے جاتے ہیں جو عیش پسند، عیاش ہوں یا حاکم بھی نہ بنیں تو اس قوم کے افراد میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دیجاتی ہے دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہوات ولذات میں مست ہو کر اللہ کی نافرمانیاں خود بھی کرتے ہیں دوسروں کے لئے بھی اس کی راہ ہموار کرتے ہیں بالآخر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔

مالداروں کا قوم پر اثر ہونا ایک طبعی امر ہے آیت میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ فطری طور پر عوام اپنے مالداروں اور حاکموں کے اخلاق و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں جب یہ لوگ بدعمل ہو جائیں تو پوری قوم بدعمل ہو جاتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دیا ہے ان کو اس کی زیادہ فکر ہونا چاہئے کہ اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرتے رہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عیش پرستی میں پڑ کر اس سے غافل ہو جائیں اور پوری قوم ان کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جائے تو قوم کے اعمال بد کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اسکو اُسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ

پھر ٹھہرایا ہے ہم نے اُسکے واسطے دوزخ داخل ہوگا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جاکر اور جس نے

اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

چاہا پچھلا گھر اور دوڑ کی اُس کے واسطے جو اُسکی دوڑ ہے اور وہ یقین پر ہے سو

كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ

ایسوں کی دوڑ ٹھکانے لگی ہے ہر ایک کو ہم پہنچائے جاتے ہیں ان کو اور اُن کو تیرے

عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ

رب کی بخشش میں سے اور تیرے رب کی بخشش کسی نے نہیں روک لی دیکھ کیسا

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

بڑھا دیا ہم نے ایک کو ایک سے اور پچھلے گھر میں تو اور بڑے درجے ہیں اور بڑی فضیلت

خلاصۂ تفسیر

جو شخص (اپنے نیک اعمال سے صرف) دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا (خواہ اس لئے کہ وہ آخرت کا منکر ہے یا اس لئے کہ آخرت سے غافل ہے) ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے (پھر یہ بھی سب کے لئے نہیں بلکہ) جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے (یعنی دنیا ہی میں کچھ جزا مل جاوے گی) پھر (آخرت میں خاک نہ ملے گا بلکہ وہاں) ہم اس کے لئے جہنم تجویز کر دینگے وہ اس میں بدحال راندہ (درگاہ) ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص (اپنے اعمال میں) آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش کا دیا گیا ہے، جو عمل اور سعی شریعت و سنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی (غرض اللہ کے یہاں کامیابی کی شرطیں چار ہوئیں اول تصحیح نیت یعنی خالص ثواب آخرت کی نیت ہونا جسمیں اغراض نفسانی شامل نہوں دوسرے اُس نیت کے لئے عمل اور کوشش کرنا صرف نیت و ارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے عمل نہ کرے تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی و عمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مقصد سے اور دور کر دیتا ہے چوتھی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں اور کفار کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہونا ان کے اعمال کی مقبولیت کی علامت نہیں کیونکہ دنیا کی نعمتیں مقبولین بارگاہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ) آپ کے رب کی عطاء (دنیوی) میں سے تو ہم ان (مقبولین) کی بھی امداد کرتے ہیں اور اُن (غیر مقبولین) کی بھی (امداد کرتے ہیں) اور آپ کے رب کی عطاء (دنیوی کسی پر) بند نہیں آپ دیکھ لیجئے کہ ہم نے (اس دنیوی عطاء میں بلاشرط ایمان و کفر کے) ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے (یہاں تک کہ اکثر کفار اکثر مومنین سے زیادہ نعمت و دولت رکھتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں قابل وقعت نہیں) اور البتہ آخرت (جو مقبولین بارگاہ کے ساتھ خاص ہے وہ) درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی (اس لئے اہتمام اسی کا کرنا چاہیئے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اپنے عمل سے صرف دنیا کا ارادہ کرنے والوں کا اور اُن کی سزا کا جو بیان

فرمایا ہے اس کے لئے تو الفاظ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ استعمال فرمائے جو استمرار و دوام پر دلالت کرتے ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ یہ سزا رجہنم صرف اس صورت میں ہے کہ اس کے ہر عمل میں ہر وقت صرف دنیا ہی کی غرض چھائی ہوئی ہو آخرت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ ہو اور ارادہ آخرت کرنے اور اس کی جزار کے بیان میں لفظ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ کا استعمال فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس وقت بھی جس عمل میں آخرت کا ارادہ اور نیت کرلیگا اسکا وہ عمل مقبول ہو جائے گا خواہ کسی دوسرے عمل کی نیت میں کوئی فساد بھی شامل ہو گیا ہو۔

پہلا حال صرف کافر منکر آخرت کا ہو سکتا ہے اس لئے اسکا کوئی بھی عمل مقبول نہیں اور دوسرا حال مومن کا ہے اُس کا وہ عمل جو اخلاصِ نیت کے ساتھ آخرت کے لئے ہو اور باقی شرائط بھی موجود ہوں وہ مقبول ہو جائے گا اور اس کے بھی جس عمل میں اخلاص نہ ہو یا دوسری شرطیں مفقود ہوں وہ مقبول نہیں ہو گا۔

بدعت اور خود رائی کا عمل کتنا ہی اچھا نظر آئے مقبول نہیں

اس آیت میں سعی و عمل کے ساتھ لفظ سَعْيَهَا بڑھا کر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل و سعی وہی معتبر ہے جو مقصد (آخرت) کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اس لئے جو نیک اعمال خود رائی اور منگھڑت طریقوں سے کئے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی بھلے اور مفید نظر آئیں مگر آخرت کے لئے سعی مناسب نہیں اس لئے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کارآمد۔

اور تفسیر روح المعانی نے سَعْيَهَا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں استقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اسپر استقامت اور مداومت بھی ہو بدنظمی کے ساتھ کبھی کرلیا کبھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم پھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بیکس ہو کر

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اُس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ

اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک اُن میں سے یا دونوں تو نہ کہہ

لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ
اُن کو ہوں اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن سے بات ادب کی اور جھکادے

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا
اُن کے آگے کندھے عاجزی کرکر نیازمندی سے اور کہہ اے رب اُن پر رحم کر جیسا

رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ
پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر

تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿٢٥﴾
تم نیک ہوگے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے۔

ربطِ آیات سابقہ آیات میں قبول اعمال کے لئے چند شرائط کا بیان آیا ہے جنمیں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عمل مقبول وہی ہوسکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ہو اور شریعت و سنت کے مطابق ہو۔ ان آیات میں ایسے ہی خاص خاص اعمال کی ہدایت کی گئی ہے جو شریعت کے تبلائے ہوئے احکام ہیں ان کی تعمیل آخرت کی فلاح اور ان کی خلاف ورزی آخرت کی ہلاکت کا سبب ہے اور چونکہ شرائط مذکورہ میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

حکم اوّل توحید لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (اے مخاطب) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت تجویز کر (یعنی شرک نہ کر) ورنہ تو بدحال بے یار و مددگار ہو کر بیٹھ رہے گا (آگے پھر اسکی تاکید ہے) تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اُس (معبود برحق) کے کسی کی عبادت مت کر (یہ سعی آخرت کے طریقہ کی تفصیل ہے)

حکم دوم۔ ادائے حقوق والدین وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو (اگر وہ) تیرے پاس (ہوں اور) ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے (کی عمر) کو پہونچ جائیں (جس کی وجہ سے محتاج خدمت ہوجائیں اور جبکہ طبعاً ان کی خدمت کرنا بھاری معلوم ہو تو اس وقت بھی اتنا ادب کرو کہ) ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کہنا اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے حق تعالیٰ

سے، یوں دعا کرو رَبِّنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انھوں نے مجھکو بچپن (کی عمر) میں پالا پرورش کیا ہے (اور صرف اس ظاہری توقیر و تعظیم پر اکتفا مت کرنا دل میں بھی انکا ادب اور قصد اطاعت رکھنا کیونکہ) تمہارا رب تمہارے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے (اور اسی وجہ سے تمہارے لئے اس کی تعمیل آسان کرنے کے واسطے ایک تخفیف کا حکم بھی سناتے ہیں کہ) اگر تم (حقیقت میں دل ہی سے) سعادتمند ہو (اور غلطی یا تنگ مزاجی یا دل تنگی سے کوئی ظاہری کوتاہی ہو جائے اور پھر نادم ہو کر معذرت کر لو) تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

معارف و مسائل

والدین کے ادب و احترام اور اطاعت کی بڑی اہمیت

امام قرطبی رح فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورۂ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (یعنی میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کیطرح والدین کا شکر گذار ہونا واجب ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جسمیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ "اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے" آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "نماز اپنے وقت (مستحب) میں" اس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپؐ نے فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک" (قرطبی)

والدین کی اطاعت و خدمت کے فضائل روایات حدیث میں

(۱) مسند احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ، مستدرک حاکم میں بسند صحیح حضرت ابو الدرداء رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا ضائع کردو (مظہری)۔ (۲) اور جامع ترمذی، مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کی رضا، باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں۔

(۳) ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو امامہ رض نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت و خدمت جنت میں لیجاتی ہے اور اُن کی بے ادبی اور ناراضی دوزخ میں۔

(۴) بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن عساکر نے بروایت حضرت ابن عباس رضؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو اُن کا نافرمان ہوا اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا تو ایک دروازہ (جنت یا دوزخ کا کھلا رہیگا) اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ (یہ جہنم کی وعید) کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا (یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو ایذارسانی پر جہنم کی وعید ہے خواہ ماں باپ نے ہی لڑکے پر ظلم کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقام لینے کا حق نہیں کہ انھوں نے ظلم کیا تو یہ بھی ان کی خدمت و اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں۔)

(۵) بیہقی نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خدمتگذار بیٹا اپنے والدین پر رحمت و شفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرے، آپ نے فرمایا کہ "ہاں سو مرتبہ بھی (ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا) اللہ تعالیٰ بڑا ہے (اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی"

والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے

(۶) بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابی بکرہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اسکی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دیجاتی ہے (یہ سب روایات تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں)

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں واجب ہے اور کہاں مخالفت کی گنجائش ہے

اس پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے ناجائز یا گناہ کے کام میں اطاعت واجب تو کیا جائز بھی نہیں حدیث میں ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کے لئے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں

امام قرطبیؒ نے اس مسئلہ کی شہادت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتاء کیا کہ میری والدہ جو مشرک ہے مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خاطر مدارات کروں آپ نے فرمایا " صِلِی اُمَّكِ (یعنی اپنی ماں کی صلہ رحمی اور خاطر مدارات کرو) اور کافر ماں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا مَعْرُوفًا یعنی جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اسکو بھی کافر ہونے کا حکم

دیں تو ان کا اس معاملے میں حکم ماننا تو جائز نہیں مگر دنیا میں اُن کے ساتھ معروف طریقہ کا برتاؤ کیا جاوے ظاہر ہے کہ معروف طریقہ سے یہی مراد ہے کہ اُن کے ساتھ مدارات کا معاملہ کریں۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرض عین نہ ہوجائے فرض کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی لڑکے کے لئے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہوجانا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ "کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟" اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا ففیھما فجاھد یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہکر جہاد کرو مطلب یہ ہے کہ اُن کی خدمت ہی میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں اسپر آپ نے فرمایا کہ "جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رُلایا ہے" یعنی ان سے جاکر کہدو کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جہاد میں نہیں جاؤنگا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں اسمیں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جسکو حاصل ہو وہ عالم بننے کے لئے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ و دعوت کے لیے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔

مسئلہ: والدین کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم قرآن و حدیث میں آیا ہے اسمیں یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے خصوصًا ان کی وفات کے بعد۔ صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "باپ کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور حضرت ابو اسید بدری رضؓ نے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا تھا ایک انصاری شخص آیا اور سوال کیا یا رسول اللہ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی انکا کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ ان کے لئے دعاء اور استغفار کرنا اور جو عہد انھوں نے کسی سے کیا تھا اس کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا اور ان کے ایسے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جنکا رشتہ قرابت صرف انھیں کے واسطے سے ہے والدین کے یہ حقوق ہیں جو ان کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ حضرت خدیجہؓ ام المومنین کی وفات کے بعد ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے جس سے حضرت خدیجہ کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔

والدین کے ادب کی رعایت خصوصاً بڑھاپے میں

والدین کی خدمت و اطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے لیکن واجبات و فرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃً رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہوجائیں ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بنجاتی ہے۔ دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑا بنا دیتے ہیں تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات و مطالبات کچھ ایسے بھی ہوجاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جسقدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انھوں نے اپنی راحت وخواہشات کو اُس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل و شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو۔ آیت میں كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات مذکورہ میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہونچنے کے وقت چند تاکیدی احکام دیئے گئے ہیں

اوّل یہ کہ ان کو اُف بھی نہ کہے لفظ اُف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو یہاں تک کہ ان کی بات سنکر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اسی کلمہ اُف میں داخل ہے ایک حدیث میں بروایت حضرت علی رضی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایذا رسانی میں اُف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا (حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے)۔

دوسرا حکم ہے وَلَا تَنْهَرْهُمَا لفظ نہر کے معنی جھڑکنے ڈانٹنے کے ہیں اسکا سبب ایذا ہونا ظاہر ہے تیسرا حکم وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ہے پہلے دو حکم منفی پہلو سے متعلق تھے جنمیں والدین کی ادنیٰ سے ادنیٰ بارخاطر کو روکا گیا ہے اس تیسرے حکم میں مثبت انداز سے والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھلایا گیا ہے کہ ان سے محبت وشفقت کے نرم لہجہ میں بات کیجائے حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا جسطرح کوئی غلام اپنے سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہو

چوتھا حکم وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو عاجز وذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے، جناح کے معنی

بازو کے ہیں لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لئے اپنے بازو عاجزی اور ذلت کے ساتھ جھکائے آخر میں مِنَ الرَّحْمَةِ کے لفظ سے ایک تو اس پر متنبہ کیا کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو بلکہ قلبی رحمت و عزت کی بنیاد پر ہو دوسرے شاید اشارہ اس طرف بھی ہے کہ والدین کے سامنے ذلت کے ساتھ پیش آنا حقیقی عزت کا مقدمہ ہے کیونکہ یہ واقعی ذلت نہیں بلکہ اس کا سبب شفقت و رحمت ہے۔

پانچواں حکم وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ والدین کی پوری راحت رسانی تو انسان کے بس کی بات نہیں اپنی مقدور بھر راحت رسانی کی فکر کے ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اُن کی سب مشکلات کو آسان اور تکلیفوں کو دور فرمائے یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ والدین کی خدمت کرسکتا ہے۔

مسئلہ والدین اگر مسلمان ہوں تو اُن کے لئے رحمت کی دعا ء ظاہر ہے لیکن اگر وہ مسلمان نہوں تو ان کی زندگی میں یہ دعا اس نیت سے جائز ہوگی کہ اُن کو دنیوی تکلیف سے نجات ہو اور ایمان کی توفیق ہو مرنے کے بعد اُن کے لئے دعاء رحمت جائز نہیں (قرطبی ملخصا)

ایک واقعہ عجیبہ قرطبی نے اپنی اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد کو لیکر پہونچا تو آپؐ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپکا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اسکی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِیْہٖ (جسکا مطلب یہ تھا کہ بس حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں) اس کے بعد اس کے والد سے دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جنکو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمیں ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ آپ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں (جو بات کسی نے نہیں سنی اسکی آپ کو اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے) پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے تھے جنکو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپؐ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے یہ اشعارِ ذیل سنائے۔

غَذَوْتُكَ مَوْلُوْدًا وَمُنْتُكَ يَافِعًا   تُعَلُّ بِمَا اَجْنِيْ عَلَيْكَ وَتَنْهَلُ

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا

اِذا ليلة ضافتك بالسقم لم ابت   لسقمك الا ساهرا اتململ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گذاری

كأني انا المطروق دونك بالذي   طُرِقْتَ به دوني فعيني تهمل

گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

تخاف الردٰى نفسي عليك وانها   لَتَعْلَمُ ان المَوْتَ وَقْتٌ مؤجَّلُ

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہو سکتی

فَلَمَّا بَلَغْتَ السِنَّ والغاية الَّتِيْ   اليها مدى ماكنت فيك اُؤَمِّلُ

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جعلت جزائي غلظةً وفظاظةً   كانك انت المنعم المتفضِّلُ

تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تمہی مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔

فليتكَ اذ لم ترع حقَّ اُبوتي   فعلتَ كما الجارُ المصاقب يفعلُ

کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے

فَاَوْلَيْتَنِيْ حَقَّ الْجِوَارِ ولم تكن   عليَّ بمال دون مالك تَبْخَلُ

تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا۔ انت و مالك لابيك یعنی جا تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے (تفسیر قرطبی ص ۲۴۶ ج ۱۰) یہ اشعار عربی ادب کی مشہور کتاب حماسہ میں بھی نقل کئے گئے، مگر ان کو امیہ ابن ابی الصلت شاعر کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ عبدالاعلیٰ کے اشعار ہیں بعض نے انکی نسبت ابو العباس اعمیٰ کی طرف کی ہے (حاشیہ قرطبی)

مذکورہ آیات میں سے آخری آیت رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ میں اس دل تنگی کو رفع فرما دیا گیا ہے جو والدین کے ادب و تعظیم کے متعلقہ احکام مذکورہ سے اولاد کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ والدین کے ساتھ ہر وقت رہنا ہے ان کے اور اپنے حالات بھی ہر وقت یکساں نہیں ہوتے کسی وقت زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو مذکورا لصدر آداب کے خلاف ہو تو اس پر جہنم کی وعید ہے اس طرح گناہ

سے بچنا سخت مشکل ہوگا اس آیت میں اس شبہ اور اس سے دلتنگی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بغیر ارادہ بے ادبی کے کبھی کسی پریشانی یا غفلت سے کوئی کلمہ صادر ہو جائے اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہیں کہ وہ کلمہ بے ادبی یا ایذار کے لئے نہیں کہا تھا وہ معاف فرمانے والے ہیں لفظ اوّابین بمعنے توّابین ہے حدیث میں بعد مغرب کی چھ رکعات اور اشراق کی نوافل کو صلوٰۃ الاوّابین کہا گیا ہے جسمیں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوّابین اور توّابین ہیں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا

اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت

تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ

اُڑا بے جا بے شک اڑانے والے بھائی ہیں

الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

شیطانوں کے اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکر۔

خلاصہ تفسیر

ان دونوں آیتوں میں حقوق عباد سے متعلق دو مزید حکم مذکور ہیں اوّل والدین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق۔ دوسرے خرچ کرنے میں فضول خرچی کی ممانعت مختصر تفسیر یہ ہے

اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی وغیر مالی) دیتے رہنا اور محتاج و مسافر کو بھی (اون کے حقوق) دیتے رہنا اور (مال کو) بے موقع مت اڑانا بیشک بے موقع مال اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں (یعنی اس کے مشابہ ہوتے ہیں) اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے (کہ حق تعالیٰ نے اس کو دولت عقل کی دی اس نے اس دولت عقل کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا اسیطرح فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دولت مال کی دی مگر وہ اُسکو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

عام رشتہ داروں کے حقوق کا اہتمام

پچھلی آیتوں میں والدین کے حقوق اور ان کے ادب و احترام کی تعلیم تھی اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ کا حق ادا کیا جائے

جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اور وہ اگر حاجتمند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اسمیں داخل ہے اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر شخص پر اسکے عام رشتے دار عزیزوں کا بھی حق ہے۔ وہ کیا اور کتنا ہے اس کی تفصیل مذکور نہیں مگر عام صلہ رحمی اور حُسنِ معاشرت کا اسمیں داخل ہونا واضح ہے امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گذارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر بھی قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا اندھا ہو اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گذارہ ہوسکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کرسکتے ہیں ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گذارہ نفقہ دیا جائے گا سورۂ بقرہ کی آیت وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَالِكَ سے بھی یہ حکم ثابت ہے (تفسیر مظہری)

اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین و مسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے کسی پر احسان نہیں کر رہا۔

تبذیر یعنی فضول خرچی کی ممانعت فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ایک تبذیر اور دوسرے اسراف تبذیر کی ممانعت تو اسی آیت مذکورہ میں واضح ہے اسراف کی ممانعت آیت وَلَا تُسْرِفُوْا سے ثابت ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں کسی معصیت میں یا بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے اسکو اسراف کہتے ہیں اسلئے تبذیر بہ نسبت اسراف کے اشد ہے مبذرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے

امام تفسیر حضرت مجاہد رح نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لئے خرچ کر دے تو وہ تبذیر نہیں اور اگر باطل کے لئے ایک مُد (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رض نے فرمایا کہ غیر حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے (مظہری) امام مالک رح نے فرمایا کہ تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلاف حق خرچ کر ڈالے اور اس کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام ہے۔ (قرطبی)

امام قرطبی رح نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تبذیر میں داخل ہے ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اسکے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں (قرطبی ج ۱۰ ص ۲۴۸)

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا

اور اگر کبھی تغافل کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی تجھکو

فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

توقع ہے تو کہہ دے اُن کو بات نرمی کی ۔

خلاصۂ تفسیر

اس آیت میں حقوق العباد سے متعلق پانچواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو انکی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی ان کو روکھا جواب نہ دیا جائے بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے ۔ آیت کی تفسیر یہ ہے ۔

اور اگر (کسی وقت تمہارے پاس ان لوگوں کو دینے کے لئے مال نہ ہو اور اس لئے) تم کو اس رزق کے انتظار میں جسکی اپنے پروردگار سے توقع ہو (اس کے نہ آنے تک) اُن سے پہلوتہی کرنا پڑے تو (اتنا خیال رکھنا کہ) اُن سے نرمی کی بات کہدینا (یعنی دلجوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کر لینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کہیں سے آئیگا تو دیں گے دل آزار جواب مت دینا)

معارف ومسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے واسطے سے پوری اُمت کی عجیب اخلاقی تربیت ہے کہ اگر کسیوقت ضرورتمند لوگ سوال کریں اور آپ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو اس لئے ان لوگوں سے اعراض کرنے پر مجبور ہو تو بھی آپ کا یہ اعراض مستغنیانہ یا مخاطب کے لئے توہین آمیز نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ پہلوتہی کرنا اپنے عجز و مجبوری کے اظہار کے ساتھ ہونا چاہئے ۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ابن زید کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کیا کرتے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ان کو دیا جائے گا تو یہ فساد میں خرچ کریں گے اس لئے آپ ان کو دینے سے انکار کر دیتے تھے کہ یہ انکار اُن کو فساد سے روکنے کا ذریعہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)

مسند سعید بن منصور میں بروایت سبار بن حکم مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کپڑا آیا تھا آپ نے اس کو مستحقین میں تقسیم فرما دیا اس کے بعد کچھ اور لوگ آئے جبکہ آپ فارغ ہو چکے تھے اور کپڑا ختم ہو چکا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ

اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھولدے اس کو بالکل کھول دینا

الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس

لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾

کے واسطے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا

خلاصۂ تفسیر

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو (کہ انتہائی بخل سے بالکل ہاتھ خرچ کرنے سے روک لو) اور نہ بالکل ہی کھولدینا چاہئے (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کیا جائے) ورنہ الزام خوردہ (اور) تہیدست ہوکر بیٹھ رہوگے (اور کسی کے فقر و احتیاج پر اتنا اثر لینا کہ اپنے کو پریشانی میں ڈال لو کوئی معقول بات نہیں کیونکہ) بلاشبہ تیرا رب جسکو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی (جس پر چاہے) تنگی کر دیتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں (کی حالت اور ان کی مصلحت) کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے (سارے عالم کی حاجات پورا کرنا تو رب العالمین ہی کا کام ہے تم اس فکر میں کیوں پڑے کہ اپنے سے ہوسکے یا نہو سکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر سبکی حاجتیں پوری ہی کر دو۔ یہ صورت اس لئے بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی سبکی حاجتیں پوری کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے اس کے لئے تدبیر نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار بھی ہوکہ یہ کام تو صرف مالک کائنات ہی کا ہے کہ سب کی حاجتوں کو جانتا بھی ہے اور سب کی مصلحتوں سے بھی واقف ہے کہ کس وقت کس شخص کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کرنا چاہئے اس لئے انسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ میانہ روی سے کام لے نہ خرچ کرنے کے موقع میں بخل کرے اور نہ اتنا خرچ کرے کہ کل کو خود ہی فقیر ہو جائے اور اہل و عیال جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں اُن کے حقوق ادا نہ ہوسکیں اور بعد میں پچھتانا پڑے۔)

معارف و مسائل

خرچ کرنے میں اعتدال کی ہدایت اس آیت میں بلاواسطہ مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آپ کے واسطے سے پوری اُمت مخاطب ہے اور مقصود اقتصاد کی ایسی تعلیم ہے جو دوسروں کی امداد میں حائل بھی نہ ہو اور خود اپنے لئے بھی مصیبت نہ بنے اس آیت کے شان نزول میں ابن مردویہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بغوی نے بروایت حضرت جابر رضہ ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری والدہ آپ سے ایک کرتے کا سوال کرتی ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی کرتا اس کے سوا نہیں تھا جو آپ کے بدن مبارک پر تھا آپ نے لڑکے کو کہا کہ پھر کسی وقت آؤ جبکہ ہمارے پاس اتنی وسعت ہو کہ تمہاری والدہ کا سوال پورا کرسکیں۔ لڑکا گھر گیا اور واپس آیا اور کہا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ آپ کے بدن مبارک پر جو کرتا ہے وہی عنایت فرما دیں۔ یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک سے کرتہ اتار کر اس کے حوالے کر دیا آپ ننگے بدن رہ گئے۔ نماز کا وقت آیا حضرت بلالؓ نے اذان دی مگر آپ حسب عادت باہر تشریف نہ لائے تو لوگوں کو فکر ہوئی بعض لوگ اندر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کرتے کے بغیر ننگے بدن بیٹھے ہیں اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرنا کہ خود پریشانی میں پڑ جائے اس کا درجہ اس آیت سے بظاہر اس طرح خرچ کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے جس کے بعد خود فقیر و محتاج ہو جائے اور پریشانی میں پڑ جائے امام تفسیر قرطبی نے فرمایا کہ یہ حکم مسلمانوں کے عام حالات کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد تکلیفوں سے پریشان ہو کر پچھلے خرچ کئے ہوئے پر پچھتائیں اور افسوس کریں، قرآن کریم کے لفظ محسوراً میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے (کما قال المظہری) اور جو لوگ اتنے بلند حوصلہ ہوں کہ بعد کی پریشانی سے نہ گھبرائیں اور اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرسکیں ان کے لئے یہ پابندی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہ تھی کہ کل کے لئے کچھ ذخیرہ نہ کرتے تھے جو کچھ آج آیا آج ہی خرچ فرما دیتے تھے اور بسا اوقات بھوک اور فاقہ کی تکلیف بھی پیش آتی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت بھی آجاتی تھی اور صحابۂ کرام میں بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اسکو منع فرمایا نہ ان کو ملامت کی اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کی ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے جو فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت نہ کرسکیں اور خرچ کرنے کے بعد ان کو حسرت ہو کہ کاش ہم خرچ نہ کرتے یہ صورت اُن کے پچھلے عمل کو فاسد کر دیگی اس لئے اس سے منع فرمایا گیا۔

خرچ میں بدنظمی ممنوع ہے اور اصل بات یہ ہے کہ اس آیت نے بدنظمی کے ساتھ خرچ کرنے کو منع کیا ہے کہ آگے آنے والے حالات سے قطع نظر کر کے جو کچھ پاس ہے اُسے اسیوقت خرچ کر ڈالے کل کو دوسرے صاحب حاجت لوگ آئیں اور کوئی دینی ضرورت اہم پیش آجائے تو اب اس کے لئے قدرت نہ رہے (قرطبی) یا اہل و عیال جنکے حقوق اس کے ذمہ واجب ہیں ان کے حق ادا کرنے سے عاجز ہو جائے (مظہری) مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا کے الفاظ کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے کہ مَلُوۡم کا تعلق پہلی حالت یعنی بخل سے ہے کہ اگر ہاتھ کو بخل سے بالکل

روک لے گا تو لوگ ملامت کریں گے اور محسورا کا تعلق کسی دوسری حالت سے ہے کہ خرچ کرنے میں اتنی زیادتی کرے کہ خود فقیر ہوجائے تو یہ محسورا یعنی تھکا ماندہ عاجز یا حسرت زدہ ہوجائے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ
اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور

اِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾
تم کو بے شک اُن کا مارنا بڑی خطا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو (کیونکہ سب کے رازق ہم ہیں) ہم انکو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی (اگر رازق تم ہوتے تو ایسی باتیں سوچتے) بیشک انکا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں انسانی حقوق کے متعلق ہدایات کا ایک سلسلہ ہے یہ چھٹا حکم اہل جاہلیت کی ایک ظالمانہ عادت کی اصلاح کے لئے ہے زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ ابتداء ولادت کے وقت اپنی اولاد خصوصاً بیٹیوں کو اس خوف سے قتل کر ڈالتے تھے کہ ان کے مصارف کا بار ہم پر پڑے گا۔ آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی جہالت کو واضح کیا ہے کہ رزق دینے والے تم کون، یہ تو خالص اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تمہیں بھی تو وہی رزق دیتا ہے جو تمہیں دیتا ہے وہی ان کو بھی دیگا تم کیوں اس فکر میں قتل اولاد کے مجرم بنتے ہو بلکہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں اولاد کا ذکر مقدم کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے ہم پہلے ان کو پھر تمہیں دیں گے جسکا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اہل وعیال کا تکفل یا دوسرے غریبوں ضعیفوں کی امداد کرتا ہے تو اس کو اسی حساب سے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ضروریات بھی پوری کرسکے اور دوسروں کی امداد بھی کرسکے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ یعنی تمہارے ضعیف و کمزور طبقہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل وعیال کے متکفل والدین کو جو کچھ ملتا ہے وہ کمزور عورتوں بچوں کی خاطر ہی ملتا ہے

مسئلہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے جسمیں آج کی دنیا گرفتار

ہے کہ کثرت آبادی کے خوف سے ضبط تولید اور منصوبہ بندی کو رواج دے رہی ہے اسکی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے یہ معاملہ قتل اولاد کی برابر گناہ نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور پاس نہ جاؤ بدکاری کے وہ ہے بے حیائی اور بُری راہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو (یعنی اس کے مبادی اور مقدمات سے بھی بچو) بلاشبہ وہ (خود بھی) بڑی بے حیائی کی بات ہے اور (دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی) بُری راہ ہے (کیونکہ اسپر عداوتیں اور فتنے اور تضییع نسب مرتب ہوتے ہیں)۔

معارف و مسائل

یہ ساتواں حکم زنا کی حرمت کے متعلق ہے جس کے حرام ہونے کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں اوّل یہ کہ وہ بے حیائی ہے اور انسان میں حیا نہ رہی تو وہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے کسی بھلے بُرے کام کا امتیاز نہیں رہتا اسی معنی کے لئے حدیث میں ارشاد ہے اذا فاتك الحياء فافعل ما شئت یعنی جب تیری حیا ہی جاتی رہی تو کسی برائی سے رکاوٹ کا کوئی پردہ نہ رہا تو جو چاہو گے کرو گے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو ایمان کا ایک اہم شعبہ قرار دیا ہے وَالحیاء شعبة من الایمان (بخاری) دوسری وجہ معاشرتی فساد ہے جو زنا کی وجہ سے اتنا پھیلتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کے نتائج بد بعض اوقات پورے قبیلوں اور قوموں کو برباد کر دیتے ہیں فتنے چوری، ڈاکہ قتل کی جتنی کثرت آج دنیا میں بڑھ گئی ہے اس کے حالات کی تحقیق کیجائے تو آدھے سے زیادہ واقعات کا سبب کوئی عورت و مرد نکلتے ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے۔ اس جرم کا تعلق اگرچہ بلاواسطہ حقوق العباد سے نہیں مگر اس جگہ حقوق العباد سے متعلقہ احکام کے ضمن میں اسکا ذکر کرنا شاید اسی بنا پر ہو کہ یہ جرم بہت سے ایسے جرائم ساتھ لاتا ہے جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہیں اور قتل و غارت گری کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے اس جرم کو تمام جرائم سے اشد قرار دیا ہے اس کی سزا بھی سارے جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت رکھی ہے کیونکہ یہ ایک جرم دوسرے سینکڑوں جرائم کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں شادی شدہ

زناکار پر لعنت کرتی ہیں اور جہنم میں ایسے لوگوں کی شرمگاہوں سے ایسی سخت بدبو پھیلے گی کہ اہل جہنم بھی اس سے پریشان ہوں گے اور آگ کے عذاب کے ساتھ ان کی رسوائی جہنم میں بھی ہوتی رہے گی (رواہ البزار عن بریدۃ مظہری)

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا کرنے والا زنا کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا۔ چوری کرنے والا چوری کرنے کے وقت مومن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب پینے کے وقت مومن نہیں ہوتا یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اس کی شرح ابوداؤد کی روایت میں یہ ہے کہ ان جرائم کے کرنے والے جس وقت مبتلائے جرم ہوتے ہیں تو ایمان ان کے قلب سے نکلکر باہر آجاتا ہے اور پھر جب اس سے لوٹ جاتے ہیں تو ایمان واپس آجاتا ہے (مظہری)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ

اور نہ مارو اُس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر اور جو

قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ

مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اُس کے وارث کو زور سو حد سے نہ نکل جائے

فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳

قتل کرنے میں اس کو مدد ملتی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جس شخص (کے قتل کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر (قتل کرنا درست ہے یعنی جب کسی شرعی حکم سے قتل کرنا واجب یا جائز ہو جائے تو وہ حرّم اللہ میں داخل نہیں) اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (حقیقی یا حکمی) کو اختیار دیا ہے (قصاص لینے کا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے (یعنی قاتل پر قتل کا یقینی ثبوت ملے بغیر قتل نہ کرے اور اس کے اعزہ و اقارب وغیرہ کو جو قتل میں شریک نہیں ہیں محض جوش انتقام سے قتل نہ کرے اور قاتل کو بھی صرف قتل کرے ناک کان یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ کر مثلہ نہ کرے۔ کیونکہ) وہ شخص (قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً) مدد کے قابل ہے (اور اس نے زیادتی کی تو پھر فریق ثانی مظلوم ہو کر اللہ کی مدد کا مستحق ہو جائے گا اس لئے ولی مقتول کو چاہیئے کہ وہ اپنے منصور حق ہونے کی قدر کرے حد سے بڑھکر اس نعمت حق کو ضائع نہ کرے)

معارف ومسائل

یہ آٹھواں حکم قتلِ ناحق کی حرمت کے بیان میں ہے جسکا جرم عظیم ہونا دنیا کی ساری ہی جماعتوں اور مذہبوں اور فرقوں میں مسلّم ہے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک اس سے اہون (ہلکی) ہے کہ کسی مومن کو ناحق قتل کیا جائے (اور بعض روایات میں اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مومن کے قتل ناحق میں شریک ہو جائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دینگے۔ (ابن ماجہ بسند حسن والبیہقی۔ از مظہری)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں قاتل کی امداد ایک کلمہ سے بھی کی تو میدان حشر میں جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا آئس من رحمۃ اللہ (یعنی یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا ہے) (مظہری از ابن ماجہ واصبہانی)

اور بیہقی نے بروایت حضرت عبداللہ ابن عباس رض وحضرت معاویہ رض روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک گناہ کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے مگر وہ آدمی جو حالت کفر میں مر گیا یا جس نے جان بوجھ کر قصداً کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا۔

قتل ناحق کی تفسیر امام بخاری ومسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں جو اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو بجز تین صورتوں کے۔ ایک یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کیا ہو (کہ اسکی شرعی سزا یہ ہے کہ پتھراؤ کر کے اسکو مار دیا جائے) دوسرے وہ جسنے کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو (کہ اس کی سزا یہ ہے کہ ولی مقتول اسکو قصاص میں قتل کر سکتا ہے) تیسرے وہ شخص جو دین اسلام سے مرتد ہو گیا ہو (کہ اس کی سزا بھی قتل ہے)

قصاص لینے کا حق کسکو ہے آیت مذکورہ میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حق مقتول کے ولی کا ہے۔ اگر نسبی ولی کوئی موجود نہیں تو اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی ایک حیثیت سے سب مسلمانوں کا ولی ہے اسی لئے خلاصۂ تفسیر میں ولی حقیقی یا حکمی لکھا گیا ہے۔

ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے مجرم کی سزا میں بھی انصاف کی رعایت فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اسلامی قانون کی ایک خاص ہدایت ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے لینا جائز نہیں بدلہ میں بھی انصاف کی رعایت لازمی ہے جب تک ولی مقتول انصاف کے ساتھ اپنے مقتول کا انتقام شرعی قصاص کے ساتھ لینا چاہے تو قانون شریعت اس کے حق میں ہے یہ منصور حق ہے اللہ تعالیٰ اس

کا مددگار رہے۔ اور اگر اس نے جوش انتقام میں شرعی قصاص سے تجاوز کیا تو اب یہ مظلوم کے بجائے ظالم ہوگیا اور ظالم اس کا مظلوم بن گیا اب معاملہ برعکس ہو جائے گا اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون اب اس کی مدد کرنے کے بجائے دوسرے فریق کی مدد کرے گا کہ اس کو ظلم سے بچائے گا۔

جاہلیت عرب میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص قتل ہوا تو اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان یا ساتھیوں میں جو بھی ہاتھ لگے اس کو قتل کر دیتے تھے بعض جگہ یہ صورت ہوتی کہ جسکو قتل کیا گیا وہ قوم کا کوئی بڑا آدمی ہے تو اس کے بدلہ میں صرف ایک قاتل کو قصاصاً قتل کرنا کافی نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک خون کے بدلہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی جان لیجاتی تھی بعض لوگ جوش انتقام میں قاتل کے صرف قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر مُثلہ کر دیتے تھے یہ سب چیزیں اسلامی قصاص کی حد سے زائد اور حرام ہیں اس لئے آیت فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ میں ان کو رد کیا گیا ہے۔

یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت بعض ائمہ مجتہدین کے سامنے کسی شخص نے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا حجاج بن یوسف اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا ظالم اور انتہائی بدنام شخص ہے جس نے ہزاروں صحابہ و تابعین کو ناحق قتل کیا ہے اس لئے عام طور پر اسکو بُرا کہنے کی برائی لوگوں کے ذہن میں نہیں رہتی جس بزرگ کے سامنے یہ الزام حجاج بن یوسف پر لگایا گیا انھوں نے الزام لگانے والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس اس الزام کی کوئی سند یا شہادت موجود ہے انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف ظالم سے ہزاروں مقتولین بے گناہ کا انتقام لے گا تو یاد رکھو کہ جو شخص حجاج پر کوئی ظلم کرتا ہے اس کو بھی انتقام سے نہیں چھوڑا جائے گا حجاج کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی لیں گے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی جنبہ داری نہیں ہے کہ بڑے اور گناہگار بندوں پر دوسروں کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جو چاہیں الزام و اتہام لگا دیا کریں۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو جب تک وہ پہنچے اپنی جوانی کو

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا

اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی اور پورا بھر دو ماپ جب

كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

ماپ کر دینے لگو اور تولو سیدھی ترازو سے یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام۔

خلاصۂ تفسیر

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس پر تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقہ سے جو کہ (شرعًا) مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد (جائز) کو پورا کیا کرو بیشک عہد کی قیامت میں بازپرس ہونے والی ہے (عہد میں وہ تمام عہد بھی داخل ہیں جو بندہ نے اپنے اللہ سے کئے ہیں اور وہ بھی جو کسی انسان سے کئے ہیں) اور (ناپنے کی چیزوں کو) جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور (تولنے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دو یہ (فی نفسہ بھی) اچھی بات ہے اور انجام بھی اسکا اچھا ہے (آخرت میں تو ثواب اور دنیا میں نیکنامی کی شہرت جو ترقی تجارت کا ذریعہ ہے)

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں تین حکم نواں، دسواں، گیارہواں مالی حقوق کے متعلق مذکور ہیں سابقہ آیات میں بدنی اور جسمانی حقوق کا ذکر تھا یہ مالی حقوق کا بیان ہے۔

یتیموں کے مال میں احتیاط ان میں پہلی آیت میں نواں حکم یتیموں کے اموال کی حفاظت اور انمیں احتیاط کا ہے جسمیں بڑی تاکید سے یہ فرمایا کہ یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ یعنی ان میں خلاف شرع یا بچوں کی مصلحت کے خلاف کوئی تصرف نہونے پاوے یتیموں کے مال کی حفاظت اور انتظام جن کے ذمہ ہے ان پر لازم ہے کہ ان میں بڑی احتیاط سے کام لیں صرف یتیموں کی مصلحت کو دیکھ کر خرچ کریں اپنی خواہش یا بےفکری سے خرچ نہ کریں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ یتیم بچے جوان ہو کر اپنے مال کی حفاظت خود نہ کر سکیں جسکا ادنیٰ درجہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنا اور زیادہ اٹھارہ سال تک ہے۔

ناجائز طریقے پر کسی کا مال بھی خرچ کرنا جائز نہیں، یہاں یتیموں کا خصوصیت سے ذکر اسلئے کیا کہ وہ تو خود کوئی حساب لینے کے قابل نہیں دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہوسکتی جس جگہ کوئی انسان اپنے حق کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو وہاں حق تعالیٰ کا مطالبہ اشد ہو جاتا ہے اسمیں کوتاہی عام لوگوں کے حقوق کی نسبت سے زیادہ گناہ ہو جاتی ہے۔

معاہدات کی تکمیل و تعمیل کا حکم دسواں حکم عہد پورا کرنے کی تاکید ہے، عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اس عہد کا لازمی اثر اسکے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے۔ یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا

ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر۔ دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادت ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے جسکا حاصل احکام الٰہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے۔

دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جسمیں تمام معاہدات سیاسی، تجارتی، معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب اور جو خلاف شرع ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم کر دینا واجب ہے جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت میں مرافعہ کر کے اسکو پورا کرنے پر مجبور کرے معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپکو فلاں چیز دونگا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپکا فلاں کام کر دونگا اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے اور بعض حضرات نے اسکو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدۂ فریقین کی صورت میں اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو دوسرا فریق اسکو بذریعہ عدالت تکمیل معاہدہ پر مجبور کر سکتا ہے مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کرا سکتا ہاں بلا عذر شرعی کے کسی سے وعدہ کر کے جو خلاف ورزی کرے گا وہ شرعاً گناہگار ہوگا حدیث میں اسکو عملی نفاق قرار دیا گیا ہے

اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا یعنی قیامت میں جیسے اور فرائض و واجبات اور احکام الٰہیہ کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہوگا ایسا ہی باہمی معاہدات کے متعلق بھی سوال ہوگا یہاں صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ اس کا سوال ہوگا۔ آگے سوال کے بعد کیا ہونا ہے اسکو مبہم رکھنے میں خطرہ کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

گیارھواں حکم لین دین کے معاملات میں ناپ تول پورا کرنے کی ہدایت اور اس میں کمی کرنے کی ممانعت کا ہے جس کی پوری تفصیل سورۂ المطففین میں مذکور ہے۔

مسئلہ ۔ حضرات فقہا نے فرمایا کہ آیت میں ناپ تول میں کمی کا جو حکم ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ جسکا جتنا حق ہے اس سے کم دینا حرام ہے اس لئے اسمیں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی ملازم اپنے مفوضہ اور مقررہ کام میں کمی کرے یا جتنا وقت دینا ہے اس سے کم دے یا مزدور اپنی مزدوری میں کام چوری کرے۔

| ناپ تول میں کمی کی ممانعت |

مسئلہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ تفسیر بحر محیط میں ابوحیان رح نے فرمایا کہ اس آیت میں ناپ تول پورا کرنے کی ذمہ داری بائع (بیچنے والے) پر ڈالی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ناپنے تولنے اور اس کو پورا کرنے کا ذمہ دار بائع ہے۔

آخر آیت میں ناپ تول پورا کرنے کے متعلق فرمایا ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا اس میں ناپ تول صحیح اور برابر کرنے کے متعلق دو باتیں فرمائیں ایک اس کا خیر (بہتر) ہونا اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا کرنا اپنی ذات میں اچھا اور بہتر ہے شرعی کے علاوہ عقلی اور طبعی طور پر بھی کوئی شریف انسان ناپ تول کی کمی کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ مآل اور انجام اس کا بہتر ہے جس میں آخرت کا انجام اور حصول ثواب و جنت تو داخل ہے ہی اس کے ساتھ دنیا کے انجام کی بہتری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی تجارت کو اس وقت تک فروغ نہیں ہو سکتا جب تک بازار میں اسکی ساکھ اور اعتبار قائم نہ ہو اور وہ اس تجارتی دیانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ

اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اور دل

كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ

ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی اور مت چل زمین پر اتراتا ہوا

اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ

تو پھاڑ نہ ڈالے گا زمین کو اور نہ پہنچے گا پہاڑوں تک لمبا ہو کر یہ جتنی باتیں ہیں

كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

ان سب میں بری چیز ہے تیرے رب کی بیزاری۔

خلاصۂ تفسیر

اور جس بات کی تجھکو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی (کہ آنکھ اور کان کا استعمال کس کس کام میں کیا وہ کام اچھے تھے یا برے اور بے دلیل بات کا خیال دل میں کیوں جمایا) اور زمین پر اتراتا ہوا مت چل (کیونکہ) تو (زمین پر زور سے پاؤں رکھکر) نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ (اپنے بدن کو تان کر) پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے (پھر اترانا عبث) یہ سارے (مذکورہ) برے کام تیرے رب کے نزدیک (بالکل) ناپسند ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں دو حکم بارھواں اور تیرھواں عام معاشرت سے متعلق ہیں۔ بارھویں حکم

میں بغیر تحقیق کے کسی بات پر عمل کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق کے درجات مختلف ہوتے ہیں ایک ایسی تحقیق کہ یقینِ کامل کے درجہ کو پہنچ جائے مخالف جانب کا کوئی شبہ بھی نہ رہے دوسرے یہ کہ گمانِ غالب کے درجہ میں آجائے اگرچہ جانب مخالف کا احتمال بھی موجود ہو اسیطرح احکام میں بھی دو قسم ہیں ایک قطعیات اور یقینیات ہیں جیسے عقائد اور اصول دین، انمیں پہلے درجہ کی تحقیق مطلوب ہے اس کے بغیر عمل کرنا جائز نہیں. دوسرے ظنیات جیسے فروعی اعمال سے متعلق احکام. اس تفصیل کے بعد مقتضیٰ آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ یقینی اور قطعی احکام میں تحقیق بھی درجہ اول کی ہو یعنی قطعیت اور یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے اور جب تک ایسا نہو عقائد اور اصول اسلام میں اس تحقیق کا اعتبار نہیں اس کے مقتضیٰ پر عمل جائز نہیں اور ظنی فروعی امور میں دوسرے درجہ یعنی ظن غالب کے درجہ کی تحقیق کافی ہے۔ (بیان القرآن)

کان آنکھ اور دل کے متعلق قیامت کے روز سوال اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ اس آیت میں بتلایا ہے کہ قیامت کے روز کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا مطلب یہ ہے کہ کان سے سوال ہوگا کہ تو نے عمر میں کیا کیا سنا آنکھ سے سوال ہوگا کہ تمام عمر میں کیا کیا دیکھا دل سے سوال ہوگا کہ تمام عمر دل میں کیسے کیسے خیالات پکائے اور کن کن چیزوں پر یقین کیا۔ اگر کان سے ایسی باتیں سنیں جنکا سننا شرعاً جائز نہیں تھا جیسے کسی کی غیبت یا حرام گانا بجانا وغیرہ یا آنکھ سے ایسی چیزیں دیکھیں جنکا دیکھنا شرعاً حلال نہ تھا جیسے غیر محرم عورت یا امرد لڑکے پر نظر بد کرنا وغیرہ یا دل میں کوئی ایسا عقیدہ جمایا جو قرآن وسنت کے خلاف ہو یا کسی کے متعلق اپنے دل میں بلا دلیل کوئی الزام قائم کر لیا تو اس سوال کے نتیجہ میں گرفتار عذاب ہوگا قیامت کے روز اللہ کی دی ہوئی ساری ہی نعمتوں کا سوال ہوگا۔ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ یعنی تم سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی سب نعمتوں کا سوال ہوگا، کان. آنکھ. دل ان نعمتوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں اس لئے یہاں ان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

تفسیر قرطبی اور مظہری میں اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد آیا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، یعنی جس چیز کا تمہیں علم اور تحقیق نہیں اس پر عمل نہ کرو، اسکے متصل کان آنکھ اور دل سے سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بے تحقیق مثلاً کسی شخص پر کوئی الزام لگایا اور بلا تحقیق کسی بات پر عمل کیا اگر وہ ایسی چیز سے متعلق ہے جو کان سے سنی جاتی ہو تو کان سے سوال ہوگا اور آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ اور دل سے سمجھنے کی چیز ہے تو دل سے سوال ہوگا کہ یہ شخص اپنے الزام اور اپنے دل میں جمائے ہوئے خیال میں سچا ہے یا جھوٹا اس پر انسان کے یہ اعضا رخود شہادت دینگے جو حشر کے میدان میں بے تحقیق الزام لگانیوالے

اور بے تحقیق باتوں پر عمل کرنے والے کے لئے بڑی رسوائی کا سبب بنے گا جیسا کہ سورۂ یٰسین میں ہے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یعنی آج قیامت کے دن ہم مجرموں کے مونہوں پر مہر لگا کر بند کر دیں گے اور ان کے ہاتھ بولیں گے اور پاؤں گواہی دیں گے کہ اس نے ان اعضاء سے کیا کیا کام اچھے یا برے لئے ہیں)۔

یہاں کان، آنکھ اور دل کی تخصیص شاید اس بناء پر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ حواس اور دل کا شعور و ادراک اسی لئے بخشا ہے کہ جو خیال یا عقیدہ دل میں آئے ان حواس اور ادراک کے ذریعہ اسکو جانچ سکے کہ یہ صحیح ہے تو اس پر عمل کرے اور غلط ہے تو باز رہے جو شخص ان سے کام لئے بغیر بے تحقیق باتوں کی پیروی میں لگ گیا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی۔

پھر وہ حواس جن کے ذریعہ انسان مختلف چیزوں کو معلوم کرتا ہے پانچ ہیں۔ کان، آنکھ، ناک، زبان کی قوتیں اور پورے بدن میں وہ احساس جس سے کسی چیز کا سرد و گرم وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے مگر عادۃً زیادہ معلومات انسان کو کان یا آنکھ سے ہوتی ہیں ناک سے سونگھنے اور زبان سے چکھنے، ہاتھ وغیرہ سے چھونے کے ذریعہ جن چیزوں کا علم ہوتا ہے وہ سننے دیکھنے والی چیزوں کی نسبت سے بہت کم ہے اس جگہ حواس خمسہ میں سے صرف دو کے ذکر پر اکتفاء کرنا شاید اسی کی وجہ سے ہو پھر ان میں بھی کان کو آنکھ پر مقدم کیا گیا ہے اور قرآن کریم کے دوسرے مواقع میں بھی جہاں کہیں ان دونوں چیزوں کا ذکر آیا ہے انمیں کان ہی کو مقدم رکھا گیا ہے اس کا سبب بھی غالباً یہی ہے کہ انسان کی معلومات میں سب سے بڑا حصہ کان سے سنی ہوئی چیزوں کا ہوتا ہے آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزیں ان کی نسبت سے بہت کم ہیں۔

مذکورہ دو آیتوں میں سے دوسری آیت میں تیرھواں حکم یہ ہے کہ زمین پر اترا کر نہ چلو یعنی ایسی چال نہ چلو جس سے تکبر اور فخر و غرور ظاہر ہوتا ہو کہ یہ احمقانہ فعل ہے گویا زمین پر چل کر وہ زمین کو پھاڑ دینا چاہتا ہے جو اس کے بس میں نہیں اور تنکر چلنے سے بہت اونچا ہونا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے پہاڑ اس سے بہت اونچے ہیں تکبر دراصل انسان کے دل سے متعلق شدید کبیرہ گناہ ہے، انسان کے چال ڈھال میں جو چیزیں تکبر پر دلالت کرنے والی ہیں وہ بھی ناجائز ہیں، متکبرانہ انداز سے چلنا خواہ زمین پر زور سے نہ چلے اور تنکر اونچا نہ بنے بہر حال ناجائز ہیں تکبر کے معنی اپنے آپ کو دوسروں سے افضل و اعلیٰ سمجھنا اور دوسروں کو اپنے مقابلہ میں کمتر و حقیر سمجھنا ہے۔ حدیث میں اس پر سخت وعیدیں مذکور ہیں۔

امام مسلم نے بروایت حضرت عیاض بن حمار رضؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے پاس بذریعہ وحی یہ حکم بھیجا ہے کہ تواضع اور پستی اختیار کرو، کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی پر فخر اور اپنی بڑائی کا طرز اختیار نہ کرے اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں داخل

نہیں ہوگا وہ آدمی جس کے دل میں ذرہ کی برابر بھی تکبر ہوگا۔ (مظہری بحوالہ صحیح مسلم)

اور ایک حدیث قدسی میں بروایت ابوہریرہ رضؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری اِزار، جو شخص مجھ سے انکو چھیننا چاہے تو میں اسکو جہنم میں داخل کر دونگا (چادر اور ازار سے مراد لباس ہے اور اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے نہ جسمانی جسکے لئے لباس درکار ہو اس لئے اس سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفت کبریائی ہے جو شخص اس صفت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بننا چاہے وہ جہنمی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکبر کرنے والے قیامت کے دن چھوٹی چیونٹیوں کے برابر انسانوں کی شکل میں اٹھائے جاویں گے جنپر ہر طرف سے ذلت و خواری برستی ہوگی۔ ان کو جہنم کے ایک جیلخانہ کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام بولس ہے ان پر سب آگوں سے بڑی تیز آگ چڑھی ہوگی اور پینے کے لئے ان کو اہلِ جہنم کے بدن سے نکلا ہوا پیپ لہو دیا جائے گا (ترمذی بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ از مظہری)

اور حضرت فاروق اعظم رضؓ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو سربلند فرماتے ہیں تو وہ اپنے نزدیک تو چھوٹا مگر سب لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو ذلیل کرتے ہیں تو وہ خود اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے اور لوگوں کی نظر میں وہ کتے اور خنزیر سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ (مظہری)

احکام مذکورہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخری آیتیں فرمایا كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا یعنی مذکورہ تمام بُرے کام اللہ کے نزدیک مکروہ و ناپسند ہیں۔

مذکورہ احکام میں جو محرمات و منہیات ہیں ان کا بُرا اور ناپسند ہونا تو ظاہر ہے مگر انمیں کچھ احکام اوامر بھی ہیں جیسے والدین اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا اور وفائے عہد وغیرہ انہیں بھی چونکہ مقصود ان کی ضد سے بچنا ہے کہ والدین کی ایذا رسے رشتہ داروں کی قطع رحمی سے نقض عہد سے پرہیز کرے یہ چیزیں سب حرام و ناپسند ہیں اسلئے مجموعہ کو مکروہ فرمایا گیا ہے (بیان القرآن)

تنبیہ مذکورہ پندرہ آیتوں میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایک حیثیت سے اس سعی و عمل کی تشریح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوں جسکا ذکر اٹھارہ آیتوں سے پہلے آیا ہے وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا جسمیں یہ تبلایا گیا تھا کہ ہر سعی و عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں بلکہ صرف وہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیم کے مطابق ہو ان احکام میں اس مقبول سعی و عمل کے اہم ابواب کا ذکر آگیا ہے جسمیں پہلے حقوق اللہ کا پھر حقوق العباد کا بیان ہے۔

یہ پندرہ آیتیں پوری توریت کا خلاصہ ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا کہ پوری توریت کے احکام

سورۂ بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں جمع کر دیئے گئے ہیں (مظہری)

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ

یہ ہے اُن باتوں میں سے جو وحی بھیجی تیرے رب نے تیری طرف عقل کے کاموں سے اور نہ ٹھہرا اللہ کے

اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

سوا کسی اور کی بندگی پھر پڑے تو دوزخ میں الزام کھاکر دھکیلا جاکر

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ

کیا تم کو چُن کر دے دیئے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لئے کرلیا فرشتوں کو بیٹیاں

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

تم کہتے ہو بھاری بات اور پھیر پھیر کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں

لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ

تاکہ وہ سوچیں اور اُن کو زیادہ ہوتا ہے وہی بدکنا کہہ اگر ہوتے اُس کے

مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ

ساتھ اور حاکم جیسا یہ بتلاتے ہیں تو نکالتے صاحب عرش کی طرف

سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

راہ وہ پاک ہے اور برتر ہے اُن کی باتوں سے بے نہایت

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ

اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی اُن میں ہے اور کوئی

مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ

چیز نہیں جو نہیں پڑھتی خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے اُن کا پڑھنا

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

بے شک وہ ہے تحمل والا بخشنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یہ باتیں (یعنی احکام مذکورہ) اس حکمت میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ

نے آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں (اور اے مخاطب) اللہ برحق کے ساتھ کوئی اور معبود تجویز نہ کرنا ورنہ تو الزام خوردہ اور راندہ ہو کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا (احکام مذکورہ کو شروع بھی توحید کے مضمون سے کیا گیا تھا ختم بھی اسی پر کیا گیا اور آگے بھی اسی مضمون توحید کا بیان ہے کہ جب اوپر شرک کا تبیح اور باطل ہونا سن لیا) تو کیا (پھر بھی ایسی باتوں کے قائل ہوتے ہو جو توحید کے خلاف ہیں مثلاً یہ کہ) تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو (اپنی) بیٹیاں بنائی ہیں (جیسا کہ عرب کے جاہل فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے جو دو وجہ سے باطل ہے اول تو اللہ کے لئے اولاد قرار دینا پھر اولاد بھی لڑکیاں جن کو لوگ اپنے لئے پسند نہیں کرتے ناکارہ سمجھتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف ایک اور نقص کی نسبت ہوتی ہے) بیشک تم بڑی بات کہتے ہو اور (افسوس تو یہ ہے کہ اس مضمونِ توحید اور شرک کے ابطال کو) ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کر دیا ہے تاکہ اچھی طرح سمجھ لیں اور مختلف طریقوں سے بار بار توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے باوجود توحید سے) ان کو نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے آپ (ابطال شرک کے لئے ان سے) فرمائیے کہ اگر اس (معبود برحق) کے ساتھ اور معبود بھی (شریک) ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس حالت میں عرش والے (حقیقی خدا) تک انھوں نے (یعنی دوسرے معبودوں نے کبھی کا) راستہ ڈھونڈ لیا ہوتا (یعنی جن کو تم اللہ کے ساتھ خدائی کا شریک قرار دیتے ہو اگر وہ واقعی شریک ہوتے تو عرش والے خدا پر چڑھائی کر دیتے اور راستہ ڈھونڈ لیتے اور جب خداؤں میں جنگ ہو جاتی تو دنیا کا نظام کس طرح چلتا جس کا ایک خاص نظام محکم کے ساتھ چلنا ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے اس لئے نظام عالم کا صحیح طور پر چلتے رہنا خود اسکی دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا اسکا شریک نہیں ہے اس سے ثابت ہوا کہ) یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور اس سے بہت زیادہ بالا و برتر ہے (وہ ایسا پاک ہے کہ) تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے (فرشتے۔ آدمی اور جن) ان میں (موجود) ہیں (سب کے سب قالاً یا حالاً) اس کی پاکی بیان کر رہے ہیں اور (یہ تسبیح صرف عقل والے انسان اور جن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زمین و آسمان کی) کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح (یا پاکی بیان کرنے کو) سمجھتے نہیں ہو بیشک وہ بڑا حلیم بڑا غفور ہے۔

معارف و مسائل

توحید کی جو دلیل آیت اِذًا لَّابْتَغَوْا میں بیان فرمائی ہے کہ اگر تمام کائنات عالم کا خالق مالک اور منفرد صرف ایک ذات اللہ کی نہ ہو بلکہ اس خدائی میں اور بھی شریک ہوں تو ضرور ہے کہ انہیں کبھی اختلاف بھی ہوگا اور اختلاف کی صورت میں سارا نظام عالم برباد ہو جائے گا کیونکہ ان سب میں دائمی

صلح ہونا اور ہمیشہ باقی رہنا عادۃً ممتنع ہے یہ دلیل یہاں اگرچہ اقناعی انداز میں بیان کی گئی ہے مگر علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کا برہانی اور منطقی ہونا بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کے تسبیح کرنے کا مطلب

ان چیزوں میں فرشتے سب کے سب اور انسان و جن جو مومن ہیں ان کا اللہ کی تسبیح کرنا تو بدیہی ہے سبھی جانتے ہیں کافر انسان اور جن جو بظاہر تسبیح نہیں کرتے اسی طرح عالم کی دوسری چیزیں جنکو کہا جاتا ہے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے ان کے تسبیح پڑھنے کا مطلب کیا ہے بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حال یعنی ان کے حالات کی شہادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا مجموعی حال بتلا رہا ہے کہ وہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہے نہ اپنے باقی رہنے میں، وہ کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے یہی شہادت حال اس کی تسبیح ہے۔

مگر دوسرے اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح اختیاری تو صرف فرشتے اور مومن جن وانس کے لئے مخصوص ہے مگر تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنا تسبیح خواں بنا رکھا ہے کافر بھی اوّل تو عموماً خدا تعالیٰ کو مانتے اور اس کی عظمت کے قائل ہیں اور جو مادہ پرست دہریئے یا آجکل کے کمیونسٹ خدا کے وجود کے بظاہر قائل نہیں مگر ان کے وجود کا ہر جز جز جبری طور پر اللہ کی تسبیح کر رہا ہے جیسے درخت اور پتھر مٹی وغیرہ سب چیزیں تسبیح حق میں مشغول ہیں مگر ان کی یہ تسبیح جو جبری اور تکوینی ہے یہ عام لوگ سنتے نہیں، قرآن کریم کا ارشاد وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ہر ذرہ ذرہ کی تسبیح تکوینی کوئی ایسی چیز ہے جسکو عام انسان سمجھ نہیں سکتے تسبیح حالی کو تو اہل عقل و فہم جان سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف حالی نہیں حقیقی ہے مگر ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ (ذکرہ القرطبی)

حدیث میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ مذکور ہے کہ آپکی مٹھی میں کنکروں کا تسبیح کرنا صحابہ کرام نے کانوں سے سنا اس کا معجزہ ہونا تو ظاہر ہے مگر خصائص کبریٰ میں شیخ جلال الدین سیوطی رحؒ نے فرمایا کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا حضورؐ کا معجزہ نہیں وہ تو جہاں کہیں بھی ہیں تسبیح پڑھتی ہیں بلکہ معجزہ آپکا یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی وہ تسبیح کانوں سے سنی جانے لگی۔

امام قرطبی نے اسی تحقیق کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر قرآن وسنت کے بہت دلائل پیش کئے ہیں مثلاً سورۂ صٓ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ (یعنی ہم نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ وہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح و شام تسبیح کرتے ہیں اور

سورۂ بقرہ میں پہاڑوں کے پتھروں کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ (یعنی پہاڑ کے بعض پتھر اللہ کے خوف سے نیچے گر جاتے ہیں) جس سے پتھروں میں شعور و ادراک اور خدا کا خوف ہونا ثابت ہوا اور سورۂ مریم میں نصاریٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے کی تردید میں فرمایا وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا یعنی یہ لوگ اللہ کیلئے بیٹا تجویز کرتے ہیں انکے اس کلمہ کفر سے پہاڑ دہشت زدہ ہوتے ہیں اور ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ گرنے لگتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ خوف انکے شعور و ادراک کا پتہ دیتا ہے اور شعور و ادراک کے بعد تسبیح کرنا کوئی امر مستبعد نہیں رہتا۔

اور حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے کہ اے فلاں کیا تیرے اوپر کوئی ایسا آدمی گذرا ہے جو اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ اگر وہ کہتا ہے کہ ہاں تو یہ پہاڑ اس سے خوش ہوتا ہے اسپر استدلال کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت پڑھی وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا اور پھر فرمایا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ پہاڑ کلمات کفر سننے سے متاثر ہوتے ہیں ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ باطل کلمات کو سنتے ہیں حق بات اور ذکر اللہ نہیں سنتے اور اس سے متاثر نہیں ہوتے (قرطبی بحوالہ دقائق ابن مبارک) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی جن اور انسان اور درخت اور پتھر اور ڈھیلا ایسا نہیں جو موذن کی آواز سنتا ہے اور قیامت کے روز اس کے ایمان اور نیک ہونے کی شہادت نہ دے (مؤطا امام مالک و سنن ابن ماجہ بروایت ابی سعید خدری رضؓ)

امام بخاری رحؒ نے بروایت حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود نقل کیا ہے کہ ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے جبکہ وہ کھایا جارہا ہو۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر رضؓ بن سمرہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت و نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد حجر اسود ہے واللہ اعلم۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ روایات حدیث اس طرح کے معاملات میں بہت ہیں اور اسطوانہ حنانہ کی حکایت تو عام مسلمانوں کی زبان زد ہے جس کے رونے کی آواز صحابۂ کرام نے سنی جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے وقت اسکو چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینا شروع کیا۔

ان روایات کے بعد اسمیں کیا بُعد رہجاتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز میں شعور و ادراک ہے اور ہر چیز حقیقی طور پر اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور ابراہیم رحؒ نے فرمایا کہ یہ تسبیح عام ہے ذی روح چیزوں میں بھی اور غیر ذی روح چیزوں میں بھی یہاں تک کہ دروازے کے کواڑوں کی آواز میں بھی تسبیح

ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ اگر تسبیح سے مراد تسبیح حالی ہوتی تو مذکورہ آیت میں حضرت داؤد کی کیا تخصیص رہتی تسبیح حالی تو ہر انسان ذی شعور ہر چیز سے معلوم کر سکتا ہے اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ تسبیح قولی تھی انتہیٰ اور جیسا کہ بحوالہ خصائص کبریٰ اوپر نقل کیا ہے کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا معجزہ نہیں وہ ہر جگہ ہر حال اور ہر وقت میں عام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ تھا کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی تسبیح اس طرح ہوگئی کہ عام لوگوں نے کانوں سے سنا۔ اسی طرح پہاڑوں کی تسبیح بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ اسی حیثیت سے ہے کہ ان کے معجزہ سے وہ تسبیح کانوں سے سننے کے قابل ہوگئی واللہ اعلم ۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا

اور جب تو پڑھتا ہے قرآن کر دیتے ہیں ہم بیچ میں تیرے اور اُن لوگوں کے جو نہیں

يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝۴۵ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

مانتے آخرت کو ایک پردہ چھپا ہوا اور ہم رکھتے ہیں اُن کے دلوں پر

اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ

پردہ کہ اُس کو نہ سمجھیں اور اُن کے کانوں میں بوجھ اور جب ذکر کرتا ہے تو

رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶

قرآن میں اپنے رب کا اکیلا کر کر بھاگتے ہیں اپنی پیٹھ پر بدک کر

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى

ہم خوب جانتے ہیں جس واسطے وہ سنتے ہیں جس وقت کان رکھتے ہیں تیری طرف اور جب وہ مشورت کرتے

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۴۷ اُنْظُرْ

ہیں جبکہ کہتے ہیں یہ بے انصاف جس کے کہے پر تم چلتے ہو وہ نہیں ہے مگر ایک مرد جادو کا مارا دیکھ لے

كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۴۸

کیسے جماتے ہیں تجھ پر مثلیں اور بہکتے پھرتے ہیں سو راہ نہیں پا سکتے ۔

خلاصۂ تفسیر

سابقہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ توحید کا مضمون قرآن مجید میں مختلف عنوانات اور مختلف دلائل کے

ساتھ بار بار ذکر ہونے کے باوجود یہ بدنصیب مشرکین اسکو نہیں مانتے، ان آیات میں ان کے نہ ماننے کی وجہ بتلائی گئی ہے کہ یہ ان آیات میں غور و فکر ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے نفرت اور تمسخر کرتے ہیں اس لئے ان کو علم حقیقت سے اندھا کر دیا گیا ہے۔ خلاصۂ تفسیر یہ ہے۔

اور جب آپ (تبلیغ کے لئے) قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور وہ پردہ یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ اس (قرآن کے مقصود) کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ ڈال دیتے ہیں (اس سے کہ وہ ان کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے سنیں مطلب یہ ہے کہ وہ پردہ ان کی نافہمی کا اور اس کا ہے کہ وہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے جس سے وہ آپ کی شان نبوّت کو پہچان سکیں) اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے رب (کے اوصاف و کمالات) کا ذکر کرتے ہیں (اور یہ لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں انہیں وہ اوصاف ہیں نہیں) تو وہ لوگ (اپنی نافہمی بلکہ کج فہمی کے سبب اس سے) نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں (آگے ان کے اس عمل باطل پر وعید ہے کہ) جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ (قرآن کو) سنتے ہیں (کہ وہ غرض محض اعتراض اور طعن و نکتہ چینی کی ہے) اور جس وقت یہ لوگ (قرآن سننے کے بعد) آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں (ہم اسکو بھی خوب جانتے ہیں) جبکہ یہ ظالم یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ (یعنی ان کی برادری میں سے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگ گئے ہیں) محض ایسے شخص کا ساتھ دے رہے ہو جس پر جادو کا (خاص) اثر (یعنی جنوں کا) ہو گیا ہے (یعنی یہ جو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب مالیخولیا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ذرا) آپ دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسے کیسے القاب تجویز کرتے ہیں سو یہ لوگ (بالکل ہی) گمراہ ہو گئے تو (اب حق کا) راستہ نہیں پا سکتے (کیونکہ ایسی ہٹ دھرمی اور ضد اور پھر اللہ کے رسول کے ساتھ ایسا معاملہ اس سے انسان کی استعداد فہم و ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔)

معارف و مسائل

پیغمبر پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے

کسی نبی اور پیغمبر پر جادو کا اثر ہو جانا ایسا ہی ممکن ہے جیسا بیماری کا اثر ہو جانا اس لئے کہ انبیا علیہم السلام بشری خواص سے الگ نہیں ہوتے جیسے ان کو زخم لگ سکتا ہے، بخار اور درد ہو سکتا ہے ایسے ہی جادو کا اثر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی خاص اسباب طبعیہ جنات وغیرہ کے اثر سے ہوتا ہے اور حدیث میں ثابت بھی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا اثر ہو گیا تھا آخری آیت میں جو کفار نے آپ کو مسحور کہا اور قرآن نے اسکی تردید کی اسکا حاصل

وہ ہے جس کی طرف خلاصۂ تفسیر میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان کی مراد درحقیقت مسحور کہنے سے مجنون کہنا تھا اسی کی تردید قرآن نے فرمائی ہے اس لئے حدیث سحر اسکے خلاف اور متعارض نہیں۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دوسری آیت میں جو مضمون آیا ہے اسکا ایک خاص شان نزول ہے جو قرطبی نے سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن میں سورۂ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی جس میں ابولہب کی بیوی کی بھی مذمت مذکور ہے تو اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں گئی اس وقت صدیق اکبر مجلس میں موجود تھے اس کو دور سے دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ یہاں سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ عورت بڑی بدزبان ہے یہ ایسی باتیں کہے گی جس سے آپ کو تکلیف پہونچے گی، آپ نے فرمایا نہیں اس کے اور میرے درمیان اللہ تعالیٰ پردہ حائل کر دیں گے چنانچہ وہ مجلس میں پہنچی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی تو صدیق اکبر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آپ کے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے، صدیق اکبر نے فرمایا کہ واللہ وہ تو کوئی شعر ہی نہیں کہتے جسمیں عادۃً ہجو کی جاتی ہے تو وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم بھی انکی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو اس کے چلے جانے کے بعد صدیق اکبر نے عرض کیا کہ کیا اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ میرے اور اسکے درمیان پردہ کرتا رہا۔

دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کی آنکھوں سے مستور ہونا چاہتے تو قرآن کی تین آیتیں پڑھ لیتے تھے اس کے اثر سے کفار آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے وہ تین آیتیں یہ ہیں، ایک آیت سورۂ کہف میں ہے یعنی اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ دوسری آیت سورۂ نحل میں ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ اور تیسری آیت سورۂ جاثیہ میں ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا اسکو کسی ضرورت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا پھر رومی کفار نے اسکو ستایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا ان لوگوں نے اسکا تعاقب کیا۔ اس شخص کو وہ روایت یاد آگئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستہ پر یہ چل رہے تھے اسی راستہ پر دشمن گذر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے

امام ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت کعب سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے رَے کے رہنے والے ایک شخص کو بتلائی۔ اتفاق سے دیلم کے کفار نے اسکو گرفتار کر لیا کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا پھر

ایک روز موقع پاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ اس کے تعاقب میں نکلے مگر اس شخص نے بھی یہ تین آیتیں پڑھ لیں اس کا یہ اثر ہوا کہ اللہ نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالدیا کہ وہ اسکو نہ دیکھ سکے حالانکہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ان کے کپڑے ان کے کپڑوں سے چھو جاتے تھے۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ ان تینوں کے ساتھ وہ آیات سورۂ یٰسین کی بھی ملالی جائیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت پڑھا تھا جبکہ مشرکین مکہ نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا آپ نے یہ آیات پڑھیں اور ان کے درمیان سے نکلتے ہوئے چلے گئے بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گئے انہیں سے کسی کو خبر نہیں ہوئی وہ آیات سورۂ یٰسین کی یہ ہیں۔ یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مجھے خود اپنے ملک اندلس میں قرطبہ کے قریب قلعہ منثور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میں دشمن کے سامنے بھاگا اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا دشمن نے دو گھوڑے سوار میرے تعاقب میں بھیجے اور میں بالکل کھلے میدان میں تھا کوئی چیز پردہ کرنے والی نہ تھی مگر میں سورۂ یٰسین کی یہ آیتیں پڑھ رہا تھا یہ دونوں سوار میری برابر سے گذرے پھر جہاں سے آئے تھے یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ یہ شخص کوئی شیطان ہے کیونکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے اللہ تعالیٰ نے ان کو مجھ سے اندھا کر دیا تھا۔ (قرطبی)

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہو جائیں ہڈیاں اور چورا چورا پھر اٹھیں گے نئے بن کر

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ

تو کہہ تم ہو جاؤ پتھر یا لوہا یا کوئی خلقت جس کو مشکل سمجھو اپنے جی میں

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ

پھر اب کہیں گے کون لوٹا کر لائے گا ہم کو کہہ جس نے پیدا کیا تم کو پہلی بار

فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى

پھر اب مٹکائیں گے تیری طرف اپنے سر اور کہیں گے کب ہوگا یہ تو کہہ شاید

اَنۡ یَّکُوۡنَ قَرِیۡبًا ﴿۵۱﴾ یَوۡمَ یَدۡعُوۡکُمۡ فَتَسۡتَجِیۡبُوۡنَ بِحَمۡدِہٖ

نزدیک ہی ہوگا جس دن تم کو پکارے گا پھر چلے آؤ گے اُس کی تعریف کرتے ہوئے

وَ تَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۵۲﴾ ع

اور اٹکل کروگے کہ دیر نہیں لگی تم کو مگر تھوڑی

ع ۱۲ ۵

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور (ہڈیوں کا بھی) چورا (یعنی ریزہ ریزہ) ہو جاویں گے تو کیا (اس کے بعد قیامت میں) ہم از سرِ نو پیدا اور زندہ کئے جاویں گے (یعنی اوّل تو مرکر زندہ ہونا ہی مشکل ہے کہ جسم میں زندگی کی صلاحیت نہیں رہی پھر جبکہ وہ جسم بھی ریزہ ریزہ ہوکر اس کے اجزاء منتشر ہو جاویں تو اس کے زندہ ہونے کو کون مان سکتا ہے) آپ (انکے جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم تو ہڈیوں ہی کی حیات کو بعید سمجھتے ہو اور ہم کہتے ہیں کہ) تم پتھر یا لوہا یا اور کوئی ایسی مخلوق ہوکر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں (زندگی کی صلاحیت سے) بہت ہی بعید ہو (پھر دیکھو کہ زندہ کئے جاؤ گے یا نہیں اور پتھر اور لوہے کو بعید از حیات قرار دینا اس لئے ظاہر ہے کہ انمیں کسیوقت بھی حیات حیوانی نہیں آتی بخلاف ہڈیوں کے کہ ان میں پہلے اس وقت تک حیات رہ چکی ہے تو جب پتھر لوہے کا زندہ کرنا اللہ کے لئے مشکل نہیں تو اعضائے انسانی کو دوبارہ زندگی بخشدینا کیا مشکل ہوگا اور آیت میں لفظ کُوۡنُوۡا جو صیغہ امر ہے اس سے مراد یہاں امر نہیں بلکہ ایک تعلیق اور شرط ہے کہ اگر تم بالفرض پتھر اور لوہا بھی ہوجاؤ تو اللہ تعالیٰ پھر بھی تمہیں دوبارہ زندہ کردینے پر قادر ہیں) اس پر وہ پوچھیں گے کہ وہ کون ہے جو دوبارہ ہم کو زندہ کریگا آپ فرما دیجئے کہ وہ وہ ہے جسنے تم کو اوّل بار میں پیدا کیا تھا (اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزیں درکار ہیں ایک مادہ اور محل میں وجود کی قابلیت دوسرے اسکو وجود میں لانے کے لئے قوت فاعلہ پہلا سوال محل کی قابلیت کے متعلق تھا کہ وہ مرنے کے بعد زندگی کے قابل نہیں رہا اس کا جواب دیکر محل کی قابلیت ثابت کر دی گئی تو یہ دوسرا سوال فاعلیت کے متعلق کیا گیا کہ ایسا کونسا قوت و قدرت والا ہے جو اپنی قوت فاعلیت سے یہ عجیب کام کرسکے اس کے جواب میں فرمادیا گیا کہ جسنے پہلے تمہیں ایسے مادے سے پیدا کیا تھا جسمیں قابلیت حیات کا کسی کو گمان بھی نہ تھا تو اس کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے اور جب قابل و فاعل دونوں کا سوال حل ہوگیا تو اب یہ لوگ زمانۂ وقوع کی تحقیق کے لئے) آپ کے آگے سر ہلا ہلا کر کہیں گے کہ (اچھا یہ بتلایئے کہ) یہ (زندہ ہونا)

کب ہوگا آپ فرما دیجئے کہ عجب نہیں کہ یہ قریب ہی آپہونچا ہو (آگے ان حالات کا بیان ہے جو اس نئی زندگی کے وقت پیش آویں گے) یہ اس روز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم کو (زندہ کرنے اور میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے فرشتہ کے ذریعہ) پکارے گا اور تم (باضطرار) اس کی حمد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کروگے (یعنی زندہ بھی ہوجاؤ گے اور میدان حشر میں جمع بھی ہوجاؤگے) اور (اس روز کی ہول اور ہیبت دیکھ کر تمہارا یہ حال ہوجاویگا کہ دنیا کی ساری عمر اور قبر میں رہنے کی ساری مدت کی نسبت) تم یہ خیال کروگے کہ تم بہت ہی کم (مدت دنیا میں) رہے تھے (کیونکہ دنیا اور قبر میں آج کی ہولناکی کے مقابلہ میں پھر کچھ نہ کچھ راحت تھی اور راحت کا زمانہ انسان کو مصیبت پڑنے کے وقت بہت مختصر معلوم ہوا کرتا ہے)

معارف و مسائل

یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ لفظ یَدْعُوْكُمْ دعاء سے مشتق ہے جس کے معنے آواز دیکر بلانے کے ہیں اور معنے یہ ہیں کہ جس روز اللہ تعالیٰ تم سب کو محشر کی طرف بلائے گا اور یہ بلانا بواسطہ فرشتہ اسرافیل کے ہوگا کہ جب وہ دوسرا صور پھونکیں گے تو سب مردے زندہ ہوکر میدان حشر میں جمع ہوجائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زندہ ہونے کے بعد سب کو میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے آواز دیجائے (قرطبی)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے روز تمکو تمہارے اپنے اور باپ کے نام سے پکارا جائے گا اس لئے اپنے نام اچھے رکھا کرو (بیہودہ ناموں سے پرہیز کرو) (قرطبی)

محشر میں کفار بھی اللہ کی حمد و ثنا کرتے اٹھیں گے

فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ - استجابت کے معنے کسی کے بلانے پر حکم کی تعمیل کرنے اور حاضر ہوجانے کے ہیں معنے یہ ہیں کہ میدان حشر میں جب تم کو بلایا جاویگا تو تم سب اس آواز کی اطاعت کروگے اور جمع ہوجاؤ گے بحمدہ یہ تستجیبون کی ضمیر فاعل کا حال ہے بمعنے حامدین مراد یہ ہے کہ اس میدان میں آنے کے وقت تم سب کے سب اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے حاضر ہوگے۔

اس آیت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مومن و کافر سبکا یہی حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے کیونکہ اس آیت میں اصل خطاب کفار ہی کو ہے انھیں سے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے کہ سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے ائمہ تفسیر میں حضرت سعید بن جُبَیر رح نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلتے وقت سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے مگر اس وقت کا حمد و ثنا،

کرنا انکو کوئی نفع نہیں دیگا (قرطبی) کیونکہ یہ لوگ جب مرنے کے بعد زندگی دیکھیں گے تو غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے الفاظ نکلیں گے وہ کوئی ایسا عمل نہیں ہوگا جس پر جزاء مرتب ہو۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس حال کو مومنین کیلئے مخصوص بتلایا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ کفار کے متعلق تو قرآن کریم میں یہ ہے کہ جب وہ زندہ کئے جاویں گے تو یہ کہیں گے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (اے افسوس ہمیں کس نے ہماری قبر سے زندہ کرا اٹھایا ہے) اور دوسری آیت میں ہے کہ یہ کہیں گے یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ - (یعنی اے حسرت وافسوس اسپر کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں بڑی کوتاہی کی ہے)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہوسکتا ہو کہ شروع میں سب کے سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں بعد میں جب کافروں کو مومنین سے الگ کر دیا جاویگا جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیت میں ہے وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّہَا الْمُجْرِمُوْنَ - (اے مجرمو تم آج سب الگ ممتاز ہوکر جمع ہو جاؤ) اس وقت ان کی زبانوں سے وہ کلمات بھی نکلیں گے جو آیات مذکورہ میں آئے ہیں اور یہ بات قرآن وسنت کی بیشمار تصریحات سے معلوم اور ثابت ہے کہ محشر کے مواقف مختلف ہونگے ہر موقف میں لوگوں کے حال مختلف ہوں گے امام قرطبی نے فرمایا کہ حشر میں اٹھنے کی ابتدا بھی حمد سے ہوگی سب کے سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے۔ اور سب معاملات کا خاتمہ بھی حمد پر ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَقُضِیَ بَیْنَہُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یعنی سب اہل محشر کا فیصلہ حق کے مطابق کر دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ حمد وشکر ہے اللہ رب العالمین کا)

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ

اور کہہ دے میرے بندوں کو کہ بات وہی کہیں جو بہتر ہو شیطان جھگڑپ کرواتا ہے

بَیْنَہُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّکُمْ

اُن میں شیطان ہے انسان کا دشمن صریح تمہارا رب

اَعْلَمُ بِکُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ ؕ وَمَآ

خوب جانتا ہے تم کو اگر چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تم کو عذاب دے اور تجھ کو

اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْہِمْ وَکِیْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّکَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ

نہیں بھیجا ہم نے اُن پر ذمہ لینے والا اور تیرا رب خوب جانتا ہے اُن کو جو آسمانوں میں ہیں

وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝۵۵

اور زمین میں اور ہم نے افضل کیا ہے بعضے پیغمبروں کو بعضوں سے اور دی ہم نے داؤد کو زبور -

خلاصۂ تفسیر

اور آپ میرے (مسلمان) بندوں سے کہہ دیجئے کہ (اگر کفار کو جواب دیں تو) ایسی بات کہا کریں جو (اخلاق کے اعتبار سے) بہتر ہو (یعنی اسمیں سب وشتم اور تشدد اور اشتعال انگیزی نہ ہو کیونکہ) شیطان (سخت بات کہلوا کر) لوگوں میں فساد ڈلوا دیتا ہے۔ واقعی شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے (اور وجہ اس تعلیم کی یہ ہے کہ سختی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور ہدایت و گمراہی تو مشیت ازلیہ کے تابع ہے) تم سبکا حال تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے (کہ کون کس قابل ہے بس) اگر وہ چاہے تو تم (میں سے جس) پر (چاہے) رحمت فرمادے (یعنی ہدایت کردے) یا اگر وہ چاہے تو تم (میں سے جس) کو (چاہے) عذاب دینے لگے (یعنی اسکو توفیق اور ہدایت نہ دے) اور ہم نے آپ (تک) کو ان (کی ہدایت) کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا (اور جب باوجود نبی ہونے کے آپ ذمہ دار نہیں بنائے گئے تو دوسروں کی کیا مجال ہے اس لئے کسی کے درپے ہونا اور سختی کرنا بے فائدہ ہے)

اور آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو (بھی) جو کہ آسمانوں میں ہیں اور (ان کو بھی جو کہ) زمین میں ہیں (آسمان والوں سے مراد فرشتے اور زمین والوں سے مراد انسان اور جنات ہیں مطلب یہ ہی کہ ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں سے کسکو نبی اور رسول بنانا مناسب ہے کسکو نہیں اس لئے اگر ہم نے آپکو نبی بنا دیا تو اسمیں تعجب کی کیا بات ہے) اور (اسیطرح اگر ہم نے آپکو دوسروں پر فضیلت دیدی تو تعجب کیا ہے کیونکہ) ہم نے (پہلے بھی) بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے (اور اسی طرح اگر ہم نے آپکو قرآن دیا تو تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ آپ سے پہلے) ہم داؤد کو زبور دے چکے ہیں۔

معارف و مسائل

بد زبانی اور سخت کلامی کفار کیساتھ بھی درست نہیں پہلی آیت میں جو مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کیا گیا ہے اسکی مراد یہ ہے کہ بے ضرورت سختی نہ کی جاوے اور ضرورت ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے ۔

کہ بے حکم شرع آب خوردن خطاست   وگر خون بفتوی بریزی رواست

قتل و قتال کے ذریعہ کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جا سکتا ہے اس لئے اسکی اجازت ہے۔ گالی گلوچ اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ کسیکو ہدایت ہوتی ہے اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ میں نازل ہوئی جسکی صورت یہ تھی کہ کسی شخص نے حضرت فاروق اعظم رضؓ کو گالی دی اسکے جواب میں انھوں نے بھی اسکو سخت جواب دیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا اس کے نتیجہ میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور قرطبی کی تحقیق یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو آپسمیں خطاب کرنے کے متعلق ہدایت ہے کہ باہم اختلاف کے وقت سخت کلامی نہ کیا کریں کہ اس کے ذریعہ شیطان ان کے آپسمیں جنگ و فساد پیدا کرا دیتا ہے۔

وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا - یہاں خاص طور پر زبور کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ زبور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خبر دیگئی ہے کہ آپ رسول و پیغمبر ہونے کے ساتھ صاحب ملک و سلطنت بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ اور موجودہ زبور میں بھی بعض حضرات نے اس کا مذکور ہونا ثابت کیا ہے۔ (تفسیر حقانی)

امام بغوی رحؒ نے اپنی تفسیر میں اس جگہ لکھا ہے کہ زبور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اسمیں ایک سو پچاس سورتیں ہیں اور تمام سورتیں صرف دعاء اور حمد و ثناء پر مشتمل ہیں انمیں حلال و حرام اور فرائض و حدود کا بیان نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ
کہہ پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اُس کے سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف کو

عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰى
تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود ڈھونڈھتے ہیں اپنے

رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ
رب تک وسیلہ کہ کونسا بندہ بہت نزدیک ہے اور اُمید رکھتے ہیں اسکی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں

عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَاِنْ مِّنْ
اسکے عذاب سے بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اور کوئی بستی نہیں

قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا
جس کو ہم خراب نہ کردیں گے قیامت سے پہلے یا آفت ڈالیں گے اُس پر سخت
شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾
آفت۔ یہ ہے کتاب میں لکھا گیا۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان لوگوں سے) فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے سوا (معبود) قرار دے رہے ہو (جیسے فرشتے اور جنات) ذرا ان کو (اپنی تکلیف دور کرنے کے لئے) پکارو تو سہی سو وہ نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا (مثلاً تکلیف کو بالکل دور نہ کرسکیں کچھ ہلکا ہی کر دیں) یہ لوگ کہ جنکو مشرکین (اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لئے) پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف (پہونچنے کا) ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے (یعنی وہ خود ہی اطاعت وعبادت میں مشغول ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب میسر ہوجائے اور چاہتے ہیں کہ تقرب کا درجہ اور بڑھ جائے) اور وہ اسکی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے (نافرمانی کی صورت میں) ڈرتے ہیں واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کی چیز (مطلب یہ ہے کہ جب وہ خود عابد ہیں تو معبود کیسے ہو سکتے ہیں اور جب وہ خود ہی اپنی ضروریات اور تکلیف کے دور کرنے میں اللہ تعالےٰ کے محتاج ہیں تو وہ دوسروں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کیا کرسکتے ہیں) اور (کفار کی) ایسی کوئی بستی نہیں جسکو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں (یا قیامت کے روز) اسکے رہنے والوں کو (دوزخ کا) سخت عذاب نہ دیں یہ بات کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے (پس اگر کوئی کافر یہاں ہلاک ہونے سے بچ گیا تو قیامت کے روز کی بڑی آفت سے نہ بچیگا اور طبعی موت سے ہلاک ہونا تو کفار کے ساتھ مخصوص نہیں سبھی مرتے ہیں اسلئے بستیوں کے ہلاک ہونیسے اس جگہ مراد یہ ہے کہ کسی عذاب اور آفت کے ذریعہ ہلاک کیا جائے تو خلاصہ یہ ہوا کہ کفار پر کبھی تو دنیا میں عذاب بھیجدیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ ہوگا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی عذاب نہ آیا تو آخرت کے عذاب سے بہر حال نجات نہیں۔

معارف ومسائل

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ لفظ وسیلہ کے معنی ہر وہ چیز جسکو کسی دوسرے تک پہنچنے

کا ذریعہ بنایا جائے اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علم و عمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کی ہر وقت رعایت رکھو اور احکام شرعیہ کی پابندی کرے مطلب یہ ہے کہ یہ سب حضرات اپنے عمل صالح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔

یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ رجاء اور خوف یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہنا اور ڈرتے بھی رہنا یہ انسان کے دو مختلف حال ہیں جب یہ دونوں برابر درجے میں رہیں تو انسان صحیح راستہ پر چلتا رہتا ہے اور اگر انہیں سے کوئی ایک مغلوب ہو جائے تو اسی مقدار سے انسان کے احوال میں خرابی آجاتی ہے۔ (قرطبی)

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَ

اور ہم نے اس لئے موقوف کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں نے اُن کو جھٹلایا اور

اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا

ہم نے دی ثمود کو اونٹنی اُن کے سمجھانے کو پھر ظلم کیا اُس پر اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں سو

تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا

ڈرانے کو اور جب کہہ دیا ہم نے تجھ سے کہ تیرے رب نے گھیر لیا ہے لوگوں کو اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو

الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ

دکھلایا ہم نے سو جانچنے کو لوگوں کے اور ایسے ہی وہ درخت جس پر پھٹکار ہے قرآن میں

وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ ع

اور ہم اُن کو ڈراتے ہیں تو اُن کو زیادہ ہوتی ہے بڑی شرارت۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم کو خاص (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ ان (کے ہم جنس فرمائشی معجزات) کی تکذیب کر چکے ہیں (اور مزاج و طبائع سب کافروں کے ملتے جلتے ہیں تو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی تکذیب کریں گے) اور (نمونے کے طور پر ایک قصہ بھی سن لو کہ) ہم نے قوم ثمود کو (انکی فرمائش کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر) اونٹنی دی تھی (جو عجیب طور پر پیدا ہوئی اور) جو کہ (معجزہ ہونے کے سبب فی نفسہ) بصیرت کا ذریعہ تھی سو ان لوگوں

نے (اس سے بصیرت حاصل نہ کی بلکہ) اسکے ساتھ ظلم کیا (کہ اسکو قتل کر ڈالا تو ظاہر یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کے فرمائشی معجزے دکھلائے گئے تو یہ بھی ایسا ہی کریں گے) اور ہم ایسے معجزات کو صرف (اس بات سے) ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں (کہ اگر یہ فرمائشی معجزہ دیکھکر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو فوراً ہلاک کر دئے جاؤ گے اور ہوتا یہی رہا ہے کہ جن لوگوں کے فرمائشی معجزات دکھلائے گئے وہ ایمان تو لائے نہیں یہی معاملہ ان کی ہلاکت اور عذاب عام کا سبب بنگیا اور حکمت الہیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لوگ ابھی ہلاک نہ کئے جاویں اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھلائے جاتے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو پہلے پیش آچکا ہے جسکا ذکر یہ ہے کہ) آپ وہ وقت یاد کر لیجئے جبکہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپکا رب (اپنے علم سے) تمام لوگوں (کے احوال ظاہرہ و باطنہ موجودہ و مستقبلہ) کو محیط ہے (اور احوال مستقبلہ میں ان کا ایمان نہ لانا بھی اللہ تعالے کو معلوم ہے جسکی ایک دلیل انھیں کا یہ واقعہ ہے کہ) ہم نے (واقعہ معراج میں) جو تماشا (بحالت بیداری) آپکو دکھلایا تھا اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (یعنی زقوم جو طعام کفار ہے) ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا (یعنی ان لوگوں نے ان دونوں امر کو سنکر تکذیب کی، معراج کی تکذیب تو اس بنا پر کی کہ ایک رات کی قلیل مدت میں ملک شام جانا اور پھر آسمان پر جانا ان کے نزدیک ممکن نہ تھا اور شجرہ زقوم کی تکذیب اس بنا پر کی کہ اسکو دوزخ کے اندر بتلایا جاتا ہے آگ میں کوئی درخت کیسے رہ سکتا ہے اگر ہو بھی تو جل جائے گا، حالانکہ نہ ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا عقلاً محال ہے نہ آسمان پر جانا ناممکن ہے اور آگ کے اندر درخت کا وجود ان کی سمجھ میں نہ آیا حالانکہ کوئی محال بات نہیں کہ کسی درخت کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ ایسا بنادیں کہ وہ پانی کے بجائے آگ سے پرورش پائے، پھر فرمایا) اور ہم ان لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑی سرکشی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے (شجرہ زقوم کے انکار کے ساتھ یہ لوگ استہزاء بھی کرتے تھے جسکا بیان مع زائد تحقیق کے سورۂ صٰفّٰت میں آوے گا)

معارف ومسائل

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔ (یعنی شب معراج میں جو تماشا ہم نے آپکو دکھلایا تھا وہ لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھا) لفظ فتنہ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اسکے ایک معنی وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے یعنی گمراہی ایک معنی آزمائش کے بھی آتے ہیں ایک معنی کسی ہنگامہ فساد کے برپا ہونے کے بھی آتے ہیں یہاں ان سب معانی کا احتمال ہے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ اور حسنؒ اور مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے

اس جگہ فتنہ سے مراد یہی آخری معنی لئے ہیں اور فرمایا کہ یہ فتنہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نومسلم لوگ جنمیں ایمان راسخ نہ ہوا تھا اس کلام کی تکذیب کرکے مرتد ہوگئے (قرطبی)

اسی واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ لفظ رؤیا عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ مراد خواب کا قصہ نہیں کیونکہ ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے بلکہ اس جگہ مراد رؤیا سے ایک واقعہ عجیبہ کا بحالت بیداری دکھلانا ہے آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض حضرات نے اسکو واقعہ معراج کے سوا دوسرے واقعات پر بھی محمول کیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے یہاں منطبق نہیں ہوتے اس لئے جمہور نے واقعہ معراج ہی کو اس آیت کا محمل قرار دیا ہے۔ (کما فصلہ القرطبی)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا

بولا کیا میں سجدہ کروں ایک شخص کو جسکو تو نے بنایا مٹی کا کہنے لگا بھلا دیکھ تو یہ شخص

الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ

جس کو تو نے مجھ سے بڑھا دیا اگر تو مجھ کو ڈھیل دیوے قیامت کے دن تک تو میں اُس کی اولاد

ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ

کو ڈھانٹی دے لوں مگر تھوڑے سے فرمایا جا پھر جو کوئی تیرے ساتھ ہوا اُن میں سے سو

جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ

دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ پورا اور گھبرا لے اُن میں جس کو تو

مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ

گھبرا سکے اپنی آواز سے اور لے آ اُن پر اپنے سوار اور پیادے اور ساجھا کر

فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ

اُن سے مال اور اولاد میں اور وعدہ دے اُن کو اور کچھ نہیں وعدہ دیتا اُن کو

الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

شیطان مگر دغا بازی وہ جو میرے بندے ہیں اُن پر نہیں ہے تیری حکومت

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے) جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا اور) کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جسکو آپ نے مٹی سے بنایا ہے (اس پر مردود ہو گیا اُس وقت) کہنے لگا کہ اس شخص کو جو آپ نے مجھپر فوقیت دی ہے (اور اسی بناء پر اسکو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے) تو بھلا بتلایئے تو (اس میں کیا فضیلت ہے جسکی وجہ سے میں مردود ہوا) اگر آپنے (میری درخواست کے مطابق) مجھکو قیامت کے زمانے تک (موت سے) مہلت دیدی تو میں (بھی) بجز قدر قلیل لوگوں کے (جو مخلصین ہونگے باقی) اسکی تمام اولاد کو اپنے قابو میں کر لونگا (یعنی گمراہ کر دونگا) ارشاد ہوا (جا جو تجھ سے ہو سکے کر لے) جو شخص انمیں سے تیرے ساتھ ہو لیگا تو تم سب کی سزا جہنم ہے پوری سزا اور ان میں سے جسپر تیرا قابو چلے اپنی چیخ پکار سے (یعنی اغوار اور وسوسہ سے) اس کا قدم (راہ راست سے) اکھاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لانا (کہ تیرا سارا لشکر ملکر گمراہ کرنے میں خوب زور لگاوے) اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا کر لینا (یعنی مال و اولاد کو گمراہی کا ذریعہ بنا دینا جیساکہ اسکا مشاہدہ ہوا) اور ان سے (جھوٹے جھوٹے) وعدے کرنا (کہ قیامت میں گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اور یہ سب باتیں شیطان کو بطور زجر و تنبیہ کے کہی گئی ہیں) اور شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے (یہ بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے پھر شیطان کو خطاب ہے) میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہ چلے گا اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسکا قابو مخلصین پر کیونکر چلے کہ) آپ کا رب (ان کا) کارساز کافی ہے۔

معارف و مسائل

لَاَحْتَنِكَنَّ احتناک کے معنی ہیں کسی چیز کا استیصال اور فنا کر دینا یا پوری طرح اسپر غالب آنا (قرطبی)، وَاسْتَفْزِزْ استفزاز کے اصلی معنی قطع کرنیکے ہیں مراد اس جگہ حق سے قطع کر دینا ہے بِصَوْتِكَ صوت بمعنے آواز معروف ہے اور شیطان کی آواز کیا ہے اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضؓ نے

فرمایا کہ گانے اور مزامیر اور لہو لعب کی آوازیں یہی شیطان کی آواز ہے جس سے وہ لوگوں کو حق سے قطع کرتا ہے (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ مزامیر موسیقی اور گانا بجانا حرام ہے (قرطبی)

ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے وقت دو باتیں کہی تھیں اول یہ کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے اور میں آگ کی مخلوق ہوں آپ نے مٹی کو آگ پر کیوں فوقیت اور فضیلت دیدی، یہ سوال اُمرِ الٰہی کے مقابلہ میں حکم کی حکمت معلوم کرنے سے متعلق تھا جسکا کسی مامور کو حق نہیں، اللہ جل شانہٗ کی طرف سے مامور کو تو طلب حکمت کا حق کیا ہوتا دنیا میں خود انسان اپنے نوکر کو اسکا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی کام کو کہے، تو خادم وہ کام کرنے کے بجائے آقا سے پوچھے کہ اس کام میں کیا حکمت ہے اس لئے اس کا یہ سوال ناقابل جواب قرار دیکر یہاں اسکا جواب نہیں دیا گیا، اس کے علاوہ جواب ظاہر بھی ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر فوقیت دینے کا حق اسی ذات کو ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور پالا ہے وہ جس وقت جس چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دیدے وہی افضل ہوجاوے گی۔

دوسری بات یہ کہی تھی کہ اگر تا قیامت زندگی ملنے کی میری درخواست منظور کر لیگئی تو میں آدم کی ساری اولاد کو بجز قدر قلیل کے گمراہ کر ڈالوں گا، آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اسکا جواب دیدیا کہ میرے خاص بندے جو مخلص ہیں ان پر تو تیرا قابو نہ چلے گا چاہے تو اپنا سارا لاؤ لشکر لے آوے اور پورا زور خرچ کرے باقی غیر مخلص اگر وہ تیرے قابو میں آگئے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا جو تیرا ہے کہ جہنم کے عذاب میں تم سب گرفتار ہوگے اسمیں اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ میں جو شیطانی لشکر کے سوار اور پیادوں کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں بھی شیطان کے کچھ افراد سوار ہوں کچھ پیادے بلکہ یہ محاورہ پورے لشکر اور پوری طاقت استعمال کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور اگر واقع میں ایسا ہو کہ کچھ شیطان سوار ہوتے ہوں کچھ پیادہ تو اسمیں بھی کوئی وجہ انکار نہیں اور حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ جتنے افراد بھی کفر و معصیت کی حمایت کے لئے لڑنے کو چلتے ہیں وہ سوار اور پیادے سب شیطان ہی کا سوار اور پیادہ لشکر ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ شیطان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اولادِ آدم کو بہکا کر گمراہ کرنے پر قادر ہوجائے گا جسکی بناء پر اسنے یہ دعویٰ کیا تو ممکن ہے کہ انسان کے اجزاء ترکیبی کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے اندر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوگا اسلئے بہکانے میں آجانا دشوار نہیں اور اسمیں بھی کچھ بُعد نہیں کہ یہ دعویٰ بھی محض جھوٹ ہی ہو۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ لوگوں کے اموال اور اولاد میں شیطان کی شرکت کا مطلب حضرت ابن عباس رضؓ نے یہ بیان فرمایا کہ اموال میں جو مال ناجائز حرام طریقوں سے

حاصل کیا جائے یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے یہی شیطان کی اسمیں شرکت ہے اور اولاد میں شیطان کی شرکت اولاد حرام ہونے سے بھی ہوتی ہے اور اس سے بھی کہ اولاد کے نام مشرکانہ رکھے یا انکی حفاظت کے لئے مشرکانہ رسوم ادا کرے یا ان کی پرورش کے لئے حرام ذرائع آمدنی اختیار کرے (قرطبی)

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ

تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے واسطے کشتی دریا میں تاکہ تلاش کرو اس کا فضل وہی

كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ

ہے تم پر مہربان اور جب آتی ہے تم پر آفت دریا میں بھول جاتے ہو جنکو تم پکارا کرتے تھے

إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ

اللہ کے سوائے پھر جب بچا لایا تم کو خشکی میں پھر جاتے ہو اور ہے انسان

كَفُورًا ﴿٦٧﴾ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ

بڑا ناشکر سو کیا تم بے ڈر ہوگئے اس سے کہ دھنسا دے تمکو جنگل کے کنارے یا بھیج دے

عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ

تم پر آندھی پتھر برسانے والی پھر نہ پاؤ اپنا کوئی نگہبان یا بے ڈر ہوگئے ہو اس سے کہ پھر لے جائے

فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ

تمکو دریا میں دوسری بار پھر بھیجے تم پر ایک سخت جھونکا ہوا کا پھر ڈبادے تم کو

بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بدلے میں اس ناشکری کے پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اس کا کوئی بازپرس کرنیوالا اور ہم نے عزت دی ہے

بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ

آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿٧٠﴾ ع

اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔

خلاصۂ تفسیر

سابقہ آیات میں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا، آیات مذکورہ میں یہی مضمون ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بیشمار عظیم الشان نعمتیں جو انسانوں پر ہر وقت مبذول ہیں ان کو بیان کر کے یہ بتلانا منظور ہے کہ ان تمام نعمتوں کا بخشنے والا بجز ایک حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور سب نعمتیں اسکی ہیں تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا بڑی گمراہی ہے ارشاد فرمایا کہ) تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اسکے ذریعہ رزق کی تلاش کرو (اسمیں اشارہ ہے کہ بحری سفر تجارت کے لئے عموماً بڑے نفع کا سبب ہوتا ہے) بیشک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہونچتی ہے (مثلاً دریا کی موج اور ہوا کے طوفان سے غرق ہونے کا خطرہ) تو بجز خدا کے اور جس جس کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں (کہ نہ تمہیں خود ہی اس وقت انکا خیال آتا ہے نہ ان کو پکارتے ہو اور پکارو بھی تو ان سے کسی امداد کی ذرہ برابر توقع نہیں یہ خود عملی طور پر تمہاری طرف سے توحید کا اقرار اور شرک کا ابطال ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر اس سے رخ پھیر لیتے ہو اور (انسان ہے بڑا ناشکرا (کہ اتنی جلدی اللہ کے انعام اور اپنی الحاح و زاری کو بھول جاتا ہے اور تم جو خشکی میں پہنچکر اس سے اپنا رخ پھیر لیتے ہو) تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ تم کو خشکی میں لا کر ہی زمین میں دھنسا دے (مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دریا اور خشکی میں کوئی فرق نہیں وہ جیسے دریا میں غرق کر سکتا ہے ایسا ہی خشکی میں بھی زمین میں دھنسا کر غرق کر سکتا ہے) یا تم پر کوئی ایسی سخت ہوا بھیجدے جو کنکر پتھر برسانے لگے (جیسا کہ قوم عاد ایسے ہی ہوا کے طوفان سے ہلاک کی گئی تھی) پھر تم کسیکو اپنا کارساز خدا کے سوا نہ پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تمکو دریا ہی میں دوبارہ لیجاوے پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیجدے پھر تمکو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر (یعنی غرق کر دینے پر) کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی تمکو نہ ملے (جو ہم سے تمہارا بدلہ لے سکے) اور ہم نے اولاد آدم کو (مخصوص صفات دیکر) عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور پاکیزہ نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی

معارف و مسائل

بنی آدم کی فضیلت اکثر مخلوقات پر کس وجہ سے ہے آخری آیت میں اولاد آدم کی اکثر مخلوقات پر فوقیت

اور افضلیت کا ذکر ہے اسمیں دو باتیں قابل غور ہیں، اوّل یہ کہ یہ افضلیت کن صفات اور کن وجوہ کی بنا پر ہے۔ دوسرے یہ کہ اسمیں افضلیت اکثر مخلوقات پر دینا بیان فرمایا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی آدم کو مختلف حیثیات سے ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں، مثلاً حسنِ صورت، اعتدالِ جسم، اعتدالِ مزاج، اعتدال قد وقامت جو انسان کو عطا ہوا ہے کسی دوسرے حیوان میں نہیں اسکے علاوہ عقل وشعور میں اسکو خاص امتیاز بخشا گیا ہے جس کے ذریعہ وہ تمام کائنات علویہ اور سفلیہ سے اپنے کام نکالتا ہے اسکو اللہ تعالیٰ نے اسکی قدرت بخشی ہے کہ مخلوقات الٰہیہ سے ایسے مرکبات اور مصنوعات تیار کرے جو اسکے رہنے سہنے اور نقل وحرکت اور طعام ولباس میں اسکے مختلف کام آئیں۔

نطق وگویائی اور افہام وتفہیم کا جو ملکہ اسکو عطا ہوا ہے وہ کسی دوسرے حیوان میں نہیں اشارات کے ذریعہ اپنے دل کی بات دوسروں کو بتلا دینا، تحریر اور خط کے ذریعہ دل کی بات دوسروں تک پہنچانا یہ سب انسان ہی کی امتیازات ہیں بعض علماء نے فرمایا کہ ہاتھ کی انگلیوں سے کھانا بھی انسان ہی کی صفت مخصوصہ ہے اسکے سوا تمام جانور اپنے منہ سے کھاتے ہیں اپنے کھانے کی چیزوں کو مختلف اشیاء سے مرکب کرکے لذیذ اور مفید بنانے کا کام بھی انسان ہی کرتا ہے باقی سب جانور مفرد چیزیں کھاتے ہیں کوئی کچا گوشت کھاتا ہے کوئی گھاس کوئی پھل وغیرہ بہرحال سب مفردات کھاتے ہیں انسان ہی اپنی غذا کے لئے ان سب چیزوں کے مرکبات تیار کرتا ہے اور سب سے بڑی فضیلت عقل وشعور کی ہے جس سے وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچانے اور اسکی مرضی اور نامرضی کو معلوم کرکے مرضیات کا اتباع کرے نامرضیات سے پرہیز کرے اور عقل وشعور کے اعتبار سے مخلوقات کی تقسیم اسطرح ہے کہ عام جانوروں میں شہوات اور خواہشات ہیں عقل وشعور نہیں، فرشتوں میں عقل وشعور ہے شہوات و خواہشات نہیں، انسان میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں عقل وشعور بھی ہے شہوات و خواہشات بھی ہیں اسی وجہ سے جب وہ شہوات وخواہشات کو عقل وشعور کے ذریعہ مغلوب کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ چیزوں سے اپنے آپکو بچالیتا ہے تو اسکا مقام بہت سے فرشتوں سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔

دوسری بات کہ اولاد آدم کو اکثر مخلوقات پر فضیلت دینے کا کیا مطلب ہے اسمیں تو کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات علویہ اور سفلیہ اور تمام جانوروں پر اولاد آدم کو فضیلت حاصل ہے اسی طرح جنّات جو عقل وشعور میں انسان ہی کی طرح ہیں ان پر بھی انسان کا افضل ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے اب صرف معاملہ فرشتوں کا رہ جاتا ہے کہ انسان اور فرشتہ میں کون افضل ہے اسمیں تحقیقی بات یہ ہے کہ انسان میں عام مومنین صالحین جیسے اولیاء اللہ وہ عام فرشتوں سے افضل

ہیں مگر خواص ملائکہ جیسے جبرئیل میکائیل وغیرہ ان عام صالحین سے افضل ہیں اور خواص مومنین جیسے انبیار علیہم السلام وہ خواص ملائکہ سے بھی افضل ہیں باقی رہے کفار وفجار انسان، وہ ظاہر ہے کہ فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے وہ تو جانوروں سے بھی اصل مقصد فلاح و نجاح میں افضل نہیں ان کے متعلق تو قرآن کا فیصلہ یہ ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ یعنی یہ تو چوپایہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ (تفسیر مظہری) واللہ اعلم۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ

جس دن ہم بلائیں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ سو جس کو ملا اس کا اعمالنامہ اسکے داہنے ہاتھ میں

فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ

سو وہ لوگ پڑھیں گے اپنا لکھا اور ظلم نہ ہوگا اُن پر ایک تاگے کا اور جو کوئی رہا

فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

اس جہان میں اندھا سو وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت دُور پڑا ہوا راہ سے۔

خلاصۂ تفسیر

(اس دن کو یاد کرنا چاہیئے) جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامۂ اعمال سمیت (میدان حشر میں) بلاویں گے (اور وہ نامۂ اعمال اڑا دیئے جاویں گے پھر کسی کے داہنے ہاتھ اور کسی کے بائیں ہاتھ میں آجاویں گے) پھر جسکا نامۂ اعمال اسکے داہنے ہاتھ میں دیا جاوے گا (اور یہ اہل ایمان ہوں گے) تو ایسے لوگ اپنا نامۂ اعمال (خوش ہو کر) پڑھیں گے اور ان کا ذرا نقصان نہ کیا جاوے گا (یعنی ان کے ایمان اور اعمال کا ثواب پورا پورا ملے گا ذرا کم نہ ہوگا خواہ زیادہ مل جائے اور عذاب سے نجات بھی ہوگی خواہ اوّل ہی یا گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد) اور جو شخص دنیا میں (راہ نجات دیکھنے سے) اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی (منزل نجات تک پہنچنے سے) اندھا رہے گا اور (بلکہ وہاں دنیا سے بھی) زیادہ گم کردہ راہ ہوگا (کیونکہ دنیا میں تو گمراہی کا علاج ممکن تھا وہاں یہ بھی نہ ہو سکے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنکا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔

معارف و مسائل

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ اس آیت میں لفظ امام بمعنی کتاب ہے جیسا کہ

سورۂ یٰسین میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ اسمیں امام مبین سے مراد واضح کتاب ہے اور کتاب کو امام اسلئے کہا جاتا ہے کہ بھول چوک اور اختلاف کے وقت کتاب ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جیسے کسی امام مقتدا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ (قرطبی)

اور ترمذی کی حدیث بروایت ابوہریرہ رضؓ (جسکو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام سے مراد اس آیت میں کتاب ہے۔ الفاظ حدیث کے یہ ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ قَالَ يُدْعَىٰ أَحَدُهُمْ فَيُعْطَىٰ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ (الحدیث بطولہ)

آیت يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اسکا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی متعین ہوگیا کہ امام بمعنے کتاب ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے اسی لئے خلاصۂ تفسیر از بیان القرآن میں اسکا ترجمہ نامۂ اعمال سے کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور مجاہدؒ وغیرہ مفسرین سے یہاں لفظ امام کے معنے مقتدا اور پیشوا کے بھی منقول ہیں کہ ہر شخص کو اس کے مقتدا و پیشوا کا نام لیکر پکارا جائے خواہ وہ مقتدا و پیشوا انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب مشائخ و علماء ہوں یا گمراہی اور معصیت کی طرف دعوت دینے والے پیشوا۔ (قرطبی)

اس معنے کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ میدان حشر میں ہر شخص کو اسکے مقتدا اور پیشوا کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور سبکو ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا مثلاً متبعین ابراہیم علیہ السلام متبعین موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام و متبعین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے ذیل میں ممکن ہے کہ ان متبعین کے بلا واسطہ مقتداؤں کا نام بھی لیا جائے۔

نامۂ اعمال قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال صرف کفار کو دیا جائیگا جیسا کہ ایک آیت میں ہے إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ اور ایک دوسری آیت میں ہے إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ پہلی آیت میں صراحۃً ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری میں انکار آخرت مذکور ہے وہ بھی کفر ہی ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال اہل ایمان کو دیا جائیگا خواہ متقی ہوں یا گناہگار مومن اپنے نامۂ اعمال کو خوشی کے ساتھ پڑھے گا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھوائے گا یہ خوشی ایمان کی اور عذاب ابدی سے نجات کی ہوگی گو بعض اعمال پر سزا بھی ہوگی۔

اور قرآن کریم میں نامۂ اعمال داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیت مذکور نہیں لیکن بعض احادیث میں تطایر الکتب کا لفظ آیا ہے (رواہ احمد عن عائشہ رضؓ مرفوعاً) اور بعض

روایات حدیث میں ہے کہ سب نامۂ اعمال عرش کے نیچے جمع ہوں گے پھر ایک ہوا چلے گی جو سب کو اڑا کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی کسی کے داہنے ہاتھ میں کسی کے بائیں ہاتھ میں (اخرجہ العقیلی عن انس مرفوعاً) (بیان القرآن از روح المعانی)

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اُس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف،

لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْ

تاکہ جھوٹ بنا لائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست اور اگر یہ

لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے اُن کی طرف تھوڑا سا

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ

تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دونا مزہ زندگی میں اور دونا مرنے میں پھر نہ پاتا تو اپنے

لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ

واسطے ہم پر مدد کرنے والا اور وہ تو چاہتے تھے کہ گھبرا دیں تجھ کو اس

الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

زمین سے تاکہ نکال دیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا،

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ ع ۸

دستور چلا آتا ہے اُن رسولوں کا جو تجھ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے پیغمبر اور نہ پائے گا تو ہمارے دستور میں تفاوت۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کافر لوگ (اپنی قومی تدبیروں کے ذریعہ) آپ کو اس چیز سے بچلانے (اور ہٹانے) ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے (یعنی اس کوشش میں لگے تھے کہ آپ سے حکم خداوندی کے خلاف عمل کرادیں) اور (تاکہ آپ اس (حکم الٰہی) کے سوا ہماری طرف (عملاً) غلط بات کی نسبت کردیں (کیونکہ نبی کا فعل خلاف شرع ہوتا نہیں اسلئے اگر نعوذ باللہ آپ سے کوئی عمل خلاف شرع ہوجاتا تو یہ لازم آتا کہ اس خلاف شرع عمل کو گویا اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں) اور (ایسی حالت میں) آپ کو

خالص دوست بنا لیتے اور (ان کی یہ شرارت ایسی سخت تھی کہ) اگر ہم نے آپکو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (یعنی معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہونچتے (اور) اگر ایسا ہو جاتا (کہ آپکا کچھ میلان ان کی بات کی طرف ہوتا) تو ہم آپ کو (اس وجہ سے کہ مقربان بارگاہ کا مقام بہت بلند ہے) حالت حیات میں بھی اور بعد موت کے بھی دوہرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے (مگر چونکہ آپکو ہم نے معصوم اور ثابت قدم بنایا ہے اس لئے ان کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہوا اور اس عذاب سے بچ گئے)

اور یہ (کافر) لوگ اس سرزمین (مکہ یا مدینہ) سے آپکے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ آپکو اس سے نکال دیں اور اگر ایسا ہو جاتا تو آپکے بعد یہ بھی بہت کم (یہاں) ٹھہرنے پاتے جیسا اُن انبیاء کے بارے میں (ہمارا) قاعدہ رہا ہے جنکو آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا (کہ جب ان کی قوم نے ان کو وطن سے نکالا تو پھر اس قوم کو بھی یہاں رہنا نصیب نہیں ہوا) اور آپ ہمارے قاعدے میں تغیر تبدل نہ پائیں گے۔

معارف ومسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی تین آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں تفسیر مظہری میں اس واقعہ کی تعیین کے متعلق چند روایتیں نقل کی ہیں جنمیں سے اقرب اور مؤید باشارات القرآن یہ واقعہ ہے جو بتخریج ابن ابی حاتم بروایت جبیر ابن نفیرؓ نقل کیا ہے کہ قریش مکہ کے چند سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ واقعی ہماری طرف بھیجے گئے ہیں تو پھر اپنی مجلس سے ان غریب شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجیے جنکے ساتھ بیٹھنا ہمارے لئے توہین ہے تو پھر ہم بھی آپ کے اصحاب اور دوست ہو جائیں گے۔ ان کی اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خیال پیدا ہوا کہ ان کی بات پوری کر دیں شاید یہ مسلمان ہو جائیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا گیا کہ ان کی بات فتنہ ہے ان کی دوستی بھی فتنہ ہے آپ کو ان کی بات نہیں ماننی چاہئے۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ اگر ہماری طرف سے آپکی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ آپ ان کی بات کی طرف میلان کے تھوڑے سے قریب ہو جاتے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھی جاتی ہے کہ کفار قریش کی لغویات کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میلان کا تو کوئی احتمال ہی نہ تھا ہاں میلان کے

قریب ہو جانے کا وہ بھی بہت قدر قلیل حد میں امکان تھا مگر اللہ تعالیٰ نے معصوم بنا کر اس سے بھی بچا لیا، غور کیا جائے تو یہ آیت انبیاء علیہم السلام کی اعلیٰ ترین پاکیزہ خلقت و طبیعت پر بڑی دلیل ہے کہ اگر پیغمبرانہ عصمت بھی نہ ہوتی تب بھی نبی کی فطرت ایسی تھی کہ کفار کی لغویات کی طرف میلان ہو جانا اس سے ممکن نہ تھا ہاں میلان کے کچھ قریب بقدر قلیل کا احتمال تھا جو پیغمبرانہ عصمت نے ختم کر دیا۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ یعنی اگر بفرض محال آپ ان کی غلط روش کی طرف میلان کے قریب ہو جاتے تو آپکا عذاب دنیا میں بھی دوہرا ہوتا اور موت کے بعد قبر یا آخرت میں بھی دوہرا ہوتا کیونکہ مقربان بارگاہ کی معمولی سی غلطی بھی بہت بڑی سمجھی جاتی ہے اور یہ مضمون تقریباً وہی ہے جو ازواج مطہرات کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ یعنی اے نبی کی عورتوں اگر تم میں سے کسی نے کھلی بے حیائی کا کام کیا تو اسکو دوہرا عذاب دیا جائیگا۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ استفزاز کے لفظی معنی قطع کرنے کے ہیں یہاں مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مستقر مکہ یا مدینہ سے نکال دینا ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ قریب تھا کہ یہ کفار آپکو اپنی زمین سے نکال دیں، اور اگر وہ ایسا کر لیتے تو اسکی سزا انکو یہ ملتی کہ وہ بھی آپ کے بعد زیادہ دیر اس شہر میں نہ رہ پاتے۔ یہ ایک دوسرے واقعہ کا بیان ہے اور اسکی تعیین میں بھی دو روایتیں منقول ہیں ایک واقعہ مدینہ طیبہ کا ہے کہ یہود مدینہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "اے ابوالقاسم" (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ اپنی نبوت کے دعوے میں سچے ہیں تو آپ کو چاہیئے کہ ملک شام میں جا کر رہیں کیونکہ ملک شام ہی محشر کی زمین ہے اور وہی انبیاء کی زمین ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے کلام کا کچھ اثر ہوا اور غزوۂ تبوک کے وقت جو ملک شام کا سفر ہوا تو آپکا قصد یہ تھا کہ ملک شام کو اپنا ایک مستقر بنائیں مگر یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ جسمیں آپ کو اس ارادہ سے روک دیا گیا مگر ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے ناقابل اطمینان قرار دیا ہے۔

اور اس آیت کا مصداق ایک دوسرا واقعہ بتلایا ہے جو مکہ مکرمہ میں پیش آیا اور اس سورت کا مکی ہونا اس کے لئے قوی قرینہ ہے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کا ارادہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ اور اسمیں کفار مکہ کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیں گے تو پھر خود بھی مکہ میں دیر تک چین سے نہ بیٹھ سکیں گے۔ ابن کثیرؒ نے اسی واقعہ

کا مصداق آیت ہونا راجح قرار دیا ہے، اور پھر بتلایا کہ قرآن کریم کی یہ وعید بھی کفار مکہ نے کھلی آنکھوں دیکھ لی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو مکہ والے ایک دن بھی مکہ میں چین سے نہیں بیٹھ سکے صرف ڈیڑھ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو میدان بدر میں جمع کر دیا جہاں ان کے ستر سردار مارے گئے اور ان کی قوت ٹوٹ گئی پھر غزوۂ اُحد کے آخری نتیجہ میں ان پر مزید ہیبت طاری ہوگئی اور غزوۂ احزاب کے آخری معرکہ نے تو ان کی کمر ہی توڑ دی اور ہجرت کے آٹھویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مکہ مکرمہ فتح کر لیا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا اس آیت میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عام سنت اور قاعدہ پہلے سے یہی چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی کو اسکے وطن سے نکالتی یا نکالنے پر مجبور کرتی ہے تو پھر وہ قوم بھی وہاں باقی نہیں رکھی جاتی اس پر خدا تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ

قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا

إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴿٧٨﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ

بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ

نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿٧٩﴾ وَ

یہ زیادتی ہے تیرے لئے قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود میں اور

قُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ

کہہ اے رب داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا

صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿٨٠﴾ وَ

نکالنا اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد اور

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾

کہہ آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ بے شک جھوٹ ہے نکل بھاگنے والا

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور

يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾

گنہگاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے تک نمازیں ادا کیا کیجئے (اسمیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء، چار نمازیں آگئیں جیسا کہ حدیث میں اس اجمال کی تفصیل بیان کردی گئی ہے) اور صبح کی نماز بھی (ادا کریں) بیشک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے (صبح کا وقت چونکہ نیند سے بیدار ہونے کا وقت ہے جسمیں سستی کا خطرہ تھا اسلئے اسکو الگ کرکے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا اور اسکی ایک مزید فضیلت بھی یہ بیان کردی کہ اس وقت میں فرشتے جمع ہوتے ہیں اسکی تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ انسان کی حفاظت اور اسکے اعمال کو لکھنے والے فرشتے دن کے الگ اور رات کے الگ ہیں، صبح کی نماز میں دونوں جماعتیں فرشتوں کی جمع ہوتی ہیں رات کے فرشتے اپنا کام ختم کرکے اور دن کے فرشتے اپنا کام سنبھالنے کے لئے مجتمع ہوجاتے ہیں اسی طرح شام کو عصر کی نماز میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اجتماع باعث برکات ہے) اور کسیقدر رات کے حصے میں بھی (نماز ادا کریں) یعنی اسمیں نماز تہجد پڑھا کریں جو کہ آپ کے لئے (پانچ نمازوں کے علاوہ) ایک زائد چیز ہے۔ (اس زائد سے مراد بعض کے نزدیک ایک زائد فرض ہے جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کیا گیا اور بعض نے مراد زائد سے نفل لی ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ آپکا رب آپکو مقام محمود میں جگہ دے گا (مقام محمود سے مراد شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جو محشر میں تمام بنی آدم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا) اور آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب (مکہ سے جانے کے بعد) مجھکو (جہاں لیجانا ہو) خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچائیو اور (جب) مکہ سے لیجانا ہو تو مجھکو خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ لیجائیو اور مجھکو اپنے پاس سے (ان کفار پر) ایسا غلبہ دیجیو جسکے ساتھ (آپ کی) نصرت (اور مدد) ہو (جس سے وہ غلبہ پائدار اور ترقی پذیر ہو ورنہ عارضی غلبہ تو کبھی کفار کو بھی ہوجاتا ہے مگر اس کے ساتھ اللہ کی نصرت نہیں ہوتی اسلئے پائدار نہیں ہوتا) اور کہدیجئے کہ (بس اب دین) حق (غالب ہونے کو) آیا اور باطل گیا گذرا ہوا واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے (ہجرت کے بعد مکہ فتح ہوا تو یہ سب وعدے پورے ہوگئے) اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفا اور رحمت ہے (کیونکہ وہ اسکو مانتے اور اسپر عمل کرتے ہیں جس سے ان پر رحمت ہوتی اور عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ سے شفا ہوتی ہے) اور ظالموں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے۔ (کہ جب وہ اسکو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں)

معارف و مسائل

دشمنوں کے مکر و کید سے بچنے کا بہترین علاج نماز ہے

سابقہ آیات میں اعداء اسلام کی مخالفت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرنے کی تدبیریں اور اسکا جواب مذکور تھا اس کے بعد آیات صدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دینے میں اسطرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کے مکر وکید اور ایذاؤں سے بچنے کا بہترین علاج نماز کی اقامت ہے جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ

(یعنی ہم جانتے ہیں کہ کفار کے دل آزار اقوال سے آپ دلتنگ ہوتے ہیں تو آپ اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ (قرطبی)

اس آیت میں دشمنوں کی ایذاؤں کا علاج اللہ کے ذکر، حمد و تسبیح اور نماز میں مشغول ہو جانے کو قرار دیا ہے ذکر اللہ اور نماز بالخاصہ ان سے بچنے کا علاج ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنا اللہ تعالیٰ کی مدد پر موقوف ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا سب سے افضل ذریعہ نماز ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ

(یعنی مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ)

نماز پنجگانہ کا حکم جمہور ائمہ تفسیر نے اس آیت کو پانچوں نمازوں کے لئے جامع حکم قرار دیا ہے کیونکہ دلوك کا لفظ اگرچہ اصل میں میلان کے معنی میں آتا ہے اور میلانِ آفتاب زوال کے وقت شروع ہوتا ہے اور غروب کو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جمہور صحابہ و تابعین نے اس جگہ لفظ دلوك کے معنی زوال آفتاب ہی کے لئے ہیں۔ (کما فصلہ القرطبی والمظہری وابن کثیر)

اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ لفظ غسق کے معنی رات کی تاریکی مکمل ہو جانے کے ہیں امام مالکؒ نے حضرت ابن عباس رضؓ سے غسق کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے۔

اس طرح دُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ۔ میں چار نمازیں آگئیں ظہر، عصر، مغرب، عشار اور انہیں سے دو نمازوں کا ابتدائی وقت بھی بتلا دیا گیا کہ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عشار کا وقت غسق لیل سے یعنی جس وقت رات کی تاریکی مکمل ہو جائے اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحؒ نے وقت عشار کی ابتدا اسوقت سے قرار دی ہے جبکہ شفق احمر کے بعد شفق ابیض بھی غروب ہو جائے یہ سب جانتے ہیں کہ غروب آفتاب کے متصل افق مغرب پر ایک سرخی نمودار ہوتی ہے اور اس سرخی کے بعد ایک قسم کی سفیدی افق پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے پھر وہ سفیدی

بھی غروب ہوجاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ رات کی تاریکی مکمل اسیوقت ہوگی جبکہ افق کی سفیدی بھی ختم ہوجائے اس لئے اس لفظ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ دوسرے ائمہ نے شفق احمر کے غروب ہونے پر وقت عشاء کی ابتدا قرار دی ہے اور اسی کو غَسَقِ الَّیۡلِ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اس جگہ لفظ قرآن بولکر نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ قرآن نماز کا جزا اہم ہے اکثر ائمہ تفسیر ابن کثیرؒ، قرطبیؒ، مظہریؒ وغیرہ نے یہی معنے لکھے ہیں اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ دُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ کے الفاظ میں چار نمازوں کا بیان تھا یہ پانچویں نماز فجر کا بیان ہے اسکو الگ کر کے بیان کرنے میں اس نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

كَانَ مَشْهُوْدًا یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جسکے معنے ہیں حاضر ہونا اس وقت میں حسب تصریح احادیث صحیحہ رات اور دن کے دونوں فرشتوں کی جماعتیں حاضر نماز ہوتی ہیں اس لئے اسکو مشہود کہا گیا ہے اس آیت میں پانچ نمازوں کا حکم اجمال کے ساتھ آیا ہے جسکی مکمل تفسیر و تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بتلائی ہیں اور جب تک اس تشریح پر عمل نہ کیا جائے کوئی شخص نماز ادا ہی نہیں کر سکتا معلوم نہیں کہ جو لوگ قرآن کو بغیر حدیث اور بیان رسول کے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ نماز کیسے پڑھتے ہیں اسیطرح اس آیت میں نماز کے اندر قراءت قرآن کا ذکر بھی اجمالاً آیا ہے اسکی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے یہ ثابت ہوئی کہ نماز فجر میں قراءت طویل کی جائے بقدر استطاعت اور ظہر و جمعہ میں اس سے کم اور عصر و عشاء میں متوسط اور مغرب میں بہت مختصر، مغرب میں طول قراءت اور فجر میں اختصار جو بعض روایات میں آیا ہے وہ عملاً متروک ہے امام قرطبیؒ نے صحیح مسلم کی وہ روایت جسمیں مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف اور مرسلات وغیرہ طویل سورتوں کا پڑھنا یا صبح کی نماز میں صرف معوذتین پر اکتفا کرنا منقول ہے اسکو نقل کر کے فرمایا ہے فمتروك بالعمل ولانكاره على معاذ التطويل وبامره الائمة بالتخفيف یعنی یہ اتفاقی واقعات مغرب میں طول قراءت اور فجر میں اختصار کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل سے نیز زبانی ارشادات کی وجہ سے متروک ہیں۔ (قرطبی)

نماز تہجد کا وقت اور اسکے احکام و مسائل

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو متضاد معنے کیلئے استعمال ہوتا ہے اس کے معنے سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے بیدار ہونے کے بھی اس جگہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے (مظہری)، قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے اسی رات کی نماز کو اصطلاح شرع میں نماز تہجد

کہا جاتا ہے اور عموماً اسکا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے لیکن تفسیر مظہری میں ہے کہ مفہوم اس آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں نماز کے لئے سونے کو ترک کر دو اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سونے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لئے نیند کو موخر کر کے نماز پڑھنے پر بھی صادق ہے اس لئے نماز تہجد کے لئے پہلے نیند ہونے کی شرط قرآن کا مدلول نہیں پھر بعض روایات حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنے پر استدلال کیا ہے۔

اور امام ابن کثیرؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے اسکے الفاظ یہ ہیں۔

قال الحسن البصری هو ما کان بعد العشاء و یحمل علی ما کان بعد النوم (ابن کثیر)	حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اسکو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے اصل مفہوم میں بعد النوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط موجود نہیں لیکن عموماً تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہو کر پڑھتے تھے اسلئے اسکی افضل صورت یہی ہوگی۔

نماز تہجد فرض ہے یا نفل نَافِلَةً لَّكَ ۔ لفظ نفل اور نافلہ کے لغوی معنے زائد کے ہیں اسی لئے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہو جسکے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ نَافِلَةً لَّكَ کے الفاظ سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نفل ہے حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت سب ہی شریک ہیں اسی لئے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ نافلہ کو فریضہ کی صفت قرار دیکر معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ نافلہ بمعنے فرض زائد کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں۔

اور تحقیق صحیح اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتدار اسلام میں جب سورۂ مزمل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں تو فرض ہوئی نہ تھیں صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی اسی فرض کا ذکر سورۂ مزمل میں ہے پھر شب معراج میں پانچ نمازیں فرض کر دیگئیں تو تہجد کی فرضیت عام امت سے تو باتفاق منسوخ ہوگئی۔ اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسکی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصی طور پر آپ کے ذمہ فرض رہا اور اس آیت میں نَافِلَةً لَّكَ کے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد

آپ کے ذمہ ایک زائد فرض ہے مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کئی وجہ سے صحیح نہیں اوّل یہ کہ فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر کہا جائے کہ مجاز ہے تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جسکی کوئی حقیقت نہیں دوسرے احادیث صحیحہ میں صرف پانچ نمازوں کی تعیین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب معراج میں جو اوّل پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں پھر تخفیف کرکے پانچ کر دیگئیں تو اگرچہ عدد گھٹا دیا گیا مگر ثواب پچاس ہی کا ملے گا اور پھر فرمایا لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ یعنی میرا قول بدلا نہیں کرتا جب پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا اگرچہ عمل میں کمی کر دی گئی۔

ان روایات کا حاصل یہی ہے کہ عام اُمت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نَافِلَة کا لفظ اگر اس جگہ فریضہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَّکَ کے بجائے عَلَیْکَ ہونا چاہئے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے لفظ لَکَ تو صرف جواز اور اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسکو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہوگئی اور سب کے لئے نفل رہگیا مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کیا ہے نفل ہونا تو سب ہی کے لئے ثابت ہے پھر نَافِلَةً لَّکَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفلی عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کمی رہ جائے اسکی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی، اس لئے آپ کے حق میں نفلی عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔ (قرطبی ومظہری)

نمازِ تہجد نفل ہے یا سنّت مؤکدہ

سنّت مؤکدہ کے لئے جو عام ضابطہ فقہاء کا ہے کہ جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً مداومت فرمائی ہو اور بلا مجبوری کے نہ چھوڑا ہو وہ سنّتِ مؤکدہ ہے بجز اس کے کہ کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا عام امت کے لئے نہیں تھا اس ضابطہ کا تقاضا بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کیلئے سنّت مؤکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سنّت متواترہ سے ثابت ہے اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں اسلئے عام امّت کے لئے بھی سنّت مؤکدہ ہونا چاہئے۔ تفسیر مظہری میں اسکو مختار اور راجح قرار دیا ہے اور اسکے مؤکدہ ہونے پر حضرت ابن مسعود رضؓ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تہجد پڑھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا یہ ارشاد فرمایا کہ "اسکے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے" اس طرح کی وعید اور تنبیہ صرف نفل میں نہیں ہو سکتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنّت موکدہ ہے۔

اور جن حضرات نے تہجد کو صرف نفل قرار دیا ہے وہ اس مواظبت اور مداومت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور تہجد پڑھنے والے کے ترک تہجد پر جو زجر کے الفاظ ارشاد فرمائے وہ دراصل مطلقاً ترک پر نہیں بلکہ اول عادت ڈالنے کے بعد ترک کرنے پر ہیں کیونکہ آدمی جس نفل کی عادت ڈال لے باتفاق امت اس کو چاہئے کہ اسپر مداومت کرے اگر عادت ڈالنے کے بعد چھوڑ یگا تو قابل ملامت ہوگا کیونکہ عادت کے بعد بلا عذر ترک ایک قسم کے اعراض کی علامت ہے اور جو شروع سے عادی نہو تو اسپر کوئی ملامت نہیں۔ واللہ اعلم۔

تہجد کی تعداد رکعات | صحیح بخاری و مسلم میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے ان گیارہ رکعات میں حنفیہ کے نزدیک تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں باقی آٹھ تہجد کی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں صدیقہ عائشہ رضہ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جنمیں وتر بھی شامل ہیں اور دو رکعتیں سنّت فجر کی بھی (مظہری) سنّت فجر کو رات کی نماز میں بوجہ رمضان کے شمار کر لیا ہے۔) ان روایات سے معلوم ہوا کہ عام عادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تہجد کی نماز میں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے۔

لیکن صدیقہ عائشہ رضی کی ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی اس تعداد سے کم چار یا چھ رکعات پر بھی اکتفا فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ سے یہ منقول ہے کہ حضرت مسروق نے صدیقہ رضہ سے تہجد کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سات، نو، اور گیارہ رکعات ہوتی تھیں علاوہ سنّت فجر کے (مظہری عن البخاری) حنفیہ کے قاعدہ کے مطابق تین رکعت وتر کی ہوئی تو سات میں سے چار نو میں سے چھ، گیارہ میں سے آٹھ تہجد کی رکعتیں رہ جاتی ہیں۔

نماز تہجد کی کیفیت | جو عام روایات حدیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو رکعت ہلکی مختصر قرارت کے ساتھ پھر باقی رکعات میں قرارت بھی طویل اور رکوع سجدہ بھی طویل ہوتا اور یہ طول لبا اوقات بہت زیادہ ہو جاتا تھا کبھی کچھ کم (یہ خلاصہ ان روایات حدیث کا ہے جو اس جگہ تفسیر مظہری میں نقل کی گئی ہیں)۔

مقام محمود | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقام محمود کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ مقام

تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اس کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں مگر صحیح وہ ہے جو احادیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میدان حشر میں جس وقت تمام بنی آدم جمع ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کر دیں گے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت فرماوینگے تفصیل اس کی روایات حدیث میں طویل ہے جو اس جگہ ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں لکھی ہے۔

انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہوگی اسلامی فرقوں میں سے خوارج اور معتزلہ شفاعت انبیاء کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کسی کی شفاعت سے معاف نہیں ہوگا مگر احادیث متواترہ اس پر شاہد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بلکہ صلحاء اُمت کی بھی شفاعت گناہگاروں کے حق میں مقبول ہوگی بہت سے لوگوں کے گناہ شفاعت سے معاف کر دیئے جاویں گے۔

ابن ماجہ اور بیہقی میں بروایت عثمان رضؓ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اوّل انبیاء علیہم السلام گناہگاروں کی شفاعت کرینگے پھر علماء پھر شہداء اور دیلمی نے بروایت ابن عمر رضؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کی برابر ہو۔

اور ابوداؤد اور ابن حبانؒ نے بروایت ابی الدرداء رضؓ مرفوعاً نقل کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے متعلق قبول کیجائے گی۔

مسند احمد، طبرانی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت ابوامامہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت پر قبیلہ ربیعہ اور مضر کے تمام لوگوں سے زیادہ آدمی جنت میں داخل کئے جاویں گے۔

ایک سوال وجواب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمادیں گے اور آپ کی شفاعت سے کوئی مؤمن دوزخ میں نہ رہ جاویگا تو پھر امت کے علماء و صلحاء کی شفاعت کس لئے اور کیونکر ہوگی۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً صورت یہ ہوگی کہ علماء اور صلحاء امت جن لوگوں کی شفاعت کرنا چاہیں گے وہ اپنی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت فرمادیں گے۔

فائدہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ یعنی میری شفاعت میری اُمت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنھوں نے کبیرہ گناہ

سکیں گے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوگی کوئی فرشتہ یا امت کا فرد اہل کبائر کی شفاعت نہ کر سکے گا بلکہ صلحاء امت کی شفاعت صغیرہ گناہ والوں کے لئے ہوگی۔

نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اول نماز تہجد کا حکم دیا گیا پھر مقام محمود یعنی شفاعت کبریٰ کا وعدہ کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ الآیہ۔ سابقہ آیات میں اول کفار مکہ کی ایذاؤں اور ان تدبیروں کا ذکر تھا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچانے کے لئے کرتے تھے اسکے ساتھ یہ بھی مذکور ہوا کہ ان کی یہ تدبیریں کامیاب نہیں ہوں گی اور ان کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل تدبیر کے درجہ میں تو صرف پنجگانہ نماز قائم کرنے اور تہجد گذاری کی تلقین فرمائی اسکے بعد آخرت میں آپکو سب انبیاء سے اعلیٰ مقام یعنی مقام محمود عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جو آخرت میں پورا ہوگا مذکورہ آیت وَقُلْ رَّبِّ میں حق تعالیٰ نے اسی دنیا میں اول آپکو کفار کے مکائد اور ایذاؤں سے نجات دینے کی تدبیر بصورت ہجرت مدینہ ارشاد فرمائی اور اسکے بعد فتح مکہ کی بشارت وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ میں ارشاد فرمائی گئی۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے پھر آپکو ہجرت مدینہ کا حکم دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ اس میں لفظ مُدْخَل اور مُخْرَج داخل ہونے اور خارج ہونے کی جگہ میں ظرف ہے اور ان کے ساتھ صفت صدق بڑھانے سے مراد یہ ہے کہ نکلنا اور داخل ہونا سب اللہ کی مرضی کے مطابق خیر و خوبی کے ساتھ ہو کیونکہ لفظ صدق عربی زبان میں ہر ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ظاہراً اور باطناً درست اور بہتر ہو قرآن کریم میں قدم صدق اور لسان صدق اور مقعد صدق کے الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

داخل ہونے کی جگہ سے مراد مدینہ اور خارج ہونے کی جگہ سے مراد مکہ ہے مطلب یہ ہے کہ یا اللہ مدینہ میں میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے وہاں کوئی خلاف طبع اور ناگوار صورت پیش نہ آئے اور مکہ مکرمہ سے میرا نکلنا خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے کہ وطن اور گھر بار کی محبت میں دل الجھا نہ رہے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور اقوال بھی آئے ہیں مگر یہ تفسیر حضرت حسن بصری اور قتادہ سے منقول ہے ابن کثیر نے اسی کو اصح الاقوال کہا ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ترتیب کا تقاضہ یہ تھا

کہ پہلے مخرج پھر مدخل کا ذکر ہوتا مگر یہاں مدخل کو مقدم اور مخرج کو مؤخر کرتے ہیں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ مکہ مکرمہ سے نکلنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ بیت اللہ کو چھوڑنا انتہائی صدمہ کی چیز تھی البتہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے مامن تلاش کرنا مقصد تھا جو داخلہ مدینہ کو ذریعہ حاصل ہونیکی امید تھی اسلئے جو مقصد تھا اسکو مقدم رکھا گیا۔

فائدہ | مہم مقاصد کے لئے مقبول دعا | ہجرت مدینہ کے وقت حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ سے نکلنا اور پھر مدینہ پہونچنا دونوں خیر و خوبی اور عافیت کے ساتھ ہوں اسی دعا کا ثمرہ تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیبہ کو ظاہراً و باطناً آپ کے اور سب مسلمانوں کے لئے سازگار بنایا۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنا چاہئے اور ہر مقصد کے لئے یہ دعا مفید ہے اسی دعا کا تکملہ بعد کا جملہ ہے وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ منصب رسالت کے فرائض کی ادائیگی اور دشمنوں کے نرغے میں کام کرنا اپنے بس کا نہیں اس لئے حق تعالیٰ سے غلبہ و نصرت کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور اس کے آثار سب کے سامنے آگئے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ یہ آیت ہجرت کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی حضرت ابن مسعود رضہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اسوقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بتوں کے مجسمے کھڑے ہوئے تھے بعض علماء نے اس خاص تعداد کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ مشرکین مکہ سال بھر کے دنوں میں ہر دن کا بت الگ رکھتے تھے اس دن میں اسکی پرستش کرتے تھے۔ (قرطبی) آپؐ جب وہاں پہونچے تو یہ آیت آپ کی زبان مبارک پر تھی جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور اپنی لکڑی ایک ایک بت کے سینے میں مارتے جاتے تھے (بخاری و مسلم)

بعض روایات میں ہے کہ اس چھڑی کے نیچے رانگ یا لوہے کی شام لگی ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بت کے سینہ میں اس کو مارتے تو وہ الٹا گر جاتا تھا یہاں تک کہ یہ سب بت گر گئے اور پھر آپؐ نے ان کے توڑنے کا حکم دیدیا (قرطبی بحوالہ قاضی عیاض و قشیری)

شرک و کفر اور باطل کی رسوم و نشانات کا مٹانا واجب ہے | امام قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ مشرکین کے بت اور دوسرے مشرکانہ نشانات کو مٹانا واجب ہے اور تمام وہ آلات باطلہ جنکا مصرف صرف معصیت ہو انکا مٹانا بھی اسی حکم میں ہے ابن منذر نے فرمایا کہ تصویریں اور مجسمے جو لکڑی پیتل وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں وہ بھی بتوں ہی کے حکم میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو پھاڑ ڈالا جسپر تصویریں نقش و رنگ سے بنائی گئی تھیں۔ اس سے عام تصاویر کا حکم معلوم ہوگیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں تشریف لاوینگے تو صحیح حدیث کے مطابق

صلیبوں کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے یہ سب امور اسکی دلیل ہیں کہ شرک و کفر اور باطل کے آلات کو توڑنا اور ضائع کر دینا واجب ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ - قرآن کریم کا قلوب کے لئے شفاء ہونا، شرک و کفر اور اخلاق رذیلہ اور امراض باطنہ سے نفوس کی نجات کا ذریعہ ہونا تو کھلا ہوا معاملہ ہے اور تمام اُمّت اس پر متفق ہے اور بعض علماء کے نزدیک قرآن جسطرح امراض باطنہ کی شفاء ہے امراض ظاہرہ کی بھی شفاء ہے کہ آیات قرآن پڑھکر مریض پر دم کرنا اور تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا امراض ظاہرہ کے لئے بھی شفاء ہوتا ہے روایات حدیث اس پر شاہد ہیں تمام کتب حدیث میں ابو سعید خدری رضؓ کی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت سفر میں تھی کسی گاؤں کے رئیس کو بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ لوگوں نے حضرات صحابہ سے پوچھا کہ آپ کچھ اسکا علاج کر سکتے ہیں انھوں نے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا مریض اچھا ہو گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسکا تذکرہ آیا تو آپؐ نے صحابۂ کرام کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔

اسی طرح دوسری متعدد روایات حدیث سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذات پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابۂ و تابعین سے معوذات اور دوسری آیات قرآن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے جسکو اس آیت کے تحت قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو جب اعتقاد و احترام کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا شفاء ہونا جس طرح ظاہر اور ثابت ہے اسی طرح قرآن کا انکار یا بے ادبی خسارہ اور آفات کا ذریعہ بھی ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا

اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال جائے اور بچائے اپنا پہلو اور جب

مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ

پہنچے اس کو بُرائی تو رہ جائے مایوس ہوکر تو کہہ ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر

فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع ۹

سو تیرا رب خوب جانتا ہے کس نے خوب پا لیا راستہ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (بعض) آدمی (یعنی کافر) ایسا ہوتا ہے کہ اس (کو جب ہم نعمت عطاء کرتے ہیں تو (ہم سے

اور ہمارے احکام سے) منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اسکو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو (بالکل رحمت سے) ناامید ہو جاتا ہے (اور یہ دونوں حالتیں دلیل ہیں اللہ تعالیٰ سے بے تعلقی کی اور وہی بنیاد ہے ہر کفر و گمراہی کی) آپ فرما دیجئے کہ (مومنین اور کفار اور اخیار و اشرار میں سے) ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کر رہا ہے (یعنی اپنی اپنی عقل صحیح پر مقیم اور علم یا جہل کی بنیاد پر مختلف طرح کے کام کر رہے ہیں) تو آپ کا رب خوب جانتا ہے اسکو جو زیادہ ٹھیک اور درست راستہ پر ہو (اسی طرح جو ٹھیک راستہ پر نہ ہو اسکو بھی جانتا ہے اور ہر ایک کو اسکے عمل کے موافق جزا یا سزا دیگا۔ یہ نہیں کہ جسکا دل چاہے بلا کسی دلیل کے اپنے کو ٹھیک راستہ پر سمجھنے لگے)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ - لفظ شَاكِلَة کی تفسیر میں ائمہ سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں طبیعت، عادت، جبلّت، نیت، طریقہ وغیرہ اور حاصل سب کا یہ ہے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور عادات اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک عادت اور طبیعت ثانیہ بنجاتی ہے اُسکا عمل اسی کے تابع رہتا ہے (قرطبی) اسمیں انسان کو اسپر تنبیہ کی گئی ہے کہ بُرے ماحول، بُری صحبت اور بُری عادتوں سے پرہیز کرے نیک لوگوں کی صحبت اور اچھی عادات کا خوگر بنے (جصاص) کیونکہ اپنے ماحول اور صحبت اور رسم و رواج سے انسان کی ایک طبیعت بنجاتی ہے اسکا ہر عمل اسی کے تابع چلتا ہے امام جصاص نے اس جگہ شاکلہ کے ایک معنی ہم شکل کے بھی کئے ہیں اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آدمی سے مانوس ہوتا ہے نیک آدمی نیک سے اور شریر شریر سے مانوس ہوتا ہے اسی کے طریقہ پر چلتا ہے اور اسکی نظیر حق تعالیٰ کا یہ قول ہے: اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ اور وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ یعنی خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے ہیں مراد یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق مرد و عورت سے مانوس ہوتا ہے اور حاصل مطلب اسکا بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خراب صحبت اور خراب عادت سے پرہیز کا اہتمام کرے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ
اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو کہہ دے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم

اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ
کو علم دیا ہے تھوڑا سا اور اگر ہم چاہیں تو لے جائیں

بِالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾

اُس چیز کو جو ہم نے تجھ کو وحی بھیجی پھر تو نہ پائے اپنے واسطے اُس کے لا دینے کو ہم پر کوئی ذمہ دار

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾

مگر مہربانی سے تیرے رب کی اُس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ

کہہ اگر جمع ہوں آدمی اور جن اس پر کہ لائیں ایسا

هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

قرآن ہرگز نہ لائیں گے ایسا قرآن اور پڑے مدد کیا کریں ایک دوسرے

ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ

کی اور ہم نے پھیر پھیر کر سمجھائی لوگوں کو اس قرآن میں ہر

كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

مثل سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری کئے۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح (کی حقیقت) کو پوچھتے ہیں آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ روح (کے متعلق بس اتنا اجمالاً سمجھ لو کہ وہ ایک چیز ہے جو) میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور (باقی اس کی مفصّل حقیقت سو) تمکو بہت تھوڑا علم (بقدر تمہاری فہم اور ضرورت کے) دیا گیا ہے (اور روح کی حقیقت کا معلوم کرنا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور نہ اسکی حقیقت عام طور پر سمجھ میں آسکتی ہے اسلئے قرآن اسکی حقیقت کو بیان نہیں کرتا)

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے (اور اسکے ذریعہ آپکو علم دیا ہے) سب سلب کرلیں پھر اس (وحی) کے (واپس لانے کے لئے) آپکو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے گا مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اسکا بڑا فضل ہے (مطلب یہ ہے کہ انسان کو روح وغیرہ ہر چیز کی حقیقت کا تو کیا علم ہوتا اسکو جو تھوڑا سا علم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بھی اس کی کوئی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ

چاہے تو دینے کے بعد بھی سلب کر سکتا ہے مگر وہ اپنی رحمت سے ایسا کرتا نہیں وجہ یہ ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے) آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب بھی وہ ایسا نہ کر سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے (یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ کوشش کر کے تو کیا کامیاب ہوتا سب کے سب ایکدوسرے کی مدد سے کام کر کے بھی قرآن کا مثل نہیں بنا سکتے) اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے نہ رہے

معارف و مسائل

آیات صدر میں پہلی آیت میں کفار کی طرف سے روح کے متعلق ایک سوال اور حق تعالیٰ کی طرف سے اسکا جواب مذکور ہے لفظ روح لغات و محاورات میں نیز قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے معروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں یعنی جان جس سے حیات اور زندگی قائم ہے. قرآن کریم میں یہ لفظ جبرئیل امین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے اور خود قرآن کریم اور وحی کو بھی روح کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔

روح سے مراد کیا ہے اس لئے یہاں پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح کا سوال کس معنی کے لحاظ سے کیا تھا بعض حضرات مفسرین نے سیاق و سباق کی رعایت سے یہ سوال وحی اور قرآن یا وحی لانے والے فرشتے جبرئیل کے متعلق قرار دیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں قرآن کا ذکر تھا اور بعد کی آیات میں پھر قرآن ہی کا ذکر ہے اس کے مناسب اسکو سمجھا کہ اس سوال میں بھی روح سے مراد وحی و قرآن یا جبرئیل ہی ہیں، اور مطلب سوال کا یہ ہوگا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے کون لاتا ہے. قرآن کریم نے اس کے جواب میں اسپر اکتفا کیا کہ اللہ کے حکم سے وحی آتی ہے تفصیلات اور کیفیات جنکا سوال تھا وہ نہیں بتلائیں۔

لیکن احادیث صحیحہ مرفوعہ میں جو اس آیت کا شان نزول بتلایا گیا ہے وہ تقریباً اسمیں صریح ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح حیوانی کا سوال کیا تھا اور مقصد سوال کا روح کی حقیقت معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا چیز ہے بدن انسانی میں کسطرح آتی جاتی ہے اور کس طرح اس سے حیوان اور انسان زندہ ہو جاتا ہے. صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ سے روایت

ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے غیر آباد حصے میں چل رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک چھڑی کھجور کی شاخ کی تھی آپکا گذر چند یہودیوں پر ہوا۔ یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آرہے ہیں ان سے روح کے متعلق سوال کرو دوسروں نے منع کیا مگر سوال کرنے والوں نے سوال کر ہی ڈالا یہ سوال سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکڑی پر ٹیک لگا کر خاموش کھڑے ہو گئے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ پر وحی نازل ہونے والی ہے کچھ وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھکر سنائی وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ یہاں ظاہر ہے کہ قرآن یا وحی کو روح کہنا یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح تھی ان لوگوں کے سوال کو اس پر محمول کرنا بہت بعید ہے البتہ روح حیوانی وانسانی کا معاملہ ایسا ہے کہ اسکا سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہی ہے اسی لئے جمہور مفسرین ابن کثیر ابن جریر، قرطبی، بحر محیط، روح المعانی سبھی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ سوال روح حیوانی کی حقیقت سے تھا رہا یہ معاملہ کہ سیاق وسباق میں ذکر قرآن کا چلا آیا ہے درمیان میں روح کا سوال جواب بے جوڑ ہے تو اسکا جواب واضح ہے کہ اس سے پہلی آیات میں کفار ومشرکین کی مخالفت اور معاندانہ سوالات کا ذکر آیا ہے جن سے منظور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربارۂ رسالت امتحان کرنا تھا یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس لئے بے جوڑ نہیں خصوصاً شان نزول کے متعلق ایک دوسری حدیث صحیح منقول ہے اسمیں یہ بات زیادہ وضاحت سے آگئی ہے کہ سوال کرنے والوں کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا امتحان لینا تھا

چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ (قریش مکہ جو جا و بے جا سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہتے تھے انکو خیال پیدا ہوا کہ یہود علم والے ہیں انکو پچھلی کتابوں کا بھی علم ہے ان سے کچھ سوالات حاصل کئے جاویں جنکے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیا جائے اسلئے قریش نے یہود سے دریافت کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے انھوں نے کہا کہ تم اُن سے روح کے متعلق سوال کرو (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباس ؓ ہی سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ روح پر عذاب کسطرح ہوتا ہے اسوقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بارے میں کوئی بات نازل نہ ہوئی تھی اسلئے اسوقت آپ نے فوری جواب نہیں دیا پھر جبرئیل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (ابن کثیر ملخصاً)

واقعہ سوال مکہ میں پیش آیا یا مدینہ میں

اس سے پہلے یہاں ایک بات اور قابل نظر ہے کہ شان نزول کے متعلق جو دو حدیثیں ابن مسعود ؓ وابن عباس ؓ کی اوپر نقل کیگئیں ہیں انہیں سو ابن مسعود ؓ

کی روایت کے مطابق یہ واقعہ سوال مدینہ میں پیش آیا اور اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اگرچہ اکثر حصّہ سورۂ بنی اسرائیل کا مکی ہے اور ابن عباس رضؓ کی روایت کا تعلق مکہ مکرمہ کے واقعہ سے ہے اسکے مطابق یہ آیت بھی پوری سورت کی طرح مکی باقی رہتی ہے اسی لئے ابن کثیرؒ نے اسی احتمال کو راجح قرار دیا ہے اور ابن مسعود رضؓ کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ میں دوسری مرتبہ ہوا ہو جیسا کہ بہت سی آیات قرآن کا نزول مکرر سب علماء کے نزدیک مسلم ہے اور تفسیر مظہری نے ابن مسعود رضؓ کی روایت کو راجح قرار دیکر واقعہ مدینہ کا اور آیت کو مدنی قرار دیا ہے جس کی دو وجہ بتلائیں ایک یہ کہ یہ روایت صحیحین میں ہے اور سند اسکی روایتِ ابن عباس رضؓ سے زیادہ قوی ہے دوسرے یہ کہ اسمیں خود صاحب واقعہ ابن مسعود رضؓ اپنا واقعہ بیان کر رہے بخلاف روایت ابن عباس رضؓ کے کہ اسمیں ظاہر یہی ہے کہ ابن عباس رضؓ نے یہ بات کسی سے سنی ہوگی۔

سوال مذکور کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ اس جواب کی تشریح میں حضرات مفسرین کے کلمات اور تعبیرات مختلف ہیں انمیں سب سے زیادہ اقرب اور واضح وہ ہے جو تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحؒ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس جواب میں جتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے صرف وہ بتلا دیگئی اور روح کی مکمل حقیقت جسکا سوال تھا اسکو اسلئے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی اور ان کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ آپ ان کے جواب میں یہ فرما دیجئے کہ "روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے" یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تطورات اور توالد و تناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں بلکہ وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے حکم کُنْ سے پیدا ہونے والی چیز ہے۔ اس جواب نے یہ تو واضح کر دیا کہ روح کو عام مادیات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جس سے وہ تمام شبہات رفع ہو گئے جو روح کو عام مادیات پر قیاس کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے لئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے اس سے زائد علم کے ساتھ اسکا کوئی دینی یا دنیوی کام اٹکا ہوا نہیں اسلئے وہ حصّہ سوال فضول اور لایعنی قرار دیکر اس کا جواب نہیں دیا گیا خصوصاً جبکہ اس کی حقیقت کا سمجھنا عوام کے لئے تو کیا بڑے بڑے حکماء و عقلاء کے لئے بھی آسان نہیں۔

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سائل کی دینی مصلحت کی رعایت لازم ہے امام جصاص رحؒ نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ سائل کے ہر سوال اور اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھکر جواب دینا چاہئے جو جواب

مخاطب کے فہم سے بالاتر ہو یا اسکے غلط فہمی میں پڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے
اسی طرح بے ضرورت یا لایعنی سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا
واقعہ پیش آیا جسکے متعلق اسکو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے
مطابق اسکا جواب دینا ضروری ہے (بصاص) امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس مسئلے کا ایک مستقل
ترجمۃ الباب رکھکر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اسکا جواب نہیں دینا چاہئے۔

روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں

قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اور فہم کے مطابق دیدیا حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا مگر اس سے
یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت کو کوئی انسان سمجھ ہی نہیں سکتا اور یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو بھی اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اسکی نفی کرتی ہے نہ اثبات اگر
کسی نبی و رسول کو وحی کے ذریعہ یا کسی ولی کو کشف و الہام کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے
تو اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ عقل و فلسفہ کی رو سے بھی اسپر کوئی بحث و تحقیق کی جائے تو
اسکو فضول اور لایعنی تو کہا جائے گا مگر ناجائز نہیں کہا جا سکتا اسی لئے بہت سے علماء متقدمین
و متاخرین نے روح کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں آخری دور میں ہمارے استاد محترم شیخ الاسلام
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے ایک مختصر سے رسالے میں اس مسئلے کو بہترین انداز سے
لکھا ہے اور اسمیں جسقدر حقیقت سمجھنا عام انسان کے لئے ممکن ہے وہ سمجھا دی ہے جسپر ایک
تعلیم یافتہ انسان قناعت کر سکتا ہے اور شبہات و اشکالات سے بچ سکتا ہے۔

فائدہ: امام بغوی رح نے اس جگہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک مفصل روایت
اس طرح نقل فرمائی ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ مکہ کے قریشی سرداروں نے جمع ہو کر
مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے اندر پیدا ہوئے اور جوان ہوئے ان کی امانت و
دیانت اور سچائی میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا اور کبھی ان کے متعلق جھوٹ بولنے کی تہمت بھی کسی نے نہیں
لگائی۔ اور اس کے باوجود اب جو دعویٰ نبوت کا وہ کر رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے
ایسا کرو کہ اپنا ایک وفد مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجکر ان سے ان کے بارے میں تحقیقات
کرو، چنانچہ قریش کا ایک وفد علماء یہود کے پاس مدینہ پہنچا علماء یہود نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم تمہیں
تین چیزیں بتلاتے ہیں تم ان سے ان تینوں کا سوال کرو۔ اگر انھوں نے تینوں کا جواب دیدیا تو وہ نبی
نہیں اسیطرح تینوں میں سے کسی کا جواب نہ دیا تو بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیا تیسری چیز کا جواب
نہ دیا تو سمجھ لو کہ وہ نبی ہیں[1] وہ تین سوال یہ بتلائے کہ ایک تو ان سے ان لوگوں کا حال پوچھو جو قدیم

[1] یہ تفصیل معالم التنزیل ص ۱۳۴ ج ۴ کے مطابق ہے۔ محمد تقی عثمانی

زمانے میں شرک سے بچنے کے لئے کسی غار میں چھپ گئے تھے کیونکہ انکا واقعہ عجیب ہے دوسرے اس شخص کا حال پوچھو جسنے زمین کے مشرق و مغرب کا سفر طے کیا کہ اس کا کیا واقعہ ہے تیسرے روح کے متعلق دریافت کرو۔

یہ وفد واپس آیا اور تینوں سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیئے آپؐ نے فرمایا کہ میں اسکا جواب تمہیں کل دونگا۔ مگر اسپر انشاء اللہ نہیں کہا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا بارہ پندرہ سے لیکر چالیس دن تک کی مختلف روایات ہیں جنمیں سلسلہ وحی بند رہا۔ قریش مکہ کو طعن تشنیع کا موقع ملا کہ کل جواب دینے کو کہا تھا آج اتنے دن ہوگئے جواب نہیں ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پریشانی ہوئی پھر حضرت جبرئیل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ جسمیں آپکو یہ تلقین کی گئی کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہکر کیا جائے اور اسکے بعد روح کے متعلق یہ آیت سنائی جو اوپر مذکور ہوئی اور غار میں چھپنے والوں کے متعلق اصحاب کہف کا واقعہ اور مشرق سے مغرب تک سفر کرنے والے ذوالقرنین کا واقعہ جو سورۂ کہف میں آنے والا ہے اس کی آیات نازل ہوئیں جنمیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ جواب میں بیان فرمایا گیا اور روح کے متعلق جس حقیقت کا سوال تھا اس کا جواب نہیں دیا گیا جس سے یہود کی بتلائی ہوئی علامت صدق نبوت کی ظاہر ہوگئی۔ اس واقعہ کو ترمذی نے بھی مختصراً بیان کیا ہے (مظہری)

سورۂ حجر کی آیت ۲۹ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کے تحت روح اور نفس وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ایک تحقیق بحوالہ تفسیر مظہری پہلے گذر چکی ہے جسمیں روح کی اقسام اور ہر ایک کی حقیقت کو کافی حد تک واضح کر دیا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ پچھلی آیت میں روح کے سوال پر بقدر ضرورت جواب دیکر روح کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش سے یہ کہکر روک دیا گیا تھا کہ انسان کا علم کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر حقائق الاشیاء کی ہمہ گیری کے اعتبار سے کم ہی رہتا ہے اس لئے غیر ضروری مباحث اور تحقیقات میں الجھنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ آیت وَلَئِنْ شِئْنَا میں اسطرف اشارہ ہے کہ انسان کو جسقدر بھی علم ملا ہے وہ بھی اسکی ذاتی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسکو بھی سلب کر سکتے ہیں اسلئے اسکو چاہئے کہ موجودہ علم پر اللہ کا شکر ادا کرے اور فضول و لایعنی تحقیقات میں وقت ضائع نہ کرے خصوصاً جبکہ مقصود تحقیق کرنا بھی نہ ہو بلکہ دوسرے کا امتحان لینا یا اسکو خفیف کرنا مقصود ہو اگر اس نے ایسا کیا تو کچھ بعید نہیں کہ اس کج روی کے نتیجہ میں جتنا علم حاصل ہے وہ سب سلب ہو جائے اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر اصل سنانا امت کو مقصود ہے کہ جب رسول کا علم بھی انکے اختیار میں نہیں تو دوسروں کا کیا کہنا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ یہ مضمون قرآن مجید کی چند آیات میں آیا ہے جسمیں پوری دنیائے انسان کو خطاب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تم قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے بلکہ کسی انسان کا بنایا ہوا مانتے ہو تو پھر تم بھی انسان ہو اسکی مثال بنا کے دکھلا دو۔ اس آیت میں اس دعویٰ کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا کہ صرف انسان نہیں جنّات کو بھی اپنے ساتھ ملا لو اور پھر تم سب ملکر قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت کی مثال بھی نہ بنا سکو گے۔

اس مضمون کا اس جگہ پر اعادہ ممکن ہے کہ یہ بتلانے کے لئے ہو کہ تم جو ہمارے رسول سے مختلف قسم کے سوالات روح وغیرہ کے متعلق ان کی رسالت و نبوت کی آزمائش کے لئے کرتے ہو کیوں ان فضول قصّوں میں پڑے ہو خود قرآن کریم کو دیکھ لو تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ جب ساری دنیا کے جن و انس اس کی ادنیٰ سی مثال بنانے سے عاجز ہیں تو اسکے کلام الٰہی ہونے میں کیا شبہ رہتا ہے اور جب قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا اس بداہت سے ثابت ہو گیا تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شبہ کی کیا گنجائش رہتی ہے۔

آخری آیت وَلَقَدْ صَرَّفْنَا میں یہ بتلا دیا کہ اگرچہ قرآن کریم کا معجزہ اتنا کھلا ہوا ہے کہ اسکے بعد کسی سوال اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی مگر ہو یہ رہا ہے کہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے نعمت قرآن کی بھی قدر نہیں پہچانتے اسلئے گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾

اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا

یا ہو جائے تیرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا پھر بہائے تو اس کے بیچ نہریں

تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ

چلا کر یا گرا دے ہم پر آسمان جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا

تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ

لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے یا ہو جائے تیرے لئے ایک گھر سنہرا

زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى

یا چڑھ جائے تو آسمان میں اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو جب تک

تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ

نہ اُتار لائے ہم پر ایک کتاب جسکو ہم پڑھ لیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں

اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ

مگر ایک آدمی ہوں بھیجا ہوا اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی

الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ

اُن کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بھیجا آدمی کو پیغام دے کر کہہ اگر

كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ

ہوتے زمین میں فرشتے پھرتے بستے تو ہم اُتارتے اُن پر

مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کر۔

خلاصۂ تفسیر

سابقہ آیات میں کفار کے چند سوالات اور ان کے جوابات ذکر کئے گئے ہیں مذکور الصدر آیات میں ان کے چند معاندانہ سوالات اور بے سروپا فرمائشوں کا ذکر اور ان کا جواب ہے (اخرجہ ابن جریر عن ابن عباس) اور یہ لوگ دبا وجود اسکے کہ اعجاز قرآنی کے ذریعہ آپ کی نبوت و رسالت کا کافی اور واضح ثبوت ان کو مل چکا پھر بھی ازراہ عناد ایمان نہیں لاتے اور یہ بہانے کرتے ہیں کہ) کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لاویں گے جب تک آپ ہمارے لئے (مکہ کی) زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دیں یا خاص آپ کے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرادیں (جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد ہے اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (یعنی ہم چاہیں تو ان کو زمین کے اندر دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرادیں) یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے نہ لا کھڑا کر دیں (کہ ہم کھلم کھلا دیکھ لیں) یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر (ہمارے سامنے) نہ چڑھ جاویں اور ہم تو آپ کے (آسمان پر) چڑھنے کا کبھی بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ (وہاں سے) آپ ہمارے پاس ایک کتاب نہ لادیں جسکو ہم پڑھ بھی لیں (اور اسمیں آپ کے آسمان پر پہونچنے کی تصدیق بطور رسید لکھی ہوئی ہو) آپ

(ان سب خرافات کے جواب میں) فرما دیجئے کہ سبحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں (مگر) پیغمبر ہوں اور کیا ہوں (کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا میری قدرت میں ہو یہ قدرت مطلقہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے، بشریت اپنی ذات میں خود عجز و بے اختیاری کو مقتضی ہے رہا رسالت کا معاملہ تو وہ بھی اسکو مقتضی نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو ہر چیز کا مکمل اختیار ہو بلکہ نبوت و رسالت کے لئے تو اتنی بات کافی ہے کہ رسالت کی کوئی صاف و واضح دلیل آجاوے جس پر اہل عقل کو اعتراض نہ ہو سکے اور وہ دلیل اعجاز قرآنی اور دوسرے معجزات کی صورت میں بارہا پیش کی جا چکی ہے اس لئے نبوت و رسالت کے لئے ان فرمائشوں کا مطالبہ محض لغو ہے ہاں اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر اس سے کسی کو مطالبہ کا حق نہیں جس چیز کو وہ حکمت کے مطابق دیکھتے ہیں ظاہر بھی کر دیتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہاری سب فرمائشیں پوری کریں اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت (یعنی رسالت کی صحیح دلیل مثل اعجاز قرآن کے) پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی (قابل التفات) بات مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے (بشریت کو رسالت کے منافی سمجھا اس لئے) کہا کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا) آپ (جواب میں ہماری طرف سے) فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے (رہتے) ہوتے کہ اس پر چلتے بستے تو ہم البتہ ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

معارف و مسائل

بے سروپا معاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب

آیات مذکورہ میں جو سوالات اور فرمائشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دیکر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو سنکر ایک قسم کا تمسخر اور ایمان نہ لانے کا بیہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا ایسے سوالات کے جواب میں انسان کو فطرۃً غصہ آتا ہے اور جواب بھی اسی انداز کا دیتا ہے۔ مگر ان آیات میں ان کے بیہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور مصلحین امت کے لئے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بے وقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا، نہ ان پر کوئی فقرہ کسا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے اسے سارے خدائی اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہونا چاہئے یہ تخیل غلط ہے رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ ان کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے معجزات بھی بھیجتے ہیں مگر وہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت

و اختیار سے ہوتا ہے رسول کو خدائی کے اختیارات نہیں ملتے وہ ایک انسان ہوتا ہے اور انسانی قوت و قدرت سے باہر نہیں ہوتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسکی امداد کے لئے اپنی قوت قاہرہ کو ظاہر فرما دیں۔

اللہ کا رسول انسان ہی ہوسکتا ہے فرشتے انسانوں کیطرف رسول نہیں ہوسکتے

عام کفار و مشرکین کا خیال تھا کہ بشر یعنی آدمی اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو ہماری طرح تمام حوائج انسانی کا عادی ہوتا ہے پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ ہم اسکو اللہ کا رسول سمجھیں اور اپنا مقتدا بنالیں۔ ان کے اس خیال کا جواب قرآن کریم میں کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا گیا ہے یہاں آیت مَا مَنَعَ النَّاس میں جو جواب دیا گیا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول جن لوگوں کی طرف بھیجا جائے وہ انھیں کی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اگر یہ آدمی ہیں تو رسول بھی آدمی ہونا چاہیئے کیونکہ غیر جنس کے ساتھ باہم مناسبت نہیں ہوتی اور بلا مناسبت کے رشد و ہدایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اگر آدمیوں کی طرف کسی فرشتے کو رسول بناکر بھیج دیں جو نہ بھوک کو جانتا ہے نہ پیاس کو نہ جنسی خواہشات کو نہ سردی گرمی کے احساس کو نہ اس کو کبھی محنت سے تکان لاحق ہوتا ہے تو وہ انسانوں سے بھی ایسے ہی عمل کی توقع رکھتا انکی کمزوری و مجبوری کا احساس نہ کرتا۔ اسی طرح انسان جب یہ سمجھتے کہ یہ تو فرشتہ ہے ہم اسکے کاموں کی نقل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو اس کا اتباع خاک کرتے۔ یہ فائدہ اصلاح اور رشد و ہدایت کا صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو تو جنس بشر سے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا خود بھی حامل ہو مگر ساتھ ہی اسکو ایک شان ملکیت کی بھی حاصل ہو کہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کرسکے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کرے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو پہونچائے۔

اس تقریر سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا کہ جب انسان فرشتہ سے فیض حاصل نہیں کرسکتا تو پھر رسول باوجود انسان ہونے کے کس طرح ان سے فیض وحی حاصل کرسکے گا۔

رہا یہ شبہ کہ جب رسول اور امّت میں مجانست شرط ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جنّات کا رسول کسطرح بنایا گیا جنّات تو انسان کے ہم جنس نہیں تو جواب یہ ہے کہ رسول صرف انسان نہیں بلکہ اسمیں ایک شان ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جنّات کو بھی مناسبت ان سے ہوسکتی ہے۔

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ تم انسان ہونے کے باوجود یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہمارا رسول فرشتہ ہونا چاہیئے یہ مطالبہ تو نامعقول ہے البتہ اگر اس زمین پر فرشتے آباد ہوتے اور ان کیطرف

رسول بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو فرشتہ ہی کو رسول بنایا جاتا اس میں جو زمین پر بسنے والے فرشتوں کا یہ وصف ذکر کیا گیا ہے کہ یَمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ یعنی وہ فرشتے زمین پر مطمئن ہو کر چلتے پھرتے، اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی طرف فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجنے کی ضرورت اسی وقت ہو سکتی تھی جبکہ زمین کے فرشتے خود آسمان پر نہ جا سکتے بلکہ زمین ہی پر چلتے پھرتے رہتے ورنہ اگر وہ خود آسمان پر جانے کی قدرت رکھتے تو زمین پر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ

کہہ اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا میرے اور تمہارے بیچ میں وہ ہے اپنے بندوں سے

خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ

خبردار دیکھنے والا اور جس کو راہ دکھلائے اللہ وہی ہے راہ پانے والا اور جس کو بھٹکائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پھر تو نہ پائے اُن کے واسطے کوئی رفیق اللہ کے سوائے اور اٹھائیں گے ہم ان کو دن قیامت کے

عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا

چلیں گے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے ٹھکانا اُن کا دوزخ ہے جب لگے گی

خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا

بجھنے اور بھڑکا دیں گے اُن پر یہ اُن کی سزا ہے اس واسطے کہ منکر ہوئے

بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا

ہماری آیتوں سے اور بولے کیا جب ہم ہو گئے ہڈیاں اور چورا چورا کیا ہم کو اٹھائیں گے

جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ

نئے بنا کر کیا نہیں دیکھ چکے کہ جس اللہ نے بنائے آسمان اور زمین وہ بنا

عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ

سکتا ہے ایسوں کو اور مقرر کیا ہے اُن کے واسطے ایک وقت بے شبہ سو نہیں رہا جاتا بے انصافوں

اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا

سے بے ناشکری کئے کہہ اگر تمہارے ہاتھ میں ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانے تو ضرور

النصف

لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

بند کر رکھتے اس ڈر سے کہ خرچ نہ ہوجائیں اور ہے انسان دل کا تنگ ۔

خلاصۂ تفسیر

جب یہ لوگ رسالت و نبوت کی دلائل واضحہ آجانے اور تمام شبہات دور ہوجانے کے بعد بھی نہیں مانتے تو) آپ (آخری بات) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے تمہارے درمیان (کے اختلاف میں) کافی گواہ ہے (یعنی خدا جانتا ہے کہ میں واقع میں اللہ کا رسول ہوں کیونکہ) وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے (تمہارے عناد کو بھی دیکھتا ہے) اور اللہ جسکو راہ پر لادے وہی راہ پر آتا ہے اور جسکو بے راہ کر دے تو خدا کے سوا آپ کسیکو بھی ایسوں کا مددگار نہ پاویں گے (اور بوجہ کفر کے یہ خدا کی مدد سے محروم رہے، مطلب یہ ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے دستگیری نہ ہو نہ ہدایت ہوسکتی ہے نہ عذاب سے نجات) اور ہم قیامت کے روز انکو اندھا گونگا بہرہ کر کے منہ کے بل چلائیں گے انکا ٹھکانا دوزخ ہے (جسکی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (یعنی دوزخ کی آگ) جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی اسیوقت ہم ان کے لئے اور زیادہ بھڑکا دیں گے۔ یہ ہے انکی سزا، اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور یوں کہا تھا کہ کیا ہم ہڈیاں اور (وہ بھی) بالکل ریزہ ریزہ ہوجاویں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے (قبروں سے) اٹھائے جاویں گے کیا ان لوگوں کو اتنا معلوم نہیں کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے وہ اس بات پر (بدرجہ اولیٰ) قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے اور (منکرین کو شاید یہ وسوسہ ہو کہ ہزاروں لاکھوں مر گئے مگر اب تک تو یہ وعدہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا پورا ہوا نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ) ان کے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے ایک میعاد معین کر رکھی ہے کہ اس میعاد (معین کے آنے) میں ذرا بھی شک نہیں۔ اسپر بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے (کہ جسکو چاہتے دیتے جسکو چاہتے نہ دیتے) تو اس صورت میں تم (اس کے) خرچ ہوجانے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے (کبھی کسیکو نہ دیتے حالانکہ یہ چیز کسیکو دینے سے گھٹتی بھی نہیں) اور آدمی ہے بڑا تنگدل (کہ نہ گھٹنے والی چیز کو بھی عطا کرتے سے دریغ کرتا ہے جس کی وجہ رسولوں سے عداوت اور بخل کے علاوہ شاید یہ بھی ہو کہ اگر کسی کو نبی اور رسول بنا لیا تو پھر اس کے احکام کی پابندی کرنا پڑے گی جیسے کوئی قوم باہم اتفاق کر کے کسیکو اپنا بادشاہ بنالے تو گو بنایا انھوں نے ہے مگر جب

وہ بادشاہ بن گیا تو اسکی اطاعت کرنی پڑتی ہے)

معارف و مسائل

آخری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہو جاؤ تو تم بخل کرو گے کسیکو نہ دو گے اس خطرہ سے کہ اگر لوگوں کو دیتے رہے تو یہ خزانہ ختم ہو جائے گا اگرچہ رحمت رب کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں مگر انسان اپنی طبیعت سے تنگدل کم حوصلہ ہوتا ہے اسکو فراخی کے ساتھ لوگوں کے دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

اسمیں خزائن رحمت رب کے لفظ سے عام مفسرین نے مال و دولت کے خزائن مراد لئے ہیں اور اسکا ربط ماسبق سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اسکی فرمائش کی تھی کہ اگر آپ واقعی نبی حق ہیں تو آپ اس مکہ کے خشک ریگستان میں نہریں جاری کر کے اسکو سرسبز باغات میں منتقل کر دیں جیسا ملک شام کا خطہ ہے جسکا جواب پہلے آچکا ہے کہ تم نے تو گویا مجھے خدا ہی سمجھ لیا کہ خدائی کے اختیارات کا مجھے مطالبہ کر رہے ہو میں تو صرف ایک رسول ہوں خدا نہیں کہ جو چاہوں کر دوں۔ یہ آیت بھی اگر اسی کے متعلق قرار دیجائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سرزمین مکہ کو نہری زمین اور سبزہ زار بنانے کی فرمائش اگر میری نبوت و رسالت کے امتحان کے لئے ہے تو اسکے لئے اعجاز قرآن کا معجزہ کافی ہے دوسری فرمائشوں کی ضرورت نہیں اور اگر اپنی قومی اور ملکی ضرورت رفع کرنے کے لئے ہے تو یاد رکھو کہ اگر تمہاری فرمائش کے مطابق تمہیں زمین مکہ میں سب کچھ دے بھی دیا جائے اور خزائن کا مالک تمہیں بنا دیا جائے تو اسکا انجام بھی قومی اور ملک کے عوام کی خوشحالی نہیں ہوگی بلکہ انسانی عادت کے مطابق جنکے قبضہ میں یہ خزائن آجاویں گے وہ ان پر سانپ بنکر بیٹھ جاویں گے عوام پر خرچ کرتے ہوئے افلاس کا خوف ان کو مانع ہوگا۔ ایسی صورت میں بجز اسکے کہ مکہ کے چند رئیس اور زیادہ امیر اور خوشحال ہو جائیں عوام کا کیا فائدہ ہوگا۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے بیان القرآن میں اس جگہ رحمت رب سے مراد نبوت و رسالت اور خزائن رحمت سے مراد کمالات نبوت لئے ہیں اس تفسیر کے مطابق اسکا ربط آیات سابقہ سے یہ ہوگا کہ تم جو نبوت و رسالت کے لئے بے سروپا اور بیہودہ مطالبات کر رہے ہو اسکا حاصل یہ ہے کہ میری نبوت کو ماننا نہیں چاہتے تو کیا پھر تمہاری خواہش یہ ہے کہ نبوت کا نظام تمہارے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسکو تم چاہو نبی بنا لو۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کسیکو بھی نبوت و رسالت نہ دو گے بخل کر کے بیٹھ جاؤ گے۔ حضرت رحؒ نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ تفسیر مواہب الٰہیہ میں سے ہے کہ مقام کے ساتھ نہایت چسپاں ہے اسمیں نبوت کو رحمت کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہی ہوگا

جیسا آیت اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ میں بالاجماع رحمت سے مراد نبوت ہی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ
اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں صاف پھر پوچھ بنی اسرائیل سے جب

جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ
آیا وہ اُن کے پاس تو کہا اُس کو فرعون نے میری اٹکل میں تو موسیٰ تجھ پر جادو ہوا بولا تو جان

عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ
چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سُجھانے کو اور

اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
میری اٹکل میں فرعون تو غارت ہوا چاہتا ہے پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین نہ دے اُس زمین میں

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ
پھر ڈبا دیا ہم نے اُس کو اور اسکے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے بنی

اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ
اسرائیل کو آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئینگے ہم تم کو

لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا
سمیٹ کر اور سچ کے ساتھ اتارا ہم نے یہ قرآن اور سچ کے ساتھ اُترا اور تجھ کو جو بھیجا ہم نے سو

مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى
خوشی اور ڈر سنانے کو اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے قرآن کو جُدا جُدا کرکے کہ پڑھے تو اُس کو لوگوں پر

مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ
ٹھہر ٹھہر کر اور ہم نے اس کو اُتارتے اُتارتے اُتارا کہہ تم اس کو مانو یا نہ مانو

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ
جن کو علم ملا ہے اس کے پہلے سے جب اُن کے پاس اس کو پڑھئے

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ
گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر سجدہ میں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب

وقف لازم

إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ

بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہوکر رہے گا اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة

روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی -

السجدۃ ۴

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کھلے ہوئے نو معجزے دیئے (جنکا ذکر پارہ نہم کے رکوع ششم آیت اوّل میں ہے) جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے تھے سو آپ بنی اسرائیل سے (بھی چاہے) پوچھ دیکھئے (اور چونکہ آپ فرعون کی طرف بھی بھیجے گئے تھے اور فرعون و آل فرعون کے ایمان نہ لانے پر وہ عجائبات معجزات ظاہر ہوئے تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوبارہ ایمان لانے کے لئے یاد دہانی کی اور ان آیات بینہ سے ڈرایا) تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جس سے تمہاری عقل مخبوط ہوگئی کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تو (دل میں) خوب جانتا ہے (گو عار کیوجہ سے زبان سے اقرار نہیں کرتا) کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے (کافی) ذرائع ہیں اور میرے خیال میں ضرور تیری کمبختی کے دن آگئے ہیں (اور یا تو فرعون کی یہ حالت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بھی بنی اسرائیل کو مصر سے جانیکی اجازت نہ دیتا تھا اور) پھر (یہ ہوا کہ) اس نے (اس احتمال سے کہ کہیں بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے اثر سے قوت نہ پکڑ جاویں خود ہی) چاہا کہ بنی اسرائیل کا اس سرزمین سے قدم اکھاڑ دے (یعنی ان کو شہر بدر کر دے) سو ہم نے (قبل اسکے کہ وہ کامیاب ہو خود) اس (ہی) کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا اور (اس کے غرق کرنے کے بعد) ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ (اب) تم اس سرزمین (کے جہاں سے تم کو نکالنا چاہتا تھا مالک ہو تم ہی اس) میں رہو سہو (خواہ بالقوہ یا بالفعل مگر یہ مالکیت حیوٰۃ دنیا تک ہے) پھر جب آخرت کا وعدہ آجاویگا تو ہم سبکو جمع کرکے (قیامت کے میدان میں حاکمانہ محکومانہ) لاکر حاضر کرینگے (یہ ابتدا میں ہوگا پھر مومن و کافر اور نیک و بد کو الگ الگ کر دیا جاویگا) اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیئے اسی طرح آپ کو بھی بہت سے معجزات دیئے جن میں عظیم الشان معجزہ قرآن ہے کہ) ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ (آپ پر) نازل ہوگیا (یعنی جیسا کاتب کے پاس سے چلا تھا اسی طرح مکتوب الیہ تک پہنچ گیا اور درمیان میں کوئی تغیر و تبدل و تصرف

نہیں ہوا پس سرتا سر راستی ہی راستی ہے) اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ہدایت ان کے اختیار میں نہ تھی اسی طرح) ہم نے آپکو بھی (صرف ایمان پر ثواب کی) خوشی سنانے والا اور (کفر پر عذاب سے) ڈرانیوالا بنا کر بھیجا ہے (اگر کوئی ایمان نہ لاوے کچھ غم نہ کیجئے) اور قرآن (میں صفت راستی کے ساتھ بمقتضائے رحمت اور بھی ایسے صفات کی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے ہدایت زیادہ آسان ہو چنانچہ ایک تو یہ کہ اس) میں ہم نے (آیات وغیرہ کا) جا بجا فصل رکھا تاکہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں (جس میں وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کیونکہ تقریر طویل مسلسل بعض اوقات ضبط میں نہیں آتی) اور (دوسرے یہ کہ) ہم نے اسکو اتارنے میں بھی (حسب واقعات) تدریجاً اتارا (تاکہ معانی کا خوب انکشاف ہو اب ان سب امور کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ ایمان لے آتے لیکن اس پر بھی ایمان نہ لاویں تو آپ کچھ پروا نہ کیجئے بلکہ صاف) کہدیجئے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ (مجھکو کوئی پرواہ نہیں دو وجہ سے اوّل تو یہ کہ میرا کیا ضرر کیا۔ دوسرے یہ کہ تم ایمان نہ لائے تو کیا ہوا دوسرے لوگ ایمان لے آئے چنانچہ) جن لوگوں کو قرآن (کے نزول) سے پہلے (دین کا) علم دیا گیا تھا (یعنی منصف علماء اہل کتاب) یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب (وعدہ خلافی سے) پاک ہے بیشک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے (سو جس کتاب کا جس نبی پر نازل کرنے کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا تھا اسکو پورا فرمادیا) اور ٹھوڑیوں کے بل (جو) گرتے ہیں (تو) روتے ہوئے (گرتے ہیں) اور یہ قرآن (یعنی اسکا سننا) ان کا (دلی) خشوع اور بڑھادیتا ہے (کیونکہ ظاہر و باطن کا توافق کیفیت کو قوی کردیتا ہے۔)

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو آیات بینات عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ آیت کا لفظ معجزے کے معنی میں بھی آتا ہے اور آیات قرآن یعنی احکام الٰہیہ کے معنی میں بھی اس جگہ دونوں معنی کا احتمال ہے اسی لئے ایک جماعت مفسرین نے اس جگہ آیات سے مراد معجزات لئے ہیں اور نو کے عدد سے یہ ضرور نہیں کہ نو سے زائد نہوں مگر اس جگہ نو کا ذکر کسی خاص اہمیت کی بناء پر کیا گیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے یہ نو معجزات اسطرح شمار فرمائے ہیں (۱) عصائے موسیٰ جو اژدہا بنجاتی تھی (۲) ید بیضا جسکو گریبان میں ڈالکر نکالنے سے چمکنے لگتا تھا (۳) زبان میں لکنت تھی وہ دور کردی گئی (۴) بنی اسرائیل کے دریا پار کرنے کے لئے دریا کو پھاڑ کر اسکے دو حصے الگ کردیئے اور راستہ دیدیا (۵) ٹڈی دل کا عذاب غیر معمولی صورت میں بھیجدیا گیا۔ (۶) طوفان بھیجدیا گیا۔ (۷) بدن کے کپڑوں میں بیحد جوئیں پیدا کردی گئیں جن سے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا (۸) مینڈکوں کا ایک عذاب مسلط کردیا گیا کہ ہر کھانے پینے کی

چیزیں مینڈک آجاتے تھے (۹) خون کا عذاب بھیجا گیا کہ ہر برتن اور کھانے پینے میں خون ملجاتا تھا۔

اور ایک صحیح حدیث کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد احکام الٰہیہ ہیں یہ حدیث ابو داؤد نسائی۔ ترمذی۔ ابن ماجہ میں بسند صحیح حضرت صفوان بن عسال رضہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھے اس نبی کے پاس لیچلو۔ ساتھی نے کہا کہ نبی نہ کہو اگر ان کو خبر ہوگی کہ ہم بھی انکو نبی کہتے ہیں تو ان کی چار آنکھیں ہوجاویگی یعنی انکو فخر و مسرت کا موقع ملجاوے گا۔ پھر یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نو آیات بیّنات دیگئی تھیں وہ کیا ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (۱) اللہ کے ساتھ کسیکو شریک نہ کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو۔ (۴) جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسکو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگاکر قتل و سزا کے لئے پیش نہ کرو (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پر بدکاری کا بہتان نہ باندھو (۹) میدان جہاد سے جان بچاکر نہ بھاگو۔ اور اے یہود خاصکر تمہارے لئے یہ بھی حکم ہے کہ یوم سبت (سنیچر) کے جو خاص احکام تمہیں دیئے گئے انکی خلاف ورزی نہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنکر دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں میرا اتباع کرنے سے کیا چیز روکتی ہے کہنے لگے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ ان کی ذریت میں ہمیشہ نبی ہوتے رہیں اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر ہم آپکا اتباع کرنے لگیں تو یہود ہمیں قتل کردینگے۔

چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے اس لئے بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

یَبۡکُوۡنَ وَیَزِیۡدُهُمۡ خُشُوۡعًا تفسیر مظہری میں ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم میں نہ جاوے گا وہ شخص جو اللہ کے خوف سے رویا جب تک کہ دوہا ہوا دودھ دوبارہ تھنوں میں واپس نہ لوٹ جائے (یعنی جیسے یہ نہیں ہوسکتا کہ تھنوں سے نکالا ہوا دودھ پھر تھنوں میں واپس ڈالدیا جائے اسی طرح یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے خوف سے رونے والا جہنم میں چلا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام کردی ایک وہ جو اللہ کے خوف سے روئے دوسرے جو اسلامی سرحد کی حفاظت کے لئے رات کو بیدار رہے (بیہقی وحاکم وصححہ) اور حضرت نضر بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں کوئی اللہ کے خوف سے رونے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس کی وجہ سے آگ سے نجات عطا فرماوینگے (روح عن الحکیم الترمذی)

آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انمیں خدا کے خوف

سے رونے والے بہت کم رہ گئے صاحب روح المعانی اس موقع پر خدا کے خوف سے رونے کے فضائل کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ وینبغی ان یکون ذٰلک حال العلماء یعنی علماء دین کا یہی حال ہونا چاہئے کیونکہ ابن جریر ابن منذر وغیرہ نے عبدالاعلی تیمی رحمہ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔ "جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو جو اسکو رلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اسکو علم نافع نہیں ملا"۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ

کہہ اللہ کہکر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکارو گے سو اسی کے ہیں سب

الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ

نام خاصے اور پکار کر مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ

ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ

میں راہ اور کہہ سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس

لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ

کا ساجھی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ذلت کے وقت پر

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور اُس کی بڑائی کر بڑا جان کر۔

ع ۱۲/۱۱/۱۲

خلاصۂ تفسیر

آپ فرما دیجئے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے (تو بہتر ہے کیونکہ) اس کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں (اور اس کا شرک سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک ہی ذات کے کئی نام ہونے سے اسکی توحید میں کوئی فرق نہیں آتا) اور اپنی جہری نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھئے (کہ مشرکین سنیں اور خرافات بکیں اور نماز میں قلب مشوش ہو) اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھئے (کہ مقتدی نمازیوں کو بھی سنائی نہ دے۔ کیونکہ اس سے انکی تعلیم و تربیت میں کمی آتی ہے) اور دونوں کے درمیان ایک (متوسط) طریقہ اختیار کر لیجئے (تاکہ مصلحت فوت نہ ہو اور مضرت پیش نہ آئے) اور (کفار پر رد کرنے کے لئے علی الاعلان) کہدیجئے کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے (خاص) ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اس کا کوئی شریک سلطنت ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا

مددگار رہے اور اسکی خوب بڑائی بیان کیا کیجئے۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیات ہیں اس سورت کے شروع میں بھی حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور توحید کا بیان تھا ان آخری آیات میں بھی اسی پر ختم کیا جا رہا ہے ان آیتوں کا نزول چند واقعات کی بناء پر ہوا، اوّل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز دعا میں یا اللہ اور یا رحمٰن کہہ کر پکارا تو مشرکین نے سمجھا کہ یہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہمیں تو ایک کے سوا کسی اور کو پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں اسکا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے دو ہی نہیں اور بھی بہت سے اچھے اچھے نام ہیں کسی نام سے بھی پکاریں مراد ایک ہی ذات ہے تمہارا وہم غلط ہے۔

دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بلند آواز سے تلاوت قرآن فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآن اور جبرئیل امین اور خود حق تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جسمیں آپکو جہر و اخفاء میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی کہ ضرورت تو اس درمیانہ آواز سے پوری ہو جاتی ہے اور زیادہ بلند آواز سے جو مشرکین کو موقع ایذا رسانی کا ملتا تھا اس سے نجات ہو۔

تیسرا قصہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دیتے تھے اور عرب بتوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے اور صابی اور مجوسی کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے مخصوص مقرب نہوں تو اسکی قدر و عزت میں کمی آجاوے ان تینوں فرقوں کے جواب میں آخری آیت نازل ہوئی جسمیں تینوں چیزوں کی نفی ذکر کی گئی ہے۔

دنیا میں جس سے مخلوق کو کسیقدر قوت پہونچا کرتی ہے وہ کبھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد اور کبھی اپنی برابر ہوتا ہے جیسے شریک اور کبھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی و مددگار، حق تعالیٰ نے اس آیت میں بہ ترتیب تینوں کی نفی فرمادی۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں نماز کے اندر تلاوت کرنے کا یہ ادب بتلایا گیا ہے کہ بہت بلند آواز سے ہو نہ بہت آہستہ جسکو مقتدی نہ سن سکیں۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے ظہر اور عصر کی نمازوں میں تو بالکل اخفاء ہونا سنت متواترہ سے ثابت ہے۔

جہری نمازمیں مغرب عشاء اور فجر کے فرض بھی داخل ہیں اور نماز تہجد بھی جیسا کہ ایک حدیث میں ہے

کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد کے وقت صدیق اور فاروق اعظم کے پاس سے گذرے تو صدیق اکبر تلاوت آہستہ کر رہے تھے اور فاروق اعظم خوب بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق سے فرمایا کہ آپ ایسا آہستہ کیوں پڑھتے ہیں صدیق نے عرض کیا کہ مجھے جسکو سنانا تھا اسکو سنا دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر خفی سے خفی آواز کو بھی سنتے ہیں آپ نے فرمایا کسی قدر جہر سے پڑھا کرو۔ پھر عمر بن خطاب رضہ سے فرمایا کہ آپ اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہیں حضرت عمر رضہ نے عرض کیا کہ میں نیند اور شیطان کو دفع کرنے کے لئے بلند آواز سے پڑھتا ہوں آپ نے ان کو بھی یہ حکم دیا کہ کچھ پست آواز سے پڑھا کرو۔ (ترمذی از مظہری)

نماز اور غیر نماز میں تلاوت قرآن کو جہر سے اور اخفار سے ادا کرنے کے متعلقہ مسائل سورۂ اعراف میں بیان ہو چکے ہیں آخری آیت قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ کے متعلق حدیث میں ہے کہ آیت عزت یہ آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ الخ (رواہ احمد والطبرانی عن معاذ الجہنی کذا فی المظہری) اس آیت میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کوئی انسان کتنی ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح وتحمید کرے اپنے عمل کو اس کے حق کے مقابلہ میں کم سمجھنا اور قصور کا اعتراف کرنا اسکے لئے لازم ہے (مظہری)

اور حضرت انس رضہ فرماتے ہیں کہ بنی عبدالمطلب میں جب کوئی بچہ زبان کھولنے کے قابل ہو جاتا تو اسکو آپ یہ آیت سکھا دیتے تھے وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا (مظہری)

اور حضرت ابو ہریرہ رضہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلا اسطرح کہ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا آپ کا گذر ایک ایسے شخص پر ہوا جو بہت شکستہ حال اور پریشان تھا آپ نے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوگیا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ بیماری اور تنگدستی نے یہ حال کر دیا آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں چند کلمات بتلاتا ہوں وہ پڑھو گے تو تمہاری بیماری اور تنگدستی جاتی رہے گی وہ کلمات یہ تھے تَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الآیۃ اس کے کچھ عرصہ کے بعد پھر آپ اس طرف تشریف لے گئے تو اس کو اچھے حال میں پایا آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اس نے عرض کیا کہ جب سے آپ نے مجھے یہ کلمات بتلائے تھے میں پابندی سے ان کو پڑھتا ہوں (ابو یعلی وابن سنی از مظہری)

تمّ تفسیر سورۃ بنی اسرائیل بعون اللہ وحمدہ بعد العشاء لعاشر

جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۹۰ھ فالحمد للہ اولہ وآخرہ۔

عرض حال از مؤلف آج ۲۹ شعبان ۱۳۹۰ھ یوم السبت میں بحمد اللہ معارف القرآن کے مسودہ پر نظر ثانی بھی مکمل ہوگئی ہے اب یہ نصف قرآن کریم کی تفسیر حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے پوری کرا دی جس کی بظاہر اسباب کوئی امید نہیں تھی کیونکہ رمضان ۱۳۸۸ھ کے آخر میں یہ ناکارہ ایسے مختلف

امراض میں مبتلا ہوا کہ تقریباً ایک سال تو بستر ہی پر موت و حیات کی کشمکش میں گذرا، اس وقت مجبوری و معذوری کے عالم میں بار بار یہ حسرت ہوتی تھی کہ بعض تصانیف کے مسودات جو قریب تکمیل تھے کاش ان کی تکمیل ہو جاتی، معارف القرآن کے نام سے جو درس قرآن عرصۂ دراز تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا بہت سے دوستوں کے تقاضہ سے اس پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی رہی ہوئی آیات کی تفسیر کی تکمیل کا جو سلسلہ چل رہا تھا کسی طرح اس کی تکمیل ہو جاتی اسی طرح سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ نے قرآن کریم کی دو منزلیں پانچویں اور چھٹی کے احکام القرآن بزبان عربی لکھنے کے لئے احقر کو مامور فرمایا تھا اس کا بھی آخری حصہ لکھنے سے باقی رہ گیا تھا، موت و حیات کی کشمکش اٹھنے بیٹھنے سے معذوری ہی کے عالم میں شاید اس حسرت ناپافت کی شنوائی بارگاہ رب العزت میں ہو گئی اور یہ خیال غالب آیا کہ جو کچھ جتنا بن پڑے وہ کام کر لیا جائے یہ فکر چھوڑ دی جائے کہ جو رہ جائے گا اس کا کیا ہوگا اس خیال نے ایک عزم کی صورت اختیار کر لی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تفسیر پر نظر ثانی اور احکام القرآن کی تکمیل کا کام شروع کر دیا عجائب قدرت سے ہے کہ اس بیماری کے زمانے میں کام اتنی سرعت سے چلا کہ تندرستی میں بھی یہ رفتار نہ تھی اور پھر شاید اسی کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان معذور و مجبور کر دینے والے امراض سے شفا بھی فرما دی اور ایک حد تک تندرستی کی صورت حاصل ہو گئی، تو اب وقت کی قدر پہچانی اور ان کاموں پر بقدر استطاعت وقت صرف کیا۔ یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہی تھا کہ احکام القرآن کی دونوں منزلوں کی تکمیل بھی ہو گئی اور اسی عرصہ میں یہ دونوں جلدیں چھپکر شائع بھی ہو گئیں اور تفسیر معارف القرآن کی دو جلدیں سورۂ نساء تک چھپکر شائع ہو گئی ہیں تیسری جلد سورۂ اعراف تک زیر طباعت ہے اور آج نصف قرآن کے مسودہ تفسیر پر نظر ثانی کی بھی تکمیل ہو گئی۔ (فللہ الحمد اولہ وآخرہ)

اس وقت جبکہ یہ سطور زیر تحریر ہیں احقر ناکارہ کی عمر کے ۷۵ سال پورے ہو کر ۱۲ شعبان ۱۳۹۰ھ کو عمر کی چھیترویں منزل شروع ہو گئی، مختلف امراض میں ابتلا، ضعف طبعی اس پر مشاغل و افکار کا ہجوم ہے اب آگے کسی تصنیف و تالیف کی توقع رکھنا امید موہوم سے زائد کچھ نہیں ہو سکتا لیکن خدمت قرآن کے نام پر خامہ فرسائی کتنی ہی ناقص در ناقص خدمت ہو لکھنے والے کیلئے سعادت ہی سعادت ہے اس خیال نے اس پر آمادہ کر دیا کہ سورۂ کہف کی تفسیر بھی بنام خدا تعالیٰ شروع کر دیجائے اور بقیہ عمر میں جو کچھ ہو سکے اس کو غنیمت سمجھا جائے کیونکہ مقصد قرآن ختم کرنا نہیں قرآن میں اپنی عمر و توانائی ختم کرنا ہے واللہ الموفق والمعین۔

سورۂ بنی اسرائیل ختم شد

سُوْرَةُ الْكَهْفِ

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّعَشْرُ اٰيَاتٍ وَّاِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ کہف مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ

سب تعریف اللہ کو جس نے اُتاری اپنے بندے پر کتاب اور نہ رکھی

لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ

اس میں کچھ کجی ، ٹھیک اُتاری تاکہ ڈر سنادے ایک آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوش خبری دے

الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲

ایمان لانے والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں کہ ان کے لئے اچھا بدلہ ہے ،

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴

جس میں رہا کریں ہمیشہ ، اور ڈر سنادے ان کو جو کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَاۗىِٕهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ

کچھ خبر نہیں اُن کو اس بات کی اور نہ اُن کے باپ دادوں کو ، کیا بڑی بات نکلتی ہے

اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں ، سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو

عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا

ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچھتا پچھتا کر ، ہم نے بنایا ہو

مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا

جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق تاکہ جانچیں لوگوں کو کون ان میں اچھا کرتا ہے کام ، اور ہمکو

لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

کرنا ہے جو کچھ اس پر ہے میدان چھانٹ کر۔

سورۂ کہف کی خصوصیات اور فضائل

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد میں حضرت ابوالدرداءؓ سے ایک روایت ہے کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کرلیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا، اور کتب مذکورہ میں حضرت ابوالدرداءؓ ہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرنے کے متعلق منقول ہے۔

اور مسند احمد میں بروایت حضرت سہل بن معاذؓ یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ کہف کی پہلی اور آخری آیتیں پڑھ لے اس کے لئے اس کے قدم سے سر تک ایک نور ہو جاتا ہے، اور جو پوری سورت پڑھ لے تو اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرلے، اس کے قدم سے لے کر آسمان کی بلندی تک نور ہو جائے گا، جو قیامت کے دن روشنی دے گا، اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، (امام ابن کثیر نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے)

اور حافظ ضیاء مقدسی نے اپنی کتاب مختارہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھ لے وہ آٹھ روز تک ہر فتنہ سے معصوم رہے گا، اور اگر دجال نکل آئے تو یہ اس کے فتنہ سے بھی معصوم رہے گا۔ (یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)۔

روح المعانی میں دیلمی سے بروایت حضرت انسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی، اور ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے، جس سے اس کی عظمتِ شان ظاہر ہوتی ہے۔

شانِ نزول

امام ابن جریر طبری نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ (جب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا ہوا اور قریشِ مکہ اس سے

پریشان ہوئے تو) انھوں نے اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجا کہ وہ لوگ کتب سابقہ تورات و انجیل کے عالم ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ علماء یہود نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ ان سے تین سوالات کرو، اگر انھوں نے ان کا جواب صحیح[1] دیدیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور یہ نہ کر سکے تو یہ سمجھ لو کہ یہ بات بنانے والے ہیں رسول نہیں۔ ایک تو ان سے اُن نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے، ان کا کیا واقعہ ہے، کیونکہ یہ واقعہ عجیبہ ہے، دوسرے ان سے اس شخص کا حال پوچھو جس نے دنیا کی مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا اس کا کیا واقعہ ہے، تیسرے ان سے روح کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا چیز ہے؟

یہ دونوں قریشی مکہ مکرمہ واپس آئے اور اپنی برادری کے لوگوں سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن صورتِ حال لے کر آئے ہیں، اور علماء یہود کا پورا قصہ سنا دیا، پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوالات لے کر حاضر ہوئے، آپؐ نے سن کر فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا، مگر آپؐ اس وقت انشاء اللہ کہنا بھول گئے، یہ لوگ لوٹ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحیِ الٰہی کے انتظار میں رہے کہ ان سوالات کا جواب وحی سے بتلا دیا جائے گا، مگر وعدے کے مطابق اگلے دن تک کوئی وحی نہ آئی، بلکہ پندرہ دن اسی حال پر گذر گئے، کہ نہ جبرئیل امین آئے نہ کوئی وحی نازل ہوئی، قریشِ مکہ نے مذاق اڑانا شروع کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت رنج و غم پہونچا۔

پندرہ دن کے بعد جبرئیل امین سورۂ کہف لے کر نازل ہوئے (جس میں تاخیر وحی کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہنا چاہئے، اس واقعہ میں چونکہ ایسا نہ ہوا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے وحی میں تاخیر ہوئی، اس سورۃ میں اس معاملہ کے متعلق یہ آیتیں آگے آئیں گی وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ) اور اس سورۃ میں نوجوانوں کا واقعہ بھی پورا بتلا دیا گیا، جن کو اصحابِ کہف کہا جاتا ہے، اور مشرق و مغرب کے سفر کرنے والے ذی القرنین کے واقعہ کا بھی مفصل بیان آگیا، اور روح کے سوال کا جواب بھی، (قرطبی و مظہری بحوالہ ابن جریر) (مگر روح کے سوال کا جواب اجمال کے ساتھ دینا مقتضائے حکمت تھا، اس کو سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں علیحدہ کر کے بیان کر دیا گیا، اور اسی سبب سے سورۂ کہف کو سورۂ بنی اسرائیل کے بعد رکھا گیا ہے، کذا ذکرہ السیوطی)۔

---

[1] یعنی جو جواب انہیں دینا چاہئے، وہ دیدیا (اور روح کے بارے میں ان کا صحیح جواب یہ ہوگا کہ اسکی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں) لہٰذا یہ روایت جو تفسیر طبری ص ۱۹۱ ج ۱۵ میں منقول ہے اس روایت کے منافی نہیں جو پیچھے اسی جلد کے صفحہ ۵۲۸ پر سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۵ کے تحت گذری ہے۔ محمد تقی عثمانی

خلاصۂ تفسیر

تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی، اور اس (کتاب) میں (کسی قسم کی) ذرا بھی کجی نہیں رکھی (نہ لفظی کہ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہو، اور نہ معنوی کہ اس کا کوئی حکم حکمت کے خلاف ہو بلکہ اس کو) بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا (اور نازل اس لئے کیا کہ) تاکہ وہ (کتاب کافروں کو عموماً) ایک سخت عذاب سے جو منجانب اللہ (ان کو آخرت میں ہوگا) ڈرائے اور اہل ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دے کہ ان کو (آخرت میں) اچھا اجر ملے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (کفار میں سے بالخصوص) ان لوگوں کو (عذاب سے) ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے (اور اولاد کا عقیدہ رکھنے والے کافروں کا عام کافروں سے الگ کر کے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس باطل عقیدہ میں عرب کے عام لوگ مشرکین، یہود، نصاریٰ سب ہی مبتلا تھے) نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی، بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، (اور) وہ لوگ بالکل (ہی) جھوٹ بکتے ہیں (جو عقلاً بھی ناممکن ہے، کوئی ادنیٰ عقل والا بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا، اور آپ جو ان لوگوں کے کفر و انکار پر اتنا غم کرتے ہیں کہ) سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے (یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ ہلاکت کے قریب کر دے، وجہ یہ ہے کہ دنیا عالمِ امتحان ہے، اس میں ایمان و کفر اور خیر و شر دونوں کا مجموعہ ہی رہے گا، سبھی مؤمن ہو جائیں گے ایسا نہ ہوگا، اسی امتحان کے لئے) ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس (زمین) کے لئے باعث رونق بنایا، تاکہ ہم (اس کے ذریعہ) لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے (یہ امتحان کرنا ہے کہ کون اس دنیا کی زینت اور رونق پر مفتون ہو کر اللہ سے اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور کون نہیں، غرض یہ کہ یہ عالمِ ابتلاء ہے، تکویناً اس میں کوئی مؤمن ہوگا کوئی کافر رہے گا، پھر غم بیکار ہے آپ اپنا کام کئے جایئے، اور ان کے کفر کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو جانے کا انتظار نہ کیجئے، کیونکہ وہ ہمارا کام ہے، ایک مقرر وقت پر ہوگا چنانچہ ایک روز وہ آئے گا کہ) ہم زمین پر کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان کر دیں گے، (نہ اس پر کوئی بسنے والا رہے گا نہ کوئی درخت اور پہاڑ اور نہ کوئی مکان و تعمیر، خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنا کام تبلیغ کا کرتے رہیئے، منکرین کے انجام بد کا اتنا غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا، لفظ عوج کے معنی کسی قسم کی کجی اور ایک طرف جھکاؤ کے ہیں، قرآن کریم اپنے لفظی اور معنوی کمال میں اس سے پاک ہے، نہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کسی جگہ ذرہ برابر کجی یا کمی ہوسکتی ہے نہ علم و حکمت کے لحاظ سے، جو مفہوم لفظ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا سے ایک منفی صورت میں بتلایا گیا ہے، پھر تاکید کے لئے اسی مضمون کو مثبت طور پر لفظ قَيِّمًا سے واضح کر دیا ہے، کیونکہ قیّماً کے معنے ہیں مُسْتَقِيْمًا، اور مستقیم وہی ہے جس میں کوئی ادنیٰ کجی اور میلان کسی جانب نہ ہو، اور یہاں قیّم کے ایک دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں، یعنی نگراں اور محافظ، اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم جیسا اپنی ذات میں کامل مکمل ہر قسم کی کجی اور افراط و تفریط سے پاک ہے، اسی طرح یہ دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا اور بندوں کی تمام مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے، اب خلاصہ ان دونوں لفظوں کا یہ ہو جائے گا کہ قرآن کریم خود بھی کامل و مکمل ہے اور مخلوقِ خدا کو بھی کامل و مکمل بنانے والا ہے (مظہری)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا، یعنی زمین پر جو مخلوقات حیوانات، نباتات، جمادات اور زمین کے اندر مختلف چیزوں کی کانیں موجود ہیں وہ سب زمین کے لئے زینت اور رونق بنائی گئی ہیں، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مخلوقاتِ ارضیہ میں تو سانپ، بچھو، درندے جانور اور بہت سی مضر اور مہلک چیزیں بھی ہیں ان کو زمین کی زینت اور رونق کیسے کہا جا سکتا ہے کیونکہ جتنی چیزیں دنیا میں مضر اور مہلک اور خراب سمجھی جاتی ہیں وہ ایک اعتبار سے بیشک خراب ہیں مگر مجموعۂ عالم کے لحاظ سے کوئی چیز خراب نہیں، کیونکہ ہر بُری سے بُری چیز میں دوسری حیثیات سے بہت سے فوائد بھی اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں، کیا زہریلے جانوروں اور درندوں سے ہزاروں انسانی ضروریات معالجات وغیرہ میں پوری نہیں کی جاتیں، اس لئے جو چیزیں کسی ایک حیثیت سے بُری بھی ہیں، لیکن مجموعۂ عالم کے کارخانے کے لحاظ سے وہ بھی بُری نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ⁂ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور کھوہ کے رہنے والے ہماری قدرتوں میں

عَجَبًا ﴿٩﴾ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ	
عجب اچنبھا تھے، جب جا بیٹھے وہ جوان پہاڑ کی کھوہ میں پھر بولے اے رب ہم کو دے اپنے پاس	
رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ	
سے بخشش اور پوری کردے ہمارے کام کی درستی ، پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان	
فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ	
اس کھوہ میں چند برس گنتی کے ، پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ معلوم کریں دو فرقوں میں	
اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿١٢﴾	ع ۱۲/۱۳
کس نے یاد رکھی ہے جتنی مدت وہ رہے۔	

تشریح اللغات کہف ، پہاڑی غار جو وسیع ہو اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو اس کو غار کہا جاتا ہے ، رَقِیْم ، لفظی اعتبار سے بمعنے المرقوم ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز، اس مقام پر اس سے کیا مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، ضحاک اور سدی اور ابن جبیرؒ بروایت ابن عباسؓ اس کے معنی ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں جس پر بادشاہِ وقت نے اصحابِ کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازہ پر لگا دیا تھا، اسی وجہ سے اصحابِ کہف کو اصحابُ الرّقیم بھی کہا جاتا ہے ، قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول یہ ہے کہ رقیم اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے جس میں اصحابِ کہف کا غار تھا، بعض نے خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے ، حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی کا نام ہے یا کسی بستی کا، کعب احبار، وہب بن منبہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رقیم، ایلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے جو بلادِ رُوم میں واقع ہے ۔

فِتْيَةٌ ، فتی کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نوجوان

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ کے لفظی معنی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں، غفلت کی نیند کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے ، مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سُنائی دیتی ہے ، جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے ۔

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں) ہماری عجائبات (قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے (جیسا کہ یہود نے کہا تھا کہ ان کا واقعہ عجیب ہے، یا خود ہی سوال کرنے والے کفار قریش نے اس کو عجیب سمجھ کر سوال کیا تھا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سُنانا مقصود ہے کہ یہ واقعہ بھی اگرچہ عجیب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی دوسری عجائبات قدرت کے مقابلہ میں ایسا قابلِ تعجب نہیں جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ زمین و آسمان اور چاند و سورج اور تمام کائناتِ زمین و آسمان کو عدم سے وجود میں لانا اصل عجائب میں سے ہے، چند نوجوانوں کا زمانۂ دراز تک سوتے رہنا پھر بیدار ہونا اس کے مقابلہ میں کچھ عجیب نہیں، اس تمہید کے بعد اصحاب کہف کا قصہ اس طرح بیان فرمایا اور) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے (ایک بے دین بادشاہ کی گرفت سے بھاگ کر) اس غار میں (جس کا قصہ آگے آتا ہے) جا کر پناہ لی پھر (اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگی کہ) کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے (اس) کام میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے (غالباً رحمت سے مراد حصولِ مقصود ہے، اور درستی کے سامان سے مراد وہ اسباب و مقدمات ہیں جو حصولِ مقصد کے لئے عادۃً ضروری ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا کو قبول فرمایا، اور ان کی حفاظت اور تمام پریشانیوں سے نجات دینے کی صورت اس طرح بیان فرمائی کہ) سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھایا تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کر لیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا، (نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان میں ایک گروہ کا قول تو یہ تھا کہ ہم پورا دن یا کچھ حصہ ایک دن کا سوئے ہیں، دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دن سوتے رہے، آیت میں اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ دوسرا گروہ ہی زیادہ حقیقت شناس تھا جس نے مدت کی تعیین کو اللہ کے حوالہ کیا، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہ تھی)۔

معارف و مسائل

قصۂ اصحاب کہف و رقیم اس قصہ میں چند مباحث ہیں، اوّل یہ کہ اصحابِ کہف و اصحابِ رقیم ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں، یا یہ الگ الگ دو جماعتیں ہیں، اگرچہ کسی صحیح حدیث میں اس کی

کوئی تصریح نہیں، مگر امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح میں اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم دو عنوان الگ الگ دیئے، پھر اصحاب الرقیم کے تحت وہ مشہور قصہ تین شخصوں کے غار میں بند ہوجانے پھر دُعاؤں کے ذریعہ راستہ کھل جانے کا ذکر کیا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مفصل موجود ہے، امام بخاری کی اس صنیع سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اصحاب کہف ایک جماعت ہے، اور اصحاب رقیم ان تین شخصوں کو کہا گیا ہے جو کسی زمانے میں غار میں چھپے تھے، پھر پہاڑ سے ایک بڑا پتھر اس غار کے دہانے پر آگرا جس سے غار بالکل بند ہوگیا، ان کے نکلنے کا راستہ نہ رہا، ان تینوں نے اپنے اپنے خاص نیک اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کی کہ یہ کام اگر ہم نے خالص آپ کی رضا کے لئے کیا تھا تو اپنے فضل سے ہمارا راستہ کھول دے، پہلے شخص کی دعا سے پتھر کچھ سرک گیا، روشنی آنے لگی، دوسرے کی دعا سے اور زیادہ سرکا، پھر تیسرے کی دُعاء سے راستہ بالکل کھل گیا۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں یہ واضح کیا ہے کہ از روئے روایت حدیث اس کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے کہ اصحاب رقیم مذکورہ تین شخصوں کا نام ہے، بات صرف اتنی ہے کہ واقعۂ غار کے ایک راوی حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں بعض راویوں نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپؐ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سُنا رہے تھے، یہ اضافہ فتح الباری میں بزار اور طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اوّل تو اس حدیث کے عام راویوں کی روایات جو صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مفصل موجود ہیں، اُن میں کسی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، خود بخاری کی روایت بھی اس جملے سے خالی ہے، پھر اس جملے میں بھی اس کی تصریح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں بند ہونے والے ان تین شخصوں کو اصحاب الرقیم فرمایا تھا، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ رقیم کا ذکر فرما رہے تھے، اس ضمن میں ان تین شخصوں کا ذکر فرمایا، لفظ رقیم کی مراد کے متعلق صحابہ و تابعین اور عام مفسرین میں جو اختلافِ اقوال اوپر نقل کیا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رقیم کی کوئی مراد متعین کرنے کے بارے میں کوئی روایتِ حدیث نہیں تھی، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لفظ کی مراد خود متعین فرما دیں، پھر صحابہ و تابعین اور دوسرے مفسرین اس کے خلاف کوئی قول اختیار کریں، اسی لئے حافظ ابن حجر شارح بخاریؒ نے اصحاب کہف و رقیم کے دو الگ الگ جماعتیں ہونے سے انکار فرمایا، اور صحیح یہ قرار دیا کہ یہ دونوں ایک ہی جماعت کے نام ہیں، غار میں بند ہوجانے والے تین شخصوں کا ذکر رقیم کے ذکر کے ساتھ آگیا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہی تین شخص اصحاب الرقیم تھے۔

حافظ ابن حجر نے اس جگہ یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن نے جو قصہ اصحاب کہف کا بیان کیا ہے اس کا سیاق خود یہ بتلا رہا ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی جماعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسرین اور محدثین ان دونوں کے ایک ہی ہونے پر متفق ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس جگہ خود اس قصے کی تفصیلات کا ہے جس کے دو حصے ہیں ایک وہ جو اس قصہ کی رُوح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایات و نصائح بھی، دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق اس قصہ کی صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے، بیانِ مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں، مثلاً یہ قصہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کافر بادشاہ سے بھاگ کر ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد و خیالات تھے، اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہو گئے، پھر یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اور زمانۂ دراز تک سوتے رہنے کا کُل زمانہ کتنا تھا، اور پھر یہ لوگ اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں ایک قصہ یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ اجزاء موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا۔ (قصہ یوسف علیہ السلام کو اس اسلوب سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سورۂ یوسف کی تفسیر میں گذر چکی ہے)۔

قصہ اصحابِ کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزا جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحابِ کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور و فکر اور بحث و تکرار مناسب نہیں ان کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا فرضِ منصبی معانی قرآن کو بیان کرنا ہے آپؐ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزاءِ قصہ کو بیان نہیں فرمایا، اور اکابر صحابہ و تابعین نے اسی قرآنی اسلوب کی بناء پر ایسے معاملات میں ضابطہ کار یہ قرار دیا کہ:

أَبْهِمُوا مَا أَبْهَمَهُ اللّٰهُ، (اتقان، سیوطی)	"یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو (کہ اس میں بحث و تحقیق کچھ مفید نہیں)"

اکابر صحابہ و تابعین کے اس طرزِ عمل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی ان اجزاءِ قصّہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی اور جغرافیائی انکشافات ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علماءِ تفسیر نے اسی لئے کم و بیش ان اجزاء کو بھی بیان فرما دیا ہے، اس لئے زیرِ نظر تفسیر میں قصّے کے وہ اجزاء جو خود قرآن میں مذکور ہیں ان کا بیان تو آیاتِ قرآن کی تفسیر کے تحت آجائے گا، باقی تاریخی اور جغرافیائی اجزاءِ قصّہ کو یہاں بقدرِ ضرورت بیان کیا جاتا ہے، اور بیان کرنے کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلامی اور پھر مسیحی تاریخوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنّف اپنی تحقیق و رائے کے پیشِ نظر مقدمات و قرائن کی مدد سے کسی ایک چیز کو متعیّن کرتا ہے تو دوسرا اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

دین کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لینے والوں کے واقعات مختلف شہروں اور خطّوں میں متعدد ہوئے ہیں۔

مؤرخین کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں چونکہ رہبانیت کو دین کا سب سے بڑا کام سمجھ لیا گیا تھا تو ہر خطے اور ہر ملک میں ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے غاروں میں پناہ گزین ہو گئے، وہیں عمریں گذار دیں، اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اس پر مؤرخ کو اصحاب کہف کا گمان ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا۔

اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ

امام تفسیر قرطبی اندلسی نے اپنی تفسیر میں اس جگہ چند واقعات کچھ سماعی کچھ چشم دید نقل کئے ہیں، جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں، قرطبی نے سب سے پہلے تو ضحاک کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ رقیم روم کے ایک شہر کا نام ہے، جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے ہیں، پھر امام تفسیر ابن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سُنا ہے کہ شام میں ایک غار ہے جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں، وہاں کے مجاورین یہ کہتے ہیں کہ یہی لوگ اصحابِ کہف ہیں، اور اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، اور ان مُردہ لاشوں کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔

اور دوسرا واقعہ اندلس غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک لَوشہ نامی گاؤں کے قریب ایک غار ہے، جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مُردہ کُتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں رہا، صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں، اور بعض پر ابتک گوشت پوست بھی موجود ہے، اس پر صدیاں گذر گئیں، مگر صحیح سند سے انکا کچھ حال معلوم نہیں، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں،

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں خود ۵۰۴ھ میں وہاں پہنچا تو واقعی یہ لاشیں اسی حالت میں پڑی ہیں اور انکے قریب ہی ایک مسجد بھی ہے، اور ایک رومی زمانے کی تعمیر بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کوئی عالیشان محل ہوگا اِس وقت تک بھی اس کی بعض دیواریں موجود ہیں، اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے، اور فرمایا کہ غرناطہ کے بالائی حصہ میں ایک قدیم شہر کے آثار و نشانات پائے جاتے ہیں، جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام رَقیُوس بتلایا جاتا ہے، ہم نے اس کے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں، قرطبی جو اندلس ہی کے رہنے والے ہیں ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو متعین طور پر اصحابِ کہف کہنے سے گریز کرتے ہیں، اور خود ابن عطیہ نے بھی اپنے مشاہدے کے باوجود یہ جزم نہیں کیا کہ یہی لوگ اصحابِ کہف ہیں، محض عام شہرت نقل کی ہے، مگر دوسرے اندلسی مفسر ابو حیان جو ساتویں صدی ۶۵۴ھ میں خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے وہیں رہے، بسے ہیں وہ بھی اپنی تفسیر بحر محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح قرطبی نے کیا ہے، اور ابن عطیہ کے اپنے مشاہدہ کا ذکر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے) تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ وہ لاشیں اب تک وہاں موجود ہیں، اور زیارت کرنے والے ان کو شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان کی تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ ابن عطیہ نے جس شہر رقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ کی جانبِ قبلہ میں واقع ہے تو اس شہر سے میں خود بے شمار مرتبہ گذرا ہوں، اور اس میں بڑے بڑے غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں ویترجح کون اھل الکھف بالاندلس لکثرۃ دین النصاریٰ بھا حتیٰ ھی بلاد مملکتھم العظمیٰ (تفسیر بحر محیط ص ۱۰۲ ج ۶) "یعنی اصحابِ کہف کے اندلس میں ہونے کی ترجیح کے لئے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں نصرانیت کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ یہی خطہ ان کی سب سے بڑی مذہبی مملکت ہے"۔ اس میں یہ بات واضح ہے کہ ابو حیان کے نزدیک اصحابِ کہف کا اندلس میں ہونا راجح ہے۔ (تفسیر قرطبی، ص ۳۵۶، ۳۵۷ ج ۹)

امام تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے آیلہ (عقبہ) کے قریب ہے، اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ رقیم اس بستی کا نام ہے، جس میں اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے (روح المعانی)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا جس کو غزوۃ المضیق

کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہو حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے اس ہستی کو بھی منع کر دیا ہو جو آپ سے بہتر تھی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ (یعنی اگر آپ ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب وہیبت سے مغلوب ہو جائیں گے) مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لئے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت بیان کی ہو یہ وہ ہی جوان کی زندگی کے وقت تھی یہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی حالت ہو، اس لئے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا، وہ غار پر پہونچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا (روح المعانی، ص ۲۲۷ ج ۱۵)

مذکور الصدر روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتہ دیا ہے اُن کے اقوال تین مقامات کا پتہ دیتے ہیں، ایک خلیج فارس کے ساحل عقبہ (ایلہ) کے قریب، حضرت ابن عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایات میں گذر چکا ہے۔

ابن عطیہ کے مشاہدے اور ابو حیان کی تائید سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار غرناطہ اندلس میں ہے، ان دونوں جگہوں میں سے عقبہ میں ایک شہر یا کسی خاص عمارت کا نام رقیم ہونا بھی بتلایا گیا ہے، اسی طرح غرناطہ میں غار کے متصل عظیم الشان شکستہ عمارت کا نام رقیم بتلایا گیا ہے، اور دونوں قسم کی روایات میں کسی نے بھی اس کا قطعی فیصلہ اور جزم نہیں کیا، کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات کا مدار مقامی شہرت اور سماعی روایات پر ہے، اور تقریباً تمام تفاسیر قرطبی، ابو حیان، ابن جریر وغیرہ کی روایات میں اصحاب کہف جس شہر میں رہتے تھے اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس بتلایا گیا ہے، اس شہر کا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہل تاریخ کے نزدیک مسلّم ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار بھی ایشیائے کوچک میں ہے، اس لئے کسی ایک کو قطعی طور پر صحیح اور باقی کو غلط کہنے کی کوئی دلیل نہیں، احتمال تینوں جگہ کا ہو سکتا ہے، بلکہ اس احتمال کی بھی کوئی نفی نہیں کر سکتا کہ ان غاروں کے واقعات صحیح ہونیکے باوجود بھی یہ اُن اصحاب کہف کے غار نہ ہوں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ اور کسی جگہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ رقیم اس جگہ کسی شہر یا عمارت ہی کا نام ہو بلکہ اس احتمال کی بھی نفی نہیں کی جا سکتی کہ رقیم سے مراد وہ کتبہ ہو جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دہانے پر

کسی بادشاہ نے لگا دیا تھا۔

جدید مورخین کی تحقیق عصر حاضر کے بعض مورخین اور علماء نے مسیحی تاریخوں اور اہلِ یورپ کی تواریخ کی مدد سے غارِ اصحاب کہف کی جگہ اور زمانہ متعین کرنے کے لئے کافی بحث و تحقیق کی ہے۔

ابو الکلام صاحب آزاد نے اَیلہ (عقبہ) کے قریب موجودہ شہر پٹرا جس کو عرب مورخین بطرا لکھتے ہیں، اس کو قدیم شہر رقیم قرار دیا ہے، اور موجودہ تاریخوں سے اس کے قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار بھی بتلائے ہیں، جس کے ساتھ کسی مسجد کی تعمیر کے آثار بھی بتلائے جاتے ہیں، اس کی شہادت میں لکھا ہے کہ بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸، آیت ۲۷) میں جس جگہ کو رقم یا راقم کہا ہے یہ وہی مقام ہے جس کو اب پٹرا کہا جاتا ہے، مگر اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ کتاب یشوع میں جو رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے، اور یہ علاقہ دریائے اردن سے اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں شہر پٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اس زمانے کے محققینِ آثار قدیمہ نے اس بات کے ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۶ء جلد ۱۷، ص ۶۵۸)

اور عام مفسرین نے اصحاب کہف کی جگہ شہر اِفسوس کو قرار دیا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈر اب بھی موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰، ۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی ارض القرآن میں شہر پٹرا کا ذکر کرتے ہوئے بین القوسین (رقیم) لکھا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی کہ شہر پٹرا کا پرانا نام رقیم تھا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا اور اس کی شہادت میں تورات سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ کے حوالہ سے شہر پٹرا کا نام راقمہ بیان کیا ہے (ماخوذ از دائرۃ المعارف عرب)

مملکتِ اردن میں عمان کے قریب ایک سنسان جنگل میں ایک غار کا پتہ لگا تو حکومت کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ۱۹۶۳ء میں اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا تو اس میں مٹی اور پتھروں کے ہٹانے کے بعد ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ تابوت اور دو قبریں برآمد ہوئیں، غار کی جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے جو بزنطینی زبان میں ہیں، یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے، جس کے پاس اصحابِ کہف کا یہ غار ہے۔ واللہ اعلم

حضرت سیدی حکیم الامت تھانوی نے بیان القرآن میں تفسیر حقانی کے حوالہ سے اصحاب کہف کی جگہ اور مقام کی تاریخی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحاب کہف

نے غار میں پناہ لی تھی، اس کا زمانہ ۲۵۰ء تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۵۵۰ء ہوگیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے یہ واقعہ ان کے بیدار ہونے کا پیش آیا، اور تفسیر حقانی میں بھی ان کا مقام شہر اُفسُوس یا طرسُوس کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک میں تھا، اب اس کے کھنڈرات موجود ہیں، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

یہ تمام تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات ہیں جو قدمائے مفسرین کی روایات سے پھر جدید مؤرخین کے بیانات سے پیش کی گئی ہیں احقر نے پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضروری حصہ ان سے متعلق ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ قصہ بیان کیا ہے، پھر روایات و حکایات اور ان کے آثار و قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق و کاوش کے بعد بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آجکل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھا ہوا ہے، اس کی تسکین کے لئے یہ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں، جن سے تقریبی اور تخمینی طور پر اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا، اور بیشتر روایات اس کے شہر افسوس یا طرسوس کے قریب ہونے پر متفق نظر آتی ہیں، واللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے کی جا سکتی ہے، امام تفسیر و حدیث ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ:

قَدْ اَخْبَرَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی بِذٰلِکَ وَاَرَادَ مِنَّا فَهْمَهٗ وَتَدَبُّرَهٗ وَلَمْ یُخْبِرْنَا بِمَکَانِ هٰذَا الْکَهْفِ فِیْ اَیِّ الْبِلَادِ مِنَ الْاَرْضِ اِذْ لَا فَائِدَةَ لَنَا فِیْهِ وَلَا قَصْدَ شَرْعِیٌّ

(ابن کثیر، ج ۳ ص ۷۵)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اصحابِ کہف کے ان حالات کی خبر دی جن کا ذکر قرآن میں ہے تاکہ ہم ان کو سمجھیں اور ان میں تدبر کریں اور اس کی خبر نہیں دی کہ یہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے، کیونکہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی شرعی مقصد اس سے متعلق ہے۔"

اصحابِ کہف کا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور غار میں پناہ لینے کے اسباب کیا تھے؟

قصہ کا یہ ٹکڑا بھی وہی ہے جس پر نہ کسی آیتِ قرآن کا سمجھنا موقوف ہے، نہ مقصد قصہ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، اور نہ قرآن و سنت میں اس کا بیان ہے، صرف تاریخی حکایات ہیں، اسی لئے ابوحیانؒ نے تفسیر بحر المحیط میں فرمایا:۔

وَالرُّوَاۃُ مُخْتَلِفُوْنَ فِیْ قِصَصِہِمْ وَکَیْفَ کَانَ اِجْتِمَاعُھُمْ وَخُرُوْجُھُمْ وَلَمْ یَاْتِ فِی الْحَدِیْثِ الصَّحِیْحِ کَیْفِیَّۃُ ذٰلِکَ وَلَا فِی الْقُرْاٰنِ (بحر محیط ص۱۰۱ ج ۶)	"ان حضرات کے قصہ میں راویوں کا سخت اختلاف ہے، اور اس میں کہ یہ اپنے اس پروگرام پر کس طرح متفق ہوئے، اور کس طرح نکلے، نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی کیفیت مذکور ہے نہ قرآن میں"

تاہم موجودہ طبائع کی دلچسپی کے لئے جیسے اوپر اصحاب کہف کے مقام سے متعلق کچھ معلومات لکھی گئی ہیں، اس واقعہ کے زمانۂ وقوع اور اسباب وقوع کے متعلق بھی مختصر معلومات تفسیری اور تاریخی روایات سے نقل کی جاتی ہیں، اس قصہ کو پوری تفصیل اور استیعاب کے ساتھ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں مختلف روایات سے نقل فرمایا ہے، مگر یہاں صرف وہ مختصر واقعہ لکھا جاتا ہے جس کو ابن کثیر نے سلف و خلف کے بہت سے مفسرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :۔

"اصحاب کہف بادشاہوں کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار تھے، قوم بُت پرست تھی، ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لئے شہر سے باہر نکلی، جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا تھا، وہاں جاکر یہ لوگ اپنے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے، اور ان کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے، ان کا بادشاہ ایک جبّار ظالم دقیانوس نامی تھا، جو قوم کو اس بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، اس سال جبکہ پوری قوم اس میلے میں جمع ہوئی، تو یہ اصحاب کہف نوجوان بھی پہونچے، اور وہاں اپنی قوم کی یہ حرکتیں دیکھیں کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے، اور ان کی عبادت کرتے اور ان کے لئے قربانی کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عقل سلیم عطا فرمادی کہ قوم کی اس احمقانہ حرکت سے ان کو نفرت ہوئی، اور عقل سے کام لیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہونی چاہئے جس نے زمین و آسمان اور ساری مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، یہ خیال بیک وقت ان چند نوجوانوں کے دل میں آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قوم کی اس احمقانہ عبادت سے بچنے کے لئے اس جگہ سے ہٹنا شروع کیا، ان میں سب سے پہلے ایک نوجوان مجمع سے دور ایک درخت کے نیچے جاکر بیٹھ گیا، اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور وہ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اسی طرح پھر تیسرا اور چوتھا آدمی آتا گیا، اور درخت کے نیچے بیٹھتا رہا، مگر اُن میں کوئی دوسرے کو نہ پہچانتا تھا اور نہ یہ کہ یہاں کیوں آیا ہے، مگر ان کو درحقیقت اس قدرت نے یہاں جمع کیا تھا جس نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمایا"۔

قومیت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد　ابن کثیر نے اس کو نقل کرکے فرمایا کہ لوگ تو باہمی اجتماع کا سبب

قومیت اور جنسیت کو سمجھتے ہیں، مگر حقیقت وہ ہے جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ درحقیقت اتفاق و افتراق اوّل ارواح میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر اس عالم کے ابدان میں پڑتا ہے، جن روحوں کے درمیان ازل میں مناسبت اور اتفاق پیدا ہوا وہ یہاں بھی باہم مربوط اور ایک جماعت کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت اور باہمی توافق نہ ہوا بلکہ وہاں علیحدگی رہی ان میں یہاں بھی علیحدگی رہے گی، اسی واقعہ کی مثال کو دیکھو کہ کس طرح الگ الگ ہر شخص کے دل میں ایک ہی خیال پیدا ہوا اِس خیال نے ان سب کو غیر شعوری طور پر ایک جگہ جمع کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جگہ جمع تو ہوگئے، مگر ہر ایک اپنے عقیدہ کو دوسرے سے اس لئے چھپاتا تھا کہ یہ کہیں جاکر بادشاہ کے پاس مخبری نہ کردے، اور میں گرفتار ہو جاؤں، کچھ دیر سکوت کے عالم میں جمع رہنے کے بعد ان میں سے ایک شخص بولا کہ بھائی ہم سب کے سب قوم سے علیحدہ ہو کر یہاں پہونچنے کا کوئی سبب تو ضرور ہے، مناسب یہ ہو کہ ہم سب باہم ایک دوسرے کے خیال سے واقف ہو جائیں، اس پر ایک شخص بول اٹھا، کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کو جس دین و مذہب اور جس عبادت میں مبتلا پایا مجھے یقین ہوگیا کہ یہ باطل ہے، عبادت تو صرف اللہ جل شانہٗ کی ہونی چاہئے، جس کا تخلیق کائنات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں، اب تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اقرار کیا کہ یہی عقیدہ اور خیال ہے جس نے مجھے قوم سے علیحدہ کرکے یہاں پہونچایا۔

اب یہ ایک متحد الخیال جماعت ایک دوسرے کی رفیق اور دوست ہوگئی، اور انھوں نے الگ اپنی ایک عبادت گاہ بنالی، جس میں جمع ہو کر یہ لوگ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرنے لگے۔

مگر شدہ شدہ ان کی خبر شہر میں پھیل گئی، اور چغل خوروں نے بادشاہ تک اُن کی خبر پہنچا دی، بادشاہ نے ان سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا، یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان کے عقیدے اور طریقے کے متعلق سوال کیا، اللہ نے ان کو ہمت بخشی، انھوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا عقیدۂ توحید بیان کردیا، اور خود بادشاہ کو بھی اس کی طرف دعوت دی، اسی کا بیان قرآن کریم کی آیات میں اس طرح آیا ہے:۔ وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (الیٰ قولہ) كَذِبًا ۝

جب ان لوگوں نے بادشاہ کو بیباک ہو کر دعوتِ ایمان دی تو بادشاہ نے اس سے انکار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا، اور ان کے بدن سے وہ عمدہ پوشاک جو اُن شہزادوں کے بدن پر تھی اُتروادی، تاکہ یہ لوگ اپنے معاملہ میں غور کریں، اور غور کرنے کے لئے چند روز کی مہلت یہ کہہ کر دیدی کہ تم نوجوان ہو میں تمھارے قتل میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کہ تم کو غور کرنے کا موقع مل جائے

اب بھی اگر تم اپنی قوم کے دین و مذہب پر آجاتے ہو تو تم اپنے حال پر رہو گے ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔
یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اپنے مؤمن بندوں پر تھا، کہ اس مہلت نے ان لوگوں کے لئے راہِ فرار کھول دی، اور یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر ایک غار میں روپوش ہو گئے۔

عام روایات مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، ابن کثیر اور دوسرے تمام مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اگرچہ ابن کثیر نے اس کو قبول اس لئے نہیں کیا کہ اگر یہ لوگ مسیحی دین پر ہوتے تو یہود مدینہ ان سے عداوت کی بنا پر ان کے واقعہ کا سوال نہ کراتے اور ان کو اہمیت نہ دیتے مگر یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں جس کی وجہ سے تمام روایات کو رد کر دیا جائے، یہود مدینہ نے تو محض ایک واقعہ عجیبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا سوال کرایا، جیسے ذوالقرنین کا سوال بھی اسی بنا پر ہی، اس طرح کے سوالات میں یہودیت اور نصرانیت کا تعصب درمیان میں نہ آنا ہی ظاہر ہے۔

تفسیر مظہری میں بروایت ابن اسحٰق ان لوگوں کو ان موحدین میں شمار کیا ہے جو مسیحی دین کے مٹ جانے کے بعد ان کے حق پرست لوگ خال خال رہ گئے تھے، جو صحیح دین مسیح اور توحید پر قائم تھے، ابن اسحٰق کی روایت میں بھی اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، اور جس شہر میں یہ نوجوان غار میں چھپنے سے پہلے رہتے تھے اس کا نام افسوس بتلایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بھی واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے، اور بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، ابن اسحٰق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اصحاب کہف کے بیدار ہونے کے وقت ملک پر دین مسیح علیہ السلام کے پابند جن لوگوں کا قبضہ ہو گیا تھا ان کے بادشاہ کا نام بیدوسیس تھا۔

مجموعۂ روایات سے یہ بات تو بظنِ غالب ثابت ہو جاتی ہے کہ اصحاب کہف صحیح دین مسیح علیہ السلام پر تھے اور ان کا زمانہ بعد المسیح ہے، اور جس بادشاہ مشرک سے بھاگے تھے اس کا نام دقیانوس تھا، تین سو نو سال کے بعد بیدار ہونے کے وقت جس نیک مؤمن بادشاہ کی حکومت تھی ابن اسحٰق کی روایت میں اس کا نام بیدوسیس بتلایا ہے، اس کے ساتھ موجودہ زمانے کی تاریخوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تخمینی اور تقریبی طور پر ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ تعیین کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کے علم کے اسباب موجود ہیں۔

کیا اصحاب کہف اب بھی زندہ ہیں اس معاملے میں صحیح اور ظاہر یہی ہے کہ انکی وفات ہو چکی ہے، تفسیر مظہری میں ابن اسحٰق کی مفصل روایت میں ہے کہ اصحابِ کہف کی بیداری اور شہر میں ان کے واقعۂ عجیبہ کی شہرت ہو جانے اور اس وقت کے بادشاہ بیدوسیس کے پاس پہونچ کر ملاقات کرنے کے بعد اصحابِ کہف نے ملک بیدوسیس سے رخصت چاہی، اور رخصتی سلام کے ساتھ اس کو

لئے دعا کی، اور ابھی بادشاہ اسی جگہ موجود تھا کہ یہ لوگ اپنے لیٹنے کی جگہوں پر جا کر لیٹ گئے، اور اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دیدی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ سبھی مفسرین نے نقل کی ہے کہ:

قَالَ قَتَادَۃُ غَزَا ابْنُ عَبَّاسٍ مَعَ حَبِیْبِ بْنِ مَسْلَمَۃَ فَمَرُّوْا بِکَھْفٍ فِیْ بِلَادِ الرُّوْمِ فَرَاَوْا فِیْہِ عِظَامًا فَقَالَ قَائِلٌ ھٰذِہٖ عِظَامُ اَھْلِ الْکَھْفِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ بَلِیَتْ عِظَامُھُمْ مِنْ اَکْثَرَ مِنْ ثَلٰثِمِائَۃِ سَنَۃٍ (ابن کثیر)

"قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے حبیب ابن مسلمہ کے ساتھ ایک جہاد کیا، تو بلاد روم میں ان کا گذر ایک غار پر ہوا جس میں مردہ لاشوں کی ہڈیاں تھیں، کسی نے کہا کہ یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں، تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو اب تین سو برس پہلے خاک ہو چکی ہیں"

یہ سب اس تاریخی قصے کے وہ اجزاء تھے جن کو نہ قرآن نے بیان کیا نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ اس واقعہ کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، باقی رہے قصے کے وہ اجزاء جن کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل انہی آیات کے تحت آتی ہے۔

یہاں تک قرآن کریم نے اس قصے کا اجمالی ذکر فرمایا تھا، آگے تفصیلی ذکر آتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ نَبَاَھُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ

ہم سنا دیں تجھ کو ان کا حال تحقیق، وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر

وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی ﴿۱۳﴾ وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا

اور زیادہ دی ہم نے ان کو سوجھ، اور گرہ دی اُن کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب ہے

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلٰھًا لَّقَدْ

رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوائے کسی کو معبود، نہیں تو

قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً ؕ

کہی ہم نے بات عقل سے دور، یہ ہماری قوم ہے ٹھہرا لئے انھوں نے اللہ کے سوائے اور معبود

لَوْلَا يَأْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ		
کیوں نہیں لاتے ان پر کوئی سند کھلی پھر اس سے بڑا گنہگار کون جس نے باندھا اللہ پر		
كَذِبًا ﴿١٥﴾ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى		
جھوٹ، اور جب تم نے کنارہ کرلیا ان سے اور جنکو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے تو اب جا بیٹھو		
الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ		
اس کھوہ میں پھیلادے تم پر تمہارا رب کچھ اپنی رحمت سے اور بنادیوے تمہارے واسطے		
	اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾	
	کام میں آرام۔	

خلاصۂ تفسیر

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں (اس میں اشارہ کر دیا کہ اس کے خلاف جو کچھ دنیا میں مشہور ہے وہ درست نہیں) وہ لوگ (اصحابِ کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر (اس زمانے کے دین عیسوی کے مطابق) ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی (کہ صفاتِ ایمان، ثابت قدمی اور بلاؤں پر صبر، دنیا سے اعراض، آخرت کی فکر وغیرہ بھی عطا کر دیں، انہی صفات ایمان و ہدایت میں ایک بات یہ تھی کہ) ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جبکہ وہ پختہ ہو کر (آپس میں یا مخالف بادشاہ کے رُو برو) کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے (کیونکہ اگر خدانخواستہ ہم نے ایسا کیا) تو اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی، اور یہ جو ہماری قوم ہے انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں، (کیونکہ ان کی قوم اور بادشاہِ وقت سب بُت پرست تھے، سو) یہ لوگ اپنے معبودوں (کے معبود ہونے) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے (جیسا کہ موحّدین توحید پر واضح اور یقینی دلیل رکھتے ہیں) تو اس سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگادے (کہ اس کے کچھ ساجھی اور شریک بھی ہیں) اور پھر (آپس میں کہا کہ) جب تم ان لوگوں سے عقیدہ ہی میں الگ ہوگئے اور ان کے معبودوں (کی عبادت) سے بھی (الگ ہوگئے ہو) مگر اللہ سے (الگ نہیں ہوتے، بلکہ اسی کی وجہ سے سب کو چھوڑا ہے) تو اب (مصلحت یہ

ہے کہ تم (فلاں) غار میں (جو مشورے سے طے ہوا ہوگا) چل کر پناہ لو (تاکہ امن اور بے فکری کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکو) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کے سامان درست کر دے گا (اللہ تعالیٰ سے اسی امید اور توقع پر غار میں جانے کے وقت انھوں نے سب سے پہلے یہ دعا کی کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝)

معارف و مسائل

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ ، فتیٰ کی جمع ہے، نوجوان کے معنی میں آتا ہے، علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصلاحِ اعمال و اخلاق اور رشد و ہدایت کا زمانہ جوانی ہی کی عمر ہے، بڑھاپے میں پچھلے اعمال و اخلاق ایسے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کتنا ہی اس کے خلاف حق واضح ہو جائے ان سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانیوالے بیشتر نوجوان ہی لوگ تھے (ابن کثیر، ابوحیان)

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ، ابن کثیر کے حوالے سے جو واقعہ کی صورت اوپر بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کے دلوں کو مضبوط کر دینے کا واقعہ اس وقت ہوا جب کہ بُت پرست ظالم بادشاہ نے ان نوجوانوں کو اپنے دربار میں حاضر کر کے سوالات کئے، اس موت و حیات کی کش مکش اور قتل کے خوف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اپنی محبت اور ہیبت و عظمت ایسی مسلط کر دی کہ اس کے مقابلے میں قتل و موت اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر اپنے عقیدے کا صاف صاف اظہار کر دیا، کہ وہ اللہ کے سوا کسی معبود کی عبادت نہیں کرتے، اور آئندہ بھی نہ کریں گے، جو لوگ اللہ کے لئے کسی کام کا عزم پختہ کر لیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی ایسی ہی امداد ہوا کرتی ہے۔

فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ ، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اصحابِ کہف نے جو صورت اختیار کی کہ جس شہر میں رہ کر اللہ کی عبادت نہ ہو سکتی تھی اس کو چھوڑ کر غار میں پناہ لی، یہی سنت ہے تمام انبیاء کی کہ ایسے مقامات سے ہجرت کر کے وہ جگہ اختیار کرتے ہیں جہاں عبادت کی جا سکے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچ کر جاتی ہے اُن کی کھوہ سے داہنے کو

وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ

اور جب ڈوبتی ہے کترا جاتی ہے اُن سے بائیں کو اور وہ میدان میں ہیں اس کے،

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ

یہ ہے اللہ کی قدرتوں سے جس کو راہ دیوے اللہ وہی آئے راہ پر اور جس کو وہ بچلائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ

پھر تو نہ پائے اس کا کوئی رفیق راہ پر لانے والا، اور تو سمجھے وہ جاگتے ہیں اور وہ

رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ

سورہے ہیں اور کروٹیں دلاتے ہیں ہم ان کو داہنے اور بائیں اور کتا ان کا

بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ

پسار رہا ہے اپنی باہیں چوکھٹ پر اگر تو جھانک کر دیکھے ان کو تو پیٹھ دے کر بھاگے

فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

ان سے اور بھر جائے تجھ میں اُن کی دہشت ۔

خلاصۂ تفسیر

اور اے مخاطب (وہ غار ایسی وضع پر واقع ہوا ہے کہ) جب دھوپ نکلتی ہے تو تو اس کو دیکھے گا کہ وہ غار سے داہنی جانب کو بچی رہتی ہے (یعنی غار کے دروازے سے داہنی طرف الگ کو رہتی ہے) اور جب وہ چھپتی ہے تو (غار کے) بائیں طرف ہٹی رہتی ہے (یعنی اُس وقت بھی غار کے اندر دھوپ نہیں جاتی، تاکہ ان کو دھوپ کی تپش سے تکلیف نہ پہونچے) اور وہ لوگ اس غار کے ایک فراخ موقع میں تھے (یعنی ایسے غاروں میں جو عادۃً کہیں تنگ کہیں کشادہ ہوتے ہیں، تو وہ اس غار کے ایسے موقع پر تھے جو کشادہ تھا تاکہ ہوا بھی پہونچے اور جگہ کی تنگی سے جی بھی نہ گھبرائے) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے (کہ اسباب ظاہری کے خلاف ان کے لئے آرام کا سامان مہیّا کر دیا پس معلوم ہوا کہ) جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پائیں گے (غار کی جو ہیئت بتلائی گئی ہے کہ اس میں نہ طلوع کے وقت صبح کو دھوپ اندر جاتی نہ شام کو غروب کے وقت، یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ غار شمال رویہ یا جنوب رویہ ہو، کیونکہ داہنی بائیں جانب غار میں داخل ہونے والے کی مراد ہوں تو غار شمال رویہ ہوگا، اور داہنی بائیں

جانب غار سے نکلنے والے کی مراد ہوں تو غار جنوب رویہ ہوگا)
اور اے مخاطب (تو اگر اس وقت جبکہ وہ غار میں گئے اور ہم نے ان پر نیند مسلّط کر دی اُن کو دیکھتا تو) ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالانکہ وہ سوتے تھے (کیونکہ اللہ کی قدرت نے ان کو نیند کے آثار و علامات سے محفوظ رکھا تھا، جیسے سانس کا تغیر، بدن کا ڈھیلا پن، آنکھیں اگر بند بھی ہوں تو سونے کی یقینی علامت نہیں) اور (اس نیند کے زمانۂ دراز میں) ہم ان کو (کبھی) داہنی طرف اور (کبھی) بائیں طرف کروٹ دیدیتے تھے اور (اس حالت میں) ان کا کتا (جو کسی وجہ سے ان کے ساتھ آگیا تھا غار کی) دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (بیٹھا تھا) (اور ان کے رعب و جلالِ خداداد کی یہ حالت تھی کہ) اگر (اے مخاطب) تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا، اور (تیرے اندر) ان کی دہشت سما جاتی (اس آیت میں خطاب عام مخاطبین کو ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرعوب ہونا لازم نہیں آتا، اور یہ تمام سامان حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لئے جمع کر دیئے تھے، کیونکہ جاگتے ہوئے آدمی پر حملہ کرنا آسان نہیں ہوتا، اور نیند کے طویل زمانے میں کروٹیں نہ بدلی جائیں تو مٹی ایک کروٹ کو کھا لیتی، اور غار کے دروازے پر کتے کا بیٹھنا بھی سامانِ حفاظت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے تین حال بتائے ہیں، اور تینوں عجیب ہیں جو اُن حضرات کی کرامت سے بطور خرقِ عادت ظاہر ہوئے۔

اوّل، زمانۂ دراز تک مسلسل نیند کا مسلّط ہونا اور اس میں بغیر کسی غذا وغیرہ کے زندہ رہنا سب سے بڑی کرامت اور خرقِ عادت ہے، اس کی تفصیل تو اگلی آیات میں آئے گی، یہاں اس طویل نیند کی حالت میں ان کا ایک حال تو یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو غار کے اندر اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ صبح شام دھوپ ان کے قریب سے گذرتی مگر غار کے اندر ان کے جسموں پر نہ پڑتی تھی، قریب سے گذرنے کے فوائد زندگی کے آثار کا قیام، ہوا اور سردی گرمی کا اعتدال وغیرہ تھے، اور ان کے جسموں پر دھوپ نہ پڑنے سے جسموں کی اور ان کے لباس کی حفاظت بھی تھی۔

دھوپ کے ان کے اوپر نہ پڑنے کی یہ صورت غار کی کسی خاص وضع کی بنا پر بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا دروازہ جنوب یا شمال میں ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ طبعی اور عادی طور پر اس کے اندر نہ پہونچے، ابن قتیبہؒ نے اس کی وضع خاص متعین کرنے کیلئے یہ تکلف کیا کہ ریاضی کے اصول و

قواعد کی رُو سے اس جگہ کا طول بلد عرض بلد اور غار کا رخ متعین کیا، (مظہری) اور اس کے بالمقابل زجاج نے کہا کہ دھوپ کا ان سے الگ رہنا کسی وضع اور ہیئت کی بنار پر نہیں بلکہ ان کی کرامت سے بطور خرقِ عادت تھا، اور اس آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ، یہ بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ دھوپ سے حفاظت کا یہ سامان غار کی کسی خاص وضع و ہیئت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک نشانی تھی (قرطبی)

اور صاف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان مہیا فرما دیا تھا کہ دھوپ ان کے جسموں پر نہ پڑے، خواہ یہ سامان غار کی خاص ہیئت اور وضع کے ذریعے ہو یا کوئی بادل وغیرہ دھوپ کے وقت حائل کر دیا جاتا ہو، یا براہِ راست آفتاب کی شعاعوں کو ان سے بطور خرقِ عادت کے ہٹا دیا جاتا ہو، آیت میں یہ سب احتمالات ہیں، کسی ایک کو متعین کرنے پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

اصحابِ کہف طویل نیند کے زمانے میں اس حالت پر تھے کہ دیکھنے والا انکو بیدار سمجھے

دوسرا حال یہ بتلایا ہے کہ اصحابِ کہف پر اتنے زمانہ دراز تک نیند مسلط کر دینے کے باوجود ان کے اجسام پر نیند کے آثار نہ تھے، بلکہ ایسی حالت تھی کہ ان کو دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ جاگ رہے ہیں، عام مفسرین نے فرمایا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، بدن میں ڈھیلا پن جو نیند سے ہوتا ہے وہ نہیں تھا، سانس میں تغیر جو سونے والوں کے ہو جاتا ہے وہ نہیں تھا، ظاہر یہ ہے کہ یہ حالت بھی غیر معمولی اور ایک قسم کی کرامت ہی تھی، جس میں بظاہر حکمت ان کی حفاظت تھی، کہ کوئی ان کو سوتا ہوا سمجھ کر ان پر حملہ نہ کرے، یا جو سامان اُن کے ساتھ تھا وہ نہ چرا لے، اور مختلف کروٹیں بدلنے سے بھی دیکھنے والے کو بیداری کا خیال ہو سکتا ہے، اور کروٹیں بدلنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ مٹی ایک کروٹ کو نہ کھالے۔

اصحابِ کہف کا کُتا

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں کُتا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شکاری کُتے یا جانوروں کے محافظ کُتے کے علاوہ کُتا پالتا ہو تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط گھٹ جاتے ہیں، (قیراط ایک چھوٹے سے وزن کا نام ہے) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ایک تیسری قسم کے کتے کا بھی استثناء آیا ہے، یعنی جو کھیتی کی حفاظت کے لئے پالا گیا ہو۔

ان روایاتِ حدیث کی بنار پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگ اللہ والوں نے کُتا کیوں ساتھ لیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم کُتا پالنے کی ممانعت شریعت محمدیہ

کا حکم ہی ممکن ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو، دوسرے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ صاحب جائداد صاحب مویشی تھے اُن کی حفاظت کے لئے کتا پالا ہو، اور جیسے کتے کی وفا شعاری مشہور ہے، یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

نیک صحبت کے برکات کہ اس نے کتے کا بھی اعزاز بڑھا دیا

ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے بتلایا کہ میں نے ابوالفضل جوہریؒ کا ایک وعظ ۴۶۹ھ ہجری میں جامع مصر کے اندر سنا وہ بر سر منبر یہ فرما رہے تھے کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کی نیکی کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے، دیکھو اصحاب کہف کے کتے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابن عطیہؒ کی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ایک کتا صلحاء اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پا سکتا ہے تو آپ قیاس کرلیں کہ مؤمنین موحدین جو اولیاء اللہ اور صالحین سے محبت رکھیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا، بلکہ اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے مسجد کے دروازے پر ایک شخص ملا، اور یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے (جو اس کے آنے کی جلدی کر رہے ہو) یہ بات سُن کر یہ شخص دل میں کچھ شرمندہ ہوا اور پھر عرض کیا کہ میں نے قیامت کے لئے بہت نماز، روزے اور صدقات تو جمع نہیں کئے، مگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو (سن لو کہ) تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت رکھتے ہو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم یہ جملہ مبارکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنکر اتنے خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ خوشی کبھی نہ ہوئی تھی، اور اس کے بعد حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (الحمد للہ) میں اللہ سے اس کے رسولؐ سے، ابوبکر و عمر سے محبت رکھتا ہوں، اس لئے اس کا امیدوار ہوں کہ ان کے ساتھ ہوں گا (قرطبی)

اصحاب کہف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا کہ جو دیکھے ہیبت کھا کر بھاگ جائے

لَوِاطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ، ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب عام لوگوں کو ہے اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحاب کہف کا رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چھا سکتا تھا، عام مخاطبین کو

فرمایا گیا ہے، اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب و ہیبت تم پر طاری ہو جائے۔

یہ رعب و ہیبت کس بنا اور کن اسباب کی وجہ سے تھا، اس میں بحث فضول ہے، اور اسی لئے قرآن و حدیث نے اس کو بیان نہیں کیا حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے ایسے حالات پیدا فرما دیئے تھے کہ ان کے بدن پر دھوپ نہ پڑے اور دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے اور دیکھنے والے پر اُن کی ہیبت طاری ہو جائے کہ پوری طرح دیکھ نہ سکے، یہ حالات خاص اسباب طبیعہ کے راستہ سے ہونا بھی ممکن ہے، اور بطور کرامت خرقِ عادت کے طریق سے بھی جب قرآن و حدیث نے اس کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں فرمائی، تو خالی قیاسات اور تخمینوں سے اس میں بحث کرنا بے کار ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور تائید میں ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے روم کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ جہاد کیا، جو غزوۃ المضیق کے نام سے معروف ہے، اس سفر میں ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ اصحاب کہف کی تحقیق اور مشاہدہ کے لئے غار میں جائیں، ابن عباسؓ نے منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑی اور بہتر ہستی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے مشاہدہ سے منع کر دیا ہے، اور یہی آیت پڑھی لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ (اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک لَوِ اطَّلَعْتَ کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا (غالباً وجہ یہ ہوگی کہ انھوں نے آیت کا مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے عام مخاطبین کو قرار دیا ہوگا، یا یہ کہ یہ حالت قرآن نے اس وقت کی بیان کی ہے جس وقت اصحاب کہف زندہ تھے اور سو رہے تھے، اب ان کی وفات کو عرصہ ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ اب بھی وہی رعب و ہیبت کی کیفیت موجود ہو بہرحال) حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی بات قبول کی اور چند آدمی تحقیق و مشاہدہ کے لئے بھیج دیئے، جب یہ لوگ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت گرم ہوا بھیج دی جس کی وجہ سے یہ کچھ نہ دیکھ سکے (مظہری)

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ

اور اسی طرح ان کو جگا دیا ہم نے کہ آپس میں پوچھنے لگے، ایک بولا ان میں کتنی دیر ٹھہرے تم

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ

بولے ہم ٹھہرے ایک دن یا دن سے کم، بولے تمھارا رب ہی خوب جانے جتنی دیر تم رہے ہو

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ

اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنا اس شہر میں پھر دیکھے کونسا کھانا

اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ

ستھرا ہے سو لائے تمھارے پاس اس میں سے کھانا اور نرمی سے جائے اور جتا نہ دے

بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ

تمھاری خبر کسی کو ، وہ لوگ اگر خبر پالیں تمھاری پتھروں سے مار ڈالیں تم کو یا لوٹا لیں تم کو

فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

اپنے دین میں اور تب تو بھلا نہ ہوگا تمھارا کبھی۔

خلاصۂ تفسیر

اور (جس طرح ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو اتنے زمانۂ دراز تک سُلایا) اسی طرح (اس طویل نیند کے بعد) ہم نے ان کو جگا دیا تاکہ وہ آپس میں پوچھ پاچھ کریں (تاکہ باہمی سوال وجواب کے بعد ان کو حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت منکشف ہو چنانچہ) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ (اس نیند کی حالت میں) تم کس قدر رہے ہوگے (جواب میں) بعض نے کہا کہ (غالباً) ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے ہوں گے، دوسرے بعض نے کہا کہ (اس کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے) یہ تو (ٹھیک ٹھیک) تمھارے رب ہی کو خبر ہے کہ تم کس قدر (سوتے) رہے اب (اس فضول بحث کو چھوڑ کر ضروری کام کرنا چاہئے وہ یہ کہ) اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا، کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے، غرضیکہ کسی کو یہ روپیہ) دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر (وہ وہاں پہونچ کر) تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے (اس جگہ لفظ اَزْکیٰ کی تفسیر بروایت ابن جریر حضرت سعید بن جبیر سے یہی منقول ہے کہ مراد اس سے حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی قوم بُت پرست بکثرت اپنے بتوں کے نام ذبح کیا کرتی تھی اور بازار میں بکثرت یہی حرام گوشت بکتا تھا) تو وہ اس میں سے تمھارے پاس کچھ کھانا لے آوے اور کام خوش تدبیری سے کرے (کہ ایسی وضع ہیئت سے جاوے کہ کوئی اس کو پہچانے نہیں اور کھانے کی تحقیق کرنے میں بھی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ بُت کے نام کے ذبیحہ کو حرام سمجھتا ہے) اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے (کیونکہ) اگر وہ لوگ (یعنی اہلِ شہر جن کو اپنے خیال میں اپنے زمانے

کے مشرکین سمجھے ہوئے تھے) کہیں تمہاری خبر پاجائیں گے تو تم کو یا پتھراؤ کر کے مار ڈالیں گے یا (جبراً) تم کو اپنے مذہب میں پھر داخل کرلیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہوگی۔

معارف ومسائل

كَذٰلِكَ یہ لفظ تشبیہ و تمثیل کے لئے ہے، مراد اس جگہ دو واقعوں کی باہم تشبیہ بیان کرنا ہے ایک واقعہ اصحاب کہف کی نوم طویل اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا ہے، جس کا ذکر شروع قصے میں آیا ہے فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا، دوسرا واقعہ اس زمانہ دراز کی نیند کے بعد صحیح سالم اور باوجود غذا نہ پہونچنے کے قوی اور تندرست اٹھنے اور بیدار ہونے کا ہے، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت ہونے میں متماثل ہیں، اسی لئے اس آیت میں جوان کے بیدار کرنے کا ذکر فرمایا تو لفظ کَذٰلِکَ سے اشارہ کر دیا کہ جس طرح ان کی نیند عام انسانوں کی عادی نیند کی طرح نہیں تھی، اسی طرح ان کی بیداری بھی عام عادت طبعی سے ممتاز تھی، اور اس کے بعد جو لِيَتَسَآءَلُوْا فرمایا جس کے معنی ہیں "تاکہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں کہ نیند کتنے زمانے رہی" یہ ان کے بیدار کرنے کی علت نہیں، بلکہ عادی طور پر پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس کے لام کو حضرات مفسرین نے لام عاقبت یا لام صیرورت کا نام دیا ہے (ابوحیان، قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ان کی نوم طویل ایک نشانی قدرت کی تھی، اسی طرح سینکڑوں سال کے بعد بغیر کسی غذا کے قوی، تندرست بیدار ہو کر بیٹھ جانا بھی قدرت کاملہ کی نشانی تھی، اور چونکہ قدرت کو یہ بھی منظور تھا کہ خود ان لوگوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہوجائے کہ سینکڑوں برس سوتے رہے تو اس کی ابتداء باہمی سوالات سے ہوئی، اور انتہا اس واقعہ سے ہوئی جس کا ذکر اگلی آیت میں وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا میں آیا ہے کہ شہر کے لوگوں پر ان کا راز کھل گیا، اور تعیینِ مدت میں اختلاف کے باوجود زمانہ دراز تک غار میں سوتے رہنے کا سب کو یقین ہوگیا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ، شروع قصہ میں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی کہ غار میں رہنے کی مدت کے متعلق باہم اختلاف رائے ہوا، ان میں سے ایک جماعت کا قول صحیح تھا، یہ اس کی تفصیل ہے کہ اصحابِ کہف میں سے ایک شخص نے سوال اٹھایا کہ تم کتنا سوئے ہو، تو بعض نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا ایک حصہ، کیونکہ یہ لوگ صبح کے وقت غار میں داخل ہوئے تھے، اور بیدار ہونے کا وقت شام کا وقت تھا، اس لئے خیال یہ ہوا کہ یہ وہی دن ہے جس میں ہم غار میں داخل ہوئے تھے، اور سونے کی مدت تقریباً ایک دن ہے، مگر انہی میں سے دوسرے لوگوں کو کچھ یہ احساس ہوا کہ شاید یہ وہ دن نہیں جس میں داخل ہوئے تھے، پھر معلوم نہیں کتنے دن ہوگئے، اس لئے اس کے علم کو

حوالہ بخدا کیا، قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ، اور اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر اصل کام کی طرف توجہ دلائی کہ شہر سے کچھ کھانا لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیج دیا جائے۔

اِلَى الْمَدِيْنَةِ، اس لفظ سے اتنا تو ثابت ہوا کہ غار کے قریب بڑا شہر تھا، جہاں یہ لوگ رہتے تھے، اس شہر کے نام کے متعلق ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ جس زمانے میں اصحابِ کہف یہاں سے نکلے تھے، اس وقت اس شہر کا نام افسوس تھا، اور اب اس کا نام طرسوس ہے، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ بُت پرستوں کے اس شہر پر غلبہ اور جاہلیت کے زمانے میں اس کا نام افسوس تھا، جب اس زمانے کے مسلمان یعنی مسیحی اس پر غالب آئے تو اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔

بِوَرِقِكُمْ سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات غار میں آنے کے وقت اپنے ساتھ کچھ رقم روپیہ پیسہ بھی ساتھ لائے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ضروری نفقہ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے خلاف نہیں (بحر محیط)

اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا لفظ ازکیٰ کے لفظی معنی پاک صاف کے ہیں، مراد اس سے حسبِ تفسیر ابن جبیرؒ حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ جس زمانے میں یہ لوگ شہر سے نکلے تھے وہاں بتوں کے نام کا ذبیحہ ہوتا، اور وہی بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، اس لئے جانے والے کو یہ تاکید کی کہ اس کی تحقیق کر کے کھانا لائے کہ یہ کھانا حلال بھی ہے یا نہیں۔

مسئلہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا جس بازار ، ہوٹل میں اکثریت حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

يَرْجُمُوْكُمْ، رجم کے معنی سنگسار کرنے کے ہیں، بادشاہ نے غار میں جانے سے پہلے ان کو دھمکی دی تھی کہ اگر اپنا یہ دین نہ چھوڑو گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ان کے دین سے پھر جانے والے کی سزائے قتل بصورتِ سنگساری دی جاتی تھی تاکہ سب لوگ اس میں شریک ہوں، اور ساری قوم اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر کے قتل کرے۔

شاید شریعتِ اسلام میں شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا بھی جو سنگسار کر کے قتل کرنا تجویز کیا گیا ہے اس کا بھی منشاء یہ ہو کہ جس شخص نے حیاء کے سارے پردوں کو توڑ کر اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا ہے اس کا قتل منظرِ عام پر سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ ہونا چاہئے تاکہ اس کی رسوائی بھی پوری ہو، اور سب مسلمان عملاً اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں، تاکہ آئندہ قوم میں اس حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ، اس واقعہ میں جماعت اصحابِ کہف نے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا، اور رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر لائے، قرطبی نے

بحوالۂ ابن خویز منداؔ فرمایا کہ اس سے چند فقہی مسائل حاصل ہوئے ۔

چند مسائل اوّل یہ کہ مال میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ رقم سب کی مشترک تھی، دوسری یہ کہ مال میں وکالت جائز ہے، کہ مشترک مال میں کوئی ایک شخص بحیثیت وکیل دوسروں کی اجازت سے تصرفات کرے، تیسرے یہ کہ چند رفیق اگر کھانے میں شرکت رکھیں یہ جائز ہے، اگرچہ کھانے کی مقداریں عادۃً مختلف ہوتی ہیں، کوئی کم کھاتا ہے کوئی زیادہ ۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ

اور اسی طرح خبر ظاہر کردی ہم نے ان کی تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت

لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ

کے آنے میں دھوکہ نہیں، جب جھگڑ رہے تھے آپس میں اپنی بات پر پھر کہنے لگے بناؤ ان پر

بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ

ایک عمارت، اُن کا رب خوب جانتا ہے اُن کا حال، بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا ہم بنائیں گے

لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اُن کی جگہ پر عبادت خانہ ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ہم نے جس طرح اپنی قدرت سے ان کو سلایا اور جگایا) اسی طرح ہم نے (اپنی قدرت و حکمت سے اس زمانے کے) لوگوں کو ان (کے حال) پر مطلع کر دیا تاکہ (منجملہ اور فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ) وہ لوگ (اس واقعہ سے استدلال کرکے) اس بات کا یقین (یا زیادہ یقین) کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور وہ یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں (یہ لوگ اگر پہلے سے قیامت میں زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے تو زیادہ یقین اس واقعہ سے ہوگیا، اور اگر قیامت کے منکر تھے تو اب یقین حاصل ہوگیا، یہ واقعہ تو اصحاب کہف کی زندگی میں پیش آیا، پھر اُن صاحبوں نے وہیں غار میں وفات پائی، تو ان کے متعلق اہل عصر میں اختلاف ہوا جس کو آگے بیان فرمایا ہے کہ) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اس زمانے کے لوگ ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے،

(اور وہ معاملہ اس غار کا منہ بند کرنا تھا، تاکہ اُن کی لاشیں محفوظ رہیں، یا ان کی یادگار قائم کرنا مقصود تھا) سو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے (غار کے) پاس کوئی عمارت بنوا دو (پھر اختلاف ہوا کہ وہ عمارت کیا ہو، اس میں رائیں مختلف ہوئیں، تو اختلاف کے وقت) ان کا رب ان (کے احوالِ مختلفہ) کو خوب جانتا تھا (بالآخر) جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی اہلِ حکومت جو اس وقت دینِ حق پر قائم تھے) انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنا دیں گے (تاکہ مسجد اس بات کی بھی علامت رہے کہ یہ لوگ خود عابد تھے معبود نہ تھے اور دوسری عمارتوں میں یہ احتمال تھا کہ آگے آنے والے انہی کو معبود نہ بنالیں) ؏

معارف و مسائل

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ، اس آیت میں اصحابِ کہف کے راز کا اہلِ شہر پر منکشف ہو جانا اور اس کی حکمت، عقیدۂ آخرت و قیامت کہ سب مُردے دوبارہ زندہ ہوں گے اس پر ایمان و یقین حاصل ہونا بیان فرمایا ہے، تفسیر قرطبی میں اس کا مختصر قصہ اس طرح مذکور ہے کہ :-

اصحابِ کہف کا حال اہلِ شہر پر کھل جانا

اصحابِ کہف کے نکلنے کے وقت جو ظالم اور مشرک بادشاہ دقیانوس اس شہر پر مسلط تھا وہ مرگیا، اور اس پر صدیاں گذر گئیں، یہاں تک اس مملکت پر قبضہ اہلِ حق کا ہوگیا جو توحید پر یقین رکھتے تھے ان کا بادشاہ ایک نیک صالح آدمی تھا (جس کا نام تفسیر مظہری میں تاریخی روایات سے بیدوسیس لکھا ہے) اس کے زمانے میں اتفاقاً قیامت اور اس میں سب مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مسئلے میں کچھ اختلافات پھیل گئے، ایک فرقہ اس کا منکر ہوگیا کہ یہ بدن گلنے سڑنے، پھر ریزہ ریزہ ہو کر ساری دنیا میں پھیل جانے کے بعد پھر زندہ ہو جائیں گے، بادشاہِ وقت بیدوسیس کو اس کی فکر ہوئی کہ کس طرح ان کے شکوک و شبہات دُور کئے جائیں، جب کوئی تدبیر نہ بنی تو اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ سے دُعاء کی اور الحاح و زاری شروع کی، کہ یا اللہ آپ ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرما دیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو جائے اور یہ راہ پر آجائیں، اس طرف یہ بادشاہ گریہ و زاری اور دعاء میں مصروف تھا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی دعاء کی قبولیت کا یہ سامان کر دیا کہ اصحابِ کہف بیدار ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک آدمی کو (جس کا نام تملیخا بتلایا جاتا ہے) ان کے بازار میں بھیجدیا وہ کھانا خریدنے کے لئے دُکان پر پہونچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکّہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دُکاندار حیران رہ گیا، کہ یہ سکّہ کہاں سے آیا، کس زمانے کا ہے، بازار کے دوسرے دُکان داروں کو دکھلایا، سب نے یہ کہا کہ اس شخص کو کہیں پرانا

خزانہ ہاتھ آگیا ہے اس میں سے یہ سکہ نکال کر لایا ہے، اس نے انکار کیا کہ نہ مجھے کوئی خزانہ ملا، نہ کہیں سے لایا یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔

بازار والوں نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا، یہ بادشاہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ایک نیک صالح اللہ والا تھا، اور اس نے سلطنت کے پرانے خزانے کے آثار قدیمہ میں کہیں وہ تختی بھی دیکھی تھی جس میں اصحابِ کہف کے نام اور ان کے فرار ہو جانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا، بعض کے نزدیک خود ظالم بادشاہ دقیانوس نے یہ تختی لکھوائی تھی، کہ یہ اشتہاری مجرم ہیں، ان کے نام اور پتے محفوظ رہیں، جب کہیں ملیں گرفتار کر لئے جائیں، اور بعض روایات میں ہے کہ شاہی دفتر میں بعض ایسے مؤمن بھی تھے جو دل سے بت پرستی کو برا سمجھتے اور اصحاب کہف کو حق پر سمجھتے تھے، مگر ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی، انھوں نے یہ تختی بطور یادگار کے لکھ لی تھی، اسی تختی کا نام رقیم ہے جس کی وجہ سے اصحابِ کہف کو اصحابِ رقیم بھی کہا گیا۔

الغرض اس بادشاہ کو اس واقعہ کا کچھ علم تھا، اور اس وقت وہ اس دعاء میں مشغول تھا کہ کسی طرح لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ مُردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے کچھ بعید نہیں۔

اس لئے تملیخا سے اس کے حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہو گیا کہ یہ انہی لوگوں میں سے ہے اور اس نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے دعاء کیا کرتا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے ملا دے جو دقیانوس کے زمانے میں اپنا ایمان بچا کر بھاگے تھے؟ بادشاہ اس پر مسرور ہوا اور کہا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعاء قبول فرمائی، اس میں لوگوں کے لئے شاید کوئی ایسی حجت ہو جس سے ان کو حشرِ اجساد کا یقین آجائے، یہ کہہ کر اس شخص سے کہا کہ مجھے اس غار پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ بہت سے اہلِ شہر کے مجمع کے ساتھ غار پہونچا، جب غار قریب آیا تو تملیخا نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں میں جا کر اپنے ساتھیوں کو حقیقتِ معاملہ سے باخبر کر دوں کہ اب بادشاہ مسلمان موحّد ہے اور قوم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کے لئے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اطلاع سے پہلے آپ پہونچیں، تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھ آیا ہے، اس کے مطابق تملیخا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سنائے تو وہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے، بادشاہ کا استقبال تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے، اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے ساتھیوں کو یہ سارا قصہ سنایا، اسی وقت سب کی وفات ہو گئی، بادشاہ سے ملاقات نہیں ہو سکی، بحر محیط میں ابوحیان نے اس جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ ملاقات

کے بعد اہل غار نے بادشاہ اور اہلِ شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں اور غار کے اندر چلے گئے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دیدی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بہرحال اب اہلِ شہر کے سامنے یہ واقعہ عجیبہ قدرت آلہیہ کا واشگاف ہو کر آگیا تو سب کو یقین ہو گیا کہ جس ذات کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ تین سو برس تک زندہ انسانوں کو بغیر کسی غذا اور سامانِ زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصہ تک ان کو نیند میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، قوی، تندرست اٹھادے اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد بھی پھر ان اجسام کو زندہ کردے، اس واقعہ سے ان کے انکار کا سبب دور ہو گیا کہ حشر اجساد کو مستبعد اور خارج از قدرت سمجھتے تھے، اب معلوم ہوا کہ مالک الملکوت کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا خود جہالت ہے۔

اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا لِيَعْلَمُوٓا أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا، یعنی ہم نے اصحابِ کہف کو زمانۂ دراز تک سلانے کے بعد جگا کر بٹھادیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ یعنی قیامت میں سب مُردوں کے اجسام کو زندہ کرنے کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

اصحابِ کہف کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلافِ رائے

اصحابِ کہف کی بزرگی اور تقدس کے تو سب ہی قائل ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد سب کا خیال ہوا کہ غار کے پاس کوئی عمارت بطور یادگار کے بنائی جائے، عمارت کے بارے میں اختلافِ رائے ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ شہر میں اب بھی کچھ بُت پرست لوگ موجود تھے وہ بھی اصحابِ کہف کی زیارت کو آتے تھے، ان لوگوں نے عمارت بنانے میں یہ رائے دی کہ کوئی رفاہِ عام کی عمارت بنادی جائے، مگر اربابِ حکومت اور بادشاہ مسلمان تھے، اور انہی کا غلبہ تھا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنادی جائے جو یادگار بھی رہے اور آئندہ بُت پرستی سے بچانے کا سبب بھی بنے، یہاں اختلافِ رائے کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں قرآن کا یہ جملہ ہے رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ، یعنی ان کا رب ان کے حالات کو پوری طرح جانتا ہے۔

تفسیر بحر محیط میں اس جملے کے معنی میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، ایک یہ کہ یہ قول انہی حاضرین اہلِ شہر کا ہو، کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار بنانے کی رائے ہوئی تو جیسا عموماً یادگاری تعمیرات میں ان لوگوں کے نام اور خاص حالات کا کتبہ لگایا جاتا ہے جن کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے تو ان کے نسب اور حالات کے بارے میں مختلف گفتگوئیں ہونے لگیں، جب کسی حقیقت پر نہ پہونچے تو خود انھوں نے ہی آخر میں عاجز ہو کر کہہ دیا، رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ اور یہ کہہ کر اصل کام یعنی یادگار بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے، جو لوگ غالب تھے ان کی رائے مسجد بنانے کی ہو گئی۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، جس میں اس زمانے کے باہم جھگڑا اور اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہیں حقیقت کا علم نہیں، اور اس کے علم کے ذرائع بھی تمہارے پاس نہیں تو کیوں اس بحث میں وقت ضائع کرتے ہو، اور ممکن ہے کہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود وغیرہ جو اس واقعہ میں اسی طرح کی بے اصل باتیں اور بحثیں کیا کرتے تھے، ان کو تنبیہ مقصود ہو، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مسئلہ: اس واقعہ سے اتنا معلوم ہوا کہ اولیاء صلحاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنا دینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبور انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنا دینا ہے، جو باتفاق شرک و حرام ہے (مظہری)

سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ

اب یہی کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا اُن کا کُتا اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا

كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ

کُتا بدون نشانہ دیکھے پتھر چلانا، اور یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کُتا،

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۟ قف فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ

تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے اُن کی گنتی، اُن کی خبر نہیں رکھتے مگر تھوڑے لوگ، سو مت جھگڑ اُن کی بات میں

اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ ع

مگر سرسری جھگڑا، اور مت تحقیق کر اُن کا حال اُن میں کسی سے۔

خلاصۂ تفسیر

(جس وقت اصحاب کہف کا قصہ بیان کریں گے تو) بعضے لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے اور بعضے کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے (اور) یہ لوگ بے تحقیق بات کو ہانک رہے ہیں اور بعضے کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں اُن کا کتا ہے، آپ (ان اختلاف کرنے والوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے (کہ ان مختلف اقوال میں کوئی قول صحیح بھی ہے یا سب غلط ہیں) ان (کی تعداد) کو (صحیح صحیح) بہت کم لوگ

جانتے ہیں (اور چونکہ تعداد متعین کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لئے آیت میں کوئی صریح فیصلہ نہیں فرمایا، لیکن روایات میں حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا انا من القلیل کانوا سبعۃ یعنی میں بھی ان قلیل لوگوں میں داخل ہوں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ کم لوگ جانتے ہیں وہ سات تھے، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وغیرہ، اور آیت میں بھی اس قول کی صحت کا اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اس قول کو نقل کر کے اس کو رد نہیں فرمایا، بخلاف پہلے دونوں قول کے کہ ان کے تردید میں رجماً بالغیب فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم) سو اس پر بھی اگر وہ لوگ اختلاف سے باز نہ آویں تو آپ اس معاملہ میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے (یعنی مختصر طور پر تو ان کے خیالات کا رد قرآن کی آیات میں آہی چکا ہے جو رجماً بالغیب، قُلْ رَّبِّیٓ اَعْلَمُ سے بیان کر دیا گیا ہے، پس سرسری بحث یہی ہے کہ اس پر اکتفاء کریں، ان کے اعتراض کے جواب میں اس سے زیادہ مشغول ہونا اور اپنے دعوے کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ یہ بحث ہی کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی) اور آپ ان (اصحاب کہف) کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھئے (جس طرح آپ کو ان کے اعتراض وجواب میں زیادہ کاوش سے منع کیا گیا، اسی طرح اس کی بھی ممانعت فرمادی کہ اب اس معاملہ کے متعلق کسی سے سوال یا تحقیق کریں، کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آگئی غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شانِ انبیاء کے خلاف ہے)۔

معارف ومسائل

اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب

سَيَقُولُونَ، یعنی وہ لوگ کہیں گے، وہ کہنے والے کون لوگ ہیں، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ مراد ان سے وہی لوگ ہوں جن کا باہم اختلاف اصحاب کہف کے زمانے میں ان کے نام ونسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، انہی لوگوں میں سے بعض نے عدد کے متعلق پہلا، بعض نے دوسرا، بعض نے تیسرا قول اختیار کیا تھا۔ (ذکرہ فی البحر عن الماوردی)

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ سَيَقُولُونَ کی ضمیر نصاریٰ نجران کی طرف عائد ہو، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا، ان کے تین فرقے تھے ایک فرقہ ملکانیہ کے نام سے موسوم تھا، اس نے تعداد کے متعلق پہلا قول کہا، یعنی تین کا عدد بتلایا، دوسرا فرقہ یعقوبیہ تھا، اس نے دوسرا قول یعنی پانچ ہونا اختیار کیا، تیسرا فرقہ نسطوریہ تھا اس نے تیسرا قول کہا کہ سات تھے، اور بعض نے کہا کہ یہ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا، اور بالآخر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور قرآن کے اشارے سے تیسرے قول کا صحیح ہونا معلوم ہوا (بحر محیط)
وَّثَامِنُهُمْ ، یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس جگہ اصحابِ کہف کی تعداد میں تین قول نقل کئے گئے ہیں، تین، پانچ، سات، اور ہر ایک کے بعد ان کے کتے کو شمار کیا گیا ہے، لیکن پہلے دو قول میں ان کی تعداد اور کتے کے شمار میں واؤ عاطفہ نہیں لایا گیا، ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ اور خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ بلا واؤ عاطفہ کے آیا، اور تیسرے قول میں سَبْعَةٌ کے بعد واؤ عاطفہ کے ساتھ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ فرمایا۔

اس کی وجہ حضرات مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ عرب کے لوگوں میں عدد کی پہلی گرہ سات ہی ہوتی تھی، سات کے بعد جو عدد آئے وہ الگ سا شمار ہوتا تھا، جیسا کہ آجکل نو کا عدد اس کے قائم مقام ہے کہ نو تک اکائی ہے، دس سے دہائی شروع ہوتی ہے، ایک الگ سا عدد ہوتا ہے اسی لئے تین سے لے کر سات تک جو تعداد شمار کرتے تو اس میں واؤ عطف نہیں لاتے تھے سات کے بعد کوئی عدد بتلانا ہوتا تو واؤ عاطفہ کے ساتھ الگ کر کے بتلاتے تھے، اور اسی لئے اس واؤ کو واؤ ثمان کا لقب دیا جاتا تھا (مظہری وغیرہ)

اسماءِ اصحابِ کہف اصل بات تو یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے اصحابِ کہف کے نام صحیح صحیح ثابت نہیں، تفسیری اور تاریخی روایات میں نام مختلف بیان کئے گئے ہیں، ان میں اقرب وہ روایت ہے جس کو طبرانی نے معجم اوسط میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نام یہ تھے:۔

مُکْسَلْمِینَا، تَمْلِیْخَا، مَرْطُوْنُسْ، سنونس، سَارینونس، ذونواس، کعسططیونس

فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا ص وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ أَحَدًا ○ یعنی آپ اصحابِ کہف کی تعداد وغیرہ کے متعلق ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں کاوش نہ کریں، بلکہ سرسری بحث فرما دیں، اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس کے متعلق نہ کریں۔

اختلافی معاملات میں طویل بحثوں سے اجتناب کیا جائے ان دونوں جملوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ درحقیقت علماءِ امت کے لئے اہم رہنما اصول ہیں، کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے، اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث و تکرار میں وقت

کی اضاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جملے میں یہ دی گئی ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے قصہ اصحابِ کہف کی جتنی معلومات آپ کو دیدی گئی ہیں اُن پر قناعت فرمادیں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے یہ بھی اخلاقِ انبیاء کے خلاف ہے، اس لئے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کردیا گیا، یعنی تحقیقِ مزید کے لئے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لئے ہو۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ ز

اور نہ کہنا کسی کام کو کہ میں کروں گا کل ، مگر یہ کہ اللہ چاہے

وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیۡتَ وَقُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّهۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ

اور یاد کرلے اپنے رب کو جب بھول جائے اور کہہ امید ہو کہ میرا رب مجھ کو دکھلائے اس سے زیادہ

مِنۡ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوۡا فِیۡ كَهۡفِهِمۡ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیۡنَ

نزدیک راہ نیکی کی ، اور مدت گذری اُن پر اپنی کھوہ میں تین سو برس

وَازۡدَادُوۡا تِسۡعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ج لَهٗ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ

اور اُن کے اوپر نو ، تو کہہ اللہ خوب جانتا ہے جتنی مدت ان پر گذری اسی کے پاس ہیں چھپے

وَالۡاَرۡضِ ط اَبۡصِرۡ بِهٖ وَاَسۡمِعۡ ط مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِیٍّ ز

بھید آسمان اور زمین کے، کیا عجیب دیکھتا ہے اور سنتا ہے، کوئی نہیں بندوں پر اس کے سوائے مختار،

وَلَا یُشۡرِكُ فِیۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اور اگر لوگ آپ سے کوئی بات قابلِ جواب دریافت کریں اور آپ جواب کا وعدہ کریں تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ضرور ملا لیا کریں، بلکہ وعدہ کی بھی تخصیص نہیں، ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ) آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں

اس کو (مثلاً) کل کردوں گا مگر خدا کے چاہنے کو (اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہدیا کیجئے، اور آئندہ ایسا نہ ہو جیسا اس واقعہ میں پیش آیا کہ آپ سے لوگوں نے روح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوالات کئے، آپ نے بغیر انشاء اللہ کہے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ کرلیا، پھر پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی، اور آپ کو بڑا غم ہوا، اس ہدایت کے ساتھ ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی نازل ہوا (کذا فی اللباب عن ابن عباسؓ) اور جب آپ (اتفاقاً انشاء اللہ کہنا) بھول جاویں (اور پھر کبھی یاد آوے) تو (اسی وقت انشاء اللہ کہکر) اپنے رب کا ذکر کرلیا کیجئے اور (ان لوگوں سے یہ بھی) کہدیجئے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس (قصہ) سے بھی نزدیک تر بات بتلادے (مطلب یہ ہے کہ تم نے میری نبوت کا امتحان لینے کے لئے اصحاب کہف وغیرہ کے قصے دریافت کئے، جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے بتلا کر تمہارا اطمینان کردیا، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان قصوں کے سوال وجواب اثبات نبوت کے لئے کوئی بہت بڑی دلیل نہیں ہوسکتی، یہ کام تو کوئی غیر نبی بھی جو تاریخ عالم سے زیادہ واقف ہو وہ بھی کرسکتا ہے، مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کے اثبات کے لئے اس سے بھی بڑے قطعی دلائل اور معجزات عطا فرمائے ہیں، جن میں سب سے بڑی دلیل تو خود قرآن ہے، جس کی ایک آیت کی بھی ساری دنیا مل کر نقل نہیں اتار سکی۔

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے وہ واقعات بذریعہ وحی مجھے بتلا دیئے گئے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے بھی بہ نسبت واقعہ اصحاب کہف و ذوالقرنین کے زیادہ بعید ہیں، اور ان کا علم بھی کسی کے لئے بجز وحی کے ممکن نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ تم نے تو اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات کو سب سے زیادہ عجیب سمجھ کر اسی کو امتحان نبوت کے سوال میں پیش کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی زیادہ عجیب عجیب چیزوں کے علوم عطا فرمائے ہیں) اور (جیسا اختلاف ان لوگوں کا اصحاب کہف کے عدد میں ہے، ایسا ہی ان کے سوتے رہنے کی مدت میں بھی بہت اختلاف ہے، ہم اس میں صحیح بات بتلاتے ہیں کہ) وہ لوگ اپنے غار میں (نیند کی حالت میں) تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے (اور اگر اس صحیح بات کو سن کر بھی وہ اختلاف کرتے رہیں تو) آپ کہدیجئے کہ خدا تعالیٰ ان کے (سوتے رہنے کی مدت کو (تم سے) زیادہ جانتا ہے (اس لئے جو اس نے بتلا دیا وہی صحیح ہے اور اس واقعہ کی کیا تخصیص ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ) تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا کیسا کچھ سننے والا ہے ان کا خدا کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک (کیا) کرتا ہے (خلاصہ یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی مزاحم ہے نہ شریک، ایسی ذات عظیم کی مخالفت سے بہت ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر چار آیتوں پر قصۂ اصحاب کہف ختم ہو رہا ہے، ان میں سے پہلی دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ یا اقرار کرنا ہو تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ کا کلمہ ملا لیا کرو، کیونکہ آئندہ کا حال کس کو معلوم ہے کہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں، اور زندہ بھی رہا تو یہ کام کر سکے گا یا نہیں، اس لئے مؤمن کو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ دل میں بھی کرے اور زبان سے اس کا اقرار کرے کہ اگلے دن میں کسی کام کے کرنے کو کہے تو یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں یہ کام کل کروں گا، یہی معنی ہیں کلمۂ انشاء اللہ کے۔

تیسری آیت میں اس اختلافی بحث کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں زمانۂ اصحابِ کہف کے لوگوں کی رائیں بھی مختلف تھیں، اور موجودہ زمانے کے یہود و نصاریٰ کے اقوال بھی مختلف تھے یعنی غار میں سوتے رہنے کی مدت، اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ وہ تین سو نو سال تھے، گویا یہ اس اجمال کا بیان ہے جو شروع قصہ میں بیان ہوا تھا، فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا۔

اس کے بعد چوتھی آیت میں پھر اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقتِ حال کی تم کو خبر نہیں، اس کا جاننے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب غائبات کو جاننے والا سمیع و بصیر ہے، اس نے جو مدت تین سو نو سال کی تبلادی اس پر مطمئن ہو جانا چاہئے۔

آئندہ کام کرنے پر انشاء اللہ کہنا لباب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پہلی دو آیتوں کے شانِ نزول کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ جب اہلِ مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصۂ اصحابِ کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہے ہوئے کر لیا تھا، مقربین بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہوا کرتی ہے، اس لئے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا غم ہوا، اور مشرکینِ مکہ کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ملا، پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہدایت دینے کے لئے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو انشاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کر لیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے، ان دونوں آیتوں کو قصۂ اصحابِ کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں انشاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آئے اسی وقت کہہ لے

یہ حکم اس مخصوص معاملہ کے لئے ہے جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، یعنی محض تبرک اور اقرار عبدیت کے لئے یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے، کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاملات بیع و شراء اور معاہدات میں جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور شرط لگانا طرفین کے لئے معاہدہ کا مدار ہوتا ہے وہاں بھی اگر معاہدہ کے وقت کوئی شرط لگانا بھول جائے تو پھر کبھی جب یاد آجائے جو چاہے شرط لگالے، اس مسئلے میں بعض فقہاء کا اختلاف بھی ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

تیسری آیت میں جو غار میں سونے کی مدت تین سو نو سال بتلائے ہیں، ظاہر نسق قرآن سے یہی ہے کہ یہ بیانِ مدت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، ابن کثیر نے اسی کو جمہور مفسرین سلف و خلف کا قول قرار دیا ہے، ابو حیان اور قرطبی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر حضرت قتادہؓ وغیرہ سے اس میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول بھی انہی اختلاف کرنے والوں میں سے بعض کا قول ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول صرف وہ ہے جو بعد میں فرمایا یعنی اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، کیونکہ پہلا قول تین سو نو کے متعین کرنے کا اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے بعد اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہنے کا موقع نہ تھا، مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں، پہلے میں حقیقتِ واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدت کا بیان آگیا تو اب اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، وہی جاننے والا ہے، محض تخمینوں اور رایوں سے اس کی مخالفت بے عقلی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بیان مدت میں پہلے تین سو سال بیان کئے اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہوگئے، پہلے ہی تین سو نو نہیں فرمایا اس کا سبب حضرات مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہوگئے، ان دونوں سالوں کا امتیاز بتانے کے لئے عنوانِ تعبیر یہ اختیار کیا گیا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبوی کے اندر یہود و نصاریٰ میں دو باتیں زیر اختلاف تھیں ایک اصحاب کہف کی تعداد دوسری غار میں ان کے سوتے رہنے کی مدت، قرآن نے ان دونوں کو بیان تو کر دیا، مگر اس فرق کے ساتھ کہ تعداد کا بیان صریح الفاظ میں نہیں آیا، اشارے کے طور پر آیا، کہ جو قول صحیح تھا اس کی تردید نہیں کی، اور مدت کی تعیین کو صاف و صریح الفاظ میں بتلایا وَلَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ

سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا، وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اس اسلوب سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دینوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ مدت دراز تک خلاف عادتِ انسانی سوتے رہنا اور بغیر غذا کے صحیح تندرست رہنا پھر اتنے عرصہ کے بعد صحیح تندرست اور قوی اٹھ کر بیٹھ جانا ایک نظیر حشر و نشر کی ہے، اس سے مسئلہ قیامت و آخرت پر استدلال ہو سکتا ہے، اس لئے اس کو بصراحت بیان کر دیا۔

جو لوگ معجزات اور خوارقِ عادات کے یا منکر ہیں یا کم از کم آجکل کے مستشرقین یہود و نصاریٰ کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر ان میں تاویلیں کرنیکے خوگر ہو گئے ہیں انھوں نے اس آیت میں بھی حضرت قتادہ کی تفسیر کا سہارا لے کر تین سو نو سال کی مدت انہی لوگوں کا قول قرار دے کر رد کرنا چاہا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ قرآن کے ابتدائی جملے میں جو لفظ سِنِيْنَ عَدَدًا کا آیا ہے اس کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا قول نہیں کہا جا سکتا، خرقِ عادت اور کرامت کے ثبوت کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ سالہا سال کوئی سوتا رہے اور پھر صحیح، تندرست زندہ اٹھکر بیٹھ جائے، واللہ اعلم

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ

اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ

اور کہیں نہ پائے گا تو اس کے سوائے چھپنے کو جگہ، اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ

جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دوڑیں

عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ

تیری آنکھیں انکو چھوڑ کر تلاش میں رونقِ زندگانی دنیا کی، اور نہ کہا مان اس کا

اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے، اور پیچھے پڑا ہوا ہو اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہو حد پر نہ رہنا

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ

اور کہہ سچی بات ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے

فَلْيَكْفُرْ ۙ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِن

نہ مانے ہم نے تیار کر رکھی ہے گنہگاروں کے واسطے آگ، کہ گھیر رہی ہیں ان کو اس کی قناتیں، اور اگر

يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَآءٍ كَٱلْمُهْلِ يَشْوِى ٱلْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ ٱلشَّرَابُ

فریاد کریں گے تو ملے گا پانی جیسے پیپ بھون ڈالے منہ کو، کیا برا پینا ہے،

وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا ٱلصَّٰلِحَٰتِ إِنَّا

اور کیا برا آرام، بیشک جو لوگ یقین لائے اور کیں نیکیاں، ہم

لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ جَنَّٰتُ عَدْنٍ

نہیں کھوتے بدلہ اس کا جس نے بھلا کیا کام، ایسوں کے واسطے باغ ہیں بسنے کے

تَجْرِى مِن تَحْتِهِمُ ٱلْأَنْهَٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں پہنائے جائیں گے ان کو وہاں کنگن سونے کے،

وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٔينَ

اور پہنیں گے کپڑے سبز باریک اور گاڑھے ریشم کے تکیہ لگائے ہوئے

فِيهَا عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ ٱلثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

ان میں تختوں پر، کیا خوب بدلہ ہے اور کیا خوب آرام۔

خلاصۂ تفسیر

اور (آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ) آپ کے پاس جو آپ کے رب کی کتاب وحی کے ذریعہ آئی ہے وہ (لوگوں کے سامنے) پڑھ دیا کیجئے (اس سے زیادہ اس کی فکر میں نہ پڑیں کہ دنیا کے بڑے لوگ اگر اسلام کی مخالفت کرتے رہے تو دین کو ترقی کس طرح ہوگی، کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ فرما لیا ہے اور) اس کی باتوں کو (یعنی وعدوں کو) کوئی نہیں بدل سکتا (یعنی ساری دنیا کے مخالف بھی مل کر اللہ کو وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک سکتے اور اللہ تعالیٰ خود اگرچہ تبدیلی پر قدرت رکھتے ہیں مگر وہ تبدیل نہیں کریں گے) اور (اگر آپ نے ان بڑے لوگوں کی دل جوئی اس طرح کی جس سے احکام الٰہیہ ترک ہو جاویں تو پھر) آپ خدا کے سوا کوئی پناہ نہ پاویں گے (اگرچہ احکام الٰہیہ کا ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلائل شرعیہ محال ہے، یہاں مبالغہ اور تاکید

کے لئے بفرض محال یہ کہا گیا ہے) اور (جیسا کہ کفار کے امیروں اور رئیسوں سے آپ کو مستغنی رہنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح فقراء مسلمین کے حال پر مزید توجہ کا آپ کو حکم ہے پس) آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھنے میں) مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام (یعنی علی الدّوام) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں (کوئی غرض دنیوی نہیں) اور (دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پاویں (رونقِ دنیا کے خیال سے مراد یہ ہے کہ رئیس لوگ مسلمان ہوجاویں تو اسلام کی رونق بڑھے گی، اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ اسلام کی رونق مال و متاع سے نہیں بلکہ اخلاص و اطاعت سے ہے وہ غریب فقیر لوگوں میں ہو تو بھی رونق اسلام کی بڑھے گی) اور ایسے شخص کا کہنا (غریبوں کو مجلس سے ہٹا دینے کے متعلق) نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے (اس کے عناد کی سزا میں) اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال (یعنی اتباعِ ہویٰ) حد سے گذر گیا ہے اور آپ (ان رؤسائے کفار سے صاف) کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے (ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں، بلکہ نفع نقصان خود اس کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی (یعنی وہ قناتیں بھی آگ ہی کی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ اس گھیرے سے نہ نکل سکیں گے) اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جاوے گی جو (مکروہ صورت ہونے میں تو) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا (اور تیز گرم ایسا ہوگا کہ پاس لاتے ہی) مونہوں کو بھون ڈالے گا (یہاں تک کہ چہرے کی کھال اُتر کر گر پڑے گی جیسا کہ حدیث میں ہے) کیا ہی بُرا پانی ہوگا اور وہ دوزخ بھی کیا ہی بُری جگہ ہوگی (یہ تو ایمان نہ لانے کا ضرر ہوا اور ایمان لانے کا نفع یہ ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح کام کو کرے، ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ان کے (مساکن کے نیچے) نہریں بہتی ہوں گی ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے (اور) وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا صلہ ہے اور (جنّت) کیا ہی اچھی جگہ ہے ؂

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے خاص آداب

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ، اس آیت کے شانِ نزول میں چند واقعات مذکور ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ سب ہی اس ارشاد کا سبب بنے ہوں، بغوی نے نقل کیا ہے کہ

عُیَینہ بن حصن فزاری مکہ کا رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جو فقراء صحابہ میں سے تھے، ان کا لباس خستہ اور ہیئت فقیرانہ تھی، اور بھی اسی طرح کے کچھ فقراء غرباء مجمع میں تھے، عُیَینہ نے کہا کہ ہمیں آپ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے سے یہی لوگ مانع ہیں، ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپ ان کو اپنی مجلس سے ہٹا دیں، یا کم از کم ہمارے لئے علیحدہ مجلس بنا دیں اور ان کے لئے الگ۔

ابن مردویہ نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ امیہ بن خلف جمحی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ غریب فقیر شکستہ حال مسلمانوں کو آپ اپنے قریب نہ رکھیں، بلکہ مکہ اور قریش کے سرداروں کو ساتھ لگائیں، یہ لوگ آپ کا دین قبول کرلیں گے تو دین کو ترقی ہوگی۔

اس طرح کے واقعات پر یہ ارشاد ربانی نازل ہوا جس میں اُن کا مشورہ قبول کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا، اور صرف یہی نہیں کہ ان کو اپنی مجلس سے ہٹائیں نہیں، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ، یعنی آپ اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ باندھ کر رکھیں، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی وقت جدا نہ ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رہیں، معاملات میں انہی سے مشورہ لیں، انہی کی امداد و اعانت سے کام کریں، اور اس کی وجہ اور حکمت ان الفاظ سے بتلا دی گئی کہ یہ لوگ صبح شام یعنی ہر حال میں اللہ کو پکارتے اور اسی کا ذکر کرتے ہیں، ان کا جو عمل ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہے، اور یہ سب حالات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کو کھینچتے ہیں، اللہ کی مدد ایسے ہی لوگوں کے لئے آیا کرتی ہے، چند روز کی کس مپرسی سے گھبرائیں نہیں، انجام کار فتح و نصرت انہی کو حاصل ہوگی۔

اور رؤسا قریش کا مشورہ قبول کرنے کی ممانعت کیوجہ بھی آخر آیات میں یہ بتلائی کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان کے سب کام اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہیں، اور یہ حالات اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت سے ان کو دُور کرنے والے ہیں۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ مشورہ تو قابل عمل تھا کہ ان کے لئے ایک مجلس علیحدہ کردی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہونچانے میں اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں سہولت ہوتی، مگر اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہو سکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصول دعوت و تبلیغ یہی قرار دیدیا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہئے، واللہ اعلم

اہل جنت کے لئے زیور | يُحَلَّوْنَ فِيهَا، اس آیت میں اہل جنت مردوں کو بھی سونے کے کنگن پہنانے کا ذکر ہے، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لئے نہ زیبا ہے، نہ کوئی

جمال اور زینت، جنت میں اگر ان کو کنگن پہنائے گئے تو وہ ان کو بدہیئت کر دیں گے۔

جواب یہ ہے کہ زینت و جمال عرف و رواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت و جمال سمجھی جاتی ہے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابلِ نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے دوسرے زمانے میں وہ عیب ہوجاتا ہے، جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت و جمال قرار دیے جائیں گے تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے، کہ یہاں مردوں کو سونے کا کوئی زیور یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی سونے کی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں، جنت کا یہ قانون ہوگا وہ اس سارے جہان سے الگ ایک عالم ہے اس کو اس بناء پر کسی چیز میں بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ

اور بتلا ان کو مثل دو مردوں کی کر دیئے ہم نے ان میں سے ایک کیلئے دو باغ انگور کے

وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ

اور گرد ان کے کھجوریں اور رکھی دونوں کے بیچ میں کھیتی، دونوں باغ لاتے ہیں اپنا

أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَكَانَ

میوہ اور نہیں گھٹاتے اس میں سے کچھ اور بہادی ہم نے ان دونوں کے بیچ نہر، اور ملا

لَهُ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَ

اس کو پھل پھر بولا اپنے ساتھی سے جب باتیں کرنے لگا اس سے میرے پاس زیادہ ہے تجھ سے مال اور

أَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ

آبرو کے لوگ، اور گیا اپنے باغ میں اور وہ بُرا کر رہا تھا اپنی جان پر، بولا نہیں آتا مجھکو خیال

أَنْ تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ

کہ خراب ہووے یہ باغ کبھی، اور نہیں خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہونیوالی ہے، اور اگر کبھی

رُّدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ

پہنچا دیا گیا میں اپنے رب کے پاس پاؤں گا بہتر اس سے وہاں پہنچ کر، کہا اس کو دوسرے نے

وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ

جب بات کرنے لگا کیا تو منکر ہو گیا اس سے جس نے پیدا کیا تجھ کو مٹی سے پھر قطرہ سے

ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

پھر پورا کر دیا تجھ کو مرد، پھر میں تو یہی کہتا ہوں وہی اللہ ہے میرا رب، اور نہیں مانتا شریک اپنے رب کا کسی کو

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ

اور جب تو آیا تھا اپنے باغ میں کیوں نہ کہا تو نے جو چاہے اللہ سو ہو، طاقت نہیں مگر جو دے اللہ

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ

اگر تو دیکھتا ہے مجھ کو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں، تو امید ہے کہ میرا رب دیوے مجھ کو

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ

تیرے باغ سے بہتر اور بھیج دے اس پر لُو کا ایک جھونکا آسمان سے پھر صبح کو رہ جاوے

صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

میدان صاف، یا صبح کو ہو رہے اس کا پانی خشک پھر نہ لا سکے تو اس کو ڈھونڈھ کر،

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰي مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ

اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور وہ گرا پڑا تھا

عَلٰي عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ

اپنی چھتریوں پر اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا اگر میں شریک نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو، اور نہ ہوئی

تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوائے اور نہ ہوا وہ کہ خود بدلہ لے سکے،

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

یہاں سب اختیار ہے اللہ سچے کا، اسی کا انعام بہتر ہے اور اچھا ہے اسی کا دیا ہوا بدلہ۔

۵ ع ۱۳ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور آپ (دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری ظاہر کرنے کے لئے) دو شخصوں کا حال (جن میں باہم دوستی یا قرابت کا تعلق تھا) بیان کیجئے (تاکہ کفار کا خیال باطل ہو جائے اور مسلمانوں کو تسلی ہو) ان دو شخصوں میں سے ایک کو (جو کہ بد دین تھا) ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے اور دونوں (باغوں) کا کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان میں کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور) دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے، اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی (بخلاف عام باغوں کے کہ کبھی کسی درخت میں اور کسی سال پورے باغ میں پھل کم آتا ہے) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس اور بھی مال داری کا سامان تھا سو (ایک دن) اپنے اس (دوسرے) ساتھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور مجمع بھی میرا زبردست ہے (مطلب یہ تھا کہ تو میرے طریقے کو باطل اور اللہ کے نزدیک ناپسند کہتا ہے تو اب تو دیکھ لے کہ کون اچھا ہے، اگر تیرا دعویٰ صحیح ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا، کیونکہ دشمن کو کوئی نوازا نہیں کرتا اور دوست کو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا) اور وہ (اپنے اس ساتھی کو ساتھ لے کر) اپنے اوپر جرم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہونچا، (اور) کہنے لگا کہ میرا تو خیال نہیں ہے کہ یہ باغ (میری زندگی میں) کبھی بھی برباد ہوگا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے وجود اور ہر چیز پر اس کی قدرت کا قائل نہ تھا، بس ظاہری سامانِ حفاظت کو دیکھ کر اس نے یہ گفتگو کی) اور (اسی طرح) میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آوے گی اور اگر (بفرضِ محال قیامت آ بھی گئی اور) میں اپنے رب کے پاس پہونچایا گیا (جیسا تیرا عقیدہ ہے) تو ضرور اس باغ سے بھی بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی (کیونکہ جنّت کی جگہوں کا دنیا سے اچھا اور بہتر ہونے کا تو تجھے بھی اقرار ہے، اور یہ بھی تجھے تسلیم ہے کہ جنّت اللہ کے مقبول بندوں کو ملے گی، میری مقبولیت کے آثار و علامات تو دنیا ہی میں دیکھ رہا ہے اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو باغات کیوں ملتے، اس لئے تمہارے اقرار و تسلیم کے مطابق بھی مجھے وہاں یہاں سے اچھے باغ ملیں گے) اس (کی یہ باتیں سنکر اس) سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار مگر غریب آدمی تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو (توحید اور قیامت سے انکار کرکے) اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھکو (اوّل) مٹی سے (جو کہ تیرا مادہ بعیدہ ہے بواسطہ آدم علیہ السلام کے) پیدا کیا پھر (تجھ کو) نطفہ سے (جو کہ تیرا مادۂ قریبہ ہے رحم مادر میں بنایا) پھر تجھ کو صحیح سالم آدمی بنایا (اس کے باوجود تو توحید اور قیامت سے انکار اور کفر کرتا ہے تو کیا کر) لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ (یعنی) اللہ تعالیٰ میرا رب

(حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا اور (جب اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ ہر چیز پر ثابت ہے، اور اس کے نتیجہ میں یہ کچھ بعید نہیں کہ باغ کی ترقی اور حفاظت کے تیرے سارے اسباب و سامان کسی وقت بھی بیکار اور معطل ہو جائیں اور باغ برباد ہو جائے، اس لئے تجھے لازم تھا کہ مسبب الاسباب پر نظر کرتا) تو تو جس وقت اپنے باغ میں پہونچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے (اور) بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں (جبتک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ باغ قائم رہے گا اور جب چاہے گا ویران ہو جائے گا) اگر تو مجھ کو مال و اولاد میں کمتر دیکھتا ہے (اس سے تجھ کو اپنے مقبول ہونے کا شبہ پڑ گیا ہے) تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دیدے (خواہ دنیا ہی میں یا آخرت میں) اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے (یعنی بلا واسطہ اسباب طبعیہ کے) بھیج دے جس سے وہ باغ دفعۃً ایک صاف (چٹیل) میدان ہو کر رہ جائے یا اس سے اس کا پانی (جو نہر میں جاری ہے) بالکل اندر (زمین میں) اُتر (کر خشک ہو) جائے پھر تو اس (کے دوبارہ لانے اور نکالنے) کی کوشش بھی نہ کر سکے (یہاں اس دیندار ساتھی نے اس بے دین کے باغ کا تو جواب دیدیا، مگر اولاد کے متعلق کچھ جواب نہیں دیا، شاید وجہ یہ ہے کہ اولاد کی کثرت جبھی بھلی معلوم ہوتی ہے جب اس کی پرورش کے لئے مال موجود ہو ورنہ وہ اُلٹا وبال جان بنجاتی ہے، حاصل اس کلام کا یہ ہوا کہ تیرے بدعقیدہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ تجھو دنیا میں اللہ نے دولت دیدی اسکو تو نے اپنی مقبولیت کی علامت سمجھ لیا، اور میرے پاس دولت نہ ہونے سے مجھ کو غیر مقبول سمجھ لیا، تو دنیا کی دولت و ثروت کو مقبولیت عند اللہ کا مدار سمجھ لینا ہی بڑا دھوکا اور غلطی ہے، دنیا کی نعمتیں تو رب العالمین سانپوں بچھوؤں اور بھیڑیوں اور بدکاروں سبھی کو دیتے ہیں، اصل مدار مقبولیت کا آخرت کی نعمتوں پر ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں سب زوال پذیر ہیں) اور (اس گفتگو کے بعد واقعہ یہ پیش آیا کہ) اس شخص کے سامان کو تو آفت نے آگھیرا، پس اس نے جو کچھ باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا، اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا (اس سے معلوم ہوا کہ باغ پر آفت آنے سے وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ وبال کفر و شرک کے سبب سے آیا ہے، اگر کفر نہ کرتا تو اول تو یہ آفت ہی شاید نہ آتی، اور آ بھی جاتی تو اس کا بدلہ آخرت میں ملتا، اب دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے، مگر صرف اتنی حسرت و افسوس سے اس کا ایمان ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حسرت و ندامت تو دنیا کے نقصان کے وجہ سے ہوئی، آگے اللہ کی توحید اور قیامت کا اقرار جب تک ثابت نہ ہو اس کو مؤمن نہیں کہہ سکتے) اور اس کے پاس ایسا کوئی مجمع نہ ہوا جو خدا کے سوا اسکی

مدد کرتا) اس کو اپنے مجمع اور اولاد پر ناز تھا وہ بھی ختم ہوا) اور نہ وہ خود (ہم سے) بدلہ لے سکا، ایسے موقع پر مدد کرنا تو اللہ برحق ہی کا کام ہے (اور آخرت میں بھی) اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور (دنیا میں بھی) اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے (یعنی مقبولین کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو دونوں جہان میں اس کا ثمرہ نیک ملتا ہے بخلاف کافر کے کہ بالکل خسارہ میں رہ گیا)۔

معارف و مسائل

وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ لفظ ثمر درختوں کے پھل کو بھی کہا جاتا ہے، اور مطلق مال وزر کو بھی، اس جگہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ سے یہی دوسرے معنی منقول ہیں (ابن کثیر) قاموس میں ہے کہ لفظ ثمرہ درخت کے پھل اور انواعِ مال وزر سب کو کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس صرف باغات اور کھیت ہی نہیں بلکہ سونا چاندی اور تمام اسبابِ عیش دوسرے بھی موجود تھے، خود اس کے الفاظ میں جو قرآن نے نقل کئے اس میں اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں (ابن کثیر)

مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، شعب الایمان میں حضرت انسؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز دیکھے اور وہ اس کو پسند آئے تو اگر اس نے یہ کلمہ کہہ لیا مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، تو اس کو کوئی چیز نقصان نہ پہونچائے گی (یعنی وہ پسندیدہ محبوب چیز محفوظ رہے گی) اور بعض روایات میں ہے کہ جس نے کسی محبوب و پسندیدہ چیز کو دیکھ کر یہ کلمہ پڑھ لیا تو اس کو نظر بد نہ لگے گی۔

حُسْبَانًا اس لفظ کی تفسیر حضرت قتادہؒ نے مطلق عذاب سے کی ہے، اور ابن عباسؓ نے آگ سے اور بعض نے پتھراؤ سے، اس کے بعد جو قرآن میں آیا ہے اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اس میں ظاہر یہ ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال وزر اور سامانِ عیش پر کوئی بڑی آفت آپڑی، جس نے سب کو برباد کر دیا، قرآن نے صراحۃً کسی خاص آفت کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی، جس نے سب کو جلا دیا، جیسا کہ لفظ حُسْبَانٌ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی آگ منقول ہے، واللہ اعلم

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ

اور بتلا دے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ

پھر رلا ملا نکلا اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہواییں اڑتا ہوا، اور اللہ

اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ

کو ہے ہر چیز پر قدرت ، مال اور بیٹے رونق ہیں دنیا کی زندگی میں

الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ

اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے

اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ

توقع ، اور جس دن ہم چلائیں پہاڑ اور تو دیکھے زمین کو کھلی ہوئی اور گھیر بلائیں ہم انکو

فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ

پھر نہ چھوڑیں ان میں سے ایک کو ، اور سامنے آئیں تیرے رب کے صف باندھ کر، آ پہنچے

جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ

تم ہمارے پاس جیسا کہ ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار، نہیں، تم تو کہتے تھے کہ نہ مقرر کریں گے ہم

مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا

تمہارے لئے کوئی وعدہ ، اور رکھا جائے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گنہگاروں کو ڈرتے ہیں اس سے

فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ

جو اس میں لکھا ہے ، اور کہتے ہیں ہائے خرابی کیسا ہے یہ کاغذ نہیں چھوٹی اس سے چھوٹی بات اور

لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ

نہ بڑی بات جو اس میں نہیں آ گئی ، اور پائیں گے جو کچھ کیا ہے سامنے ، اور تیرا رب

رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

ظلم نہ کرے گا کسی پر ۔

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلے دنیوی زندگی اور اس کے سامان کی ناپائیداری ایک شخصی اور جزوی مثال سے بیان فرمائی تھی، اب یہی مضمون عام اور کلی مثال سے واضح کیا جاتا ہے) اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو پھر اس (پانی سے) زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی ہوں پھر وہ (بعد اس کے کہ سرسبز و تر و تازہ تھی خشک ہوکر) ریزہ ریزہ ہوجائے کہ اس کو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو (یہی حال دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آتی ہے کل اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (جب چاہیں ایجاد کریں ترقی دیں اور جب چاہیں فنا کردیں اور جب اس حیاتِ دنیا کا یہ حال ہے اور) مال و اولاد حیات دنیا کی ایک رونق (اور اس کے توابع میں سے) ہے (تو خود مال و اولاد تو اور بھی زیادہ سریع الزوال ہے) اور جو اعمالِ صالحہ (ہمیشہ ہمیشہ کو) باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک (یعنی آخرت میں اس دنیا سے) ثواب کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے (یعنی اعمالِ صالحہ سے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں ضرور پوری ہوں گی، اور اس کی امید سے بھی زیادہ ثواب ملے گا، بخلاف متاعِ دنیا کے کہ اس سے دنیا میں بھی انسانی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، اور آخرت میں تو کوئی احتمال ہی نہیں) اور اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ہٹا دیں گے (یہ ابتداء میں ہوگا پھر وہ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے) اور (آپ زمین کو دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے (کیونکہ پہاڑ، درخت، مکان کچھ باقی نہ رہے گا) اور ہم ان سب کو (قبروں سے اٹھا کر میدان حساب میں) جمع کردیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہ وہاں نہ لایا جائے) اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو (یعنی موقف حساب میں) برابر کھڑے کرکے پیش کئے جائیں گے (یہ احتمال نہ رہے گا کہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ جائے اور ان میں جو قیامت کا انکار کرتے تھے ان سے کہا جائے گا کہ) دیکھو آخر تم ہمارے پاس (دوبارہ پیدا ہوکر) آئے بھی جیسا ہم نے تم کو پہلی بار (یعنی دنیا میں) پیدا کیا تھا (مگر تم پہلی پیدائش کا مشاہدہ کرلینے کے باوجود اس دوسری پیدائش کے قائل نہ ہوئے) بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے کوئی وقت موعود نہ لائیں گے اور نامۂ عمل (خواہ داہنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں دیکر اس کے سامنے کھلا ہوا) رکھ دیا جائے گا (جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا) تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہوگا (اسکو دیکھکر)

اس سے (یعنی اس کی سزا سے) ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامۂ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا (کہ نہ کیا ہوا گناہ لکھ لے یا کی ہوئی نیکی جو شرائط کے ساتھ کی جائے اس کو نہ لکھے)۔

معارف و مسائل

وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ، مسند احمد، ابن حبان اور حاکم نے بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ جمع کیا کرو، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا سُبْحَانَ اللّٰهِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنا، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور عقیلی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ، یہی باقیات صالحات ہیں، یہی مضمون طبرانی نے بروایت حضرت سعد بن عبادہ بھی روایت کیا ہے، اور صحیح مسلم و ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمہ یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ میرے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، یعنی سارے جہان سے۔

اور حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ بکثرت پڑھا کرو کیونکہ یہ ننانوے باب بیماری اور تکلیف کے دُور کر دیتا ہے، جن میں سب سے کم درجہ کی تکلیف ہَمّ یعنی فکر و غم ہے۔

اسی لئے اس آیت میں لفظ "باقیات صالحات" کی تفسیر حضرت ابن عباس، عکرمہ، مجاہد نے یہی کی ہے کہ مراد اس سے یہی کلمات پڑھنا ہے، اور سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم نے فرمایا کہ باقیات صالحات سے پانچ نمازیں مراد ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آیت میں باقیات صالحات سے مراد مطلق اعمال صالحہ ہیں جن میں یہ کلمات مذکورہ بھی داخل ہیں، پانچوں نمازیں بھی اور دوسرے تمام نیک اعمال بھی، حضرت قتادہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے (مظہری)

الفاظِ قرآن کے مطابق بھی یہی ہے کیونکہ ان الفاظ کا لفظی مفہوم وہ اعمالِ صالحہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اعمالِ صالحہ سب ہی اللہ کے نزدیک باقی اور قائم ہیں ابن جریر طبری اور قرطبی نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ کھیتی دو قسم کی ہوتی ہے، دنیا کی کھیتی تو مال و اولاد ہے، اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات ہیں، حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ باقیات صالحات انسان کی نیت اور ارادہ ہیں کہ اعمال صالحہ کی قبولیت اس پر موقوف ہے۔

اور عبیدابن عمر نے فرمایا کہ باقیات صالحات نیک لڑکیاں ہیں کہ وہ اپنے والدین کے لئے سب سے بڑا ذخیرۂ ثواب ہیں، اس پر حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیدیا گیا، تو اس کی نیک لڑکیاں اس کو چمٹ گئیں اور رونے اور شور کرنے لگیں، اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ انھوں نے دنیا میں ہم پر بڑا احسان کیا، اور ہماری تربیت میں محنت اٹھائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرما کر بخش دیا (قرطبی)

لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ، قیامت کے دن سب کو خطاب ہوگا کہ آج تم اسی طرح خالی ہاتھ بغیر کسی ساز و سامان کے ہمارے سامنے آئے ہو، جیسا تمہیں اوّل پیدائش کے وقت پیدا کیا تھا، بخاری، مسلم، ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے لوگو! تم قیامت میں اپنے رب کے سامنے ننگے پاؤں ننگے بدن پیدل چلتے ہوئے آؤ گے، اور سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے، یہ سن کر حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا سب مرد و عورت ننگے ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کہ اس روز ہر ایک کو ایسا شغل اور ایسی فکر گھیرے رہے گی کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے گا، سب کی نظریں اوپر اٹھی ہوئی ہوں گی۔

قرطبی نے فرمایا کہ ایک حدیث میں جو آیا ہے کہ مُردے برزخ میں ایک دوسرے سے اپنے کفنوں میں ملبوس ہو کر ملاقات کریں گے، وہ اس حدیث کے منافی نہیں، کیونکہ وہ معاملہ قبر اور برزخ کا ہے یہ میدان حشر کا، اور بعض روایاتِ حدیث میں جو یہ منقول ہے کہ میّت اپنے اسی لباس میں میدانِ حشر میں اٹھے گا جس میں اس کو دفن کیا گیا تھا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے مُردوں کے کفن اچھے بنایا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز اسی کفن میں اٹھیں گے، اس کو بعض حضرات نے شہیدوں پر محمول کیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ محشر میں بعض لوگ ملبوس اٹھیں اور بعض ننگے، اس طرح دونوں قسم کی روایات جمع ہو جاتی ہیں (مظہری)

جزاء عین عمل ہے | وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا، یعنی سب اہلِ محشر اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر پائیں گے، اس کا مفہوم عام طور پر حضرات مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنے

کئے ہوئے اعمال کی جزاء کو حاضر و موجود پائیں گے، ہمارے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور کشمیریؒ فرماتے تھے کہ اس تاویل کی ضرورت نہیں، روایات حدیث بے شمار اس پر شاہد ہیں، کہ یہی اعمال دنیا و آخرت کی جزاء و سزا بن جائیں گے، ان کی شکلیں وہاں بدل جائیں گی، نیک اعمال جنت کی نعمتوں کی شکل اختیار کرلیں گے اور بُرے اعمال جہنم کی آگ اور سانپ و بچھو بن جائیں گے۔

احادیث میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کا مال قبر میں ایک بڑے سانپ کی شکل میں آ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا انا مالک (میں تیرا مال ہوں)، نیک عمل ایک حسین انسان کی شکل میں انسان کو قبر کی تنہائی میں کچھ وحشت دور کرنے کے لئے انس دلانے آئے گا، قربانی کے جانور پُل صراط کی سواری بنیں گے، انسان کے گناہ محشر میں بوجھ کی شکل میں ہر ایک کے سر پر لاد دیئے جائیں گے۔

قرآن میں یتیموں کے مال کو ناحق کھانے کے بارے میں ہے اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا "یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں" ان تمام آیات و روایات کو عموماً مجاز پر محمول کیا جاتا ہے، اور اگر اس تحقیق کو لیا جائے تو ان میں کسی جگہ مجاز کی ضرورت نہیں رہتی، سب اپنی حقیقت پر رہتی ہیں۔

قرآن نے یتیم کے ناجائز مال کو آگ فرمایا، تو حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی آگ ہی ہے، مگر اس کے آثار محسوس کرنے کے لئے اس دنیا سے گذر جانا شرط ہے، جیسے کوئی دیا سلائی کے بکس کو آگ کہے تو صحیح ہے مگر اس کے آگ ہونے کے لئے رگڑ کی شرط ہے، اسی طرح کوئی پیٹرول کو آگ کہے تو صحیح سمجھا جائے گا اگرچہ اس کے لئے ذرا سی آگ سے اتصال شرط ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ انسان جو کچھ نیک یا بد عمل دنیا میں کرتا ہے یہ عمل ہی آخرت میں جزاء و سزا کی شکل اختیار کرے گا، اس وقت اس کے آثار و علامات اس دنیا سے الگ دوسرے ہو جاویں گے۔ واللہ اعلم

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس، تھا جن کی

الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ

قسم سے سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے، سو کیا اب تم ٹھہراتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق

مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ

میرے سوائے اور وہ تمہارے دشمن ہیں برا ہاتھ لگا بے انصافوں کے بدلہ، دکھلا نہیں لیا تھا میں نے

خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ

ان کو بنانا آسمان اور زمین کا اور نہ بنانا خود ان کا ، اور میں وہ نہیں کہ بناؤں

الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ

بہکانے والوں کو اپنا مددگار ، اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے شریکوں کو جن کو تم

زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

مانتے تھے پھر پکاریں گے سو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور کر دیں گے ہم انکے اور انکے بیچ مرنے کی جگہ

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا

اور دیکھیں گے گنہگار آگ کو پھر سمجھ لیں گے کہ ان کو پڑنا ہے اس میں اور نہ بدل سکیں گے اس سے

مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ ع وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ

رستہ ، اور بیشک پھیر پھیر کر سمجھائی ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر ایک مثل ،

ع ۱۹

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا

اور ہے انسان سب چیز سے زیادہ جھگڑالو ، اور لوگوں کو جو روکا اس بات سے کہ یقین لے آئیں

اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ

جب پہنچی ان کو ہدایت اور گناہ بخشوائیں اپنے رب سے سو اسی انتظار نے کہ پہنچے ان پر رسم پہلوں

الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ

کی یا آکھڑا ہو اُن پر عذاب سامنے کا ، اور ہم جو رسول بھیجتے ہیں سو

اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ

خوشخبری اور ڈر سنانے کو ، اور جھگڑا کرتے ہیں کافر جھوٹا جھگڑا ،

لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

کہ ٹلادیں اس سے سچی بات کو اور ٹھہرالیا انھوں نے میرے کلام کو اور جو ڈر سنا دیئے گئے ٹھٹھا ،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا

اور اس سے زیادہ ظالم کون جسکو سمجھایا گیا اس کے رب کے کلام سے پھر منہ پھیر لیا اس کی طرف سے اور بھول گیا جو

قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ	
کچھ آگے بھیج چکے ہیں اس کے ہاتھ، ہم نے ڈال دیئے ہیں اُن کے دلوں پر پردے کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے	
اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا	
کانوں میں ہے بوجھ، اور اگر تو ان کو بلائے راہ پر تو ہرگز نہ آئیں راہ پر اس وقت	
اَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا	
کبھی، اور تیرا رب بڑا بخشنے والا ہے رحمت والا اگر ان کو پکڑے ان کے کئے	
كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ	
پر تو جلد ڈالے اُن پر عذاب، پر اُن کے لئے ایک وعدہ ہے کہیں نہ پائیں گے	
دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ	
اس سے ورے سرک جانے کی جگہ، اور یہ سب بستیاں ہیں جنکو ہم نے غارت کیا جب وہ ظالم ہو گئے اور	
جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝	
مقرر کیا تھا ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وعدہ۔	

ع ۸ / ۲۰

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنّات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا، (کیونکہ جنّات کا عنصر غالب جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں آگ ہے، اور عنصر نار کا مقتضا پابند نہ رہنا ہے، مگر اس اقتضائے عنصری کی وجہ سے ابلیس معذور نہ سمجھا جائیگا کیونکہ اس تقاضائے عنصری کو خدا کے خوف سے مغلوب کیا جا سکتا تھا) تو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کی ذرّیت (اولاد اور توابع) کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر (یعنی میری اطاعت چھوڑ کر اس کے کہنے پر چلتے ہو) حالانکہ وہ (ابلیس اور اس کی جماعت) تمھارے دشمن ہیں (کہ ہر وقت تمھیں ضرر پہونچانے کی فکر میں رہتے ہیں) یہ (ابلیس اور اس کی ذریت کی دوستی) ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے (بدل اس لئے کہا کہ دوست تو بنانا چاہئے تھا مجھے، لیکن انھوں نے میرے بدلے شیطان کو دوست بنالیا، بلکہ دوست ہی نہیں اس کو خدائی کا شریک

بھی مان لیا حالانکہ) یعنی اُن کو نہ تو آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت (اپنی مدد یا مشورے کے لئے بلایا) اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت (بلایا یعنی ایک کے پیدا کرنے کے وقت دوسرے کو نہیں بلایا) اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ (کسی کو بالخصوص) گمراہ کرنے والوں کو (یعنی شیاطین کو) اپنا (دست و) بازو بناتا (یعنی مدد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو خود قادر نہ ہو) اور (تم یہاں ان کو شریکِ خدائی سمجھتے ہو قیامت میں حقیقت معلوم ہوگی) اس دن کو یاد کرو کہ حق تعالیٰ (مشرکین سے) فرمائے گا کہ جن کو تم ہمارا شریک سمجھا کرتے تھے ان کو (اپنی امداد کے لئے) پکارو تو وہ پکاریں گے تو وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم اُن کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے (جس سے بالکل ہی مایوسی ہو جائے ورنہ بغیر آڑ کے بھی ان کا مدد کرنا ممکن نہ تھا) اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں، اور (اس پر بھی منکر) آدمی جھگڑنے میں سب سے بڑھ کر ہے (جنات اور حیوانات میں اگرچہ شعور و ادراک ہے مگر وہ ایسا جدال اور جھگڑا نہیں کرتے) اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ہدایت پہنچ چکی، (جس کا تقاضا تھا کہ ایمان لے آتے) ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے (کفر و معصیت سے) مغفرت مانگنے سے اور کوئی امر مانع نہیں بجز اس کے کہ اُن کو اس کا انتظار ہو کہ اگلے لوگوں کا سا معاملہ (ہلاکت اور عذاب کا) ان کو بھی پیش آجائے یا یہ کہ عذاب ان کے روبرو آکھڑا ہو، (مطلب یہ ہے کہ ان کے حالات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عذاب ہی کا انتظار ہے ورنہ اور سب حجتیں تو تمام ہو چکیں) اور رسولوں کو تو صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا کرتے ہیں (جس کے لئے معجزات وغیرہ کے ذریعہ کافی دلائل ان کے ساتھ کر دیئے جاتے ہیں، اس سے زائد ان سے کوئی فرمائش کرنا جہالت ہے) اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑے نکالتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ حق بات کو بچلادیں اور انھوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے، اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جاوے پھر وہ اس سے رُوگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں (اور اس کے سننے سے) ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور (اس وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ ان کو راہِ راست کی طرف بلائیں تو ہرگز بھی راہ پر نہ آئیں (کیونکہ کانوں سے دعوتِ حق سنتے نہیں، دلوں سے سمجھتے نہیں، اس لئے آپ غم نہ کریں) اور (تاخیر عذاب کی وجہ سے جو اُن کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے کہ اب ان کو ہوش آجائے اور ایمان لے آئیں تو ان کی مغفرت کر دی جائے ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ) اگر ان سے ان کے اعمال پر دار وگیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) ان کے (عذاب کے) واسطے ایک معین وقت (ٹھہرا رکھا) ہے (یعنی روز قیامت) کہ اس سے اس طرف (یعنی پہلے) کوئی پناہ کی جگہ نہیں پا سکتے (یعنی اس وقت کے آنے سے پہلے کسی پناہ کی جگہ میں جا چھپیں اور اس سے محفوظ رہیں) اور (یہی قاعدہ پہلے کفار کے ساتھ برتا گیا چنانچہ) یہ بستیاں (جن کے قصے مشہور و مذکور ہیں) جب انھوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) شرارت کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت معین کیا تھا (اسی طرح ان موجودہ لوگوں کے لئے بھی وقت معین ہے)۔

معارف و مسائل

ابلیس کے اولاد اور ذریت بھی ہے وَذُرِّيَّتَهٗ اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے کہ شیطان کے اولاد و ذریت ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ذریت سے مراد معین و مددگار ہیں، یہ ضروری نہیں کہ شیطان کی صلبی اولاد بھی ہو، مگر ایک صحیح حدیث جس کو حمیدی نے کتاب الجمع بین الصحیحین میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ان لوگوں میں سے نہ بنو جو سب سے پہلے بازار میں داخل ہو جاتے ہیں، یا وہ لوگ جو سب سے آخر میں بازار سے نکلتے ہیں، کیونکہ بازار ایسی جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بچے دے رکھے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کے انڈوں سے پھیلتی ہے، قرطبی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان کے مددگار اور لشکر ہونا تو قطعی دلائل سے ثابت ہے اولاد صلبی ہونے کے متعلق بھی ایک صحیح حدیث اوپر گذر چکی ہے، واللہ اعلم

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ساری مخلوقات میں سب سے زیادہ جھگڑالو انسان واقع ہوا ہے، اس کی شہادت میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک شخص کفار میں سے پیش کیا جائے گا اس سے سوال ہوگا کہ ہم نے جو رسول بھیجا تھا ان کے متعلق تمہارا کیا عمل رہا؟ وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میں تو آپ پر بھی ایمان لایا آپ کے رسول پر بھی، اور عمل میں ان کی اطاعت کی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تیرا اعمال نامہ سامنے رکھا ہے اس میں تو یہ کچھ بھی نہیں، یہ شخص کہے گا

کہ میں تو اس اعمال نامہ کو نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ ہمارے فرشتے تو تمھاری نگرانی کرتے تھے وہ تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں، یہ کہے گا کہ میں ان کی شہادت کو بھی نہیں مانتا، اور نہ ان کو پہچانتا ہوں، نہ میں نے ان کو اپنے عمل کے وقت دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو یہ لوح محفوظ سامنے ہے' اس میں بھی تیرا یہی حال لکھا ہے، وہ کہے گا کہ میرے پروردگار! آپ نے مجھے ظلم سے پناہ دی ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بیشک ظلم سے تو ہماری پناہ میں ہے، تو اب وہ کہے گا کہ میرے پروردگار میں ایسی غیبی شہادتوں کو کیسے مانوں جو میری دیکھی بھالی نہیں، میں تو ایسی شہادت کو مان سکتا ہوں جو میرے نفس کی طرف سے ہو، اس وقت اس کے مُنہ پر مُہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے کفر و شرک پر گواہی دیں گے، اس کے بعد اس کو آزاد کر دیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس روایت کا مضمون صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے منقول ہے، قرطبی)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو میں نہ ہٹوں گا جب تک پہنچ جاؤں جہاں ملتے ہیں دو دریا یا

اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ

چلا جاؤں قرنوں ، پھر جب پہنچے دونوں دریا کے ملاپ تک بھول گئے اپنی مچھلی پھر اس نے اپنی

سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا

راہ کرلی دریا میں سُرنگ بنا کر ، پھر جب آگے چلے کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو لا ہمارے پاس ہمارا کھانا

لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ

ہم نے پائی اپنے اس سفر میں تکلیف ، بولا وہ دیکھا تو نے جب ہم نے جگہ پکڑی

اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ

اس پتھر کے پاس سو میں بھول گیا مچھلی ، اور یہ مجھکو بھلا دیا شیطان ہی نے کہ

اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ڰ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا

اس کا ذکر کروں ، اور اس نے کر لیا اپنا رستہ دریا میں عجیب طرح ، کہا یہی ہے جو ہم

كُنَّا نَبْغِ ڰ فَارْتَدَّا عَلٰٓي اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ

چاہتے تھے ، پھر اُلٹے پھرے اپنے پیر پہچانتے ، پھر پایا ایک بندہ

عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

ہمارے بندوں میں کا جس کو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھلایا تھا اپنے پاس سے ایک علم ۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

کہا اس کو موسیٰ نے کہے تو تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ

بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ ، اور کیونکر ٹھہریگا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو

تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ

میں نہیں اس کا سمجھنا ، کہا تو پائے گا اگر اللہ نے چاہا مجھ کو ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا

لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ

کوئی حکم ، بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو مت پوچھیو مجھ سے کوئی چیز جب تک میں شروع نہ

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع

کروں تیرے آگے اس کا ذکر ۔

ع ۹ ۱۱ ۲۱

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے (جن کا نام یوشع تھا رواہ البخاری) فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا (اور وجہ اس سفر کی یہ ہوئی تھی کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں وعظ فرمایا، تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا "میں" مطلب یہ تھا کہ ان علوم میں کہ جن کو قرب الی اللہ کی تحصیل میں دخل ہے میرے برابر کوئی نہیں، اور یہ فرمانا صحیح تھا، اس لئے کہ آپ نبی اولوالعزم تھے، آپ کے برابر دوسرے کو یہ علم نہیں تھا، لیکن ظاہراً لفظ مطلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم دی جائے، غرض ارشاد ہوا کہ ایک ہمارا بندہ مجمع البحرین میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ زیادہ ہے گو اُن علوم کو قرب الٰہی میں دخل نہ ہو جیسا عنقریب واضح ہوگا، لیکن اس بنار

پر جواب میں مطلقاً تو اپنے کو اعلم کہنا نہ چاہیے تھا، غرض موسیٰ علیہ السلام ان کے ملنے کے مشتاق ہوئے اور پوچھا کہ ان تک پہونچنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایک بے جان مچھلی اپنے ساتھ لے کر سفر کرو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ شخص وہیں ہے۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یوشعؑ کو ساتھ لیا، اور یہ بات فرمائی) پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہونچے (وہاں کسی پتھر سے لگ کر سو رہے اور وہ مچھلی باذنہ تعالیٰ زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی، یوشع علیہ السلام نے بیدار ہو کر مچھلی کو نہ پایا، ارادہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جاگیں گے تو اس کا ذکر کروں گا، مگر ان کو مطلق یاد نہ رہا، شاید اہل و عیال اور وطن وغیرہ کے خیالات کا ہجوم ہوا ہوگا جو ذکر کرنا بھول گئے، ورنہ ایسی عجیب بات کا بھول جانا کم ہوتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت معجزات دیکھتا ہو اس کے ذہن سے کسی ادنیٰ درجہ کی عجیب بات کا نکل جانا کسی خیال کے غلبہ سے عجب نہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پوچھنے کا خیال نہ رہا، اس طرح سے) اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے (اس کے قبل زندہ ہو کر) دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی، پھر جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر (یعنی آج کی منزل) میں بڑی تکلیف پہونچی (اور اس کے قبل کی منزلوں میں نہیں تھکے تھے جس کی وجہ ظاہراً موقع مقصود سے آگے بڑھ آنا تھا) خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے (اور سو گئے تھے اس وقت اس مچھلی کا ایک قصہ ہوا اور میرا ارادہ آپ سے ذکر کرنے کا ہوا لیکن میں کسی دوسرے دھیان میں لگ گیا) سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا، اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی (ایک عجیب طور پر تو خود زندہ ہو جانا ہے دوسرا عجیب طور یہ کہ وہ مچھلی دریا میں جہاں کو گذری تھی وہاں کا پانی بطور خرقِ عادت کے اسی طرح سرنگ کے طور پر ہو گیا تھا غالباً پھر مل گیا ہوگا) موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ حکایت سُن کر) فرمایا کہ یہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی (وہاں ہی لوٹنا چاہئے) سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے لوٹے (غالباً وہ رستہ سڑک کا نہ ہوگا اس لئے نشان دیکھنے پڑے) سو (وہاں پہونچ کر) انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی (مقبولیت کے معنی میں ولایت اور نبوت دونوں کا احتمال ہے) اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے (یعنی بلا واسطہ اسباب اکتساب) ایک خاص طور کا علم سکھلایا تھا (مراد اس سے علم اسرارِ کونیہ ہے جیسا واقعات آئندہ

سے معلوم ہوگا، اور اس علم کو حصولِ قربِ الٰہی میں کچھ دخل نہیں، جس علم کو قرب میں دخل ہے وہ علمِ اسرارِ الٰہیہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام بڑھے ہوئے تھے، غرض) موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان کو سلام کیا اور ان سے) فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں (یعنی آپ مجھے اپنی ساتھ رہنے کی اجازت دیجئے) اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو (من جانب اللہ) سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں، ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر (میرے افعال پر) صبر نہ ہو سکے گا (یعنی آپ مجھ پر روک ٹوک کریں گے اور معلّم پر تعلیم کے متعلق متعلم کی روک ٹوک کرنے سے مصاحبت مشکل ہے) اور (بھلا) ایسے امور پر (روک ٹوک کرنے سے) آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں (یعنی ظاہر میں وہ امور بوجہ منشاء معلوم نہ ہونے کے خلافِ شرع نظر آئیں گے اور آپ خلافِ شرع امور پر سکوت نہ کر سکیں گے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (نہیں) ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلافِ حکم نہ کروں گا (یعنی مثلاً اگر روک ٹوک سے منع کر دیں گے میں روک ٹوک نہ کروں گا، اسی طرح اور کسی بات میں بھی خلاف نہ کروں گا) ان بزرگ نے فرمایا کہ (اچھا) تو اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو (اتنا خیال رہے کہ) مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ اس کے متعلق میں خود ہی ابتداءً ذکر نہ کر دوں۔

معارف و مسائل

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ، اس واقعہ میں موسیٰ سے مراد مشہور پیغمبر موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں، نوف بکالی نے جو دوسرے کسی موسیٰ کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے اس پر سخت رَدّ منقول ہے۔

اور فتیٰ کے لفظی معنی نوجوان کے ہیں، جب یہ لفظ کسی خاص شخص کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا خادم مراد ہوتا ہے، کیونکہ خدمت گار اکثر قوی جوان دیکھ کر رکھا جاتا ہے جو ہر کام انجام دے سکے، اور نوکر و خادم کو جوان کے نام سے پکارنا اسلام کا حسنِ ادب ہے کہ نوکروں کو بھی غلام یا نوکر کہہ کر خطاب نہ کرو بلکہ اچھے لقب سے پکارو، اس جگہ فتیٰ کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، اس لئے مراد ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم، اور روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ خادم یوشع بن نون ابن افرائیم بن یوسف علیہ السلام تھے، بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے، مگر اس میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، صحیح روایات سے ان کا نام یوشع بن نون ہونا تو ثابت ہے، باقی اوصاف و حالات کا ثبوت نہیں۔ (قرطبی)

مجمع البحرین کے لفظی معنی ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ مجمع البحرین سے کونسی جگہ مراد ہے، چونکہ قرآن و حدیث میں اس کو معین طور پر نہیں بتلایا، اس لئے آثار و قرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں، قتادہؒ نے فرمایا کہ بحر فارس و روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے، ابن عطیہؒ نے آذربائیجان کے قریب ایک جگہ کو کہا ہے، بعض نے بحر اردن اور بحر قلزم کے ملنے کی جگہ بتلائی ہے، بعض نے کہا یہ مقام طنجہ میں واقع ہے، ابی بن کعبؓ سے منقول ہے کہ یہ افریقہ میں ہے، سدی نے آرمینیہ میں بتلایا ہے، بعض نے بحر اندلس جہاں بحر محیط سے ملتا ہے وہ موقع بتلایا ہے، واللہ اعلم بہرحال اتنی بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مقام معین کر کے بتلا دیا تھا جس کی طرف ان کا سفر واقع ہوا ہے۔ (قرطبی)

قصۂ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابی بن کعبؓ اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے) فرمایا کہ "میں سب سے زیادہ علم والا ہوں" (اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بارگاہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے، یعنی یہ کہدیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں اعلم کون ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اعلم ہے، (موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اعلم ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے) اس لئے عرض کیا یا اللہ مجھے ان کا پتہ نشان بتلا دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو، اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو، جس جگہ پہونچ کر یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے، ان کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے، دوران سفر ایک پتھر کے پاس پہونچکر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے، یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آ گئی، اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور (مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ) جس راستہ سے مچھلی دریا میں گئی اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا جریان روک دیا اور اس جگہ

پانی کے اندر ایک سرنگ جیسی ہوگئی، (یوشع بن نون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے) جب بیدار ہوئے تو یوشع بن نون مچھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے، اور اس جگہ سے پھر روانہ ہوگئے، پورے ایک دن ایک رات کا مزید سفر کیا، جب دوسرے روز کی صبح ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ اس سفر سے کافی تکان ہوچکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (بقتضائے الٰہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تکان بھی محسوس نہیں ہوا، یہاں تک کہ جس جگہ پہونچنا تھا اس سے آگے نکل آئے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع بن نون کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا، کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا، کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی، اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزلِ مقصود وہی تھی جہاں مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے)۔

چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہوگئے، اور ٹھیک اسی راستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے تاکہ وہ جگہ مل جائے، اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے (اسی حال میں) سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس (غیر آباد) جنگل میں سلام کہاں سے آگیا، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو حضرت خضرؑ نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں، اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، اے موسیٰ! میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں، اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلاؤں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے، اتفاقاً ایک کشتی آگئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی، ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اجرت کے کشتی میں سوار کر لیا، کشتی میں سوار ہوتے ہی خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا، حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے نہ رہا گیا، کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے ہمیں کشتی میں سوار کرلیا آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی، کہ یہ سب غرق ہو جائیں، یہ تو آپ نے بہت برا کام کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے؛ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عذر کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، اس بھول پر آپ سخت گیری نہ کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خضر علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا اور دوسرا بطور شرط کے اور تیسرا قصداً (اسی اثنا میں) ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چونچ بھر پانی لیا، خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں مل کر بھی اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جتنی اس چڑیا کی چونچ کے پانی کو اس سمندر کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اُتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے، اچانک خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ دوسرے لڑکوں میں کھیل رہا ہے، خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا، لڑکا مر گیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا، یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے، موسیٰ نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے، اس لئے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے اپنے ساتھ سے الگ کر دیجئے، آپ میری طرف سے عذر کی حد پر پہونچ چکے ہیں۔

اس کے بعد پھر چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گذر ہوا، انھوں نے گاؤں والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجئے، انھوں نے انکار کر دیا، اس بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا، آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے، خضر علیہ السلام نے کہا کہ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ (یعنی اب شرط پوری ہو چکی، اس لئے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آگیا ہے)

اس کے بعد خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلا کر کہا ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا، "یعنی یہ ہے حقیقت اُن واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد

فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہیٰ)

صحیح بخاری و مسلم میں یہ طویل حدیث اس طرح آئی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موسیٰ بنی اسرائیل اور نوجوان ساتھی کا نام یوشع بن نون ہونا اور جس بندے کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کی طرف بھیجا گیا تھا ان کا نام خضر ہونا تصریحاً مذکور ہے، آگے آیات قرآن کے ساتھ ان کے مفہوم اور تفسیر کو دیکھئے۔

سفر کے بعض آداب اور پیغمبرانہ عزم کا ایک نمونہ

لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا، یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر یوشع بن نون سے کہا جس کا مطلب اپنے سفر کا رُخ اور منزلِ مقصود رفیق کو بتانا تھا، اس میں بھی حُسنِ ادب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کر دینا چاہئے، متکبر لوگ اپنے خادموں اور نوکروں کو نہ قابل خطاب سمجھتے ہیں نہ اپنے سفر کے متعلق اُن کو کچھ بتاتے ہیں۔

حُقُبًا، حُقْبَہ کی جمع ہے، اہل لغت نے کہا کہ حقبہ اسّی سال کی مدت ہو، بعض نے اس سے زیادہ کو حقبہ قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ زمانۂ دراز کو کہا جاتا ہے، تحدید و تعیین کچھ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق کو یہ بتلا دیا کہ مجھے مجمع البحرین کی اس جگہ پر پہونچنا ہی جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے، اور عزم یہ ہے کہ کتنا ہی زمانہ سفر میں گذر جائے، جب تک اس منزلِ مقصود پر نہ پہنچوں سفر جاری رہے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پیغمبرانہ عزم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام سے فضل ہونا موسیٰ علیہ السلام کی خاص تربیت اور ان کے معجزے

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا، قرآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی کا خاص شرف ان کی مخصوص فضیلت ہے، اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوّت میں بھی اختلاف ہے، اور نبوّت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں، نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ کوئی خاص امت، اس لئے بہرحال موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے بدرجہا افضل ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے مقربین کی ادنیٰ سی کمی اور کوتاہی کی اصلاح فرماتے ہیں، ان کی تربیت کے لئے ادنیٰ سی کوتاہی پر بھی سخت عتاب ہوتا ہے، اس کا تدارک بھی ان سے اسی پیمانے پر کرایا جاتا ہے، یہ سارا قصہ اسی خاص انداز تربیت کا مظہر ہے، ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا تھا

کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں، حق تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا تو ان کی تنبیہ کے لئے اپنے ایک ایسے بندے کا ان کو پتہ دیا گیا جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، مگر بہرحال وہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلبِ علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے، جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے طالب علمانہ سفر کے لئے تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندے (خضر علیہ السلام) کا پتہ پوچھا، اب یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات یہیں آسانی سے کرادیتے، یا موسیٰ علیہ السلام ہی کو طالب علم بناکر سفر کرانا تھا تو پتہ صاف بتا دیا جاتا جہاں پہونچنے میں پریشانی نہ ہوتی، مگر ہوا یہ کہ پتہ ایسا مبہم بتلایا گیا کہ جس جگہ پہونچ کر مری ہوئی مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے اس جگہ وہ ہمارا بندہ ملے گا۔

صحیح بخاری کی حدیث سے اس مچھلی کے متعلق اتنا ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لیں، اس سے زائد یہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ مچھلی کھانے کے لئے ساتھ رکھنے کا حکم ہوا تھا یا کھانے سے علیحدہ، دونوں احتمال ہیں، اسی لئے مفسرین میں سے بعض نے کہا کہ یہ بھونی ہوئی مچھلی کھانے کے لئے رکھی گئی تھی، اور اس سفر کے دونوں ساتھی دورانِ سفر اس میں سے کھاتے بھی رہے، اس کا نصف حصہ کھایا جاچکا تھا، اس کے بعد بطور معجزہ یہ بھونی ہوئی اور آدھی کھائی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔

ابن عطیہ اور بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ مچھلی بطور معجزہ کے پھر دنیا میں باقی بھی رہی اور بہت دیکھنے والوں نے دیکھا بھی کہ اس کی صرف ایک کروٹ ہے اور دوسری کھائی ہوئی ہے، ابن عطیہؒ نے خود بھی اپنا دیکھنا بیان کیا ہے (قرطبی)

اور بعض مفسرین نے کہا کہ ناشتہ کھانے کے علاوہ ایک علیحدہ زنبیل میں مچھلی رکھنے کا حکم ہوا تھا، اس کے مطابق رکھ لی گئی تھی، اس میں بھی اتنی بات تو متعین ہے کہ مچھلی مُردہ تھی، زندہ ہو کر دریا میں چلا جانا ایک معجزہ ہی تھا۔

بہرحال حضرت خضر علیہ السلام کا پتہ ایسا مبہم دیا گیا کہ آسانی سے جگہ متعین نہ ہو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ابتلاء و امتحان ہی تھا، اس پر مزید امتحان کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ جب عین موقع پر یہ لوگ پہونچ گئے تو مچھلی کو بھول گئے، آیتِ قرآنی میں یہ بھول حضرت موسیٰؑ اور ان کے رفیق دونوں کی طرف منسوب کی گئی ہے، نَسِيَا حُوْتَهُمَا، لیکن حدیث بخاری سے جو قصہ ثابت ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مچھلی

کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کا وقت آیا تو موسیٰ علیہ السلام سوئے ہوئے تھے، صرف یوشع بن نون نے یہ واقعہ عجیبہ دیکھا اور ارادہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہو جائیں تو ان کو بتلاؤں گا، مگر بیداری کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن پر نسیان مسلّط کر دیا اور بھول گئے، تو یہاں دونوں کی طرف بھولنے کی نسبت ایسی ہو گی جیسے قرآن میں يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں دریائے شیریں اور دریائے شور دونوں سے موتی اور مرجان نکلنے کا بیان آیا ہے، حالانکہ موتی مرجان صرف دریائے شور سے نکلتے ہیں مگر محاورات میں تغلیباً ایسا لکھنا ایک عام بات ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے آگے سفر کرنے کے وقت تو مچھلی کو ساتھ لینا دونوں ہی بزرگ بھولے ہوئے تھے، اس لئے دونوں کی طرف نسیان منسوب کیا گیا۔

بہرحال یہ ایک دوسری آزمائش تھی کہ منزل مقصود پر پہونچ کر مچھلی کے زندہ ہو کر پانی میں گم ہو جانے سے حقیقت کھل جاتی ہے اور مقام متعین ہو جاتا ہے، مگر ابھی اس طالبِ حق کا کچھ اور بھی امتحان لینا تھا، اس لئے دونوں پر بھول مسلّط ہو گئی، اور پورے ایک دن اور ایک رات کا مزید سفر طے کرنے کے بعد بھوک اور تکان کا احساس ہوا، یہ تیسرا امتحان تھا، کیونکہ عادۃً تکان اور بھوک کا احساس اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا، وہیں مچھلی یاد آجاتی تو اتنی طویل سفر کی مزید تکلیف نہ ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا کہ کچھ اور مشقت اٹھائے اتنا طویل سفر کرنیکے بعد بھوک پیاس کا احساس ہوا اور وہاں مچھلی یاد آئی اور یہ معلوم ہوا کہ ہم منزلِ مقصود سے بہت آگے آگئے، اس لئے پھر اسی نشانِ قدم پر واپس لوٹے۔

مچھلی کے دریا میں چلے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ تو سَرَبًا کے لفظ سے آیا ہے، سَرَب کے معنی سُرنگ کے ہیں، جو پہاڑوں میں راستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، یا شہروں میں زمین دوز راستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ مچھلی جب دریا میں گئی تو جس طرف کو جاتی پانی میں ایک سرنگ سی بنتی چلی گئی، کہ اس کے جانے کا راستہ پانی سے کھلا رہا، جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہوا، دوسری مرتبہ جب یوشع ابن نون نے موسیٰ علیہ السلام سے اس واقعہ کا ذکر سفرِ طویل کے بعد کیا وہاں وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا کے الفاظ سے اس واقعہ کو بیان کیا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ پانی کے اندر سُرنگ بنتے چلے جانا خود ایک واقعہ عجیبہ خرقِ عادت تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اور ان کی نبوّت کا مسئلہ

قرآن کریم میں اگرچہ اس صاحبِ واقعہ کا نام مذکور نہیں، بلکہ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کہا گیا، مگر صحیح بخاری کی حدیث میں ان کا نام خَضِر بتلایا گیا ہے، خَضِر کے لفظی معنی ہرے بھرے کے ہیں، ان کا نام خضر ہونے کی وجہ عامۂ مفسرین نے یہ بتلائی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تو کیسی ہی زمین ہو وہاں گھاس اُگ جاتی، اور

زمین سرسبز ہو جاتی تھی، قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ خضر علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں، ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الٰہی کے ہو نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا، اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام دے دیئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انھوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا ہے وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الٰہی سے کیا)

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں منجانب اللہ سپرد کی گئی تھیں انہی کا علم دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا، تفسیر قرطبی، بحر محیط، ابوحیان اور اکثر تفاسیر میں یہ مضمون بعنوانات مختلفہ مذکور ہے۔

کسی ولی کو ظاہر شریعت کے حکم کے خلاف ورزی حلال نہیں

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ بہت سے جاہل غلط کار تصوف کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے، بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی ولی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا، یہ کھلا ہوا زندقہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جا سکتا ہے۔

شاگرد پر استاد کا اتباع لازم ہے

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی و رسول اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضرؑ سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ سے آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ تحصیلِ علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے، اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل و اعلیٰ بھی ہو (قرطبی، مظہری)۔

عالم شریعت کیلئے جائز نہیں کہ خلاف شرع امر پر صبر کرے

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ

عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے اور کیسے صبر کریں گے جب کہ آپ کو حقیقتِ امر کی اطلاع نہ ہو، مطلب یہ تھا کہ مجھے جو علم عطا ہوا ہے اس کی نوعیت آپ کے علم سے مختلف ہے، اس لئے آپ کو میرے معاملات قابلِ اعتراض نظر آئیں گے، جب تک کہ میں ان کی حقیقت سے آپ کو مطلع نہ کر دوں، آپ اپنے فرضِ منصبی کی بناء پر اس پر اعتراض کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا، اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلافِ شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالمِ دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

پہلا واقعہ تو زیادہ سنگین بھی نہیں تھا، صرف کشتی والوں کا مالی نقصان یا غرق ہونے کا صرف خطرہ ہی تھا جو بعد میں رفع ہو گیا، لیکن بعد کے واقعات میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ میں اعتراض نہیں کروں گا، اور جب لڑکے کے قتل کا واقعہ دیکھا تو شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور اپنے اعتراض پر کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر آئندہ اعتراض کروں تو آپ کو حق ہوگا کہ مجھے ساتھ نہ رکھیں، کیونکہ کسی نبی اور پیغمبر سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ خلافِ شرع کام ہوتا دیکھ کر صبر کرے، البتہ چونکہ دوسری طرف بھی پیغمبر ہی تھے اس لئے بالآخر حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ یہ واقعاتِ جزئیہ خضر علیہ السلام کے لئے عام قواعدِ شرعیہ سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا وحیِ الٰہی کے مطابق کیا (مظہری)

علم موسوی اور علم خضری میں ایک بنیادی فرق اور دونوں میں ظاہری تضاد کا حل

یہاں طبعی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی، مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے، ان کی تقریر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاحِ خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جن میں خلقِ خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول و قواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر

قرآن کریم میں بتصریح نبوّت و رسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکۃ اللہ مقرر رہیں، مگر زمرۂ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کر لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچا لیا جائے یا فلاں کو ہلاک کر دیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے فلاں کو زیر کیا جائے ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں، ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کر دیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعات جزئیہ کا عام قانونِ شریعت سے استثناء ہوتا ہے، ابوحیان نے بحر محیط میں فرمایا الجمہور علی ان الخضر نبی وکان علمہ معرفۃ بواطن قد اوحیت الیہ وعلم موسیٰ الاحکام والفتیا بالظاھر (بحر محیط ص ۱۴۷ ج ۶) اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحیِ نبوت ہو، کسی ولی کا کشف والہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، اسی لئے حضرت خضرؑ کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے، ان پر کسی غیر نبی کے کشف و الہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نجدہ حروری (خارجی) نے ابن عباسؓ کو خط لکھا کہ خضر علیہ السلام نے لڑکے نابالغ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابن عباس رضؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر کسی بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہو جائے، جو موسیٰ علیہ السلام کے عالم (یعنی خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا تو تمہارے لئے بھی نابالغ کا قتل جائز ہو جائے گا مطلب یہ تھا کہ خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحیِ نبوت اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو نہیں ہو سکتا

کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جس کو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے (مظہری) اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا نبی صاحبِ وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

فَانْطَلَقَا وقفہ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ط قَالَ اَخَرَقْتَهَا

پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو پھاڑ ڈالا موسیٰ بولا کیا تو نے اس کو پھاڑ ڈالا

لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ج لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

کہ ڈبادے اس کے لوگوں کو البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری، بولا میں نے نہ کہا تھا تو نہ

لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا

ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، کہا مجھ کو نہ پکڑ میری بھول پر اور مت

تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا وقفہ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ لا

ڈال مجھ پر میرا کام مشکل، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا،

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ط لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

موسیٰ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے بیشک تو نے کی ایک چیز نامعقول

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

بولا میں نے تجھ کو نہ کہا تھا کہ تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ،

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ج قَدْ بَلَغْتَ

کہا اگر تجھ سے پوچھوں کوئی چیز اس کے بعد تو مجھ کو ساتھ نہ رکھیو، تو اُتار چکا

مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا وقف حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ

میری طرف سے الزام، پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب پہنچے ایک گاؤں کے لوگوں تک

اِۨسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا

کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے انھوں نے نہ مانا کہ ان کو مہمان رکھیں پھر پائی وہاں ایک دیوار

يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

جو گرا چاہتی تھی اس کو سیدھا کر دیا ، بولا (موسیٰ) اگر تو چاہتا تو لے لیتا اس پر مزدوری

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

کہا اب جدائی ہے میرے اور تیرے بیچ اب جتلائے دیتا ہوں تجھ کو پھیر ان باتوں کا جس پر

عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصۂ تفسیر

(غرض باہم قول و قرار ہوگیا) پھر دونوں (کسی طرف) چلے (غالباً ان کے ساتھ یوشع علیہ السلام بھی ہوں گے، مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اس لئے ذکر دو کا کیا گیا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہونچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت ہوئی) جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی (کا ایک تختہ نکال کر اس) میں چھید کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کی، ان بزرگ نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا (آخر وہی ہوا، آپ اپنے قول پر نہ رہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں بھول گیا تھا) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ (متابعت) میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے (کہ بھول چوک بھی معاف نہ ہو، بات گئی گذری ہوگئی) پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا موسیٰ (علیہ السلام گھبرا کر) کہنے لگے آپ نے ایک بے گناہ جان کو ہلاک کر دیا (اور وہ بھی) بغیر بدلے کسی جان کے بیشک آپ نے بڑی بے جا حرکت کی (کہ اوّل تو یہ نابالغ کا قتل ہے جس کو قصاص میں بھی قتل کرنا جائز نہیں پھر اس نے تو کسی کو قتل بھی نہیں کیا، یہ فعل پہلے فعل سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ اس میں یقینی نقصان تو صرف مال کا تھا، بیٹھنے والوں کے غرق کا اگرچہ خطرہ تھا، مگر اس کا انسداد کر دیا گیا، پھر لڑکا نابالغ ہر گناہ سے بری) ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ خیر اس مرتبہ اور درگذر کیجئے لیکن) اگر اس مرتبہ کے بعد میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر

(کی انتہا) کو پہونچ چکے ہیں (اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر پیش نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال انھوں نے قصداً اپنی پیغمبرانہ حیثیت کے مطابق کیا تھا) پھر دونوں (آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گذر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانے کو مانگا (کہ ہم مہمان ہیں) تو انھوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو (ہاتھ کے اشارے سے بطور خرقِ عادت کے) سیدھا کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس (کام) پر اجرت ہی لیلیتے (کہ اس وقت کام بھی چلتا اور ان کی بد خلقی کی اصلاح بھی ہوتی) ان بزرگ نے کہا یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے (جیسا کہ آپ نے خود شرط کی تھی) اب میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (جیسا کہ آیات آئندہ میں اس کا بیان آتا ہے)۔

معارف و مسائل

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا جس کی وجہ سے کشتی میں پانی بھر کر غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، مگر تاریخی روایات میں ہے کہ پانی اس کشتی میں داخل نہیں ہوا، خواہ اس لئے کہ خضر علیہ السلام نے ہی پھر اس کی کچھ مرمت کر دی، جیسے بغوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس تختہ کی جگہ خضر علیہ السلام نے ایک شیشہ لگا دیا تھا یا بطور معجزہ پانی کشتی میں نہ آیا، اتنی بات خود قرآن کریم کے سیاق سے معلوم ہو رہی ہے، کہ اس کشتی کو غرقابی کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، جس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا، لفظ غلام عربی زبان کے اعتبار سے نابالغ لڑکے کو کہا جاتا ہے، یہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے کہ وہ نابالغ تھا، اور آگے جو اس کے متعلق آیا نَفْسًا زَكِيَّةً اس سے بھی اس کے نابالغ ہونے کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ زکیّہ کے معنی ہیں گناہوں سے پاک اور یہ صفت یا پیغمبر کی ہو سکتی ہے یا نابالغ بچے کی جس کے افعال و اعمال پر مواخذہ نہیں، اس کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔

اَهْلَ قَرْيَةٍ، یہ بستی جس میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا گذر ہوا اور اس کے

لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں انطاکیہ اور ابن سیرین کی روایت میں ایکہ تھی، اور حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ وہ اندلس کی کوئی بستی تھی (مظہری)، واللہ اعلم

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ

وہ جو کشتی تھی سو چند محتاجوں کی جو محنت کرتے تھے دریا میں سو میں نے چاہا کہ

أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾

اس میں عیب ڈال دوں اور ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لیلیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا

اور وہ جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز

طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ

کردے زبردستی اور کفر کر کر، پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے اُن کو ان کا رب بہتر اس سے

زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ

پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں، اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں

يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا

کی تھی اس شہر میں اور اس کے نیچے مال گڑا تھا ان کا اور ان کا باپ تھا

صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا

نیک پھر چاہا تیرے رب نے کہ وہ پہنچ جائیں اپنی جوانی کو اور نکالیں اپنا مال

كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ

گڑا ہوا مہربانی سے تیرے رب کی اور میں نے یہ نہیں کیا اپنے حکم سے

ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

یہ ہے پھیر ان چیزوں کا جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصۂ تفسیر

اور وہ جو کشتی تھی سو چند غریب آدمیوں کی تھی (جو اس کے ذریعہ) دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے (اسی پران کی گذر اوقات تھی) سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ) ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا (اگر میں کشتی میں عیب ڈال کر بظاہر بیکار نہ کر دیتا تو یہ کشتی بھی چھین لی جاتی اور ان غریبوں کی مزدوری کا سہارا ابھی ختم ہو جاتا، اس لئے توڑنے میں یہ مصلحت تھی) اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے (اور اگر وہ بڑا ہوتا تو کافر ظالم ہوتا اور ماں کو اس سے محبت بہت تھی) سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے (یعنی بیٹے کی محبت کے سبب وہ بھی بے دینی میں اس کا ساتھ نہ دینے لگیں) پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ (اس کا تو قصہ تمام کر دیا جائے پھر) اس کے بدلے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) جو کہ پاکیزگی (یعنی دین) میں اس سے بہتر ہو، اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں (رہتے) ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو اُن کے باپ سے میراث میں پہونچا ہے) اور ان کا باپ (جو مر گیا ہے وہ) ایک نیک آدمی تھا (اس کے نیک ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اولاد کے مال کو محفوظ کرنا چاہا، اگر دیوار ابھی گر جاتی تو لوگ یہ مال لُوٹ لے جاتے اور غالباً جو شخص ان یتیم لڑکوں کا سرپرست تھا اس کو اس خزانے کا علم ہوگا وہ یہاں موجود نہ ہوگا جو انتظام کر لیتا) اس لئے آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور (یہ سارے کام میں نے اللہ کے حکم سے کئے ہیں ان میں سے) کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا، (جس کو میں حسبِ وعدہ بتلا چکا ہوں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے رخصت ہوگئے) ؛

معارف و مسائل

اَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ، یہ کشتی جن مسکینوں کی تھی ان کے متعلق کعب احبار سے منقول ہے کہ وہ دس بھائی تھے جن میں پانچ اپاہج معذور تھے، پانچ محنت مزدوری کر کے سب کے لئے معاش کا انتظام کرتے تھے، اور مزدوری ان کی یہ تھی کہ دریا میں ایک کشتی

چلاتے اور اس کا کرایہ حاصل کرتے تھے۔

مسکین کی تعریف بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس کی حاجات اصلیہ ضروریہ سے زائد بقدر نصاب ہو جائے، اس سے کم مال ہو تو وہ بھی مسکین کی تعریف میں داخل ہے، کیونکہ جن لوگوں کو اس آیت میں مساکین کہا گیا ہے ان کے پاس کم از کم ایک کشتی تو تھی جس کی قیمت مقدار نصاب سے کم نہیں ہوتی، مگر چونکہ وہ حاجاتِ اصلیہ ضروریہ میں مشغول تھی، اس لئے ان کو مساکین ہی کہا گیا (مظہری)

مَلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا، بغوی نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ یہ کشتی جس طرف جارہی تھی وہاں ایک ظالم بادشاہ تھا جو ادھر سے گذرنے والوں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت خضر نے اس مصلحت سے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا کہ وہ ظالم بادشاہ اس کشتی کو شکستہ دیکھ کر چھوڑ دے، اور یہ مساکین اس مصیبت سے بچ جائیں، دانائے روم نے خوب فرمایا ؎

گر خضر در بحر کشتی را شکست ٭ صد درستی در شکست خضر ہست

وَاَمَّا الْغُلٰمُ، یہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ اس لڑکے کی طبیعت میں کفر اور والدین کے خلاف سرکشی تھی، والدین اس کے نیک اور صالح تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں خطرہ تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ان صالح ماں باپ کو ستائے گا، اور تکلیف پہونچائے گا، اور کفر میں مبتلا ہو کر ماں باپ کے لئے بھی ایک فتنہ بنے گا، اس کی محبت میں ماں باپ کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا، یعنی اس لئے ہم نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان صالح ماں باپ کو اس لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دیدے، جو اعمال و اخلاق میں پاکیزہ بھی ہو اور ماں باپ کے حقوق کو بھی پورا کرے۔

اس واقعہ میں خَشِيْنَآ اور اَرَدْنَآ میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ارادہ اور خشیت خضر علیہ السلام نے اپنی اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف منسوب کیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنی ہی طرف منسوب کیا ہو تو پھر اَرَدْنَا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اللہ سے دعاء کی، کیونکہ کسی لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا معاملہ خاص حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں خضرؑ یا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں یہ شبہ کرنا درست نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لڑکا

کافر ہوگا، اور ماں باپ کو بھی گمراہ کرے گا، تو پھر واقعۂ علم آلہی کے مطابق ایسا ہی واقع ہونا ضروری تھا، کیونکہ علمِ آلہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

جواب یہ ہے کہ علمِ آلہی میں اس تعلیق و شرط کے ساتھ تھا کہ یہ بالغ ہوگا تو کافر ہوگا اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ بنے گا، پھر چونکہ وہ عمر بلوغ سے پہلے ہی قتل کردیا گیا تو جو واقعہ پیش آیا وہ اس علمِ آلہی کے منافی نہیں (مظہری)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے بروایت عطیہ نقل کیا ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا، اور ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی پیدا ہوئے، بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی اُمت کو ہدایت فرمائی۔

وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا، یہ خزانہ جو یتیم بچوں کے لئے زیرِ دیوار دفن تھا اس کے متعلق حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ تھا (رواہ الترمذی والحاکم وصححہ' از مظہری)

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے مندرجہ ذیل کلمات لکھے ہوئے تھے، یہ روایت حضرت عثمان بن عفانؓ نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی (قرطبی)

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
۲۔ تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہو پھر غمگین کیونکر ہوتا ہے۔
۳۔ تعجب ہے اس شخص پر جو اس پر ایمان رکھتا ہے کہ رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے پھر ضرورت سے زیادہ مشقت اور فضول قسم کی کوشش میں کیوں لگتا ہے۔
۴۔ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر خوش و خرم کیسے رہتا ہے۔
۵۔ تعجب ہے اس شخص پر جو حسابِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے پھر غفلت کیسے برتتا ہے۔
۶۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کو اور اس کے انقلابات کو جانتا ہے پھر کیسے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھتا ہے۔
۷۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

والدین کی نیکی کا فائدہ اولاد در اولاد کو بھی پہنچتا ہے

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا، اس میں اشارہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے مدفون خزانے کی حفاظت کا سامان بذریعہ خضر علیہ السلام اس لئے کرایا گیا تھا کہ ان یتیم

بچوں کا باپ کوئی مرد صالح اللہ کے نزدیک مقبول تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کرنے اور اس کی اولاد کو فائدہ پہونچانے کا یہ انتظام فرمایا، محمد بن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کی نیکی اور صلاحیت کی وجہ سے اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی اور اس کے آس پاس کے مکانات کی حفاظت فرماتے ہیں (مظہری)

قرطبی میں ہے کہ حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس شہر اور پورے علاقہ کے لئے امان ہوں، جب اُن کی وفات ہوگئی تو ان کے دفن ہوتے ہی کفار دیلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا، اس وقت لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ ہم پر دوہری مصیبت ہے یعنی شبلی کی وفات اور دیلم کا قبضہ (قرطبی، ص ۲۹ ج ۱۱)

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگوں کو بھی علماء و صلحاء کی اولاد کی رعایت اور اُن پر شفقت کرنی چاہئے، جب تک کہ وہ بالکل ہی کفر و فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا، لفظ اَشُدّ، شدۃ کی جمع ہے، مراد قوت ہے، اور وہ عمر جس میں انسان اپنی پوری قوت اور بھلے بُرے کی پہچان پر قادر ہو جاتا ہے، ابو حنیفہؒ کے نزدیک پچیس سال کی عمر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چالیس سال عمر ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (مظہری)

پیغمبرانہ بلاغت اور رعایتِ ادب کی ایک مثال

اس مثال کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی اچھا یا بُرا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، خیر و شر سب اس کی مخلوق اور اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، جن امور کو شر یا بُرا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ خاص افراد اور خاص حالات کے اعتبار سے ضرور شر اور بُرا کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، مگر مجموعۂ عالم اور عالمِ دنیا کے مزاج کے لئے سب ضروری اور تخلیقِ الٰہی کے اعتبار سے سب خیر ہی ہوتے ہیں، اور سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

خلاصہ یہ ہے کہ جو آفت یا حادثہ دنیا میں پیش آتا ہے، خدا تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس لحاظ سے ہر خیر و شر کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تخلیق کے اعتبار سے کوئی شر شر نہیں ہوتا، اس لئے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلمات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ،

اسی تعلیم و ادب کا سبق دیتے ہیں کہ کھلانے پلانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف فرمائی، پھر بیماری کے وقت شفاء دینے کی نسبت بھی اسی کی طرف کی، درمیان میں بیمار ہونے کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ، یعنی جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے شفاء عطا فرما دیتے ہیں، یوں نہیں کہا کہ جب وہ مجھے بیمار کرتے ہیں تو شفاء بھی دیتے ہیں۔

اب حضرت خضر علیہ السلام کے کلام پر غور کیجئے، انھوں نے جب کشتی توڑنے کا ارادہ کیا تو وہ چونکہ ظاہر میں ایک عیب اور بُرائی ہے اس کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف کر کے فرمایا اَرَدْتُّ، پھر لڑکے کو قتل کرنے اور اس کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا ذکر کیا تو اس میں قتل تو بُرائی تھی، اور بدلے میں بہتر اولاد دینا ایک بھلائی تھی، امر مشترک ہونے کی وجہ سے یہاں بصیغۂ جمع متکلم فرمایا اَرَدْنَآ "یعنی ہم نے ارادہ کیا" تاکہ اس میں جتنا ظاہری شر ہے وہ اپنی طرف اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، تیسرے واقعہ میں دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کر دینا سراسر خیر ہی خیر ہے، اس کی نسبت پوری حق تعالیٰ کی طرف کر کے فرمایا فَاَرَادَ رَبُّكَ "یعنی آپ کے رب نے ارادہ کیا"۔

خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہو چکی

قرآن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں، جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے داخل ہوئے، اور لوگوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر پہنچے اور رونے لگے، پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے :۔

اِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَآءً مِّنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَّعِوَضًا مِّنْ كُلِّ فَائِتٍ وَّخَلَفًا مِّنْ كُلِّ هَالِكٍ فَاِلَى اللّٰهِ فَاَنِيْبُوْا وَاِلَيْهِ فَارْغَبُوْا وَنَظَرُهٗ اِلَيْكُمْ فِي الْبَلَاءِ فَانْظُرُوْا فَاِنَّمَا الْمُصَابُ مَنْ لَّمْ يُجْبَرْ۔

"اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلا ہے ہر فوت ہونے والی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے ہر ہلاک ہونے والے کا اس لئے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی طرف رغبت کرو اور اس بات کو دیکھو کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کر کے تم کو آزماتا ہے اصل مصیبت زدہ وہ ہے جس کی مصیبت کی تلافی نہ ہو"

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر رخصت ہوگئے تو حضرت ابوبکر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام تھے، اس روایت کو جزریؒ نے حصن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایات اس میں درج کرتے ہیں۔

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ دجّال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلے گا جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا، یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا، ابواسحق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (قرطبی)

اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الہواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو خضر علیہ السلام نے ان کو ایک دعاء بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہو وہ دعاء یہ ہے:

يَا مَنْ لَا يُشْغِلُهُ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ وَّيَا مَنْ لَّا تُغَلِّطُهُ الْمَسَائِلُ وَيَا مَنْ لَا يَبْرَمُ مِنْ اِلْحَاحِ الْمُلِحِّيْنَ اَذِقْنِيْ بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ مَغْفِرَتِكَ (قرطبی)	"اے وہ ذات جسکو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا، اور وہ ذات جو دعاء میں الحاح واصرار کرنے اور بار بار کہنے سے ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عفو و کرم کا ذائقہ چکھا دیجئے، اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمایئے"

اور پھر اسی کتاب میں بعینہٖ یہی واقعہ اور یہی دعاء، اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا ہے (قرطبی)

اسی طرح اولیاء اُمت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخر حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپؐ کھڑے ہوگئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے:

اَرَءَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَاِنَّ عَلٰى رَاْسِ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ	"کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو اس رات سے سو سال گذرنے پر کوئی شخص ان میں سے زندہ نہ رہیگا جو آج زمین کے اوپر ہے"

حضرت ابن عمرؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ سَو سال پر یہ قرن ختم ہو جائے گا۔

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے بھی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، لیکن علامہ قرطبیؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں جو حیاتِ خضرؑ کو باطل کہتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کے لئے عموم کے الفاظ ہیں اور عموم بھی مؤکد کر کے لایا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو، کیونکہ اولادِ آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کئے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ عَلَى الْاَرْضِ میں الف لام عہد کا ہے، اور مراد ارض سے ارضِ عرب ہے، پوری زمین جس میں ارض یاجوج و ماجوج اور بلادِ مشرق اور جزائر جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سُنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قرطبی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختمِ نبوّت کو حیاتِ خضر کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختمِ نبوّت کے منافی نہیں حضرت خضرؑ کی حیات بھی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضر پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود ہوتے تو اُن پر لازم تھا کہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپؐ کے تابع ہو کر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے، کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے:۔ لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَّمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ " (یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا، کیونکہ میرے آنے سے دینِ موسوی منسوخ ہو چکا ہے)۔ لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوّت عام انبیاء کی شریعت سے مختلف ہو، ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کے لئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں، رہا اتباعِ شریعتِ محمدیہ تو اس میں کوئی بُعد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے بعد سے انھوں نے اپنا عمل شریعتِ محمدیہ پر شروع کر دیا ہو، واللہ اعلم۔

ابو حیان نے تفسیر بحرِ محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:۔

وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰۤى اَنَّهٗ مَاتَ (بحر محیط، ص ۱۴۷ ج ۶)	"جمہور علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام کی وفات ہو گئی"۔

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل

اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحؒ نے اپنے مکاشفہ سے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالمِ کشف میں دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت وحیات سے ہمارا کوئی اعتقادی یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث وتمحیص کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورۃ صدر تفصیلات نقل کردی گئی ہیں ؛

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۭ﴿۸۳﴾

اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو کہہ اب پڑھتا ہوں تمہارے آگے اس کا کچھ احوال

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ۙ فَاَتْبَعَ

ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان، پھر پیچھے پڑا

سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ

ایک سامان کے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ پایا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی

حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ

ندی میں اور پایا اس کے پاس لوگوں کو ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے

وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ

اور یا رکھ ان میں خوبی، بولا جو کوئی ہوگا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے،

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ

پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس وہ عذاب دیگا اس کو بُرا عذاب، اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا

صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ۭ

کام سو اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی ۔

خلاصۂ تفسیر

ذُوالقرنین کا پہلا سفر اور یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں (اس پوچھنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کی تاریخ قریب قریب گم تھی، اور اسی لئے اس قصہ کے جو امور قرآن میں مذکور نہیں کہ وہ اصل قصہ سے زائد تھے، ان امور کے متعلق آج تک اصل تاریخ میں اختلافات شدید پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے قریشِ مکہ نے بمشورۂ یہودِ مدینہ اس قصہ کا سوال کے لئے انتخاب کیا تھا، اس لئے اس قصہ کی تفصیلات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل ہے) آپ فرما دیجئے کہ میں اس کا ذکر ابھی تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں (آگے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی حکایت شروع ہوئی کہ ذوالقرنین ایک ایسے جلیل القدر بادشاہ ہو گذرے ہیں کہ) ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے ان کو ہر قسم کا سامان (کافی) دیا تھا (جس سے وہ اپنے شاہی منصوبوں کو پورا کر سکیں) چنانچہ وہ (بارادۂ فتوحات ملکِ مغرب) ایک راہ پر ہولئے (اور سفر کرنا شروع کیا) یہاں تک کہ جب (سفر کرتے کرتے درمیانی شہروں کو فتح کرتے ہوئے) غروبِ آفتاب کے موقع (یعنی جانبِ مغرب میں انتہائی آبادی) پر پہونچے تو آفتاب ان کو ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا (مراد اس سے غالباً سمندر ہے کہ اس کا پانی اکثر جگہ سیاہ نظر آتا ہے، اور اگرچہ آفتاب حقیقۃً سمندر میں غروب نہیں ہوتا مگر سمندر سے آگے نگاہ نہ جاتی ہو تو سمندر ہی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوگا) اور اس موقع پر انھوں نے ایک قوم دیکھی (جن کے کافر ہونے پر اگلی آیت اَمَّا مَنْ ظَلَمَ دلالت کرتی ہے) ہم نے (بصورتِ الہام یا اس زمانے کے پیغمبر کے واسطے سے) یہ کہا کہ اے ذوالقرنین (اس قوم کے بارے میں دو اختیار ہیں) خواہ (ان کو ابتدا ہی سے قتل وغیرہ کے ذریعہ) سزا دو اور خواہ ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کرو (یعنی ان کو ایمان کی دعوت دو پھر نہ مانیں تو قتل کردو، بغیر تبلیغ و دعوت کے ابتداءً ہی قتل کرنیکا اختیار شاید اس لئے دیا گیا ہو کہ ان کو اس سے پہلے کسی ذریعہ سے دعوتِ ایمان پہونچ چکی ہوگی، لیکن دوسری صورت یعنی پہلے دعوت پھر قتل کا بہتر ہونا اشارہ سے بیان کر دیا، کہ اس دوسری صورت کو اتخاذِ حسن سے تعبیر فرمایا) ذوالقرنین نے عرض کیا کہ (میں دوسری ہی صورت اختیار کر کے پہلے ان کو دعوتِ ایمان دوں گا) لیکن (دعوتِ ایمان کے بعد) جو ظالم (یعنی کافر) رہے گا سو اس کو تو ہم لوگ (قتل وغیرہ کی) سزا دیں گے (اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) پھر وہ (مرنے کے بعد) اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو (دوزخ کی) سخت سزا دے گا، اور جو شخص (دعوتِ ایمان کے بعد) ایمان لے آئے گا

اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لئے (آخرت میں بھی) بدلے میں بھلائی ملے گی اور ہم بھی (دنیا میں)
اپنے برتاؤ میں اس کو آسان (اور نرم) بات کہیں گے (یعنی ان پر کوئی عملی سختی تو کیا کی جاتی زبانی اور
قولی بھی کوئی سختی نہیں کی جائے گی)

معارف و مسائل

یَسْـَٔلُوْنَكَ (یعنی وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں) یہ لوگ سوال کرنے والے کون ہیں
روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قریشِ مکہ تھے، جن کو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی نبوت اور حقانیت کا امتحان کرنے کے لئے تین سوال بتلائے تھے، رُوح کے متعلق اور اصحاب
کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں، ان میں دو کا جواب آچکا ہے، اصحاب کہف کا قصہ ابھی گذرا
ہے، اور روح کا سوال پچھلی سورۃ کے آخر میں گذر چکا ہے، یہ تیسرا سوال ہے کہ ذوالقرنین کون تھا
اور اس کو کیا حالات پیش آئے (بحر محیط)

ذوالقرنین کون تھے؟ کس زمانے اور کس ملک میں تھے؟ اور ان کو ذوالقرنین کہنے کی وجہ

ذوالقرنین کا نام ذوالقرنین کیوں ہوا، اس کی وجہ میں بے شمار اقوال اور سخت اختلافات ہیں، بعض نے کہا کہ ان کی دو زلفیں تھیں اس لئے ذوالقرنین کہلائے، بعض نے کہا کہ مشرق و مغرب کے ممالک پر حکمران ہوئے اس لئے ذوالقرنین نام رکھا گیا، کسی نے یہ بھی کہا کہ
ان کے سر پر کچھ ایسے نشانات تھے جیسے سینگ کے ہوتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ ان کے
سر پر دونوں جانب چوٹ کے نشانات تھے اس لئے ذوالقرنین کہا گیا، واللہ اعلم، مگر اتنی بات
متعین ہے کہ قرآن نے خود ان کا نام ذوالقرنین نہیں رکھا، بلکہ یہ نام یہود نے
بتلایا ان کے یہاں اس نام سے ان کی شہرت ہوگی، واقعۂ ذوالقرنین کا جتنا حصہ قرآن کریم
نے بتلایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ:-

"وہ ایک صالح عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہونچے اور ان کے
ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے
ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے عطا کر دیئے
گئے تھے، انھوں نے فتوحات کرتے ہوئے تین اطراف میں سفر کئے، مغرب
اقصیٰ تک اور مشرق اقصیٰ تک، پھر جانب شمال میں کوہستانی سلسلے تک،
اسی جگہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار
کے ذریعہ بند کر دیا جس سے یاجوج ماجوج کی تاخت و تاراج سے اس علاقہ کے لوگ محفوظ ہوگئے"

یہود نے جو سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور نبوت کا امتحان کرنے کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس جواب سے مطمئن ہوگئے، انھوں نے مزید یہ سوالات نہیں کئے، کہ ان کا نام ذوالقرنین کیوں تھا، یہ کس ملک میں اور کس زمانے میں تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کو خود یہود نے بھی غیر ضروری اور فضول سمجھا، اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تاریخ و قصص کا صرف اتنا حصہ ذکر کرتا ہے جس سے کوئی فائدہ دین یا دنیا کا متعلق ہو، یا جس پر کسی ضروری چیز کا سمجھنا موقوف ہو، اس لئے نہ قرآن کریم نے ان چیزوں کو بتلایا اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی یہ تفصیلات بیان کی گئیں، اور نہ قرآن مجید کی کسی آیت کا سمجھنا ان چیزوں کے علم پر موقوف ہے، اسی لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اب معاملہ صرف تاریخی روایات کا یا موجودہ تورات و انجیل کا رہ گیا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کو بھی مسلسل تحریفات نے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت میں نہیں چھوڑا، ان کا مقام بھی اب زیادہ سے زیادہ ایک تاریخ ہی کا ہو سکتا ہے، اور زمانۂ قدیم کی تاریخی روایات زیادہ تر اسرائیلی قصوں کہانیوں سے ہی پُر ہیں، جن کی نہ کوئی سند ہے، نہ وہ کسی زمانے کے عقلاء و حکماء کے نزدیک قابلِ اعتماد پائی گئی ہیں، حضرات مفسرین نے بھی اس معاملہ میں جو کچھ لکھا وہ سب انہی تاریخی روایات کا مجموعہ ہے، اسی لئے ان میں اختلافات بے شمار ہیں، اہلِ یورپ نے اس زمانے میں تاریخ کو بڑی اہمیت دی، اس پر تحقیق و تفتیش میں بلاشبہ بڑی محنت و کاوش سے کام لیا آثارِ قدیمہ کی کھدائی اور وہاں کے کتبات وغیرہ کو جمع کر کے ان کے ذریعہ قدیم واقعات کی حقیقت تک پہونچنے میں وہ کام انجام دیئے جو اس سے پہلے زمانہ میں نظر نہیں آتے، لیکن آثارِ قدیمہ اور ان کے کتبات سے کسی واقعہ کی تائید میں مدد تو مل سکتی ہے مگر خود ان سے کوئی واقعہ پورا نہیں پڑھا جا سکتا، اس کے لئے تو تاریخی روایات ہی بنیاد بن گئی ہیں، اور ان معاملات میں زمانۂ قدیم کی تاریخی روایات کا حال ابھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، قدیم و جدید علماءِ تفسیر نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایات ایک تاریخی حیثیت ہی سے نقل کی ہیں، جن کی صحت پر کوئی قرآنی مقصد موقوف نہیں، یہاں بھی اسی حیثیت سے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے، اس واقعہ کی پوری تفتیش و تحقیق مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں لکھی ہے، تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ پوری دنیا پر سلطنت و حکومت کرنے والے چار بادشاہ ہوئے ہیں، دو مؤمن اور دو کافر، مؤمن بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں،

اور کافر نمرود اور بخت نصر ہیں۔

ذوالقرنین کے معاملہ میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس نام سے دنیا میں متعدد آدمی مشہور ہوئے ہیں، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہر زمانے کے ذی القرنین کے ساتھ لقب سکندر بھی شامل ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک بادشاہ سکندر کے نام سے معروف و مشہور ہے جس کو سکندر یونانی، مقدونی، رومی وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا وزیر ارسطو تھا، اور جس کی جنگ دارا سے ہوئی، اور اسے قتل کر کے اس کا ملک فتح کیا، سکندر کے نام سے دنیا میں معروف ہونے والا آخری شخص یہی تھا، اسی کے قصے دنیا میں زیادہ مشہور ہیں بعض لوگوں نے اس کو بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین کہہ دیا، یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ شخص آتش پرست مشرک تھا، قرآن کریم نے جس ذوالقرنین کا ذکر کیا ہے، ان کے نبی ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مومن صالح ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور خود قرآن کی نصوص اس پر شاہد ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بحوالہ ابن عساکر اس کا پورا نسب نامہ لکھا ہے، جو اوپر جا کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملتا ہے، اور فرمایا کہ یہی وہ سکندر ہے جو یونانی مصری مقدونی کے ناموں سے معروف ہے، جس نے اپنے نام پر شہر اسکندریہ آباد کیا، اور روم کی تاریخ اسی کے زمانے سے چلتی ہے، اور یہ سکندر ذی القرنین اول سے ایک طویل زمانے کے بعد ہوا ہے، جو دو ہزار سال سے زائد بتلایا جاتا ہے، اسی نے دارا کو قتل کیا اور شاہانِ فارس کو مغلوب کر کے ان کا ملک فتح کیا، مگر یہ شخص مشرک تھا، اس کو قرآن میں مذکور ذوالقرنین قرار دینا سراسر غلطی ہے، ابن کثیر کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

فاما ذوالقرنین الثانی فہو اسکندر بن فیلبس بن مصریم بن ہرمس بن میطون بن رومی بن لنطی بن یونان بن یافث بن یونہ بن شرخون بن رومہ بن شرخط بن توفیل بن رومی بن الاصفر بن یقز بن العیص بن اسحٰق بن ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کذا نسبہ الحافظ ابن عساکر فی تاریخہ المقدونی، الیونانی المصری بانی الاسکندریۃ الذی یؤرخ بایامہ الروم وکان متأخراً عن الاول بدہر طویل وکان ہذا قبل المسیح بنحو من ثلثمائۃ سنۃ وکان ارطاطالیس الفیلسوف وزیرہ وہو الذی قتل دارا و اذل ملوک الفرس واوطأ ارضہم وانما نبہنا علیہ لان کثیراً من الناس یعتقد انہما واحد وان المذکور فی القرآن ہو الذی کان ارطاطالیس وزیرہ فیقع بسبب ذلک خطاء کبیر وفساد عریض طویل فان الاول کان عبداً مؤمناً صالحاً وملکاً

عادلاً وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیاً علی ماقررناہ قبل ھذا واما الثانی فکان مشرکا کان وزیرہ فیلسوفاً وقد کان بین زمانیھما ازید من الفی سنۃ فاین ھذا من ھذا لا یستویان ولا یشتبھان الا علی غبی لا یعرف حقائق الامور (البدایۃ والنہایۃ ص ۱۰۶ ج ۲)

حدیث وتاریخ کے امام ابن کثیر کی اس تحقیق سے ایک تو یہ مغالطہ رفع ہوا کہ یہ اسکندر جو حضرت مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے گذرا ہے، اور جس کی جنگ دارا اور ملوک فارس سے ہوئی، اور بانی اسکندریہ ہے، یہ وہ ذوالقرنین نہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، یہ مغالطہ بعض اکابر مفسرین کو بھی لگا ہے، ابوحیان نے بحر محیط میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو ذوالقرنین مذکور فی القرآن کہہ دیا ہے۔

دوسری بات وَاِنَّہٗ کَانَ نَبِیّاً کے جملے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن کثیر کے نزدیک ان کا نبی ہونا راجح ہے، اگرچہ جمہور کے نزدیک راجح وہ قول ہے جو خود ابن کثیر نے بروایت ابی الطفیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ نہ وہ نبی تھے نہ فرشتہ بلکہ ایک نیک صالح مسلمان تھے اسی لئے بعض علماء نے یہ توجیہ کی کہ اِنَّہٗ کَانَ کی ضمیر ذوالقرنین کی طرف نہیں خضر علیہ السلام کی طرف راجع ہے، وہو الاقرب۔

اب مسئلہ یہ رہتا ہے کہ پھر وہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے کون ہیں اور کس زمانے میں ہوئے ہیں، اس کے متعلق بھی علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں، ابن کثیر کے نزدیک ان کا زمانہ اسکندر یونانی مقدونی سے دو ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے اور ان کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں سلف صالحین سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ذوالقرنین پیادہ پا حج کے لئے پہونچے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے آنے کا علم ہوا تو مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا، اور حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کے لئے دعاء بھی کی اور کچھ وصیتیں اور نصیحتیں بھی ان کو فرمائیں (البدایہ ص ۱۰۸ ج ۲) اور تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ ازرقی نقل کیا ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ طواف کیا، پھر قربانی دی۔

اور ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیۃ میں کہا ہے کہ یہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے ابوبکر بن سمی بن عمر بن افریقیس حمیری ہے، جس نے زمین کے مشارق ومغارب کو فتح کیا، اور تُبّع حمیری یمنی نے اپنے اشعار میں اس پر فخر کیا ہے کہ میرے دادا ذوالقرنین مسلمان تھے، ان کے اشعار یہ ہیں ؎

قد کان ذو القرنین جدی مسلماً ؛ ملکاً علا فی الارض غیر مبعّد

بَلَغَ الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ يَبْتَغِي ٭ أَسْبَابَ مُلْكٍ مِنْ كَرِيمٍ سَيِّدِ

یہ روایت بحر محیط میں ابوحیّان نے نقل کی ہے، ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں اس کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ ذوالقرنین تبابعۂ یمن میں سب سے پہلا تُبّع ہے، اور یہی وہ شخص ہے جس نے بیر سبع کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فیصلہ دیا تھا (البدایہ ص ۱۰۵ ج ۲) ان تمام روایات میں ان کی شخصیت اور نام و نسب کے بارے میں اختلاف ہونے کے باوجود ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ بتلایا گیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں جو ذوالقرنین کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن فارس کا وہ بادشاہ ہے جس کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں جس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے دانیال ؑ کا زمانہ بتلایا جاتا ہے، جو سکندر مقدونی قاتل دارا کے زمانے کے قریب قریب ہو جاتا ہے، مگر مولانا موصوف نے بھی ابن کثیر وغیرہ کی طرح اس کا شدت سے انکار کیا ہے کہ ذوالقرنین وہ سکندر مقدونی جس کا وزیر ارسطو تھا وہ نہیں ہو سکتا، وہ مشرک آتش پرست تھا، یہ مؤمن صالح تھے۔

مولانا موصوف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورۂ بنی اسرائیل میں جو دو مرتبہ بنی اسرائیل کے شر و فساد میں مبتلا ہونے اور دونوں مرتبہ کی سزا کا ذکر تفصیل سے آیا ہے اس میں بنی اسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر جو قرآن کریم نے فرمایا ہے بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ (یعنی تمہارے فساد کی سزا میں ہم مسلّط کردیں گے تم پر اپنے کچھ ایسے بندے جو بڑی قوت و شوکت والے ہوں گے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑیں گے) اس میں یہ قوت و شوکت والے لوگ بخت نصر اور اس کے اعوان ہیں جنھوں نے بیت المقدس میں چالیس ہزار اور بعض روایات میں ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا، اور اس کے بعد جو قرآن کریم نے فرمایا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (یعنی ہم نے پھر لوٹا دیا تمہارا غلبہ کو اُن پر) یہ واقعہ اسی کیخسرو خورس بادشاہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا، یہ مؤمن صالح تھا، اس نے بخت نصر کا مقابلہ کر کے اس کے قیدی بنی اسرائیل کو اس کے قبضہ سے نکالا، اور دوبارہ فلسطین میں آباد کیا، بیت المقدس کو جو ویران کر دیا تھا اس کو بھی دوبارہ آباد کیا، اور بیت المقدس کے خزائن اور اہم سامان جو بخت نصر یہاں سے لے گیا تھا وہ سب

واپس بنی اسرائیل کے قبضہ میں دیئے، اس لئے یہ شخص بنی اسرائیل (یہود) کا نجات دہندہ ثابت ہوا۔

یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہودِ مدینہ نے جو امتحانِ نبوّت کے لئے قریشِ مکہ کے واسطے سوالات متعین کئے ان میں ذوالقرنین کے سوال کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ یہود اس کو اپنا نجات دہندہ مان کر اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی اس تحقیق پر موجودہ تورات کے حوالہ سے انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں سے پھر تاریخی روایات سے اس پر کافی شواہد پیش کئے ہیں، جو صاحب مزید تحقیق کے درپے ہوں وہ اس کا مطالعہ کرسکتے ہیں، میرا مقصد ان تمام روایات کے نقل کرنے سے صرف اتنا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے زمانے کے بارے میں علماءِ امت اور ائمہ تاریخ و تفسیر کے اقوال سامنے آجائیں، ان میں سے راجح کس کا قول ہے یہ میرے مقصد کا جزء نہیں، کیونکہ جن امور کا نہ قرآن نے دعویٰ کیا نہ حدیث نے ان کو بیان کیا، ان کے معیّن و مبیّن کرنے کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں، اور ان میں جو قول بھی راجح اور صحیح قرار پائے مقصد قرآنی ہر حال میں حاصل ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم، آگے آیات کی تفسیر دیکھئے:

قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا، اس میں یہ قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ ذِكْرَهٗ کا مختصر لفظ چھوڑ کر مِنْهُ ذِكْرًا کے دو کلمے کیوں اختیار کئے، غور کیجئے تو ان دو کلموں میں اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کا پورا قصہ اور اس کی تاریخ ذکر کرنے کا وعدہ نہیں کیا، بلکہ اس کے ذکر کا ایک حصہ بیان کرنے کے لئے فرمایا، جس پر حرف مِنْ اور ذِكْرًا کی تنوین بقواعدِ عربیت شاہد ہے، اوپر جو تاریخی بحث ذوالقرنین کے نام و نسب اور زمانے وغیرہ کی لکھی گئی ہے، قرآن کریم نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دینے کا پہلے ہی اظہار فرما دیا ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا، لفظ سبب عربی لغت میں ہر اس چیز کیلئے بولا جاتا ہے جس سے اپنے مقصد حاصل کرنے میں مدد لی جاتی ہے، جس میں آلات و وسائل مادیہ بھی شامل ہیں اور علم و بصیرت و تجربہ وغیرہ بھی (بحر محیط) اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد وہ تمام امور ہیں، جن کی ضرورت نظامِ سلطنت کے لئے ایک بادشاہ اور حکمران کو پیش آتی ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو اپنی عدل گستری اور امنِ عالم کے قیام اور فتوحات ممالک کے لئے جس جس سامان کی ضرورت اس زمانے میں تھی وہ سب کے سب اُن کو عطا کر دیئے گئے تھے۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا، مراد یہ ہے کہ سامان تو ہر قسم کے اور دنیا کے ہر خطہ میں پہونچنے کے ان کو دیدیئے گئے تھے، انھوں نے سب سے پہلے جانبِ مغرب سفر کے سامان سے کام لیا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ، مراد یہ ہے کہ جانبِ مغرب میں اُس حد تک پہنچ گئے جس سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔

فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ، لفظ حمئۃ کے لغوی معنی سیاہ دلدل یا کیچڑ کے ہیں، مراد اس سے وہ پانی ہے جس کے نیچے سیاہ کیچڑ ہو جس سے پانی کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا ہو، اور آفتاب کو ایسے چشمے میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آفتاب اس چشمے میں ڈوب رہا ہے کیونکہ آگے آبادی یا کوئی خشکی سامنے نہیں تھی، جیسے آپ کسی ایسے میدان میں غروب کے وقت ہوں جہاں دور تک جانبِ مغرب میں کوئی پہاڑ، درخت، عمارت نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب زمین کے اندر گھس رہا ہے۔

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا، یعنی اس سیاہ چشمے کے پاس ذوالقرنین نے ایک قوم کو پایا آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کافر تھی، اس لئے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیدیا کہ آپ چاہیں تو ان سب کو پہلے ان کے کفر کی سزا دیدیں، اور چاہیں تو ان سے احسان کا معاملہ کریں، کہ پہلے دعوت و تبلیغ اور وعظ و پند سے ان کو اسلام و ایمان قبول کرنے پر آمادہ کریں، پھر ماننے والوں کو اس کی جزاء اور نہ ماننے والوں کو سزا دیں جس کے جواب میں ذوالقرنین نے دوسری ہی صورت کو تجویز کیا، کہ اوّل ان کو وعظ و نصیحت سے صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں گے، پھر جو کفر پر قائم رہے ان کو سزا دیں گے، اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کو اچھا بدلہ دیں گے۔

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو حق تعالیٰ نے خود خطاب کرکے یہ ارشاد فرمایا ہے، اگر ذوالقرنین کو نبی قرار دیا جائے تب تو اس میں کوئی اشکال ہی نہیں کہ بذریعہ وحی ان سے کہہ دیا گیا، اور اگر ان کی نبوّت تسلیم نہ کی جائے تو پھر اس قُلْنَا اور يٰذَا الْقَرْنَيْنِ کے خطاب کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پیغمبر کے واسطہ سے یہ خطاب ذوالقرنین کو کیا گیا ہے، جیسا کہ روایات میں حضرت خضرؑ کا ان کے ساتھ ہونا مذکور ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وحی نبوّت و رسالت نہ ہو، ایسی لغوی وحی ہو، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے قرآن میں وَاَوْحَيْنَا کے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ اُن کے نبی یا رسول ہونے کا کوئی احتمال نہیں، مگر ابوحیان نے بحرِ محیط میں فرمایا کہ ذوالقرنین کو جو یہاں حکم دیا گیا ہے، وہ اس قوم کے قتل و سزا کا حکم ہے اس طرح کا کوئی حکم بغیر وحیِ نبوّت کے نہیں دیا جاسکتا، یہ کام نہ کشف و الہام ہو سکتا ہے نہ بغیر وحیِ نبوّت کے کسی اور ذریعہ سے، اس لئے اس کے سوا کوئی احتمال صحیح نہیں کہ یا تو ذوالقرنین کو خود نبی مانا جائے یا پھر کوئی نبی ان کے زمانے میں موجود ہوں ان کے ذریعہ ان کو خطاب ہوتا ہو، واللہ اعلم۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ

پھر لگا ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج نکلنے کی جگہ پایا اس کو کہ نکلتا ہے

عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ

ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے اُن کے لئے آفتاب سے ورے کوئی حجاب، یوں ہی ہے اور

قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

ہمارے قابو میں آچکی ہے اس کے پاس کی خبر۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (ممالک مغربیہ فتح کر کے مشرقی ممالک فتح کرنے کے ارادہ سے مشرق کی طرف) ایک راہ پر ہولئے یہاں تک کہ جب طلوعِ آفتاب کے موقع پر (یعنی جانب مشرق میں منتہائی آبادی پر) پہونچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جن کے لئے ہم نے آفتاب کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی (یعنی اس جگہ ایک ایسی قوم آباد تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ وغیرہ بنانے کے عادی نہ تھے، بلکہ شاید لباس بھی نہ پہنتے ہوں، جانوروں کی طرح کھلے میدان میں رہتے تھے) یہ قصہ اسی طرح ہے، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ (سامان وغیرہ) تھا ہم کو اس کی پوری خبر ہے (اس میں امتحانِ نبوّت کے لئے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرنے والوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ہم جو کچھ بتلا رہے ہیں وہ علم و خبر کی بنیاد پر ہے، عام تاریخی کہانیوں کی طرح نہیں، تاکہ نبوّتِ محمدیہ کی حقانیت واضح ہوجائے)

معارف و مسائل

ذوالقرنین نے مشرق کی جانب میں جو قوم آباد پائی، اس کا یہ حال تو قرآن کریم نے ذکر فرمایا کہ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی سامان، مکان، خیمہ، لباس وغیرہ کے ذریعہ نہ کرتے تھے، لیکن ان کے مذہب و اعمال کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اور نہ یہ کہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کافر ہی تھے، اور ذوالقرنین نے ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو مغربی قوم کے ساتھ اوپر مذکور ہوچکا ہے، مگر اس کے بیان کرنے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں سمجھی کہ پچھلے واقعہ پر قیاس کر کے اس کا بھی علم ہوسکتا ہے (کذا فی البحر المحیط عن ابن عطیہ)

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا

پھر لگا ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا دو پہاڑوں کے بیچ، پائے اُن سے ورے ایک

قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ

لوگ جو لگتے نہیں کہ سمجھیں ایک بات، بولے اے ذوالقرنین! یہ

يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا

یاجوج و ماجوج دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں سو تو کہے تو ہم مقرر کردیں تیرے

عَلَىٰٓ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي

واسطے کچھ محصول اس شرط پر کہ بنادے تو ہم میں اور ان میں ایک آڑ، بولا جو مقدور دیا مجھ کو میرے رب نے وہ

خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي

بہتر ہے سو مدد کرو میری محنت میں بنادوں تمہارے اور ان کے بیچ ایک دیوار موٹی، لادو مجھ کو

زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ

تختے لوہے کے، یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پھانکوں تک پہاڑ کی کہا دھونکو،

حَتَّىٰٓ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوٓا

یہاں تک کہ جب کر دیا اس کو آگ، کہا لاؤ میرے پاس کہ ڈالوں اس پر پگھلا ہوا تانبا، پھر نہ چڑھ سکیں

أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ

اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ، بولا یہ ایک مہربانی ہے میرے

مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ

رب کی پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا گرادے اس کو ڈھاکر اور ہے وعدہ

رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾

میرے رب کا سچا۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (مغرب و مشرق فتح کر کے) ایک اور راہ پر ہولئے (قرآن میں اس سمت کا نام نہیں لیا مگر آبادی زیادہ جانب شمال ہی ہے، اس لئے مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں) یہاں تک کہ جب ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا پہونچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو (زبان اور لغت سے ناواقف وحشیانہ زندگی کی وجہ سے) کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہونچتے تھے (ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف زبان سے ناواقفیت نہ تھی، کیونکہ سمجھ بوجھ ہو تو غیر زبان والے کی باتیں بھی کچھ اشارے کنائے سے سمجھی جا سکتی ہیں، بلکہ وحشیانہ زندگی نے سمجھ بوجھ سے بھی دُور رکھا تھا مگر پھر شاید کسی ترجمان کے واسطے سے) انھوں نے عرض کیا اے ذوالقرنین قوم یاجوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں ہماری) اس سرزمین میں (کبھی کبھی آکر) بڑا فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارتگری کرتے ہیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں) سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں (کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں) ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جس مال میں میرے رب نے مجھ کو (تصرف کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندہ جمع کرنے اور مال دینے کی تو ضرورت نہیں، البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی محنت مزدوری) سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں گا (اچھا تو) تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (قیمت ہم دیں گے، ظاہر یہ ہے کہ اس آہنی دیوار بنانے کے لئے اور بھی ضرورت کی چیزیں منگوائی ہوں گی، مگر یہاں وحشی ملک میں سب سے زیادہ کم یاب چیز لوہے کی چادریں تھیں، اس لئے ان کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا، سب سامان جمع ہو جانے پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا) یہاں تک کہ جب (اس دیوار کے ردّے ملاتے ملاتے) ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (کے خلاء) کو (پہاڑوں کے) برابر کر دیا تو حکم دیا کہ دھونکو (دھونکنا شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال انگارا کر دیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ (جو پہلے سے تیار کرا لیا ہوگا) کہ اس پر ڈال دوں (چنانچہ یہ پگھلا ہوا تانبا لایا گیا اور آلات کے ذریعہ اوپر سے چھوڑ دیا گیا کہ دیوار کی تمام درزوں میں گھس کر پوری دیوار ایک ذات ہو جائے، اس کا طول و عرض خدا کو معلوم ہے) تو (اس کی بلندی

اور چکناہٹ کے سبب) نہ تو یاجوج ماجوج اس پر چڑھ سکتے اور نہ اس میں (غایت استحکام کے سبب کوئی) نقب لگا سکتے تھے، ذوالقرنین نے (جب اس دیوار کو تیار دیکھا جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو بطور شکر کے) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر بھی کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہوگیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یاجوج ماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا) تو اس کو ڈھا کر (زمین کے) برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (اور اپنے وقت پر ضرور واقع ہوتا ہے) ۔

معارف و مسائل

لغات مشکلہ کا حل | بَيْنَ السَّدَّيْنِ لفظ سَدّ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ بن جائے خواہ دیوار ہو یا پہاڑ اور قدرتی ہو یا مصنوعی، یہاں سدّین سے دو پہاڑ مراد ہیں، جو یاجوج ماجوج کے راستہ میں رکاوٹ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیانی درّے سے وہ حملہ آور ہوتے تھے جس کو ذوالقرنین نے بند کیا۔

زُبَرَ الْحَدِيْدِ، زبر، زبرہ کی جمع ہے، جس کے معنی تختی یا چادر کے ہیں، مراد لوہے کے ٹکڑے ہیں جن کو اس درّہ کو بند کرنے والی دیوار میں اینٹ پتھر کے بجائے استعمال کرنا تھا۔

الصَّدَفَيْنِ، دو پہاڑوں کی دو جانبیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں۔

قِطْرًا، قطر کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلے ہوئے تانبے کے ہیں، بعض نے پگھلے ہوئے لوہے یا رانگ کو بھی قطر کہا ہے (قرطبی)

دَكَّاءَ، یعنی ریزہ ریزہ ہو کر زمین کے برابر ہوجانے والی۔

یاجُوج ماجُوج کون ہیں اور کہاں ہیں، سَدِّ ذوالقرنین کس جگہ ہے؟

ان کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سروپا عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں، جن کو بعض حضرات مفسرین نے بھی تاریخی حیثیت سے نقل کر دیا ہے، مگر وہ خود ان کے نزدیک بھی قابلِ اعتماد نہیں، قرآن کریم نے ان کا مختصر سا حال اجمالاً بیان کیا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدرِ ضرورت تفصیلات سے بھی امت کو آگاہ کر دیا، ایمان لانے اور اعتقاد رکھنے کی چیز صرف اتنی ہی ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں آ گئی ہے، اس سے زائد تاریخی اور جغرافیائی حالات جو مفسرین محدثین اور مؤرخین نے ذکر کئے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، ان میں جو اہلِ تاریخ کے اقوال مختلف ہیں وہ قرائن اور قیاسات

اور تخمینوں پر مبنی ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی اثر قرآنی ارشادات پر نہیں پڑتا ۔

میں اس جگہ پہلے وہ احادیث نقل کرتا ہوں جو اس معاملے میں محدثین کے نزدیک صحیح یا قابلِ اعتماد ہیں اس کے بعد بقدر ضرورت تاریخی روایات بھی لکھی جاویں گی ۔

یاجوج ماجوج کے متعلق روایاتِ حدیث

قرآن و سنت کی تصریحات سے اتنی بات تو بلاشبہ ثابت ہے کہ یاجوج ماجوج انسانوں ہی کی قومیں ہیں عام انسانوں کی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، کیونکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ، یعنی طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہیں اور رہیں گے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہوں گے ، تاریخی روایات اس پر متفق ہیں کہ وہ یافث کی اولاد میں ہیں ، ایک ضعیف حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ، ان کے باقی حالات کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی اور صحیح حدیث حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی ہے جس کو صحیح مسلم اور تمام مستند کتب حدیث میں نقل کیا گیا ہے اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے ، اس میں خروجِ دجال ، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام پھر خروج یاجوج ماجوج وغیرہ کی پوری تفصیل مذکور ہے ، اس پوری حدیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کے وقت دجّال کا تذکرہ فرمایا ، اور تذکرہ فرماتے ہوئے بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے اس کا حقیر و ذلیل ہونا معلوم ہوتا تھا (مثلاً یہ کہ وہ کانا ہے) اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا فتنہ سخت اور عظیم ہے (مثلاً جنت و دوزخ کا اس کے ساتھ ہونا اور دوسرے خوارقِ عادات) ۔ آپ کے بیان سے ہم پر ایسا خوف طاری ہوا کہ گویا دجّال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے (یعنی قریب ہی موجود ہے) جب ہم شام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے قلبی تاثرات کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ تم نے کیا سمجھا ؟ ہم نے عرض کیا کہ آپ نے دجّال کا تذکرہ فرمایا اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں جن سے اس کا معاملہ حقیر اور آسان معلوم ہوتا تھا ، اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی قوت ہوگی اس کا فتنہ بڑا عظیم ہے ، ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے قریب ہی وہ کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے ، تمہارے بارے میں جن فتنوں کا مجھے خوف ہے ان میں دجّال کی بہ نسبت دوسرے فتنے زیادہ قابلِ خوف ہیں ، (یعنی دجّال کا فتنہ اتنا عظیم نہیں جتنا تم نے سمجھ لیا ہے) اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو میں اس کا مقابلہ خود کر دوں گا ، (تمہیں اس کے فکر کی ضرورت نہیں) اور اگر وہ میرے بعد آیا تو

ہر شخص اپنی ہمت کے موافق اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے گا، حق تعالیٰ میری غیر موجودگی میں ہر مسلمان کا ناصر اور مددگار ہے، (اس کی علامت یہ ہے) کہ وہ نوجوان سخت پیچدار بالوں والا ہے، اس کی ایک آنکھ اوپر کو ابھری ہوئی ہے، (اور دوسری آنکھ سے کانا ہے، جیسا کہ دوسری روایات میں ہے) اور اگر میں (اس کی قبیح صورت میں) اس کو کسی کے ساتھ تشبیہ دے سکتا ہوں تو وہ عبدالعزیٰ بن قطن ہے (یہ زمانۂ جاہلیت میں بنو خزاعہ قبیلہ کا ایک بدشکل شخص تھا) اگر تم میں سے کسی مسلمان کا دجال کے ساتھ سامنا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ لے، (اس سے دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا) دجال شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا، اور ہر طرف فساد مچائے گا، اے اللہ کے بندو! اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔

ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ وہ زمین میں کس قدر مدت رہے گا، آپؐ نے فرمایا وہ چالیس دن رہے گا، لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، اور دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا، اور تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا ہم اس میں صرف ایک دن کی (پانچ نمازیں) پڑھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، بلکہ وقت کا اندازہ کر کے پورے سال کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی، پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ وہ زمین میں کس قدر سرعت کے ساتھ سفر کریگا فرمایا اس ابر کے مانند تیز چلے گا جس کے پیچھے موافق ہوا لگی ہوئی ہو، پس دجال کسی قوم کے پاس سے گذرے گا ان کو اپنے باطل عقائد کی دعوت دے گا، وہ اس پر ایمان لائیں گے تو وہ بادلوں کو حکم دے گا تو وہ برسنے لگیں گے، اور زمین کو حکم دے گا تو وہ سرسبز و شاداب ہو جائیگی (اور ان کے مویشی اس میں چریں گے) اور شام کو جب واپس آئیں گے تو ان کے کوہان پہلے کی بہ نسبت بہت اونچے ہوں گے، اور تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے، اور ان کی کوکھیں پُر ہوں گی، پھر دجال کسی دوسری قوم کے پاس سے گذرے گا اور ان کو بھی اپنے کفر و اضلال کی دعوت دے گا، لیکن وہ اس کی باتوں کو رد کر دیں گے، وہ ان سے مایوس ہو کر چلا جائے گا تو یہ مسلمان لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ان کے پاس کچھ مال نہ رہے گا، اور ویران زمین کے پاس سے اس کا گذر ہوگا، تو وہ اس کو خطاب کرے گا کہ اپنے خزانوں کو باہر لے آ، چنانچہ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے، جیسا کہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے ہو لیتی ہیں، پھر دجال ایک آدمی کو بلائے گا جس کا شباب پورے زور دل پر ہوگا، اس کو تلوار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا، اور دونوں ٹکڑے اس قدر فاصلہ پر کر دیئے جائیں گے جس قدر تیر مارنیوالے اور نشانہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے، پھر وہ اس کو بلائے گا، وہ (زندہ ہو کر) دجال کی طرف

اس کے اس فعل پر ہنستا ہوا روشن چہرے کے ساتھ آجائے گا، در یں اثنا حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے، چنانچہ وہ دو رنگ دار چادریں پہنے ہوئے دمشق کی مشرقی جانب کے سفید مینارہ پر اس طرح نزول فرمائیں گے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے، جب اپنے سر مبارک کو نیچے کریں گے تو اس سے پانی کے قطرات جھڑیں گے (جیسے کوئی ابھی غسل کر کے آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جو موتیوں کی طرح صاف ہوں گے گریں گے، جس کافر کو آپ کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ وہیں مرجائے گا، اور آپ کا سانس اس قدر دور پہنچے گا، جس قدر دور آپ کی نگاہ جائے گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے، یہاں تک کہ آپ اُسے بابِ لُدّ پر جا پکڑیں گے (یہ بستی اب بھی بیت المقدس کے قریب اسی نام سے موجود ہے) وہاں اس کو قتل کر دیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے، اور (بطور شفقت کے) ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے، اور جنت میں اعلیٰ درجات کی ان کو خوش خبری سنائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی اسی حال میں ہوں گے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ میں اپنے بندوں میں ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کے مقابلہ کی کسی کو طاقت نہیں، آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہِ طور پر چلے جائیں (چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے) اور حق تعالیٰ یاجوج ماجوج کو کھول دیگا، تو وہ سرعتِ سیر کے سبب ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے، ان میں سے پہلے لوگ بحیرۂ طبریہ سے گذریں گے، اور اس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیں گے کہ جب ان میں سے دوسرے لوگ اس بحیرہ سے گذریں گے تو دریا کی جگہ کو خشک دیکھ کر کہیں گے کہ کبھی یہاں پانی ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کوہِ طور پر پناہ لیں گے، اور دوسرے مسلمان اپنے قلعوں اور محفوظ جگہوں میں پناہ لیں گے، کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوگا، مگر وہ کم پڑ جائیگا تو ایک بیل کے سر کو سو دینار سے بہتر سمجھا جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے مسلمان اپنی تکلیف دفع ہونے کے لئے حق تعالیٰ سے دعاء کریں گے (حق تعالیٰ دعاء قبول فرمائیں گے) اور ان پر وبائی صورت میں ایک بیماری بھیجیں گے، اور یاجوج ماجوج تھوڑی دیر میں سب کے سب مرجائیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہ طور سے نیچے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ زمین میں ایک بالشت جگہ بھی ان کی لاشوں سے خالی نہیں (اور لاشوں کے سڑنے کی وجہ سے) سخت تعفّن پھیلا ہوگا، (اس کیفیت کو دیکھ کر دوبارہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی حق تعالیٰ سے دعاء کریں گے (کہ یہ مصیبت بھی دفع ہو، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے) اور بہت بھاری بھر کم پرندوں کو بھیجیں گے، جن کی گردنیں اونٹ

کی گردن کے مانند ہوں گی، (وہ ان کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیں گے، بعض روایات میں ہے کہ دریا میں ڈالیں گے، پھر حق تعالیٰ بارش برسائیں گے، کوئی شہر اور جنگل ایسا نہ ہوگا جہاں بارش نہ ہوتی ہوگی، ساری زمین دھل جائے گی، اور شیشہ کے مانند صاف ہو جائیگی، پھر حق تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ اپنے پیٹ سے پھلوں اور پھولوں کو اگا دے، اور (از سرِ نو) اپنی برکات کو ظاہر کر دے، (چنانچہ ایسا ہی ہوگا اور اس قدر برکت ظاہر ہوگی، کہ ایک انار ایک جماعت کے کھانے کے لئے کفایت کریگا، اور لوگ اس کے چھلکے کی چھتری بنا کر سایہ حاصل کریں گے، اور دودھ میں اس قدر برکت ہوگی کہ ایک اونٹنی کا دودھ ایک بہت بڑی جماعت کے لئے کافی ہوگا، اور ایک گائے کا دودھ ایک قبیلہ کے سب لوگوں کو کافی ہو جائے گا، اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری کو کافی ہو جائے گا، (یہ غیر معمولی برکات اور امن و امان کا زمانہ چالیس[۴۰] سال رہنے کے بعد جب قیامت کا وقت آجائے گا تو) اس وقت حق تعالیٰ ایک خوشگوار ہوا چلائیں گے جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کی بغلوں کے نیچے ایک خاص بیماری ظاہر ہو جائے گی، اور سب کے سب وفات پا جائیں گے، اور باقی صرف شریر و کافر رہ جائیں گے، جو زمین پر کھلم کھلا حرام کاری جانوروں کی طرح کریں گے، ایسے ہی لوگوں پر قیامت آئے گی۔

اور حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کی روایت میں یاجوج و ماجوج کے قصہ کی زیادہ تفصیل آئی ہے، وہ یہ کہ بحیرۂ طبریہ سے گذرنے کے بعد یاجوج ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو سب کو قتل کر دیا ہے، لو اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں، چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اور وہ تیر حق تعالیٰ کے حکم سے خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے (تاکہ وہ احمق یہ سمجھ کر خوش ہوں کہ آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا)

اور دجال کے قصہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ دجال مدینہ منورہ سے دور رہے گا، اور مدینہ کے راستوں پر بھی اس کا آنا ممکن نہ ہوگا تو وہ مدینہ کے قریب ایک شور زمین کی طرف آئے گا، اس وقت ایک آدمی دجال کے پاس آئے گا، اور وہ آدمی اس وقت کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا، اور اس کو خطاب کر کے کہے گا کہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی (یہ سن کر) دجال کہنے لگے گا، لوگو! مجھے یہ بتلاؤ کہ اگر میں اس آدمی کو قتل کر دوں اور پھر اسے زندہ کر دوں تو میرے خدا ہونے میں شک کرو گے، وہ جواب دیں گے، نہیں،

چنانچہ وہ اس آدمی کو قتل کرے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا، تو وہ دجّال کو کہیگا کہ اب مجھے تیرے دجّال ہونے کا پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے، دجّال اس کو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کرے گا، لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا۔ (صحیح مسلم)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذریت میں سے بعث النار (یعنی جہنمی لوگ) اٹھائیے، وہ عرض کریں گے، اے رب وہ کون ہیں؟ تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے، صحابۂ کرام سہم گئے اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک جنتی کونسا ہوگا، تو آپؐ نے فرمایا غم نہ کرو، کیونکہ یہ نو سو ننانوے جہنمی تم میں سے ایک اور یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے،

اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دس حصے کئے، ان میں سے نو حصے یاجوج ماجوج کے ہیں اور باقی ایک حصہ میں باقی ساری دنیا کے انسان ہیں (روح المعانی)

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان روایات کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ یاجوج ماجوج کی تعداد ساری انسانی آبادی سے بیحد زائد ہے۔

مسند احمد اور ابوداؤد میں باسناد صحیح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد چالیس سال زمین پر رہیں گے، مسلم کی ایک روایت میں جو سات سال کا عرصہ بتلایا ہے حافظ نے فتح الباری میں اس کو مؤوّل یا مرجوح قرار دے کر چالیس سال ہی کا عرصہ صحیح قرار دیا ہے، اور حسبِ تصریحِ احادیث یہ پورا عرصہ امن وامان اور برکات کے ظہور کا ہوگا، بغض وعداوت آپس میں قطعاً نہ رہے گا، کبھی دو آدمیوں میں کوئی جھگڑا یا عداوت نہیں ہوگی (روایت مسلم واحمد)

بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج وعمرہ خروج یاجوج ماجوج کے بعد بھی جاری رہے گا (تفسیر مظہری)

بخاری ومسلم نے حضرت زینب بنت جحش ام المؤمنینؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک روز) نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سُرخ ہو رہا تھا، اور آپ کی زبانِ مبارک پر یہ جملے تھے،

لا الٰہ الا اللہ ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم	"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، خرابی ہے عرب کی اُس شر سے جو قریب آچکا ہے،

من ردم یاجوج وماجوج مثل ھذہ وحلق تسعین	آج کے دن یاجوج وماجوج کی ردم یعنی سدّ میں اتنا سوراخ کھل گیا ہے، اور

آپ نے عقد تسعین یعنی انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ملاکر حلقہ بناکر دکھلایا "

ام المؤمنینؓ فرماتی ہیں کہ اس ارشاد پر ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا ہم ایسے حال میں ہلاک ہوسکتے ہیں جبکہ ہمارے اندر صالحین موجود ہوں ؟ آپؐ نے فرمایا ہاں ہلاک ہوسکتے ہیں، جبکہ خبث (یعنی شر) کی کثرت ہوجائے (مثلہ فی الصحیحین عن ابی ہریرۃ رضؓ، کذا فی البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر) اور سدِّ یاجوج میں بقدر حلقہ سوراخ ہوجانا اپنے حقیقی معنی بھی ہوسکتا ہے، اور مجازی طور پر سدّ ذوالقرنین کے کمزور ہوجانے کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے (ابن کثیر، ابوحیان)

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج ہر روز سدِّ ذوالقرنین کو کھودتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس آہنی دیوار کے آخری حصّہ تک اتنے قریب پہونچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی روشنی نظر آنے لگے، مگر یہ کہہ کر لوٹ جاتے ہیں کہ باقی کو کل کھود کر پار کردیں گے، مگر اللہ تعالیٰ اس کو پھر ویسا ہی مضبوط درست کردیتے ہیں، اور اگلے روز پھر نئی محنت اس کے کھودنے میں کرتے ہیں، یہ سلسلہ کھودنے میں محنت کا اور پھر منجانب اللہ اس کی درستی کا اس وقت تک چلتا رہے گا جس وقت تک یاجوج ماجوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ان کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اس روز جب محنت کرکے آخری حد میں پہونچادیں گے اس دن یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل اس کو پار کرلیں گے (اللہ کے نام اور اس کی مشیت پر موقوف رکھنے سے آج توفیق ہوجائے گی) تو اگلے روز دیوار کا باقی ماندہ حصّہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اس کو توڑ کر پار کرلیں گے۔

ترمذی نے اس روایت کو بسند ابی عوانہ عن قتادہ عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ نقل کرکے فرمایا: غریب لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کرکے فرمایا :-

اسنادہ جیّد قوی ولکن متنہ فی رفعہ نکارۃ	" اسناد اس کی جیّد اور قوی ہے، لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے اس کو مرفوع کرنی

یا اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں ایک نکارت واجنبیت معلوم ہوتی ہے "

اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ بات صحیح مان لیجائے

کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ کعب احبار کی روایت ہے تب تو بات صاف ہو گئی کہ یہ کوئی قابلِ اعتماد چیز نہیں، اور اگر اس روایت کو وہم راوی سے محفوظ قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد قرار دیا جائے تو پھر مطلب اس کا یہ ہوگا کہ یاجوج ماجوج کا یہ عمل سدّ کو کھودنے کا اس وقت شروع ہوگا جبکہ ان کے خروج کا وقت قریب آجائے گا، اور قرآنی ارشاد کہ اس دیوار میں نقب نہیں لگائی جا سکتی، یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ذوالقرنین نے اس کو تعمیر کیا تھا، اس لئے کوئی تعارض نہ رہا، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نقب سے مراد دیوار کا وہ رخنہ اور سوراخ ہے جو آر پار ہو جائے، اور اس روایت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ سوراخ آر پار نہیں ہوتا (بدایہ ص ۱۱۲ ج ۲)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث کو عبد بن حمید اور ابن حبان کے حوالے سے بھی نقل کر کے کہا ہے کہ ان سب کی روایت حضرت قتادہ سے ہے، اور ان میں سے بعض کی سند کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں، اور حدیث کے مرفوع قرار دینے پر بھی کوئی شبہ نہیں کیا، اور بحوالہ ابن عربی بیان کیا کہ اس حدیث میں تین آیات الٰہیہ یعنی معجزات ہیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا، کہ سدّ کو کھودنے کا کام رات دن مسلسل جاری رکھیں، ورنہ اتنی بڑی قوم کے لئے کیا مشکل تھا کہ دن اور رات کی ڈیوٹیاں الگ الگ مقرر کر لیتے، دوسرے ان کے ذہنوں کو اس طرف سے پھیر دیا کہ اس سدّ کے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں، اس کے لئے آلات سے مدد لیں، حالانکہ وہب بن منبہ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحبِ زراعت و صناعت ہیں، ہر طرح کے آلات رکھتے ہیں، ان کی زمین میں درخت بھی مختلف قسم کے ہیں، کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اوپر چڑھنے کے ذرائع وسائل پیدا کر لیتے، تیسرے یہ کہ ساری مدت میں ان کے قلوب میں یہ بات نہ آئے کہ انشاء اللہ کہہ لیں، صرف اس وقت یہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہوگا، جب ان کے نکلنے کا وقت مقرر آجائے گا۔

ابن عربی نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے وجود اور اس کی مشیّت و ارادے کو مانتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر کسی عقیدے کے ہی ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ یہ کلمہ جاری کر دے، اور اس کی برکت سے ان کا کام بن جائے، (اشراط الساعۃ للسید محمد، ص ۱۵۴) مگر ظاہر یہی ہے کہ ان کے پاس بھی انبیاء علیہم السلام کی دعوت پہونچ چکی ہے، ورنہ نصِ قرآنی کے مطابق ان کو جہنم کا عذاب نہ ہونا چاہئے، وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا، معلوم ہوا کہ دعوتِ ایمان ان کو بھی پہونچی ہے، مگر یہ لوگ کفر پر جمے رہے، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے وجود

اور اس کے ارادہ و مشیت کے قائل ہوں گے، اگرچہ صرف اتنا عقیدہ ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک رسالت اور آخرت پر ایمان نہ ہو، بہرحال ان شاء اللہ کا کلمہ کہنا باوجود کفر کے بھی بعید نہیں۔

روایاتِ حدیث سے حاصل شدہ نتائج مذکور الصدر احادیث میں یاجوج ماجوج کے متعلق جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یاجوج ماجوج عام انسانوں کی طرح انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، جمہور محدثین و مؤرخین ان کو یافث ابن نوح علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یافث ابن نوح کی اولاد نوح علیہ السلام کے زمانے سے ذوالقرنین کے زمانے تک دور دور تک مختلف قبائل اور مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی، یاجوج ماجوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب سدّ ذوالقرنین کے پیچھے ہی محصور ہو گئے ہوں، ان کے کچھ قبائل اور قومیں سدّ ذوالقرنین کے اس طرف بھی ہوں گے، البتہ ان میں سے جو قتل و غارت گری کرنے والے وحشی لوگ تھے، وہ سدِّ ذوالقرنین کے ذریعہ روک دیئے گئے مؤرخین عام طور سے ان کو ترک اور مغول یا منگولین لکھتے ہیں، مگر ان میں سے یاجوج ماجوج نام صرف ان وحشی غیر متمدن خونخوار ظالم لوگوں کا ہے جو تمدن سے آشنا نہیں ہوئے، انہی کی برادری کے مغول اور ترک یا منگولین جو متمدن ہو گئے وہ اس نام سے خارج ہیں۔

(۲) یاجوج ماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زائد، کم از کم ایک اور دس کی نسبت سے ہے (حدیث نمبر ۲)

(۳) یاجوج ماجوج کی جو قومیں اور قبائل سدّ ذی القرنین کے ذریعہ اس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح محصور رہیں گے، ان کے نکلنے کا وقت مقدّر ظہور مہدی علیہ السلام پھر خروجِ دجال کے بعد وہ ہوگا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر چکیں گے۔ (حدیث نمبر ۱)

(۴) یاجوج ماجوج کے کھلنے کے وقت سدِّ ذوالقرنین منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، (آیت قرآن) اس وقت یہ یاجوج ماجوج کی بے پناہ قومیں بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی سرعتِ رفتار کے سبب ایسی معلوم ہوں گی کہ گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور یہ لاتعداد وحشی انسان عام انسانی آبادی اور پوری زمین پر ٹوٹ پڑیں گے، اور ان کے قتل و غارت گری کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا، اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بامر الٰہی اپنے ساتھی مسلمانوں کو لے کر کوہِ طور پر پناہ لیں گے، اور عام دنیا کی آبادیوں میں جہاں کچھ قلعے یا محفوظ مقامات ہیں وہ ان میں بند ہو کر اپنی جانیں بچائیں گے، کھانے پینے کا سامان ختم ہو جانے کے بعد

ضروریاتِ زندگی انتہائی گراں ہوجائے گی، باقی انسانی آبادی کو یہ وحشی قومیں ختم کر ڈالیں گی، ان کے دریاؤں کو چاٹ جائیں گی (حدیث نمبر ۱)

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی دُعاء سے پھر یہ ٹڈی دل قسم کی بے شمار قومیں بیک وقت ہلاک کردی جائیں گی، ان کی لاشوں سے ساری زمین پٹ جائے گی، ان کی بدبو کی وجہ سے زمین پر بسنا مشکل ہوجائے گا (حدیث نمبر ۱)

(۶) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء ہی کی دعاء سے ان کی لاشیں دریا بُرد یا غائب کردی جائے گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین کو دھو کر پاک صاف کردیا جائیگا (حدیث ۱)

(۷) اس کے بعد تقریباً چالیس سال امن وامان کا دَور دورہ ہوگا، زمین اپنی برکات اُگل دے گی، کوئی مفلس محتاج نہ رہے گا، کوئی کسی کو نہ ستائے گا، سکون واطمینان آرام وراحت عام ہوگی (حدیث نمبر ۳)

(۸) اس امن وامان کے زمانے میں بیت اللہ کا حج وعمرہ جاری رہے گا (حدیث نمبر ۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور روضۂ اقدس میں دفن روایاتِ حدیث سے ثابت ہے، اس کی بھی یہی صورت ہوگی کہ وہ حج یا عمرہ کے لئے حجاز کا سفر کریں گے (کما رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ، التصریح) اس کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوگی، روضۂ اقدس میں دفن کیا جائے گا۔

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں بذریعہ وحی خواب آپ کو دکھلایا گیا کہ سدِّ ذوالقرنین میں ایک سوراخ ہوگیا ہے جس کو آپ نے عرب کے لئے شر وفتنہ کی علامت قرار دی، اس دیوار میں سُوراخ ہوجانے کو بعض محدثین نے اپنی حقیقت پر محمول کیا ہے، اور بعض نے اس کا مطلب بطور استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب یہ سدِّ ذوالقرنین کمزور ہوچکی ہے، خروج یاجوج ماجوج کا وقت قریب آگیا ہے اور اس کے آثار عرب قوم کا تنزّل وانحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ واللہ اعلم

(۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کا قیام زمین پر چالیس سال ہوگا، (حدیث نمبر ۳) ان سے پہلے حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ بھی چالیس سال رہے گا جس میں کچھ حصہ دونوں کے اجتماع واشتراک کا ہوگا، سید شریف برزنجی نے اپنی کتاب اشراط الساعۃ صفحہ ۱۴۵ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتلِ دجّال اور امن وامان کے بعد چالیس سال ہوگا، اور مجموعۂ قیام پینتالیس سال ہوگا، اور صفحہ ۱۱۲ میں ہے کہ مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیس سے اوپر کچھ سال پہلے ظاہر ہوں گے، اور ان کا مجموعۂ زمانہ چالیس سال ہوگا، اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع رہے گا، اور ان دونوں زمانوں

کی یہ خصوصیت ہوگی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہوگی، زمین اپنی برکات اور خزائن اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، لوگوں کے آپس میں بغض و عداوت قطعاً نہ رہے گی، ہاں حضرت مہدی علیہ السلام کے آخری زمانے میں دجّالِ اکبر کا فتنہ عظیم سوائے مکہ اور مدینہ اور بیت المقدس اور کوہِ طور کے سارے عالم پر چھا جائے گا، اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے عظیم تر ہوگا، دجّال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہیگا، مگران چالیس دنوں میں سے پہلا دن ایک سال کا، دوسرا دن ایک مہینہ کا، تیسرا دن ایک ہفتہ کا ہوگا، باقی دن عام دنوں کی طرح کے ہونگے، جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقۃً یہ دن اتنے طویل کر دیئے جائیں، کیونکہ اس آخر زمانے میں تقریباً سارے واقعات ہی خرقِ عادت اور معجزہ کے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن رات تو اپنے معمول کے مطابق ہوتے رہیں مگر دجّال کا بڑا ساحر ہونا حدیث سے ثابت ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے سحر کے اثر سے عام مخلوق کی نظروں پر یہ دن رات کا تغیر و انقلاب ظاہر نہ ہو، وہ اس کو ایک ہی دن دیکھتے اور سمجھتے رہیں، حدیث میں جو اس دن کے اندر عام دنوں کے مطابق اندازہ لگا کر نمازیں پڑھنے کا حکم آیا ہے، اس سے بھی تائید اس کی ہوتی ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو دن رات بدل رہے ہوں گے، مگر لوگوں کے احساس میں یہ بدلنا نہیں ہوگا، اس لئے اس ایک سال کے دن میں تین سو ساٹھ دنوں کی نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر دن حقیقۃً ایک ہی دن ہوتا تو قواعد شرعیہ کی رُو سے اس میں صرف ایک ہی دن کی پانچ نمازیں فرض ہوتیں، خلاصہ یہ ہے کہ دجّال کا کُل زمانہ اس طرح کے چالیس دن کا ہوگا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجّال کو قتل کر کے اس فتنہ کو ختم کریں گے، مگر اس کے متصل ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا جو پوری دنیا میں فساد اور قتل و غارت گری کریں گے، مگر ان کا زمانہ بھی چند ایام ہی ہوں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ سب بیک وقت ہلاک ہوجائیں گے، غرض حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے کے آخر میں اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے شروع میں دو فتنے دجّال اور یاجوج ماجوج کے ہوں گے جو تمام زمین کے لوگوں کو تہہ و بالا کر دیں گے، ان ایام معدودہ سے پہلے اور بعد میں پوری دنیا کے اندر عدل و انصاف اور امن و سکون اور برکات و ثمرات کا دَور دورہ ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کے سوا کوئی کلمہ و مذہب زمین پر نہ رہیگا، زمین اپنے خزائن و دفائن اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، درندے اور زہریلے جانور بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں گے۔

یاجوج ماجوج اور سدِّ ذوالقرنین کے متعلق یہ معلومات تو وہ ہیں جو قرآن اور احادیثِ نبویّہ نے اُمّت کو بتلا دیئے ہیں، اسی پر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت ناجائز ہے،

باقی رہی اس کی جغرافیائی بحث کہ سدِ ذوالقرنین کس جگہ واقع ہے، اور قوم یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے، اور اس وقت کہاں کہاں بستی ہے، اگرچہ اس پر نہ کوئی اسلامی عقیدہ موقوف ہے، اور نہ قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا اس پر موقوف ہے، لیکن مخالفین کی ہفوات کے جواب اور مزید بصیرت کے لئے علماء امت نے اس سے بحث فرمائی ہے، اس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں بحوالہ سدی نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بائیس قبیلوں میں سے اکیس قبیلوں کو سدِ ذوالقرنین سے بند کر دیا گیا، ان کا ایک قبیلہ سدِ ذوالقرنین کے اندر اس طرف رہ گیا، وہ تُرک ہیں، اس کے بعد قرطبی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تُرک کے متعلق جو باتیں بتلائی ہیں وہ یاجوج ماجوج سے ملتی ہوئی ہیں، اور آخر زمانے میں مسلمانوں کی ان سے جنگ ہونا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، پھر فرمایا کہ اس زمانے میں تُرک قوم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلی ہوئی ہے جن کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، وہی مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی یاجوج ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا مقدمہ ہیں (قرطبی، ص ۵۸ ج ۱۱) (قرطبی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے، جس میں فتنہ تاتار ظاہر ہوا، اور اسلامی خلافت کو تباہ و برباد کیا، ان کا عظیم فتنہ تاریخ اسلام

اور سدّ ذوالقرنین اور ان کے محل و مقام کے متعلق جغرافیائی تحقیق اس طرح فرمائی ہے :-
"ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جو قنجاق اور چرکس کہلاتے ہیں، اور مشرق کی جانب یاجوج ماجوج کی آبادیاں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حدِ فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے، کہ وہ بحرِ محیط سے شروع ہوتا ہے، جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے، اور پھر بحرِ محیط سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور یہاں پہونچ کر جنوب سے شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے، اور اسی سلسلۂ کوہ کے درمیان سدِّ سکندری واقع ہے، اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ سدّ سکندری ہے، جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔
اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ خلیفہ عباسی

مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، ان میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوارِ چین ہے، جس کا طول ابوحیان اندلسی (دربارِ ایران کے شاہی مؤرخ) نے بارہ سو میل بتلایا ہے، اور یہ کہ اس کا بانی فغفور بادشاہِ چین ہے، اور اس کی بناء کی تاریخ ہبوط آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی، اور یہ کہ اس دیوارِ چین کو مغل لوگ اَتکُووَہ اور ترک لوگ بُورقُورقہ کہتے ہیں، اور فرمایا کہ اسی طرح کی اور بھی متعدد دیواریں سدیں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

ہمارے خواجہ تاش مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں حضرت شیخ کے اس بیان کی تاریخی توضیح بڑی تفصیل وتحقیق سے لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

یاجوج ماجوج کی تاخت وتاراج اور شروفساد کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم وستم کا شکار تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ہر وقت اُن کی زد میں تھے، انہی یاجوج ماجوج کے شروفساد سے بچنے کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر متعدد سدّ تعمیر کی گئی، ان میں سب سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوارِ چین ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

دوسری سدّ وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے، یہ سدّ مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی، اور شاہ روم کے خاص ہمنشین سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاؔفجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اسکا ذکر کیا ہے یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس جگہ سے گذرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بابُ الحدید کی سدّ موصل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے (از تفسیر جواہر القرآن طنطاوی صفحہ ۱۹۸ ج ۹)

تیسری سدّ روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے، یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحرِ خزر (کاسپین) کے غربی کنارے پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳-۴۳ شمالاً اور طول البلد ۱۵-۴۸ شرقاً ہے، اور اس کو دربند نوشیرواں بھی کہتے ہیں، اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے"

چوتھی سدّ اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند حصّوں میں ہے، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ درّہ داریال کے نام سے مشہور ہے، اس جگہ یہ چوتھی سدّ

جو قفقاز یا جبل قوقا یا کوہ قاف کی سد کہلاتی ہے، بستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے:

"اور اسی کے (یعنی سدِ باب الابواب کے) قریب ایک اور سد ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے، غالباً اس کو اہلِ فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا، کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا، بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی ہے، اور بعض نے کسرٰی و نوشیرواں کی طرف اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تعمیر کی گئی ہے، (دائرۃ المعارف جلد ۷، ص ۶۵۱، معجم البلدان جلد ۸، ص ۹)"

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں ہیں، اور تقریباً ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی گئی ہیں، اس لئے ان میں سے سدِ ذوالقرنین کونسی ہے، اس کے متعین کرنے میں اشکالات پیش آئے ہیں، اور بڑا اختلاط ان آخری دو سدوں کے معاملہ میں پیش آیا، کیونکہ دونوں مقامات کا نام بھی دربند ہے اور دونوں جگہ سد بھی موجود ہے، مذکورالصدر چار سدوں میں سے دیوار چین جو سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ قدیم ہے، اس کے متعلق تو سدِ ذوالقرنین ہونے کا کوئی قائل نہیں اور وہ بجائے شمال کے مشرقِ اقصٰی میں ہے، اور قرآن کریم کے اشارہ سے اس کا شمال میں ہونا ظاہر ہے۔

اب معاملہ باقی تین دیواروں کا رہ گیا جو شمال ہی میں ہیں، ان میں سے عام طور پر مورخین مسعودی، اصطخری، حموی وغیرہ اس دیوار کو سدِ ذوالقرنین بتاتے ہیں جو داغستان یا کاکیشیا کے علاقہ باب الابواب کے دربند میں بحر خزر پر واقع ہے، بخارا و ترمذ کے دربند اور اس کی دیوار کو جن مورخین نے سد ذوالقرنین کہا ہے وہ غالباً لفظ دربند کے اشتراک کی وجہ سے ان کو اختلاط ہوا ہے، اب تقریباً اس کا محلِ وقوع متعین ہو گیا کہ علاقہ داغستان کاکیشیا کے دربند باب الابواب میں یا اس سے بھی اوپر جبل قفقاز یا کوہ قاف کی بلندی پر ہے، اور ان دونوں جگہوں پر سد کا ہونا مورخین کے نزدیک ثابت ہے۔

ان دونوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ قدس سرہٗ نے عقیدۃ الاسلام میں کوہ قاف قفقاز کی سد کو ترجیح دی ہے کہ یہ سد ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ہو (عقیدۃ الاسلام ص ۲۹۷)

سد ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گی، یا وہ ٹوٹ چکی ہے؟: آجکل تاریخ وجغرافیہ کے ماہرین اہلِ یورپ اس وقت ان شمالی دیواروں میں سے کسی کا موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے، اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب بھی یاجوج ماجوج کا راستہ بند ہے، اس بناء پر بعض اہلِ اسلام مورخین نے بھی یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے کہ یاجوج ماجوج

جن کے خروج کا قرآن و حدیث میں ذکر ہے وہ ہو چکا ہے، بعض نے چھٹی صدی ہجری میں طوفان بن کر اٹھنے والی قوم تاتارہی کو اس کا مصداق قرار دیدیا ہے، بعض نے اس زمانے میں دنیا پر غالب آجانے والی قوموں روس اور چین اور اہلِ یورپ کو یاجوج ماجوج کہہ کر اس معاملہ کو ختم کردیا ہے، مگر جیسا کہ اوپر بحوالۂ روح المعانی بیان ہو چکا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے، احادیث صحیحہ کے انکار کے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس خروج یاجوج ماجوج کو قرآن کریم نے بطور علامتِ قیامت بیان کیا، اور جس کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث نواس بن سمعان وغیرہ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ واقعہ خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور قتلِ دجال کے بعد پیش آئے گا وہ واقعہ ہو چکا، کیونکہ خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اب تک نہیں ہوا۔

البتہ یہ بات بھی قرآن و سنت کی کسی نصِ صریح کے خلاف نہیں ہے کہ سدِ ذوالقرنین اس وقت ٹوٹ چکی ہو، اور یاجوج ماجوج کی بعض قومیں اس طرف آچکی ہوں، بشرطیکہ اس کو تسلیم کیا جائے کہ ان کا آخری اور بڑا ہلّہ جو پوری انسانی آبادی کو تباہ کرنے والا ثابت ہوگا وہ ابھی نہیں ہوا، بلکہ قیامت کی اُن بڑی علامات کے بعد ہوگا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت الاستاذ حجۃ الاسلام علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ اہلِ یورپ کا یہ کہنا تو کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ہم نے ساری دنیا چھان ماری ہے ہمیں اس دیوار کا پتہ نہیں لگا، کیونکہ اوّل تو خود انہی لوگوں کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ سیاحت اور تحقیق کے انتہائی معراج پر پہونچنے کے باوجود آج بھی بہت سے جنگل اور دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، دوسرے یہ بھی احتمال بعید نہیں کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے گرنے اور باہم مل جانے کے سبب ایک پہاڑ ہی کی صورت اختیار کر چکی ہو، لیکن کوئی نصِ قطعی اس کے بھی منافی نہیں کہ قیامت سے پہلے یہ سد ٹوٹ جائے، یا کسی دور دراز کے طویل راستہ سے یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آسکیں۔

اس سدِ ذوالقرنین کے تاقیامت باقی رہنے پر بڑا استدلال تو قرآن کریم کے اس لفظ سے کیا جاتا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ، یعنی ذوالقرنین کا یہ قول کہ جب میرے رب کا وعدہ آپہونچے گا (یعنی خروج یاجوج ماجوج کا وقت آجائے گا) تو اللہ تعالیٰ اس آہنی دیوار کو ریزہ ریزہ کرکے زمین کے برابر کردیں گے، اس آیت میں وَعْدُ رَبِّیْ کا مفہوم ان حضرات نے قیامت کو قرار دیا ہے، حالانکہ الفاظِ قرآن اس بارے میں قطعی نہیں، کیونکہ وَعْدُ رَبِّیْ کا صریح

مفہوم تو یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا راستہ روکنے کا جو انتظام ذوالقرنین نے کیا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے، جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ ان کا راستہ کھل جائے تو یہ دیوار منہدم ومسمار ہو جائے گی، اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل قیامت کے متصل ہو، چنانچہ تمام حضرات مفسرین نے وَعْدُ رَبِّی کے مفہوم میں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں ہے وَالوعد یحتمل ان یراد بہ یوم القیٰمۃ وان یراد بہ وقت خروج یاجوج وماجوج۔

اس کا تحقق یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار منہدم ہو کر راستہ ابھی کھل گیا ہو، اور یاجوج و ماجوج کے حملوں کی ابتداء ہو چکی ہو، خواہ اس کی ابتداء چھٹی صدی ہجری کے فتنہ تاتار سے قرار دی جائے، یا اہل یورپ اور روس وچین کے غلبہ سے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان متمدن قوموں کے خروج اور فساد کو جو آئینی اور قانونی رنگ میں ہو رہا ہے وہ فساد نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا پتہ قرآن و حدیث دے رہے ہیں کہ خالص قتل و غارت گری اور ایسی خوں ریزی کے ساتھ ہوگا کہ تمام انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر دے گا، بلکہ اس کا حاصل پھر یہ ہوگا کہ انہی مفسد یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آ کر متمدن بن گئیں، اسلامی ممالک کے لئے بلاشبہ وہ فساد عظیم اور فتنہ عظیمہ ثابت ہوئیں، مگر ابھی ان کی وحشی قومیں جو قتل وخوں ریزی کے سوا کچھ نہیں جانتیں وہ تقدیری طور پر اس طرف نہیں آئیں اور بڑی تعداد ان کی ایسی ہی ہے، ان کا خروج قیامت کے بالکل قریب میں ہوگا۔

دوسرا استدلال ترمذی اور مسند احمد کی اس حدیث سے کیا جاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ یاجوج ماجوج اس دیوار کو روزانہ کھودتے رہتے ہیں، مگر اوّل تو اس حدیث کو ابن کثیر نے معلول قرار دیا ہے، دوسرے اس میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں کہ جس روز یاجوج ماجوج انشاء اللہ کہنے کی برکت سے اس کو پار کر لیں گے وہ قیامت کے متصل ہی ہوگا، اور اس کی بھی اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں کہ سارے یاجوج ماجوج اسی دیوار کے پیچھے رُکے ہوئے رہیں گے، اگر ان کی کچھ جماعتیں یا قومیں کسی دور دراز کے راستہ سے اس طرف آ جائیں، جیسا کہ آجکل کے طاقتور بحری جہازوں کے ذریعہ ایسا ہو جانا کچھ مستبعد نہیں، اور بعض مؤرخین نے لکھا بھی ہے کہ یاجوج ماجوج کو طویل بحری سفر کر کے اس طرف آنے کا راستہ مل گیا ہے، تو اس حدیث سے اس کی بھی نفی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں کوئی ایسی دلیل صریح اور قطعی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ سدّ ذوالقرنین قیامت تک باقی رہے گی، یا ان کے ابتدائی اور معمولی حملے قیامت سے پہلے اس طرف کے انسانوں پر نہیں ہو سکیں گے، البتہ وہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن حملہ

جو پوری انسانی آبادی کو برباد کر دے گا، اس کا وقت بالکل قیامت کے متصل ہی ہوگا جس کا ذکر بار بار آچکا ہے، حاصل یہ ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص کی بناء پر نہ یہ قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ سدّ یاجوج ماجوج ٹوٹ چکی ہے اور رستہ کھل گیا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ از روئے قرآن و سنت اس کا قیامت تک قائم رہنا ضروری ہے، احتمال دونوں ہی ہیں، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ

اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو اس دن ایک دوسرے میں گھستے اور پھونک ماریں گے صور میں

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ

پھر جمع کر لائیں گے ہم اُن سب کو، اور دکھلا دیں ہم دوزخ اس دن کافروں کو

عَرْضَا ﴿١٠٠﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا

سامنے، جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے اور نہ

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾

سُن سکتے تھے۔

ع ۱۹ ۲ / ۱۱

خلاصۂ تفسیر

اور ہم اس روز (یعنی جب اس دیوار کے انہدام کا یوم موعود آئے گا اور یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا تو اس روز ہم) ان کی یہ حالت کریں گے کہ ایک میں ایک گڈمڈ ہو جائیں گے، (کیونکہ یہ کثرت سے ہوں گے اور بیک وقت نکل پڑیں گے اور سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہوں گے) اور (یہ قیامت کے قریب زمانہ میں ہوگا، پھر بعد چندے قیامت کا سامان شروع ہوگا، ایک بار اوّل صور پھونکا جائے گا جس سے تمام عالم فنا ہو جائے گا، پھر) صور (دوبارہ) پھونکا جائے گا (جس سے سب زندہ ہو جائیں گے) پھر ہم سب کو ایک ایک کر کے (میدان حشر میں) جمع کر لیں گے اور دوزخ کو اس روز کافروں کے سامنے پیش کر دیں گے جن کی آنکھوں پر (دنیا میں) ہماری یاد سے (یعنی دین حق کے دیکھنے سے) پردہ پڑا ہوا تھا اور (جس طرح یہ حق کو دیکھتے نہ تھے اسی طرح اس کو) وہ سُن بھی نہ سکتے تھے (یعنی حق کو معلوم کرنے کے ذرائع دیکھنے اور سننے کے سب راستے بند کر رکھے تھے)۔

معارف و مسائل

بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ، بَعْضَهُمْ کی ضمیر میں ظاہر یہی ہے کہ یاجوج ماجوج کی طرف راجع ہے، اور ان کا جو حال اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجائیں گے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ان کا راستہ کھلے گا، اور وہ زمین پر پہاڑوں کی بلندیوں سے جلد بازی کے ساتھ اتریں گے، مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں۔

وَجَمَعْنٰهُمْ، ضمیر عام مخلوق جن وانس کی طرف راجع ہے، مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں تمام مکلف مخلوق جن وانس کو جمع کردیا جائے گا۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ

اب کیا سمجھتے ہیں منکر کہ ٹھہرائیں میرے بندوں کو میرے سوا

اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلْ هَلْ

حمایتی ہم نے تیار کیا ہے دوزخ کو کافروں کی مہمانی، تو کہہ ہم

نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي

بتائیں تم کو کن کا کیا ہوا گیا بہت اکارت، وہ لوگ جن کی کوشش بھٹکتی رہی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ خوب بناتے ہیں کام،

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

وہی ہیں جو منکر ہوئے اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے ملنے سے سو برباد گیا انکا کیا ہوا

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ

پھر نہ کھڑی کریں گے ہم ان کے واسطے قیامت کے دن تول، یہ بدلہ ان کا ہے دوزخ اس

بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

پر کہ منکر ہوئے اور ٹھہرایا میری باتوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا، جو لوگ

۴۲

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام اُن کے واسطے ہے ٹھنڈی چھاؤں کے باغ مہمانی،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

رہا کریں ان میں نہ چاہیں وہاں سے جگہ بدلنی۔

خلاصۂ تفسیر

کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو (یعنی جو میرے مملوک و محکوم ہیں اختیاراً یا اضطراراً ان کو) اپنا کارساز (یعنی معبود اور حاجت روا) قرار دیں (جو شرک اور کفر کھلا ہوا ہے) ہم نے کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے (دعوت بطور تحقیر و تہکم کے فرمایا) اور اگر (ان کو اپنے ان اعمال پر ناز ہو جن کو وہ حسنہ اور نیکی سمجھتے ہوں اور اس کے سبب وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ، عذاب سے محفوظ سمجھتے ہوں تو) آپ (ان سے) کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت (جو اعمالِ حسنہ میں کی تھی) سب گئی گذری ہوئی اور وہ (بوجہ جہالت کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں (آگے ان لوگوں کا مصداق ایسے عنوان سے بتلاتے ہیں جس سے ان کی محنت ضائع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے، اور پھر اس حبطِ اعمال کی تصریح بھی بطور تفریع کے فرماتے ہیں یعنی) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں سو (اس لئے) ان کے سارے (نیک) کام غارت گئے تو قیامت کے روز ہم ان (کے نیک اعمال) کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے (بلکہ) ان کی سزا وہی ہوگی (جو اوپر مذکور ہوئی) یعنی دوزخ، اس لئے کہ انھوں نے کفر کیا تھا اور (اس کفر کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ) میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا، (آگے ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کی مہمانی کے لئے فردوس (یعنی بہشت) کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (نہ ان کو کوئی نکالے گا) اور نہ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہیں گے۔

معارف ومسائل

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس جگہ عبارت میں حذف ہے، یعنی فیجعہم نفعاً وینتفعون بذلك الا تخاذ، اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ کفر کرنے والے جنھوں نے میرے بجائے میرے بندوں کو اپنا معبود اور کارساز بنالیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو معبود و کارساز بنالینا ان کو کچھ نفع بخشے گا، اور وہ اس سے کچھ فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ استفہام انکاری ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا سمجھنا غلط اور جہالت ہے عِبَادِيْ سے مراد اس جگہ فرشتے اور وہ انبیاء ہیں جن کی دنیا میں لوگوں نے پرستش کی اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، جیسے حضرت عزیرؑ اور مسیح علیہ السلام، فرشتوں کی عبادت کرنے والے بعض عرب تھے، اور عزیر علیہ السلام کو یہود نے، عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا کا شریک قرار دیا، اس لئے اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے اس آیت میں کفار کے یہی فرقے مراد ہیں، اور جن بعض مفسرین نے اس جگہ عِبَادِيْ سے مراد شیاطین لئے تو اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے وہ کفار مراد ہوں گے جو جنات و شیاطین کی پرستش کرتے ہیں، بعض نے اس جگہ لفظ عِبَادِيْ کو مخلوق و مملوک کے معنی میں لے کر عام قرار دیا، جس میں سب معبوداتِ باطلہ بُت، آگ، اور ستارے بھی داخل ہو گئے، خلاصۂ تفسیر میں لفظ محکوم و مملوک سے اسی کی طرف اشارہ ہے، بحر محیط وغیرہ میں پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

اَوْلِيَآءَ، ولی کی جمع ہے، یہ لفظ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس سے مراد کارساز، حاجت روا ہے، جو معبود برحق کی خاص صفت ہے، مقصود اس سے ان کو معبود قرار دینا ہے۔

اَلْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا، اس جگہ پہلی دو آیتیں اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ہر اس فرد یا جماعت کو شامل ہیں جو کچھ اعمال کو نیک سمجھ کر اس میں جد وجہد اور محنت کرتے ہیں، مگر اللہ کے نزدیک ان کی محنت برباد اور عمل ضائع ہے، قرطبی نے فرمایا کہ یہ صورت دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے، ایک فسادِ اعتقاد، دوسرے ریاکاری، یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہو وہ عمل کتنے ہی اچھے کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہے۔ اسی طرح جس کا عمل مخلوق کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ہو وہ بھی عمل کے ثواب سے محروم ہے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے بعض حضراتِ صحابہ نے اس کا مصداق خوارج کو اور بعض مفسرین نے معتزلہ اور روافض وغیرہ گمراہ فرقوں کو قرار دیا

مگر اگلی آیت میں یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ اس جگہ مراد وہ کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور قیامت و آخرت کے منکر ہوں، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ، اس لئے قرطبی، ابوحیان، مظہری وغیرہ میں ترجیح اس کو دی گئی ہے کہ اصل مراد اس جگہ وہی کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہوں، مگر صورۃً وہ لوگ بھی اس کے مفہوم عام سے بے تعلق نہیں ہو سکتے جن کے اعمال ان کے عقائد فاسدہ نے برباد کر دیئے، اور ان کی محنت رائیگاں ہوگئی، بعض صحابہ کرام حضرت علیؓ اور سعدؓ سے جو ایسے اقوال منقول ہیں ان کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا، یعنی ان کے اعمال جو ظاہر میں بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر میزانِ حساب میں اُن کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعمال کفر و شرک کی وجہ سے بےکار اور بے وزن ہوں گے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک آدمی قدآور اور فربہ آئے گا جو اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی وزن دار نہ ہوگا، اور پھر فرمایا کہ اگر اس کی تصدیق کرنا چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا

اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ (قیامت کے روز) ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو جسامت کے اعتبار سے تہامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے، مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ (قرطبی)

جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ، فردوس کے معنی سرسبز باغ کے ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یا عجمی، جن لوگوں نے عجمی کہا ہے اس میں بھی فارسی ہے یا رُومی یا سُریانی مختلف اقوال ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے اس کے اوپر عرشِ رحمٰن ہے، اور اسی سے جنت کی سب نہریں نکلتی ہیں (قرطبی)

لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا، مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنت کا یہ مقام ان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرما دیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہوگیا وہ وہاں سے کبھی نکالا نہ جائے گا، مگر یہاں ایک خطرہ کسی کے دل میں یہ گذر سکتا تھا کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ ایک جگہ رہتے رہتے اُکتا جاتا ہے، وہاں سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کی

خواہش ہوتی ہے، اگر جنت سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہ ہوئی تو ایک قید محسوس ہونے لگے گی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ جنت کو دوسرے مقامات پر قیاس کرنا جہالت ہے، جو شخص جنت میں چلا گیا پھر جو کچھ دنیا میں دیکھا اور برتا تھا جنت کی نعمتوں اور دل کش فضاؤں کے سامنے اس کو وہ سب چیزیں لغو معلوم ہوں گی، اور یہاں سے کہیں باہر جانے کا کبھی کسی کے دل میں خیال بھی نہ آئے گا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ

تو کہہ اگر دریا سیاہی ہو کہ لکھے میرے رب کی باتیں بیشک دریا خرچ ہو چکے ابھی نہ

تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا

پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگرچہ دوسرا بھی لائیں ہم ویسا ہی اس کی مدد کو، تو کہہ میں بھی

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ

ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے، سو پھر

كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ

جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے سو وہ کرے کچھ کام نیک اور شریک نہ کرے

بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

ع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات وعبارات جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہوں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف کو کوئی بیان کرنے لگے تو ایسے کلمات کو) لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو (اور اس سے لکھنا شروع کرے) تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (اور سب باتیں احاطہ میں نہ آئیں گی) اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لئے ہم لے آئیں (تب بھی وہ باتیں ختم نہ ہوں اور دوسرا سمندر بھی ختم ہو جائے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر متناہی ہیں، اس کے سوا جن چیزوں کو کافروں نے اللہ کا شریک مانا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، اس لئے الوہیت و ربوبیت [خدا ہونا اور رب ہونا] اسی کی

ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے ان لوگوں سے آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تو تم سب کی طرح بشر ہوں (نہ خدائی کا دعوے دار ہوں نہ فرشتہ ہونے کا ہاں) میرے پاس (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے (اور) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور اس کا محبوب بننا چاہے) تو (مجھ کو رسول مان کر میری شریعت کے موافق) نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

معارف و مسائل

سورۂ کہف کی آخری آیت میں وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، کا شانِ نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرکِ خفی یعنی ریاء ہے۔

امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے، اور اس کو صحیح علیٰ شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا)۔

اور ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں طاؤس رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں بعض اوقات کسی نیک کام کے لئے یا عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا قصد اس سے اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ دل میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ لوگ میرے عمل کو دیکھیں، آپ نے یہ سن کر سکوت فرمایا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اور ابونعیم اور تاریخ ابن عساکر میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ لکھا ہے کہ جندب بن زہیر رضی اللہ عنہ صحابی جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے پھر دیکھتے کہ لوگ ان اعمال سے انکی تعریف و ثناء کر رہے ہیں تو اس سے ان کو خوشی ہوتی، اور اپنے اس عمل کو اور زیادہ کر دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریاکاری کا شرک خفی ہے، اور یہ کہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لئے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی نفسانی غرض شہرت و وجاہت کی بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے، جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رسان بنا دیتا ہے۔

لیکن بعض دوسری احادیث صحیحہ سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، مثلاً ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات اپنے گھر کے اندر اپنے جائے نماز پر (نماز میں مشغول) ہوتا ہوں، اچانک کوئی آدمی آجائے تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا (تو کیا یہ ریا ہوگئی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوہریرہ خدا تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے تمہیں اس وقت دو اجر ملتے ہیں، ایک خفیہ عمل کا جو پہلے سے کر رہے تھے دوسرا اعلانیہ عمل کا جو اس آدمی کے آجانے کے بعد ہوگیا (یہ ریاء نہیں)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں فرمایئے کہ جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، پھر لوگوں کو سُنے کہ وہ اس عمل کی تعریف و مدح کر رہے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی یہ تو مؤمن کے لئے نقد بشارت ہے (کہ اس کا عمل اللہ کے نزدیک قبول ہوا، اس نے اپنے بندوں کی زبانوں سے اس کی تعریف کرادی)۔

تفسیر مظہری میں ان دونوں قسم کی روایتوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے اس کی تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ پہلی روایات جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی اس صورت میں ہیں جب کہ انسان اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے ساتھ مخلوق کی رضاجوئی یا اپنی شہرت و وجاہت کی نیت کو بھی شریک کرے، یہاں تک کہ لوگوں کی تعریف کرنے پر اپنے اس عمل کو اور بڑھادے یہ بلاشبہ ریاء اور شرکِ خفی ہے۔

اور بعد کی روایات ترمذی اور مسلم کی اس صورت سے متعلق ہیں جبکہ اس نے عمل خالص اللہ کے لئے کیا ہو لوگوں میں اس کی شہرت یا ان کی مدح و ثناء کی طرف کوئی التفات نہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو مشہور کردیں اور لوگوں کی زبانوں پر اس کی تعریف جاری فرمادیں تو اس کا ریا سے کوئی تعلق نہیں، یہ مؤمن کے لئے نقد بشارت (قبولِ عمل کی) ہے۔

ریاکاری کے نتائج بد اور اس پر حدیث کی وعید شدید

حضرت محمود بن لبیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ریا (رواہ احمد فی مسندہ)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کرکے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزاء عطا فرمائیں گے تو ریاکار لوگوں سے

فرمادیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزاء لینے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لئے کوئی جزا ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں شرکاء میں شریک ہونے سے غنی اور بالاتر ہوں جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اسکو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا (رواہ مسلم)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص اپنے نیک عمل کو لوگوں میں شہرت کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں وہ حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے، (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان) از تفسیر مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ سے اخلاص اور ریاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تمھیں اپنے نیک اور اچھے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب ہو اور بُرے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب نہ ہو، پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال لوگوں پر ظاہر فرمادیں تو تم یہ کہو کہ یا اللہ یہ سب آپ کا فضل ہے احسان ہے میرے عمل اور کوشش کا اثر نہیں۔

اور حکیم ترمذی نے صدیق اکبرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ ھُوَ فِیۡکُمۡ اَخۡفٰی مِنۡ دَبِیۡبِ النَّمۡلِ، یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمھیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کر لو تو شرک اکبر اور شرک اصغر (یعنی ریاء) سب سے محفوظ ہو جاؤ تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعاء کیا کرو، اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُبِكَ اَنۡ اُشۡرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعۡلَمُ وَ اَسۡتَغۡفِرُكَ لِمَا لَاۤ اَعۡلَمُ

سورۂ کہف کے بعض فضائل اور خواص

حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد رکھیں وہ دجّال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (رواہ مسلم واحمد وابوداؤد والنسائی)

اور امام احمد، مسلم، اور نسائی نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ہی اس روایت میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں، کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں یاد رکھیں وہ فتنۂ دجّال سے محفوظ رہے گا۔

اور حضرت انسؓ کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے ایک نور ہو جائے گا، اس کے قدم سے لیکر سر تک اور جس نے یہ سورۃ پوری پڑھی اس کے لئے نور ہوگا زمین سے آسمان تک (اخرجہ ابن السنی واحمد فی مسندہ)

اور حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پوری پڑھ لی، تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا (رواہ الحاکم وصححہ والبیہقی فی الدعوات) از مظہری

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے کہا کہ میں دل میں ارادہ کرتا ہوں کہ آخر رات میں بیدار ہو کر نماز پڑھوں، مگر نیند غالب آجاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ جب تم سونے کے لئے بستر پر جاؤ تو سورۂ کہف کی آخری آیتیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا سے آخر سورت تک پڑھ لیا کرو، تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرو گے اللہ تعالیٰ تمھیں اسی وقت بیدار کر دیں گے (رواہ الثعلبی)

اور مسند دارمی میں ہے کہ زرّ بن حبیشؓ نے حضرت عبدہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورۂ کہف کی یہ آخری آیتیں پڑھ کر سوئے گا تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا اسی وقت بیدار ہو جائے گا، عبدہؒ کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک اہم نصیحت ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ طرطوشیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تمھاری عمر عزیز کے اوقات اپنے ہمعصروں سے مقابلے اور دوستوں سے میل جول ہی میں نہ گذر جائیں، دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان کو اس آیت پر ختم فرمایا ہے:۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا، یعنی جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو حصہ دار نہ بنائے (قرطبی)

الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، آج ۸ ر ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ سورۂ کہف کی یہ تفسیر مکمل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہی ہے کہ اس وقت قرآن کریم کا نصف اوّل سے کچھ زائد پورا ہو گیا، جبکہ عمر کا چھتّرواں سال چل رہا ہے، اور ضعفِ طبعی کے ساتھ دو سال سے مختلف امراض نے بھی گھیرا ہوا ہے، اور افکار کا ہجوم بھی غیر معمولی ہے، کچھ عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے باقی قرآن کی بھی تکمیل کرادیں، وما ذٰلک علی اللہ بعزیز ۞

جلد پنجم تمام شد